پسند فرمودہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید

حضرت العلامہ مولانا الحاج محمد عثمان غنی صاحب
شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور

مصنف

حضرت مولانا مفتی عبد الرزاق صاحب امروہوی
استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ یوپی

جلد نہم	حدیث: ۲۶۴۹-۲۸۶۱	باب: ۹۵۴-۱۰۵۵

كتاب الجهاد ، والاضحية ، والذ بائح ، والصيد ، والوصايا

زکریا بکڈپو دیوبند سہارنپور ۲۴۷۵۵۴

السمح المحمود

فی حل

سنن ابی داؤد

پسندفرمودہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے شاگرد رشید

حضرت العلامہ مولانا الحاج محمد عثمان غنی صاحب

شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور

مصنف

حضرت مولانا مفتی عبد الرزاق صاحب امروہوی

استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ یوپی

جلد نہم   حدیث: ۲۶۴۹-۲۸۶۱   باب: ۹۵۴-۱۰۵۵

كتاب الجهاد ، والاضحية ، والذبائح ، والصيد ، والوصايا

۲۴۷۵۵۴

زکریا بکڈپو دیوبند یوپی (انڈیا)

السمح المحمود
في حل
سنن أبي داود
جلد نہم

مصنف: حضرت مولانا مفتی عبد الرزاق صاحب امروہوی

تصحیح کنندہ: مولانا رضی آزاد قاسمی

سن اشاعت: ۲۰۱۵ء مطابق ۱۴۳۶ھ

باہتمام

ذوالفقار علي

ناشر

زکریا بکڈپو دیوبند یوپی (انڈیا) ۲۴۷۵۵۴

کمپیوٹر کتابت: الفضل کمپیوٹرس دیوبند 95 57 51 47 99

ضروری گزارش

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے السمح المحمود في حل سنن أبي داود کا سات جلدوں میں عظیم علمی وتحقیقی کام مکمل ہو چکا ہے، مزید جلدوں پر کام جاری ہے، انسانی استطاعت کے مطابق ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمی نہ رہے۔

تاہم انسان سے غلطی اور سہو کا صادر ہونا عین ممکن ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی کم علمی اور بے مائیگی کا اعتراف بھی ہے اس لیے اگر قارئین کرام کو ایسی غلطی نظر آجائے جو قابل اصلاح ہو تو اس کی نشاندہی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

ذوالفقار علی

مالک زکریا بکڈپو دیوبند

فون دوکان: ۰۱۳۳۶-۲۲۳۲۲۳ موبائل: ۰۹۸۹۷۳۵۳۲۲۳

ZAKARIA BOOK DEPOT
DEOBAND, 247554 (U.P.) INDIA
Ph.:(01336) 223223 (O)
Mob. 09897353223
Email. ZAKARIABOOKDEPOT@GMAIL.COM

عناوین

* * *

انتساب

اولاً:

بندہ خاکسار اپنی اس معمولی علمی کوشش اور جدو جہد کو والدین محترمین کی طرف منسوب کرنا باعث سعادت سمجھتا ہے، جن کی مخلصانہ دعاؤں کے نتیجے میں بندہ اس خدمت کے لائق ہوا۔

ثانیاً:

اُن اساتذۂ کرام، خصوصاً مربیٔ مخلص حضرت مولانا محمد یونس صاحب دامت برکاتہم مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ تحصیل حسن پور ضلع امروہہ (یوپی)، کے نام جن کے دامن شفقت میں رہ کر علوم نبوت اور اسرار شریعت سے قلب وجگر کو منور کرنے کی سعادت ملی۔

ثالثاً:

ملت بیضا کی عزت کو چار چاند لگانے والی مادر علمی ''دار العلوم دیو بند'' کے نام جس نے اپنے وسیع ترین دامن سے وابستہ کر کے استفادہ کا سنہرا موقع نصیب فرمایا۔

محمد عبد الرزاق قاسمی

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ

استاذ حدیث دارالعلوم/ دیوبند

الحمد لله رب العلمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، و على آله و أصحابه أجمعين أما بعد:

اسلامی علوم میں کتاب اللہ (قرآن حکیم) کے بعد علم حدیث ہی کا یہ مقام و مرتبہ اور بجا طور پر یہ حق ہے کہ بندۂ مؤمن اسے اپنی زندگی کا مقصد و محور بنالے۔

دين النبي وشرعه آثارهٗ ☆ وأجل علم يقتضىٰ آثارهٗ

یہی وہ بابرکت علم ہے، جس میں مشغول رہنے والے کو نبی ﷺ نے رحمت و نضارت کی دعار اور جنت کی بشارت دی ہے۔ علم کی اسی اہمیت اور فضیلت کی بنا پر علمائے اسلام نے قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ اسی علم کی خدمت کی ہے، اور حدیث و متعلقات حدیث پر اس قدر کتابیں تالیف کی ہیں کہ آج اگر کوئی شخص انھیں شمار کرنا چاہے تو اس کی زندگی کے شب و روز تمام ہو جائیں گے، مگر ان کتابوں کا شمار پھر بھی پورا نہ ہو سکے گا۔

علمائے امت کے مجد و شرف کا یہ سلسلہ تاہنوز قائم ہے، اور علمار اپنے علم و ذوق کے مطابق حالات اور تقاضوں کے پیش نظر اس بابرکت مخدوم علم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ زیر نظر کتاب "السمح المحمود فی حل سنن أبي داؤد" بھی اسی سلسلے طلائی کی ایک کڑی ہے۔ عزیز گرامی قدر جناب مولوی مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہوی (متعلم شعبہ افتاء، دارالعلوم دیوبند) کی یہ خوش بختی ہے کہ رب کریم کی توفیق نے انھیں حدیث پاک علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے خدمت گزاروں کی صف میں شامل کردیا۔

موصوف نے اپنی اس تالیف میں "سنن ابی داوٗدؒ" کی کتاب الجهاد، کتاب الاضحیہ، کتاب الذبائح، کتاب الصید اور کتاب الوصایا کی احادیث کی تشریح و توضیح کی ہے، اس شرح و بیان کی اصل زمین تو اگرچہ بندے کے درس

کی ابوداؤد کی تقریریں ہیں، جن کو موصوف نے دوران درس نقل کرلیا تھا اور بعد میں اپنے دیگر رفقاء درس کی لکھی ہوئی تقریروں سے مراجعت کر کے اس کی تصحیح کر لی تھی؛ لیکن انھوں نے زیر نظر کتاب میں صرف انھیں تقریروں پر اکتفاء نہیں کیا ہے؛ بلکہ دیگر شروح حدیث اور معتبر کتب فقہ وغیرہ سے اس املائی تقریر کو مستقل تصنیف بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

احقر نے کتاب مذکور کے چند مقامات کا مطالعہ کیا، جس کی بنا پر میری رائے میں یہ ایک لائق اعتماد شرح ہے، جس سے طلبہ اور علماء بغیر کسی تردد کے استفادہ کرسکتے ہیں۔

موصوف نے احادیث پر اعراب کے ساتھ ساتھ، ان کا سلیس ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ تشریح احادیث اور نقل مذاہب میں بیان دلائل کا بھی اہتمام کیا ہے، مراجع اور مصادر کی بھی خوب نشان دہی کر دی ہے۔ غرضیکہ آں موصوف نے کتاب کو ہر طرح بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بحمد للہ کامیاب ہیں۔

دعاء ہے کہ خدائے رحیم وکریم ان کی اس سعی کو مشکور فرمائے اور آئندہ مزید علم ودین کی خدمت کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العٰلمین۔

حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی
خادم التدریس دار العلوم دیوبند
۱۴۲۳/۶/۱۳ھ

دعائیہ کلمات

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ

استاذ حدیث وناظم تعلیمات دارالعلوم/ دیوبند

نحمدہٗ و نصلي علی رسوله الکریم!

مولوی عبدالرزاق امروہوی سلّمہٗ (متعلم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند) نے اپنے اچھے ذوق کا ثبوت دیا، اور دارالعلوم دیوبند کے اپنے اساتذۂ حدیث سے جو استفادہ کیا اُس کو سلیقہ کے ساتھ مرتب کر کے پیش کرنے کی ہمت کی، زمانۂ طالب علمی میں حدیث کی ایسی مہتم بالشان کتاب کی تشریح ان کی بلند حوصلگی کی علامت ہے۔

میں نے چند مباحث کو کہیں کہیں سے بغور دیکھا ہے، ایسی عظیم کتاب پر کسی طالب علم کا جو کام ہو سکتا ہے، میرا خیال ہے کہ اُس سطح سے انشاء اللہ بلند ثابت ہوگا، اور مستقبل میں انشاء اللہ مزید قابل قدر کام کے لیے مقدمہ بنے گا۔

راقم الحروف دعا گو ہے کہ اللہ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے، اور ان کے رشتہ کو صاحب حدیث علیہ الصلاۃ والسلام کی روح پر فتوح سے دنیا اور آخرت میں مضبوط فرمادے، آمین۔

سید ارشد مدنی

خادم حدیث دارالعلوم دیوبند

۸/۶/۱۴۲۳ھ

تقریظ

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدظلہ

استاذ حدیث دارالعلوم/ دیوبند

نحمدہٗ و نصلّي علی رسوله الکریم ا

حدیث پاک یعنی کلام نبوت ﷺ کی شرح، ہر موضوع پر تصنیف وتالیف یا اس کی کوئی خدمت خوش نصیبوں کے حصہ میں ہی آتی ہے۔

عزیز محترم جناب مولوی محمد عبدالرزاق سلمہٗ امروہوی (متعلم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند) انہی خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں، انھوں نے حدیث کی مشہور ومعروف ''سنن ابی داوٗدؒ'' (جلد ثانی) کی شرح ''السمح المحمود في حلّ سنن أبي داؤد'' کے نام سے مرتب کی ہے، ابتدار میں ایک معلومات افزا مقدمہ بھی ہے، مشکل الفاظ کی لغوی وصرفی تحقیق، ہر حدیث کی کامیاب تشریح، اختلافی مسائل میں مدلل فقہی بحثیں اور باب سے حدیث کا ربط جیسے بے شمار علمی فوائد پر مشتمل ہے۔

بندے نے کئی مقامات سے کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کیا، جس سے محسوس ہوا کہ فاضل مؤلف نے طالب علمانہ زندگی میں سلیقہ کے ساتھ یہ تحریری کام انجام دیا ہے، امید ہے کہ مستقبل میں یہ سلیقہ ان کی رہبری کرے گا۔

دعار ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس علمی کاوش کو قبول عام نصیب کرے اور دارین کی سعادت سے سرفراز فرمائے، آمین یارب العٰلمین، والحمد للہ اولاً وآخراً۔

ریاست علی غفرلہٗ

خادم التدریس دارالعلوم/ دیوبند

۱۴۲۳/۵/۳۰ھ

تاثرات

حضرت الاستاذ مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی مدظلہ، استاذ فقہ وادب دارالعلوم دیوبند

الحمد لله لأهله والصلاة على أهلها، وبعد!

دورحاضر میں ہرعلم وفن پر بےشمار کتب آئے دن منظرعام پرآرہی ہیں، علم حدیث پر بھی بہت کچھ کام ہورہا ہے، اردو کا دامن بھی اس مبارک علم کے متعلقات سے پوری طرح معمور اور بھرپور ہے، حدیث کے ذخیرے کو متعلقات کے حوالے سے مزید وسیع تر بنایا جارہا ہے اور شروح بھی سامنے آرہی ہیں۔ اسی سلسلے کی سنہری کڑی "السمح المحمود فی حل سنن أبي داؤد" ہے، جس کو مادرعلمی دارالعلوم دیوبند کے ایک ہونہار نوجوان فرزند مولوی محمد عبدالرزاق قاسمی سلمہٗ نے تیار کیا ہے، جو شعبہ افتاء دارالعلوم دیوبند میں زیرتعلیم ہیں۔

موصوف کی انتھک کوششوں کے بعد یہ ثمرہ سامنے آیا ہے، انھوں نے گزشتہ سے پیوستہ سال دورۂ حدیث شریف میں ہمہ تن مصروفیات کے باوجود سنن ابی داؤد کے سبق میں سنی ہوئی تقریروں کو مدنظر رکھ کر اس اہم کام کا آغاز کردیا تھا، اپنی جانفشاں محنت سے اس میں رنگ بھرا، اور چار چاند لگائے۔ (فجزاه الله خيراً)

یہ شرح سنن ابی داؤد (جلد ثانی) کے اہم مباحث کی اہم شرح ہے، بندے نے اس پر نظر ڈالی، موصوف نے واقعتاً عرق ریزی سے کام لے کر اس کے حل کے لیے کتنی ہی کتب کو کھنگالا اور اہم کتب کی ورق گردانی کی ہے، جس سے شرح خاصی گراں قدر ہوگئی ہے۔

امید ہے کہ علماء کرام خاص کر طالبان علوم نبوت اس سے خوب خوب فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ ان کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل ثابت ہوگی، کہ ہرحدیث کی کامیاب تشریح کے ساتھ اختلافی مسائل پر ضروری بحث، نیز مشکل الفاظ کی لغوی اور صرفی تحقیق اور باب سے حدیث کا ربط معلوم ہوگا۔ الغرض ان ہمہ جہتی مباحث اور رنگا رنگ تحقیقات سے مکمل تشنگی دور اور کافور ہوجائے گی۔ (انشاء اللہ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شارح کے علم وعمل میں از حد جلا بخشے، مزید حوصلہ دے اور شرح کو قبول عام عطا فرما کر عزیز موصوف کو اجر جزیل عنایت فرمائے، آمین یارب العٰلمین۔

عبدالخالق سنبھلی
۱۴۲۳/۶/۲۹ھ

رائے گرامی

حضرت الاستاذ مولانا ومفتی محمد ذوالفقار علی صاحب مظاہری مدظلہ

صدر المدرسین مدرسہ اسلامیہ عربیہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ تحصیل حسن پور ضلع امروہہ، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہٖ الکریم اما بعد وباللہ التوفیق

قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور احادیثِ صحیحہ شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور آپ کی تعلیمات اور سنتوں کا اتباع ہی انسان کی مکمل اصلاح کا نسخۂ اکسیر اور دُنیا وآخرت کی ہر کامیابی کا ضامن ہے، مگر اکثر لوگوں نے اطاعت واتباع کو صرف نماز روزہ وغیرہ چند عبادات میں منحصر سمجھ رکھا ہے، معاملات اور حقوق باہمی خصوصاً عادات اور آدابِ معاشرت سے متعلق قرآن وحدیث کے ارشادات اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو عام طور پر ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ نہ دین کا کوئی جزو ہے اور نہ اطاعت واتباع رسول ﷺ سے اس کا کوئی تعلق ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے ایسے مسلمان بھی دیکھے جاتے ہیں جو نماز روزہ کے اعتبار سے اچھے خاصے دین دار کہلاتے ہیں، مگر معاملات ومعاشرت اور حقوق باہمی کے معاملہ میں بالکل غافل اور بے شعور ہونے کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ننگ وعار ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ایک مثالی نمونہ بنا کر بھیجا ہے اور لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہر حال میں عبادات، معاملات، سیر، معاشرت، عادات وغیرہ میں اسی نمونے کے مطابق خود بھی بنیں اور دوسروں کو بھی بنانے کی فکر کریں۔ آیت شریفہ: "لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة" کا یہی مطلب ہے، گویا رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور شمائل ایک حیثیت سے عملی قرآن ہے، اسی لیے ہر زمانہ میں حضراتِ علماء نے عربی، فارسی، اردو اور ہر زبان میں رسول اللہ ﷺ کے شمائل وخصائل کو مختصر اور مفصل رسالوں اور کتابوں کی صورت میں جمع فرمادیا ہے، جو ایک حیثیت سے پوری تعلیماتِ نبویہ کا خلاصہ ہیں، اُنھیں

میں سے صحاحِ ستہ کی مشہور ومعروف اہم اور ضخیم کتاب ''سنن ابوداؤد شریف'' ہے جو درسِ نظامی کے آخری سال یعنی دورۂ حدیث شریف کے سال میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے، مجھے بڑی خوشی ہے کہ گرامی قدر عزیزم حافظ قاری مولوی مفتی محمد عبدالرزاق قاسمی زید شرفہم متعلّم شعبۂ افتاء دارالعلوم دیوبند نے اِس اہم کتاب کی تشریح کے لیے قلم اٹھایا اور ماشاء اللہ وبارک اللہ وہ اپنے مقصد میں کامران وکامیاب ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میں عزیز موصوف سلّمہٗ سے اُس وقت سے واقف ہوں، جب یہ بالکل ابتدائی عمر میں عبداللہ انٹر میڈیٹ کالج حسن پور سے آٹھویں کلاس میں کامیاب ہوکر حفظِ قرآن پاک کے شوق میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ میں داخل ہوئے تھے اور بالکل شروع قاعدہ سے پڑھ کر صرف تین سال میں ناظرہ اور حفظِ قرآن پاک مکمل کیا تھا (جب کہ اِن کی عمر ۱۴/۱۴ سال تھی) چوتھے سال تجوید وفارسی وغیرہ میں داخل ہوگئے اور پھر یہیں پر سال ششم (جلالین شریف وغیرہ) کی تکمیل کی اور ماشاء اللہ اپنی محنت اور خداداد صلاحیت کی بنا پر تعلیم وتعلّم میں ممتاز اور احقر سے افادۃً واستفادۃً متعلق رہے، اِسی دوران مشہور ومعروف مدرسہ جامعہ خادم الاسلام ہاپوڑ میں مسابقۃ القرآن الکریم منعقد ہوا اور موصوف نے فرع تفسیر قرآن پاک میں اول پوزیشن حاصل کی، پھر سالِ ہفتم (مشکوٰۃ شریف وغیرہ) سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور تمام امتحانات میں اول دوم پوزیشن میں کامیاب ہوتے رہے اور اب تکمیل ادب کے بعد شعبۂ افتاء میں ماشاء اللہ ممتاز ہیں، اسی دورانِ طالب علمی میں موصوف نے یہ عظیم کارنامہ، محنت، عرق ریزی، جفاکشی، تعلیم وتعلّم میں جہدِ مسلسل اور شغل کی حالت میں انجام دیا کہ سنن ابوداؤد شریف کے اُن مختلف اہم ابواب کی تشریح فرمائی کہ جن ابواب پر اب تک کسی شارح نے اردو زبان میں قلم نہیں اٹھایا، یا پھر ان ابواب تک پہنچنے کے لیے زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ رحمہم اللہ۔ میں نے اِس کتاب "السمح المحمود في حلّ سنن أبي داؤد" کے مسودہ کو مختلف مقامات سے بغور دیکھا، انداز عمدہ، سلیس اور عام فہم ہونے کی بنا پر حضرات معلّمین متعلّمین اور جن لوگوں کو علم سے کچھ بھی مناسبت ہے، وہ اِس کتاب سے انشاء اللہ فائدہ اٹھائیں گے اور اللہ کی ذات سے امید قوی یہ ہے کہ یہ شرح عوام وخواص اہلِ علم کے یہاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی وما ذلك علی اللّٰه بعزیز. موصوف سلّمہٗ کا یہ عظیم شاہکار ہمارے مدرسہ اسلامیہ عربیہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ اور دارالعلوم دیوبند کے ہر فردِ مخلص اور عزیز سلّمہٗ کے اکابر، معاصر، اصاغر مخلصین کے لیے قابلِ فخر ہے۔ حضراتِ اکابر دارالعلوم دیوبند کی تقریظات اور تصدیقات اِن باتوں کی شاہدِ عدل ہیں "ذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء"

اللہ کرے زورِ قلم، زورِ سخن، زورِ اثر اور زیادہ

دل سے دُعا گو ہوں مولائے کریم شارح سلّمہٗ کی عمر، علم وعمل میں برکت عطا فرمائے اور اس مجموعہ کو آئندہ

خدمتِ حدیث پاک کے لیے مقدمہ، دنیا میں سرخ روئی، ذخیرۂ آخرت، عند العوام والخواص شرف قبولیت سے نوازے، اور آپ کے ساتھ مجھے اور متعلقین کو حدیث پاک کی برکات وشغل سے حظِ وافر نصیب فرمائے۔

امید ہے جلدی میں لکھے گئے یہ چند کلمات اللہ کے یہاں شرفِ قبول حاصل کریں گے!

اللّٰھم آمین یا ربّ العٰلمین وصلّی اللّٰہ تبارك و تعالٰی علی خیرِ خلقہٖ سیدنا و مولانا وسندنا محمد و علٰی آلہ وصحبہٖ وعترتہٖ أجمعین .

خیر اندیش خاکپائے اکابر

دُعا جو وگو

مفتی محمد ذوالفقار علی سہارنپوری

خادم الافتاء والتدریس مدرسہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ

۱۴۲۳/۷/۵ھ بروز جمعہ بعد صلوٰۃ الفجر ۶½ بجے

عرض مؤلف

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم ! أما بعد :

اس بے بضاعت کو اس حقیقت کا اقرار واعتراف کرنے میں کوئی تأمل نہیں کہ دریا علم کا جو قطرہ اس تہی مایہ کے حصہ میں آیا، وہ کسی تشنہ لب کو تو کیا سیراب کرتا، خود کو اس کی تشنگی رفع کرنے کے لیے بھی کافی نہیں، تاہم ''ہمت مرداں مدد خدا'' طالبان علوم نبوت کی خدمت میں یہ ایک معمولی سا تحفہ پیش کرنے کی سعادت ہورہی ہے۔

عالم اسلام کی مشہور و معروف شخصیت، امام ابوداؤد سلیمان ابن اشعث سجستانی اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''سنن ابی داؤد'' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید ازوے رومتاب

حدیث شریف جتنا نازک فن ہے اللہ رب العزت نے اس کی خدمت کے لیے ایسے ہی افراد کو پیدا فرمایا، جنھوں نے حدیث کے حوالے سے نہایت ہی قابل قدر ولائق تحسین خدمات انجام دیں؛ چنانچہ ہر محدث کی الماری کی زینت ''سنن ابوداؤد'' کی بہت سی عربی شروحات بڑے بڑے صاحب علم وفن نے لکھیں، جن میں سب سے شہرت یافتہ اور بے مثال شرح محدث کبیر عالم جلیل حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نوراللہ مرقدہ کی ''بذل المجہود'' ہے، جو ہندوستان سے بڑی بڑی پانچ جلدوں میں اور بیروت سے بیس (۲۰) جلدوں میں شائع ہوئی ہے، مگر وہ تمام عربی شروحات یا تو نایاب، یا کمیاب، یا اتنی گراں ہیں کہ ہر طالب علم کے لیے حاصل کرنا دشوار گزار ہے۔

دوسری طرف عربی شروحات کو حل کرنا، ان کے معانی اور مطالب کو اخذ کرنا، ان کے پیچ وخم اور نوک و پلک کو درست کرنا اور سمجھنا خیلے دشوار ہو چکا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ کی صلاحیت اور استعداد روز افزوں کمزور ہوتی جارہی ہے۔

بندۂ خاکسار نے اسی کے پیش نظر دورۂ حدیث کے سال ہی عزم مصمم کیا کہ ''سنن ابوداؤد'' کی، کتاب الجہاد، کتاب الاضحیہ اور کتاب الوصایا سے متعلق کچھ حقائق ودقائق، نکات وباریکیوں کو اپنے دوستوں کی خدمت میں پیش کریگا۔ چنانچہ ۱۸/ربیع الاوّل ۱۴۲۱ھ کو احقر نے اس عظیم الشان کام کا آغاز کر ہی دیا اور تالیف کا یہ سلسلہ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ کے اوائل میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کے بعد حضرت الاستاذ مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی مدظلہ استاذ فقہ

وادب دارالعلوم دیوبند نے اپنے قیمتی وقت کی قربانی دے کر نظر ثانی فرمائی، دوستوں کا بار بار اصرار رہا کہ اس مسودے کو زیور طبع سے آراستہ کرادیا جائے؛ لیکن بندے کا جذبہ اور شوق یہ رہا کہ ابھی اس مسودے کو مزید دلائل اور حوالوں سے مزین کیا جائے، نتیجتاً بندہ اپنے اس مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا، اور از سر نو دلائل کا اضافہ کیا گیا، ضرورت کے مطابق حوالے بھی درج کیے گئے؛ لیکن ماہ رمضان ۱۴۲۱ھ گزر چکا تھا۔

نئے سال کا آغاز ہوا، تو بندہ اپنی مزید علمی سیرابی کے لیے مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں ہی زبان وادب کی ایک اہم کڑی ''شعبۂ تکمیل ادب'' سے اُس وقت منسلک ہو گیا جبکہ دورۂ حدیث کی کامیابی شعبۂ تکمیل افتاء سے وابستگی کی متقاضی تھی، مادر علمی کی اس درس گاہ سے اپنی وسعت بھر استفادہ کر کے ۱۴۲۳ھ میں ''شعبۂ تکمیل افتاء'' سے ملحق ہو گیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کامیابی نے ابھی بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ شعبہ افتاء میں امتحانِ ششماہی سے فراغت ہو چکی تھی کہ جذبات پھر انگڑائیاں لینے لگے کہ اس رکھے ہوئے مسودے کو ساتھیوں کی خدمت میں پیش کر ہی دیا جائے۔

اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد، احقر کی یہ علمی کاوش دوستوں کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے امید ہے کہ بنظر تحسین دیکھی جائے گی۔ بندے نے اپنی اس کاوش میں مندرجۂ ذیل چند چیزوں کا خاص طور سے التزام کیا ہے۔

(۱) ہر حدیث میں ناگزیر مقامات پر صحیح اعراب لگا کر سلیس ترجمہ کیا گیا ہے۔
(۲) ہر حدیث میں مشکل الفاظ کی لغوی اور صرفی تحقیق کی گئی ہے۔
(۳) ہر حدیث کی قابل قبول تشریح کی گئی ہے۔
(۴) ہر حدیث کی باب سے مناسبت بیان کی گئی ہے۔
(۵) اختلافی مسائل کو ''اختلافی مسئلہ یا مختلف فیہ مسئلہ'' کا عنوان دیکر ہر فریق کے دلائل کو قلم بند کیا گیا ہے۔
(۶) معرکۃ الآراء اختلافی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔
(۷) جگہ جگہ حسب ضرورت راویوں کے احوال ومراتب کو ذکر کیا گیا ہے۔
(۸) تمام ماخذ سے رجوع کرنے کے بعد صحیح حوالے درج کیے گئے ہیں۔
(۹) کسی بھی حدیث کے سلسلہ میں جتنے علمی اعتراضات اور اشکالات ہو سکتے تھے ان سب کو نقل کر کے مدلل ومکمل جواب لکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد آپ کو زیر نظر کتاب میں ضرور ملیں گے۔

یہ ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اس کتاب کے مراجع اور مآخذ بھی مہیا فرمادیئے، جہاں مراجع کے حصول کے لیے احقر کا اپنی چھوٹی سی لائبریری کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہا، وہیں پر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی عظیم الشان لائبریری سے بھی پورا پورا استفادہ کیا، لیکن ان سب کی زمین اس کاپی کو بنایا

جوحضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ استاذ حدیث دارالعلوم/ دیوبند کے درس میں لکھی تھی۔

تاہم کوئی بھی انسان خطا اور نسیان سے منزہ نہیں، اس لیے زیر نظر کتاب میں بہت سی خامیاں — جو ایک مبتدی مؤلف کی ترتیب وتالیف میں یقینی سی ہیں — ہوں گی، توجہ دلانے پر ان شاء اللہ دور کردی جائیں گی۔ اس سلسلے میں اہل علم حضرات کے مشورے بندۂ خاکسار کے لیے تشکر وامتنان کا باعث ہونگے؛ نیز حدیث نبوی ﷺ سے ذوق رکھنے والے طلبہ کے مفید مشورے بھی شکر کے ساتھ قبول کیے جائیں گے۔

اخیر میں، میں سمجھتا ہوں کہ بڑی ہی احسان فراموشی ہوگی اگر اپنے مشفق ومربی مخلص حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد ذوالفقار علی مظاہری مدظلہ صدرالمدرسین مدرسہ اسلامیہ عربیہ مصباح الظفر قصبہ ڈھکہ تحصیل حسن پور ضلع امروہہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا نہ کروں، جن کی مثالی تربیت اور کامل نگرانی اس ناکارہ کے لیے برابر راہ حق پر استقامت کے لیے معین ومددگار ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آں موصوف کا سایۂ شفقت وعاطفت تادیر قائم رکھے، اور آپ کی عنایتوں کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

نیز شکرگزار ہوں ان احباب کا جنھوں نے اس شرح کی تکمیل میں کسی نہ کسی حیثیت سے تعاون کیا، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

محمد عبدالرزاق قاسمی امروہوی
متعلم شعبہ افتاء دارالعلوم/ دیوبند
ہفتہ: ۱۴۲۳/۵/۲۱ھ
۲۰۰۲/۸/۳ء

پتہ وطن
موضع ہیبت پور، تحصیل حسن پور
ضلع امروہہ، یوپی-۲۴۴۲۴۱

مقدمہ

حدیث کے لغوی معنی

امام لغت علامہ جوہری، اپنی معروف کتاب ''صحاح'' میں حدیث کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "الحدیث: الکلام قلیله و کثیره و جمعه: أحادیث" جس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث باعتبار لغت عام ہے، ہر قسم کے کلام کو شامل ہے۔

اصطلاحی تعریف

حدیث کی اصطلاحی تعریف میں فقہاء اور محدثین کے مابین کچھ اختلاف ہے، فقہاء تو هو أقوال رسول الله صلی الله علیه وسلم و أفعاله سے تعریف کرتے ہیں، جس میں تقریرات نبوی اور افعال اختیاریہ بھی داخل ہیں؛ لیکن افعال غیر اختیاریہ مثلاً آپ ﷺ کا حلیۂ مبارک، پیدائش و وفات کے واقعات داخل نہیں؛ کیونکہ اصولیین کا مقصد استخراج واستنباطِ مسائل ہے، اس لیے وہ افعالِ غیر اختیاریہ کو تعریف میں داخل نہیں کرتے؛ کیوں کہ اس سے مسائل مستنبط نہیں ہوتے۔ حضرات محدثین حدیث کی تعریف "کل ما أضیف إلی النبي صلی الله علیه وسلم حتی الحرکات والسکنات في الیقظة والمنام" سے کرتے ہیں، جس میں افعال غیر اختیاریہ بھی داخل ہیں؛ کیوں کہ محدثین کی غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق تمام باتوں کو جمع کرکے امت کے سامنے پیش کرنا ہے، اس لیے دونوں تعریف میں حقیقتاً کوئی تضاد نہیں۔

علم حدیث کی تعریف

هو معرفة ما أضیف إلی النبي صلی الله علیه وسلم أو إلی صحابی أو إلی من دونه ممن یُقتدی بهم في الدین قولاً و فعلاً او صفةً او تقریرًا علم حدیث کی علماء نے مختلف تعریفیں کی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث کی مختلف قسمیں ہیں، کسی نے ایک قسم کو لیا دوسری کو ترک کردیا، کسی نے سب کو جمع کردیا۔ مذکورہ تعریف تمام صورتوں کو جامع ہے، نیز اس تعریف میں حدیث موقوف و مقطوع بھی داخل ہوگئی۔

موضوع

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ "مِنْ حَيْثُ اَنَّهٗ رسول" علم حدیث کا موضوع ہے۔ البتہ حافظ ابن حجرؒ نے بخاری کی شرح میں یہ تعریف کی ہے: "هو ذات الرسول صلى الله عليه وسلم" یعنی علم حدیث کا موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

غرض وغایت

علم حدیث کی غرض وغایت الاهتداء بهدى رسول الله صلى الله عليه وسلم یعنی آپ ﷺ کے طریقۂ زندگی اور اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی میں اتارنا اور اسی کے مطابق عمل کرنا۔ (تفصیل دیکھئے: الدر المنضود علی سنن أبی داؤد: ۱/۱۰)

﴿تدوین حدیث﴾

تدوین حدیث کی داغ بیل عہد رسالت اور خلفاء راشدین ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ چنانچہ احادیث کی ایک معتد بہ تعداد نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی یا پھر آپ ﷺ کی ہدایت پر تحریری شکل میں محفوظ کر لی گئی تھی، دوسری طرف بعض صحابہؓ نے بھی اپنے ذاتی مجموعے تیار کر لیے تھے جیسے صحیفۂ صادقہ جسے حضرت عبد اللہؓ بن عمرو بن العاص نے تیار کیا تھا۔ صحیفہ علی، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا، جس میں دیت، فدیہ اور قصاص وغیرہ کے احکام تھے۔ اسی طرح کتاب الصدقہ جسے حضرت نبی کریم ﷺ نے عاملین کے پاس بھیجنے کے لیے لکھوایا تھا، جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق پھر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کے پاس رہا، اس کے علاوہ حضرت انس بن مالک، ابن مسعود، ابن عباس، سمرہ بن جندب، سعد بن عبادہ، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہم نے بھی اپنی اپنی ذاتی ڈائری تیار کر رکھی تھی۔ جہاں تک مسلم شریف کی روایت "لا تكتبوا عني ومن كتب عني غير القرآن فليمحه" میں کتابت حدیث کی ممانعت کا حکم ہے وہ ابتدائے زمانہ میں ایک خاص عارض کی بنیاد پر تھا، کیونکہ اس وقت قرآن کریم کسی ایک نسخہ میں لکھا ہوا نہیں تھا؛ بلکہ متفرق طور پر صحابہ کے پاس موجود تھا، دوسری طرف صحابۂ کرام اسلوب قرآن سے اتنے مانوس نہ ہوئے تھے کہ وہ قرآن اور غیر قرآن میں باول نظر فرق کر سکیں، ان حالات میں اگر حدیث لکھی جاتی تو خطرہ تھا کہ قرآن کے ساتھ گڈمڈ ہو جائے، اس خطرہ کے پیش نظر آپ ﷺ نے کتابت حدیث کی ممانعت فرما دی تھی، پھر جب صحابہؓ مانوس ہو گئے تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی جیسا کہ ترمذی کتاب العلم میں حضرت ابو بردہؓ کی روایت؛ ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور بخاری کتاب العلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت اس امر کی واضح دلیل ہے۔

لیکن عہد صحابہ کی یہ کاوشیں کوئی باقاعدہ تدوین نہ تھیں، تابعین کے دور آخر میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور تمام جگہوں کے علماء کو حکم دیا کہ وہ احادیث جمع کر کے آپؒ کی خدمت میں بھیجیں، سب سے پہلے ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کر کے آپؒ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، اسی لیے جمہور کے نزدیک آپ ہی مدون اوّل ہیں۔ یہ کام پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ہوا اور اس زمانے میں جو کام ہوا وہ کیف ما اتفق تھا کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا؛ کیونکہ مقصد صرف یہ تھا کہ احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔

دوسری صدی میں اس سلسلے میں مزید پیش رفت ہوئی اور پوری قوت کے ساتھ تدوین کا کام شروع کیا گیا اور فقہی ابواب کی ترتیب پر کتابیں لکھی گئیں، اس زمانے میں لکھی جانے والی کتابیں بیس سے بھی متجاوز ہیں، جن میں امام صاحب کی کتاب الآثار (جس سے امام مالکؒ نے اپنی کتاب مؤطا، کی ترتیب میں استفادہ کیا) مؤطا امام مالک، جامع معمر بن راشد، جامع سفیان ثوری، کتاب الزہد لعبداللہ بن المبارک سرفہرست ہیں۔ یہ صدی مبوب کتب حدیث کی محض ابتدا تھی، تیسری صدی میں تدوین حدیث کا کام اپنے شباب اور عروج پر پہنچ گیا حدیث کی سندیں طویل ہونے لگیں کئی کئی سندوں سے روایتیں نقل کی جانے لگیں، نئی ترتیب اور نہج پر کتب حدیث مرتب ہونے لگیں، اس دور کی کاوشوں میں صحاح ستہ قابل ذکر ہیں۔ امام بخاریؒ نے سب سے پہلے نمایاں اسلوب اختیار کیا، ذخیرۂ احادیث سے صرف ان احادیث کا انتخاب کیا، جو محدثین کی اصطلاح میں صحیح ہوں، گویا ان سے پہلے صحیح وغیر صحیح کو ممتاز کر کے نہیں لکھا گیا، جس کی وجہ سے ان کے درمیان فرق کرنا دشوار تھا بغیر علم رواۃ کے فرق نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حضرت امام بخاریؒ نے امت کو اس الجھن سے نجات دلائی۔

غرض پہلی صدی میں تدوین علی الاطلاق ہوئی جبکہ دوسری صدی میں ہر مضمون کی حدیثیں الگ الگ منتخب کر کے علیحدہ علیحدہ باب میں ترتیب دی گئیں اور تیسری صدی میں احادیث صحیحہ کو غیر صحیحہ وسقیمہ سے الگ کر کے لکھا گیا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمہ فتح الباری، مقدمہ فتح الملہم، مقدمہ بذل المجہود، مقدمہ اعلاء السنن، مقدمہ درس ترمذی، مقدمہ اوجز المسالک)

علم حدیث کی فضیلت

فضیلت کے اعتبار سے یہ ہے کہ علم حدیث افضل العلوم الشرعیہ ہے، سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: "لا أعلم علمًا أفضل من علم الحديث" علوم شرعیہ پانچ ہیں: حدیث، فقہ، تفسیر، اصول فقہ اور علم العقائد اور بعض علماء نے علم تصوف کو مستقل شمار کر کے علوم دینیہ بجائے پانچ کے چھ قرار دیئے ہیں۔ شرح عقائد کی مشہور شرح

''النبر اس'' کے مصنف نے ایسا ہی کیا ہے، علامہ سیوطیؒ ''تدریب الراوی'' میں اس علم کی شرافت ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیگر تمام علوم شرعیہ اس علم کی طرف محتاج ہیں، فقہ کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے (کہ زیادہ تر فقہی مسائل حدیث اور پھر دوسرے درجہ میں قیاس ہی سے ثابت ہیں) اور تفسیر کی احتیاج اس علم کی طرف ایسے ہے کہ مفسرین نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ أولی التفاسیر ما جاء عن النبي صلی اللہ علیه وسلم کہ بہترین تفسیر وہ ہے جو حدیث سے ثابت ہو؛ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ علامہ سیوطیؒ ''اتقان فی علوم القرآن'' میں بجائے علم حدیث کے علم تفسیر کو افضل العلوم فرمارہے ہیں اور بظاہر بھی یہ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ علم کی افضلیت کا مدار اس کے موضوع پر ہوتا ہے جتنا افضل موضوع ہوگا، اسی قدر علم افضل ہوگا اور علم حدیث کا موضوع اگر حضور ﷺ کی ذات گرامی ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا، تو علم تفسیر کا موضوع قرآنِ کریم ہے جو کلام اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے، جو علم حدیث کے موضوع سے افضل ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ ماہ رمضان میں چند لوگ میرے پاس آئے جن کا آپس میں اس بات میں اختلاف ہو رہا تھا کہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی افضل ہے قرآن کریم سے یا قرآن کریم افضل ہے؟ مولانا لکھتے ہیں کہ میں نے جواب دیا قرآن کریم افضل ہے اور وجہ وہی بیان کی جو ابھی گزری، یعنی حادث اور قدیم کا فرق کہ قدیم افضل ہوتا ہے حادث سے۔

اس مضمون کی ایک حدیث ''المقاصد الحسنہ'' میں ملی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "آیة من کتاب اللہ خیرٌ من مُحَمَّدٍ وآلِه" مگر علامہ سخاویؒ نے اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ مجھے یہ روایت کہیں نہیں ملی؛ لیکن آگے چل کر انھوں نے بہت سی روایات فضائل قرآن سے متعلق ایسی جمع کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت آسمان وزمین اور دنیا و مافیہا سے افضل ہے؛ لیکن اس قسم کی روایات سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

اس لیے اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قرآن کریم افضل ہے حضور ﷺ کی ذات گرامی سے تب بھی یہ کہا جائے گا کہ علم حدیث کا موضوع حضور ﷺ کی ذات گرامی ہے بحیثیت وصف رسالت کے اور علم تفسیر کا موضوع قرآنِ کریم ہے باعتبار بیان معنی وایضاح مراد کے جو بندوں کی صفت ہے، نہ باعتبار صفتِ باری ہونے کے، یعنی علم تفسیر میں قرآنِ کریم سے بحث اس حیثیت سے نہیں ہوتی کہ وہ کلام الٰہی وصف باری ہے بلکہ ایضاح معنی کے لحاظ سے بحث ہوتی ہے لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ علم حدیث کا موضوع افضل ہے علم تفسیر کے موضوع سے وقد بقي بعض خبایا في الزوایا. (الدرالمنضود)

* * *

امام ابوداؤد سجستانی

نام ونسب اور نسبت

آپ کا اسم گرامی سلیمان، کنیت ابوداؤد، والد بزرگوار کا نام اشعث ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد عمروالازدی السجستانی اور السنجری بھی کہا جاتا ہے۔ یمن کے مشہور قبیلہ ازد سے آپ کا تعلق ہے جس کی ایک شاخ مقام قفس پر سکونت پذیر تھی، غالباً آپ کا تعلق اسی سے ہے۔

سن ولادت ووفات

امام ابوداؤد رحمہ اللہ تیسری صدی کے آغاز ۲۰۲ھ میں اس دنیائے آب وگل میں جلوہ افروز ہوئے، تحصیل علوم کے لیے مختلف بلاد اسلامیہ: مصر، شام، حجاز، عراق اور خراسان کا سفر کیا۔ بغداد بار بار تشریف آوری ہوئی اور وہیں سکونت اختیار فرمائی۔ زندگی کے آخر میں وفات سے چار سال قبل ۲۷۰ھ میں امیر بصرہ ابواحمد الموفق کی درخواست پر بغداد سے بصرہ منتقل ہوگئے اور زندگی کے بقیہ قیمتی ایام بصرہ میں گزار کر ۱۶/شوال ۲۷۵ھ بروز جمعہ محبوب حقیقی سے جاملے، آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ اگر ممکن ہو، تو مجھے حسن بن مثنی غسل دیں ورنہ سلیمان بن حرب کی تصنیف "کتاب الغسل" دیکھ کر اس کے مطابق غسل دیا جائے۔ آپ کی نماز جنازہ عباس بن عبدالواحد ہاشمی نے پڑھائی۔ (تہذیب:۱۷۳،ج:۴)

شیوخ واساتذہ

امام موصوف کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ سمع خلقًا کثیرًا امام نے بہت سے اساتذہ سے حدیث حاصل کی، حافظ ابن الحجر عسقلانی نے آپ کے شیوخ کی تعداد تقریباً تین سو بتائی ہے، امام صاحب نے امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ کے شیوخ سے حدیث حاصل کی ہے۔ امام احمد بن حنبل کے آپ ممتاز شاگردوں میں سے ہیں، خود امام احمد بن حنبل نے آپ سے ایک حدیث روایت کی ہے جو موصوف کی عظمت شان اور مقام علمی کے لیے کافی ہے۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں مسدد بن مسرہد، یحیٰ بن معین، قتیبہ بن سعید، عثمان بن ابی شیبہ، قعنبی، ابوالولید طیالسی، محمد بن کثیر عبدی، مسلم بن ابراہیم، ابوعمرو حوضی، ابوجعفر نفیلی، قطن بن نسیر وغیرہ وغیرہ ہیں۔

تلامذہ

امام صاحب کے تلامذہ کی تعداد بھی کثیر ہے جو اس دور کا مذاق تھا کہ ایک ایک شیخ کی مجلس میں ہزاروں

تشنگانِ علوم نبویہ اپنی اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔ امام موصوف کے فضائل جہاں اور بہت ہیں وہیں ارباب صحاح ستہ میں سے امام ترمذی اور امام نسائی کا آپ سے روایت کرنا بھی ہے۔

امام ترمذی نے اپنی جامع میں دو جگہ امام صاحب کی سند سے روایت نقل کی ہے، ایک تو کتاب الدعوات میں، دوسری کتاب المناقب میں اور امام نسائی نے کتاب الکنی میں امام موصوف کا نام لے کر اور سنن صغری اور کتاب الیوم واللیلہ میں کنیت سے کئی جگہ روایت کی ہے۔ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں لؤلؤی، ابن الاعرابی، ابن داسہ، ابوالحسن انصاری، ابوالطیب اشنانی، ابوعمر بصری، ابوعیسیٰ رملی، ابواسامہ روّاس، ابوعبداللہ متونی، امام ترمذی اور امام نسائی وغیرہم ہیں۔

فضائل ومناقب

آپ کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں، آپ کے قوت حفظ، علم وافر، ضبط واتقان، زہد وتقوی، فہم ثاقب کی مدح میں تمام علماء متفق ہیں۔ موسی بن ہارون جو آپ کے معاصر ہیں فرماتے ہیں کہ امام صاحب دنیا میں علم حدیث کی خدمت اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، میں نے آپ سے افضل کسی کو نہیں دیکھا۔ ان کے علاوہ اور بھی جلیل القدر علماء نے آپ کی شان میں تعریفانہ کلمات کہے ہیں۔ زہد وورع، تقوی وطہارت، خشیت الہی، انابت الی اللہ تو ہر محدث کا شعار ہوتا ہے۔ مزاج میں تواضع، دنیا کی بے ثباتی کا یقین اور دنیاوی زندگی میں ترک تکلفات ان کی عادت بن جاتی ہے، امام موصوف صورت وسیرت گفتار رفتار، چال چلن میں اپنے استاذ امام احمد بن حنبل کے مشابہ تھے۔

علمی مقام وفقہی مسلک

حدیث وفقہ دونوں میں آپ کو ید طولی حاصل تھا۔ حفاظ حدیث، ماہرین روات، واقفین علل واسناد میں امام ابوداؤدؒ کا اسم گرامی بھی سرفہرست ہے، حاکم ابوعبداللہؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام صاحب اپنے زمانے میں تمام محدثین کے امام تھے، ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

احادیث کی چھان بین صحیح کو غیر صحیح سے ممتاز کرنے اور ذخائر احادیث سے اس کو الگ کرنے والوں میں جہاں امام بخاری ومسلم اور امام نسائی کا نام لیا جاتا ہے، وہیں امام ابوداؤد بھی ان بزرگوں کے دوش بدوش ہیں۔ امام موصوف کو جہاں فن حدیث میں امامت کا درجہ حاصل تھا، وہیں آپ کا فقہی ذوق بھی بہت بلند ہے، دیگر مصنفین صحاح ستہ کی بہ نسبت یہ ذوق آپ پر غالب ہے، چنانچہ بقیہ ارباب صحاح ستہ میں یہی بزرگ ہیں جنھیں شیخ ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے، آپ کے فقہی ذوق کا مظہر آپ کی کتاب سنن ابوداؤد ہے۔

آپ نے احکام کی احادیث کو بڑے اہتمام سے اس کتاب میں جمع فرمایا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ علم حدیث میں صرف یہی کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔

جہاں تک امام ابوداوٗد رحمہ اللہ کے فقہی مسلک کا تعلق ہے، اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، علامہ سبکی شافعی، نواب صدیق حسن بھوپالی وغیرہ علماء نے انہیں شوافع کی فہرست میں داخل کیا ہے۔ دوسری طرف حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہما کی رائے یہ ہے کہ آپ حنبلی المسلک ہیں۔ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ابوداوٗد مجتہد منتسب ہیں۔ امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کے وضع کردہ اصول وقواعد کو سامنے رکھ کر خود استخراج واستنباط مسائل کرتے ہیں یہ قول اعدل معلوم ہوتا ہے۔

کچھ کتاب کے بارے میں

امام ابوداوٗدؒ کی متعدد تصانیف ہیں، لیکن جس تصنیف نے امام موصوف کو زندۂ وجاوید بنادیا اور جو اپنے وجود میں آنے سے لے کر آج تک مرجع علماء وفقہاء بنی رہی، ہر زمانے میں جس کی طرف علماء نے اپنی توجہ مرکوز فرمائی، وہ مصنف کی مبارک تصنیف ''سنن'' ہے، جس کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فقہاءِ عظام کے مستدلات کو یکجا طور پر جمع کردیا جائے تاکہ مجتہدین کے لیے آسانی ہو، چنانچہ امام موصوف نے انتہائی خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ علامہ غزالیؒ فرماتے ہیں: مجتہد کے لیے یہی ایک کتاب کافی ہے۔ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ جب حاسدین و طاعنین نے فقہاء کرام کی شان میں زبان طعن دراز کی اور ان پر قلت روایت کے الزامات کیے جانے لگے تو امام موصوف نے یہ کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ دوسری طرف سنن ابی داوٗد سے پہلے کی تصانیف جوامع اور مسانید وغیرہ کی شکل میں ہوا کرتی تھیں، جن میں احکام کی روایات کے ساتھ ساتھ قصص واخبار کی روایتیں بھی شامل ہوتی تھیں اور کسی نے احکام کی روایتوں کو الگ کر کے مستقل تصنیف کی شکل میں جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں دی؛ کیونکہ یہ کام انتہائی دشوار تھا۔ اس کے لیے جہاں قوت حفظ، بالغ نظری اور ذخیرۂ احادیث پر مکمل نگاہ کی ضرورت تھی وہیں فقہی بصیرت بھی ضروری تھی۔ اللہ نے یہ شان اور یہ خوبی امام ابوداوٗد کو عنایت فرمائی تھی، اس لیے موصوف نے اس کام کی انجام دہی کا بیڑا اپنے سر لیا اور یہ کتاب تصنیف فرمائی۔ ۲۴۱ھ سے ہی اس کو مکمل کر کے اپنے استاذ امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں پیش کیا، امام احمدؒ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کتاب کی عمدگی کا اعتراف کیا۔ سنن ابی داوٗد کے نسخے متعدد ہیں، جن میں مشہور لولوی، ابن داسہ اور رملی کا نسخہ ہے، ان میں بھی لولوی کا نسخہ زیادہ مشہور ہے۔ ہند وحجاز اور عرب کے علاقوں میں یہی رائج ہے اور مطلق بولتے وقت یہی نسخہ مراد ہوتا ہے۔

* * *

اسلام میں جہاد کی حقیقت

جہاد کے لغوی معنی: الجِهَاد (فاعل) کوشش کرنا، مشقت اٹھانا۔ علامہ قسطلانی کہتے ہیں کہ ''جہادؔ'' جَهْدٌ (بفتح الجيم) سے مشتق ہے، جس کے معنی تعب اور مشقت کے ہیں، کیونکہ جہاد میں آدمی تھک جاتا ہے اور مشقت بھی ہوتی ہے، اس لیے اس کو جہاد کہتے ہیں، یا ''جہادؔ'' جُهد (بضم الجيم) سے مشتق ہے، جہد کے معنی طاقت کے ہیں کیونکہ جہاد میں ہر شخص اپنے مقابل کو زیر کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے اس لیے جہاد کو جہاد کہا جاتا ہے۔ (فتح الباری:۶/۳، تکملہ فتح الملہم:۳/۳، بذل المجہود:۳/۴۰۰، فتاویٰ شامی:۶/۱۹۳)

جہاد کے اصطلاحی معنی

شریعت کی اصطلاح میں جہاد ''اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کرنے میں جان و مال، زبان وقلم کی پوری طاقت کے خرچ کرنے کو جہاد کہتے ہیں''

اس کے علاوہ علمائے کرام نے جہاد کی مختلف تعریفیں کی ہیں:

(۱) علامہ قسطلانی رقم طراز ہیں: "قتال الكفار لنصرة الإسلام، واعلاء كلمة الله"

(۲) علامہ کاسانی فرماتے ہیں: "وفي عرف الشرع يستعمل في بذل الوسع والطاقة بالقتل في سبيل الله عز وجل بالنفس والمال واللسان أو غير ذلك"

(۳) مالکی حضرات نے جہاد کی تعریف اس طرح کی ہے: "إنه قتال مسلمٍ كافراً غير ذي عهدٍ لإعلاء كلمة الله تعالىٰ، أو حضوره له، أو دخول أرضه له"

(۴) حنابلہ جہاد کی تعریف کرتے ہیں: "إنه قتال الكفار خاصة بخلاف المسلمين من البغاة وقطاع الطريق وغيره"

(۵) علامہ شامی لکھتے ہیں: "حاصله بذل أعز المحبوبات، وهو النفس، وإدخال أعظم المشقات عليه تقربًا بذلك إلى الله تعالىٰ"

(۶) صاحب تنویر الابصار فرماتے ہیں: "هو الدعاء إلى الدين الحق وقتال من لم يقبله"

(۷) ابن کمال لکھتے ہیں: "بانه بذل الوسع في القتال في سبيل الله مباشرةً، أو معاونةً بمالٍ أو رأيٍ، أو تكثير سوادٍ أو غير ذلك"

(بذل المجہود: ۳/۴۰۰، بدائع الصنائع: ۶/۵۷، فتح الباری: ۶/۳، تکملہ فتح الملہم: ۳/۳، ارشاد الساری: ۵/۳۱، لسان العرب: ۳/۱۳۵، تنویر الابصار: ۶/۱۹۶، حاشیہ شامی: ۶/۱۹۳، حاشیہ ابوالسعود: ۲/۴۱۷)

جہاد کی فرضیت

اسلام پوری انسانیت کے لیے، امن وامان، حفاظت وسلامتی کا علم بردار ہے۔ اسلام ایسے اخلاق وعقائد کا سبق دیتا ہے، جس سے آراستہ اور پیراستہ ہوکر بنی نوع انسان دارین میں خوش گوار زندگی گزار سکے۔

لیکن اسلام کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے راستہ میں طاغوتی اور شیطانی قوتیں ہمیشہ حائل ہوتی رہی ہیں اور یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی باطل طاقت وجود میں آئی تو اس نے فتنہ وفساد، جور وظلم، قتل وغارت گری اور بے چینی وبدامنی کا ایسا بازار گرم کیا کہ دنیا جہنم کدہ بن کر رہ گئی۔ اب ایسے سنگین حالات کے اندر امن وامان، چین واطمینان کا علم بردار مذہب اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ "ان طاغوتی قوتوں کے خلاف لڑو" تاکہ امن عالم یقینی ہوجائے اور انسانیت سکون واطمینان سے زندگی گزار سکے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب فساد وبدامنی، بغض وعداوت، طمع وہوس اور تعصب وتنگ نظری کی آگ بھڑکی تو اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو فرو کرنے کے لیے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا:

"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِم لَقَدِيرٌ"

"یعنی جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے، انھیں لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے، اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔"

قرآن کی یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں اتری ہے، اس میں جن لوگوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کا قصور یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کے پاس زرخیز ملک ہے، بلکہ ان کا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ ظلم کرتے ہیں لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں، اب ایسے لوگوں سے مظلوموں کی اعانت وحمایت کرنے کے لیے جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جہاد کا مقصد لوگوں کو جبراً مسلمان بنانا نہیں، بلکہ دشمنوں کی شان وشوکت اور دبدبہ کو مٹا کر امن وامان اور عدل وانصاف کی فضا ر تیار کرکے دنیا میں اعلاء کلمۃ اللہ کی صدا بلند کرنا ہے۔

جہاد کی فضیلت

جہاد کی فضیلت کے سلسلے میں بہت سی آیات اور احادیث وارد ہوئی ہیں، جن کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ تاہم

وضاحت کے لیے ایک دو آیات اور احادیث پیش کی جاتی ہیں، فرمان خداوندی ہے:

یآیہا الذین آمنوا ھل أدلکم علي تجارۃ تنجیکم من عذاب ألیم، تومنون باللّٰہ و رسولہٖ، وتجاھدون في سبیل اللّٰہ بأموالکم و أنفسکم، ذلکم خیرلکم إن کنتم تعلمون، یغفرلکم ذنوبکم ویدخلکم جنات تجري من تحتھا الأنھار، ومساکن طیبۃ في جنات عدن ذلك الفوز العظیم .

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت بتاؤں، جو تمھیں دردناک عذاب سے بچادے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیئے بہترین کام ہے اگر تم جانو، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر کے ایسے باغات میں داخل کرے گا جس کے تلے نہریں بہتی ہونگی۔

اسی طرح بے شمار اور آیات ہیں جو اس بات کو بتلاتی ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کی بہت سی فضیلتیں ہیں، ایسے ہی بہت سی احادیث میں رسول اکرم ﷺ نے مجاہدین کی فضیلت کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: "مَنْ قاتل في سبیل اللّٰہ فواق ناقتہ وجبت لہ الجنة" ایک دوسری حدیث میں ہے: "لغدوۃ أو روحۃ في سبیل اللّٰہ خیر من الدنیا و ما فیھا" کہ ایک صبح یا شام جہاد میں دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

جہاد کا اصل مقصد

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جہاد کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ سے غفلت میں پڑی ہوئی انسانیت کو اللہ کی طرف بلانا، حق و صداقت کا کلمہ بلند کرنا، عدل و انصاف قائم کرنا، فتنہ اور فساد کا قلع قمع کرنا، ظلم و ستم کو مٹانا اور اس دنیا سے بدی کو ختم کرنا ہے۔

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خوں خوار اور دہشت گرد مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے، بات بات پر اسلام میں تلوار اٹھانا روا ہے، دراصل ان کی یہ سوچ کم علمی یا عصبیت پر مبنی ہے، اس لیئے بالکل ناقص ہے، اگر اس دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں، جنھوں نے خون بہا بہا کر زمین کو رنگین کر دیا ہو، آخر ان کو کیا حق ہے کہ اسلام پر الزام عائد کریں، ایسا لگتا ہے کہ اس بے بنیاد الزام سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کی اُس نفرت و ناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں، جو خود ان کی اپنی خوں ریزیوں کے خلاف امنڈ کر آرہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''اسلام'' کے ساتھ دہشت گردی کو جوڑنا ایک بے بنیاد الزام ہے، اسلام کا دہشت گردی سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ یہ دونوں تو آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ اسلام ایک ایسا نظریہ اور دین ہے، جس کے جز جز میں سلامتی ہے، وہ عربی زبان کا ایک لفظ ہے، جس کا مادہ ''س، ل، م'' ہے جس کا مطلب سلامتی اور امن ہے، اس کی تمام تر تعلیمات امن وامان سے عبارت ہیں، اس کے احکامات امن پسندی کی ضمانت ہیں۔

جہاں تک اسلام میں جہاد کا تصور ہے، تو یہ خود قیام امن کے لیے ہے، اس کا مقصد سلامتی، امن اور انصاف قائم کرنا ہے، دنیا سے فساد، خوں ریزی، لوٹ مار، ظلم وتشدد، بے جا من مانی اور شر پسندوں کی دھاندلی کو ختم کرنا ہے۔

اکبرالہ بادی مشہور شاعر گزرے ہیں، انھوں نے اہل مغرب سے بڑے اچھے شعر کہے ہیں ان کا یہ قطعہ بڑا موزوں ہے:

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پر لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

☆ ☆ ☆

كتاب الجهاد

أخبرنا الإمامُ الحافظُ أبوبكر أحمدُ بنُ علي بنِ ثابتٍ الخطيبُ البغداديُّ قال أخبرنا الإمامُ القاضيُ أبو عَمرو القاسمُ بنُ جعفر بن عبدِالواحدِ الهاشميُّ قال أخبرنا أبو علي محمد بنُ أحمدَ بن عمرو اللؤلوئ، قال ثنا ابو داؤد سليمانُ بنُ الأشعث السِّجِسْتَانيّ في المحرم سنة خمس و سبعين ومأتين .

ترجمہ: ہم سے حافظ بن ابی بکر احمد بن علی بن ثابت خطیب بغدادی نے اور اُن سے امام قاضی ابوعمرو قاسم ابن جعفر بن عبدالواحد ہاشمی نے اور اُن سے ابوعلی محمد بن احمد، بن عمرولولوئ نے اور اُن سے ابوداؤد سلیمان بن اشعث بجستانیؒ نے محرم الحرام ۲۷۵ھ میں یہ کتاب نقل کی ہے۔

تشریح : امام ابوداوَد نے کتاب کے درمیان میں سند کا ذکر کرکے اس کی اہمیت کو واضح کردیا؛ کیونکہ فن حدیث میں سند کی بہت اہمیت ہے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے: لولا الإسناد لقال من شاء ماشاء. یعنی اگر سند حدیث نہ ہوتی تو جس کی مرضی میں جوآتا وہ کہہ دیتا اوراس حدیث پاک میں لوگ ملاوٹ کردیتے۔

﴿بابٌ في الأسيرِ يُكْرَهُ على الكُفْرِ﴾

قیدی کو کفر پر مجبور کرنے کا بیان

۱ ﴿حَدَّثَنا عمرو بنُ عونٍ قال أخبرنا هُشَيْمٌ وخالدٌ عن إسمٰعيلَ عن قيسِ بنِ أبي حازمٍ عن خَبَّاب قال أتَيْنَا رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وهو مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً في ظِلِّ الكعبةِ فَشَكَوْنا إليه، فقلنا ألَا تَسْتَنْصِرُ لنا؟ ألَا تَدْعُوْاللّٰهَ لَنَا؟ فَجَلَسَ مُحْمَرًّا وَجْهَهُ فقال: قد كانَ مَن كان قَبْلَكم يُؤْخَذُ الرجُلُ، فَيُحْفَرُ لَهُ في الأرضِ ثُمَّ يُؤْتٰى بالمِنْشَارِ فَيُجْعَلُ علىٰ رأسِهِ فيُجْعَلُ على فِرقَتَيْن مايَصْرِفُه ذلك عن دِيْنِه، ويُمْشَطُ بِأَمْشاطِ الحديدِ ما دُوْنَ عظمِهِ مِن لحمٍ و عَصَبٍ ما يصرِفُه ذلك عَنْ دِينِه، واللّٰهِ لَيُتِمَّنَّ اللّٰهُ هذ الأمرَ حتى يسيْرَ الراكبُ ما بين صَنْعَاءَ وحضرَموتَ، ما يخافُ إلاّ اللّٰهَ والذِّئبَ على غَنَمِهِ ولكنّكم تُعَجِّلونَ .﴾

ترجمہ: حضرت خبابؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے درانحالیکہ آپ ﷺ کعبہ کے

سائے میں ایک چادر کا تکیہ لگائے ہوئے تھے، تو ہم نے آپ ﷺ سے (کافروں کے غلبہ کی) شکایت کی، اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے لیے مدد اور دعا مانگئے (کہ یہ کفار ہم پر ظلم کر رہے ہیں) یہ سن کر آپ ﷺ بیٹھ گئے اور آپ ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا، پھر ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے ایک شخص کا (ایمان کی وجہ سے) یہ حال ہوتا تھا کہ اس کو پکڑا جاتا اور اس کے لیے زمین میں ایک گڑھا کھودا جاتا، پھر آرا لا کر اس کے سر پر چلایا جاتا اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے، مگر وہ اپنے دین سے نہیں پھرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیاں اس کی ہڈیوں کے اوپر گوشت اور پٹھوں میں چلاتے تھے، لیکن وہ اپنے دین سے نہیں پھرتا تھا، اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اس کو (دین کو) ضرور پورا کرے گا۔ (ایک دن ایسا آئے گا) کہ صنعاء اور حضر موت کے درمیان آدمی سفر کرے گا اور صرف خدا تعالیٰ سے ڈرے گا، یا بھیڑیوں سے اپنی بکریوں کی وجہ سے ڈرے گا، لیکن تم جلدی کرتے ہو (یعنی تم صبر کو اختیار کرو اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا)

تشریح مع تحقیق: مُتَوَسِّدٌ باب تفعل سے اسم فاعل ہے بمعنی تکیہ پر سر رکھنا، تکیہ لگانا۔

بُرْدَةٌ مخطط چادر یعنی حضور ﷺ چادر کی تہ بنا کر سر مبارک کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔

مُحْمَرًّا باب افعلال سے اسم فاعل ہے بمعنی سرخ ہونا، آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک یا تو نیند کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا، چونکہ عموماً جب آدمی سو کر اٹھتا ہے تو چہرا سرخ ہو جاتا ہے اور آپ ﷺ تو نہایت خوبصورت تھے، جس کی وجہ سے اور بھی امکان ہے کہ نیند کے اثر سے ہی چہرۂ مبارک پر سرخی آئی ہو، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ غصہ کی وجہ سے آپ کے چہرۂ انور پر سرخی آئی ہو کیونکہ جب صحابہ نے دعا کے لیے جلدی کی تو آپ ﷺ کو غصہ آ گیا ہو جیسا کہ روایت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے۔

مِنْشَارٌ ج مناشیر بمعنی آرا، آری۔

مادُونَ عَظْمٍ یہاں لفظ دون فَوقَ کے معنی میں ہے اور آگے لفظ مِن سے اس کا بیان ہے کہ ہڈی کے اوپر گوشت اور پٹھے میں لوہے کی کنگھی کی جاتی تھی۔

صَنعَاء معجم البلدان میں لکھا ہے کہ صنعاء دو ہیں ایک یمن میں ہے جو صنعا غطی سے مشہور ہے اور ایک گاؤں دمشق میں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں فرمایا ہے کہ یہاں دونوں کا احتمال ہے۔

حضر موت: بفتح الحاء وسكون الضاد وفتح الراء وفتح الميم یمن کے ساحلی کنارے پر ایک جگہ ہے جس کے ارد گرد بہت ریت پایا جاتا ہے اور اسی جگہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر مبارک ہے، ان دونوں جگہوں کے درمیان بہت طویل مسافت ہے اور یہاں پر دوری کو بتلانا ہی مقصود ہے، کہ امن اتنا ہو جائے گا کہ اپنی دوری کے سفر میں بھی کوئی خوف نہ رہے گا۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت ایسا ہوگا۔

(كذا في الحاشية)

ولكنكم تُعجِلُون : مطلب یہ ہے کہ تم جلدی نہ کرو بلکہ صبر کرو اللہ کی مدد آئے گی۔ اس قول پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ پریشانی کے وقت صحابہ نے حضور سے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا یعنی دعا نہیں فرمائی حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فلولا اذ جاءهم بأسنا تضرعوا، وادعوني أستحب لكم، کہ تم پریشانی کے وقت میں بھی مجھے پکارو؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مصیبت اور تکلیف ضرور بالضرور آئے گی اور اس میں صحابہ کے لیے اجر عظیم ہوگا، اس لیے آپ ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا نہیں کی؛ بلکہ صبر کی تلقین فرمائی تا کہ صحابہ کو صبر کی وجہ سے اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے؛ لیکن غیر نبی کے لیے پریشانی کے وقت میں اللہ سے دعا مانگنا واجب ہے، کیونکہ اس کو وہ باتیں نہیں معلوم ہوتیں، جو ایک نبی کو معلوم ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ

مصنف علیہ الرحمہ کا مقصد مکرہ علی الکفر کو بیان کرنا ہے، اس کے حکم کو جان لینے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اکراہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) اکراہ تام (۲) اکراہ ناقص۔

اکراہ تام : یہ ہے کہ انسان کو کلمۂ کفر کہنے پر بالکل مجبور کر دیا جائے کہ اگر تم نے کلمۂ کفر نہیں کہا تو تم کو قتل کر دیا جائے گا۔

اکراہ ناقص : یہ ہے کہ انسان کو اتنا مجبور نہ کیا جائے جس سے اس کی جان جانے کا خطرہ ہو، جیسے مثلاً یہ کہا کہ اگر تم نے کلمۂ کفر نہیں کہا تو تم کو قید کر دیا جائے گا۔

پس اگر اکراہ تام والی صورت ہے، تو کلمۂ کفر کہنے سے اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی جبکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو، اس لیے کہ شریعت نے ایسے شخص کو جس کو اپنی جان کا خطرہ ہو کلمہ کفر کہنے کی رخصت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے من كفر بالله من بعد ايمانه إلا من اكره وقلبه مطمئن بالإيمان الخ یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کر لے اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے، ہاں اگر کسی کو کفر پر بالکل مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو تو اس کے لیے یہ عذاب نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اکراہ تام کی صورت میں کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے؛ لیکن اس رخصت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفر حلال ہو جائے گا؛ بلکہ کفر تو حرام ہی ہے رخصت کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔

البتہ اکراہ تام کی صورت میں بھی زبان سے کلمۂ کفر نہ کہنا افضل ہے۔ اگر نہ کہنے کی وجہ سے قتل کر دیا گیا تو وہ شخص عنداللہ ماجور ہوگا۔ اس لیے کہ اس نے اللہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی، نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے : من قتل مجبرًا في نفسه فهو في ظل العرش يوم القيامة .

اور اگر اکراہ ناقص والی صورت ہے تو شریعت کی طرف سے کلمہ کفر کہنے کی اجازت اور رخصت نہیں ہے لہٰذا اگر اس صورت میں کوئی کلمۂ کفر کہہ لے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔ (بدائع الصنائع:۱۸۶/۶)

ترجمۃ الباب سے مناسبت

حدیث شریف میں یوخذ الرجل فیحفرله في الأرض الخ سے ترجمۃ الباب ثابت ہورہا ہے۔

﴿بَابٌ في حُكْمِ الجاسُوسِ إذا كانَ مُسْلِمًا﴾

یہ باب مسلمان جاسوس کے حکم کے بیان میں ہے (کہ اسکو قتل کیا جائیگا یا نہیں؟)

۲ ﴿حَدَّثَنا مسدد قال حدثنا سفيان عن عمرو حدثه الحسن بن محمد بن علي أخبره عبيد الله بن أبي رافع وكان كاتباً لعلي بن أبي طالبٍ قال: سمعتُ عليًا يقول: بَعَثَني رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم أنا والزُّبَيْرَ والمِقْدَادَ، فقال: إنطَلِقُوا حتى تَأتُوا رَوْضَةَ خاخٍ فإنّ بها ظَعِينَةً مَعَها كتابٌ فخُذُوْهُ مِنها، فَانطَلَقْنا يَتعادَى بِنا خَيْلُنا حتّى أتَيْنا الرَّوْضَةَ فإذا نحن بالظعينةِ فقلنا هَلُمّي الكتابَ قالت: ما عندي مِن كتابٍ فَقلتُ: لَتُخرِجِنّ الكتابَ أو لَنُلْقِيَنَّ الثِّيابَ قال فأخرجَتْهُ من عُقَاصِها، فأتينا بِهِ النبيَّ صلّى اللّٰه عليه وسلم فإذا هو مِنْ حاطبِ بنِ أبي بَلْتَعَة إلى ناسٍ من المشركينَ يُخْبِرُهم بِبعضِ أمر رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم فقال: ما هذا يا حاطبُ ؟ فقال: يا رسولَ اللّٰه لا تَعْجَلْ عليّ فإنِي كنتُ إمْرأً مُلْصَقًا من قريشٍ، ولم أكُن من أنفُسِها، وإن قريشًا لهم بها قراباتٌ يَحْمُوْنَ بها أهْلِهِمْ بمكة فأحبَبْتُ إذْ فاتَني ذلك أن أتَّخِذَ فيهم يَدًا يَحْمُون قَرَابتي بها . واللّٰهِ يا رسولَ اللّٰه ما كانَ بي كُفْرٌ ولا إرتدادٌ، فقال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: صَدَقَكم، فقال عمر دَعْنِيْ أضرِبْ عُنقَ هذ المنافقِ! فقال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم : قد شَهِد بَدْرًا ! وما يُدْرِيْكَ لعلّ اللّٰهَ إطّلَعَ على أهل بَدْرٍ ففال "إعمَلُوا ما شِئتُم فَقَدْ غَفَرْتُ لَكم"﴾

ترجمه: حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور حضرت زبیر اور حضرت مقداد کو روضہ خاخ کی طرف بھیجا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم چلتے رہو یہاں تک کہ روضۂ خاخ میں پہنچ جاؤ، اس لیے کہ روضۂ خاخ میں ایک عورت کجاوے میں بیٹھی ہوئی اونٹ پر سوار ہے اور اس کے پاس ایک خط ہے وہ اس سے

لے لینا۔ چنانچہ ہم بہت جلدی اپنے گھوڑے دوڑا کر روضۂ خاخ میں پہنچے اور اس عورت سے جا ملے، ہم نے اس عورت سے کہا کہ (جو خط تو لائی ہے) اس کو نکال دے اس نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، ہم نے کہا کہ ضرور بالضرور خط نکال ورنہ ہم تیرے کپڑے اتار دیں گے۔ (اور تجھ کو ننگا کر کے خط نکال لیں گے) اس عورت نے وہ خط اپنی چوٹی سے نکال کر دیدیا، ہم اس کو لے کر حضور کے پاس آئے (تو معلوم ہوا کہ) وہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکہ کے نام تھا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک (پوشیدہ) خبر ان تک پہنچا دیں (جب حضور نے اس خط کو دیکھا) تو ارشاد فرمایا کہ اے حاطب یہ کیا بات ہے؟ حضرت حاطب نے کہا کہ یا رسول اللہ (سزا دینے میں) جلدی نہ فرمائیے، اس لیے کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو قریش کا ملصق ہوں۔ (حلیف ہوں) اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں، اب جو لوگ قریش کی قوم میں سے ہیں ان کے مکہ میں قرابت دار موجود ہیں، مشرکین مکہ اس قرابت کی وجہ سے ان کے مال وعیال کی حفاظت کرتے ہیں، تو جب میری ان سے کوئی قرابت نہیں ہے تو میں نے یہ چاہا کہ ان پر کوئی احسان کر دوں جس کی وجہ سے وہ مشرک لوگ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں (اس غرض سے میں نے یہ خط لکھا تھا) اللہ کی قسم میں کافر اور مرتد نہیں ہوں، یہ سن کر حضور نے ارشاد فرمایا کہ حاطب نے تم سے سچ کہا ہے، حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اس منافق کی گردن اڑانے دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھ کر فرمایا ہے کہ جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا۔

تشریح مع تحقیق : رَوْضَةُ خاخٍ : مدینہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے۔

ظَعِينَةٌ بمعنی ہودج، پردہ والا کجاوہ ج۔ ظعائن و ظُعُنٌ و ظُعْنٌ اور جمع الجمع اَظعان آتی ہے، جس وقت عورت ہودج میں ہوتی تھی، تو اس کو ظعینہ کہا جاتا تھا لیکن بعد میں تنہا عورت پر اور تنہا ہودج پر بھی ظعینہ کا اطلاق ہونے لگا۔

تَتَعَادیٰ یہ باب تفاعل سے ہے جس کے معنی ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقہ ومقابلہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ ہمارے گھوڑے ہم کو لیکر اس عورت سے آگے نکل گئے اور ہم نے اس کو پکڑ لیا۔

يَحْمُوْنَ از باب (ض) بمعنی روکنا بچانا، حفاظت کرنا۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ

آپؓ یمن کے باشندہ تھے اور مکہ مکرمہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے، پھر مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اور اہل وعیال کو مکہ میں ہی چھوڑ آئے اور یہ حضرت زبیرؓ کے حلیف تھے، جنگ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، جس زمانہ میں کفار قریش نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں حملہ آور ہونے کا ارادہ

کر چکے تھے اس زمانہ میں سارہ نام کی ایک مغنیہ مدینہ منورہ آئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ہجرت کر کے آئی ہو، اس نے جواب دیا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا مسلمان ہو کر آئی ہو، اس نے کہا کہ نہیں، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آخر کس غرض سے آئی ہو، اس عورت نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں اعلیٰ خاندان کے لوگوں سے میرا گذارہ ہوتا تھا اب مکہ کے بڑے بڑے سردار غزوۂ بدر میں میں مارے گئے ہیں اور آپ لوگ یہاں چلے آئے ہیں اس لیے اب میرا گذارہ مشکل ہو گیا ہے، میں سخت پریشانی میں آپ سے مدد لینے آئی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم تو مکہ شریف کی پیشہ ور مغنیہ ہو وہ مکہ کے نوجوان کیا ہوئے جو تم پر روپے پیسے کی بارش کیا کرتے تھے، اس نے کہا کہ بدر کے بعد ان کی ساری تقریبات ختم ہو چکی ہیں اور اس وقت مجھے کسی نے نہیں بلایا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مطلب کو اس عورت کی مدد کرنے کی ترغیب دی، انھوں نے اس کو نقد پوشاک دے کر رخصت کر دیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے اسی عورت کے ذریعہ کفار مکہ کی طرف ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر اندھیری رات اور سیل بے پناہ کی طرح تم پر ٹوٹنے والا ہے، حضور ﷺ کو بذریعۂ وحی اس خط کا پتہ ہو گیا، چنانچہ آپ ﷺ نے چند صحابہ کو حکم دیا کہ ایک عورت مکہ کے راستہ میں سفر کرتی ہوئی فلاں مقام پر ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے اس کو لیکر آؤ، یہ لوگ بہت تیزی سے روانہ ہوئے اور اس عورت کو ٹھیک اسی مقام پر پالیا، کچھ ردوکد کے بعد وہ خط ان کے حوالے کر دیا، پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ خط حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے کفار مکہ کے نام ہے، جس میں مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع دی گئی ہے۔ آپ نے حضرت حاطبؓ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ حضرت حاطب نے جواب میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ نہ میں نے کفر اختیار کیا ہے اور نہ اسلام سے پھرا ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ میرے اہل وعیال مکہ میں ہیں اور ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے، میں نے کافروں پر احسان کر کے یہ چاہا کہ وہ میرے اہل وعیال کی خبر لیتے رہیں اور اسلام کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ فتح ونصرت کے جو وعدے اللہ نے آپ ﷺ سے کیے ہیں یقیناً وہ پورے ہو کر رہیں گے، چنانچہ حضور نے ان کی تصدیق فرمادی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں مذکور ہے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اشکال اول

اس روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، مقداد اور حضرت زبیرؓ کو خط لینے کے لیے بھیجا جبکہ دوسری روایات میں ہے کہ حضرت علی، حضرت ابو مرثد اور حضرت زبیر بن عوامؓ کو بھیجا؟

جواب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار افراد کو بھیجا تھا تو بعض راویوں نے ابو مرثد کا ذکر کر دیا اور مقدادؓ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے حضرت مقداد کا ذکر کر دیا اور ابو مرثد کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ اس کا دوسرا جواب یہ بھی

دیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو دو مرتبہ بھیجا ہو ایک مرتبہ حضرت ابومرثدؓ ساتھ ہوں اور دوسری مرتبہ حضرت مقدادؓ ساتھ ہوں۔ (تکملہ فتح الملہم: ۵/۲۶۳، بذل: ۴/۲، حاشیہ بخاری: ۱/۴۲۲)

اشکال ثانی

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت نے اپنی چوٹی سے خط نکالا اور بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے، کہ اس عورت نے اپنی کمر سے خط نکالا، لہٰذا دونوں روایتوں میں تعارض ہوا؟

جواب

(۱) ممکن ہے کہ اس عورت نے اولاً کمر سے خط نکالا ہو اور اس کو چوٹی میں چھپالیا ہو، مگر جب اس کو مجبور کیا ہو تو چوٹی سے نکال کر دیدیا ہو۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ اس عورت کے پاس دو خط ہوں تا کہ ایک خط گم ہو جائے تو دوسرا پہنچادے، تو اولاً اس نے ایک خط اپنی کمر سے یعنی معقد ازار سے نکالا ہو اور دوبارہ اپنی چوٹی سے خط نکال کر دیا ہو۔

(۳) اس اشکال کا سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ خط تو اس کی چوٹی میں ہی تھا؛ لیکن اس کی چوٹی بہت لمبی تھی جس کی وجہ سے معقد ازار تک پہنچ گئی تھی، اب بعض حضرات نے کہہ دیا کہ کمر سے نکالا تھا اور بعض نے کہا کہ چوٹی سے نکالا تھا اور دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ (بذل: ۴/۲، حاشیہ بخاری: ۲/۵۶۷)

اشکال ثالث

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کی معذرت کو قبول فرما کر ان کی تصدیق فرمادی کہ حاطب سچ کہہ رہے ہیں، تم ان کے بارے میں کچھ مت کہو سوائے خیر کے، تو حضرت عمرؓ ان کے قتل کی اجازت کیوں مانگ رہے ہیں، یہ تو بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کو جھٹلانا ہے؟

جواب

یہ اشکال بظاہر بہت قوی معلوم ہوتا ہے، لیکن محدثین کرام نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں، جن سے یہ اشکال بالکل رفع ہو جاتا ہے۔

(۱) حضرت عمرؓ اپنی فطری قوت اور منافقین سے عداوت کی وجہ سے یہ بات کہہ رہے ہیں اور حضرت عمرؓ نے یہ خیال کیا کہ حضرت حاطبؓ کا یہ فعل موجب قتل ہے کیونکہ انھوں نے حضور کی نافرمانی کی ہے، لیکن قتل کا پختہ ارادہ نہیں کیا اسی وجہ سے حضور سے اجازت طلب کر رہے ہیں۔

(۲) علامہ حلبی نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ قول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق سے پہلے کا ہو اور روایات میں تقدیم اور تاخیر ہوگئی ہو۔

(۳) علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ پر ایسی حالت طاری ہوگئی تھی کہ انکو یہ پتہ نہیں چلا کہ حضور ﷺ کیا فرمارہے ہیں۔

(۴) لامع میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ سوچا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاطب کی تالیف قلب کے لیے ارشاد فرمارہے ہیں اور اس موقع پر تالیف سے تادیب اچھی ہے، باقی رہا منافق کہنا تو چونکہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل ظاہر کے خلاف تھا اس لیے ان کو منافق کہہ دیا۔ (بذل: ۳/۴، حاشیہ بخاری: ۵۶۷/۲)

اشکال رابع

إعملوا ما شئتم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدر کے لیے ہر قسم کا فعل جائز تھا، اگر چہ وہ فعل حرام ہی کیوں نہ ہو، حالانکہ یہ عقیدہ شریعت کے خلاف ہے؟

جواب

(۱) یہاں پر امر نہ وجوب کے لیے ہے اور نہ ہی اباحت کے لیے ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واقعہ بدر کے بعد ان حضرات سے اگر گناہ صادر ہو تو وہ مغفور ہوگا، لہٰذا یہ امر تشریف اور تکریم کے لیے ہوگا۔ اس کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے سابقہ گناہوں کو معاف فرمادیا اور ان کے اندر ایسی اہلیت اور صلاحیت پیدا کردی کہ اگر کوئی گناہ صادر ہوگا تو وہ توبہ کرلیں گے اور اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے، لیکن مغفرت موعودہ آخرت کے ساتھ خاص ہے، چنانچہ اگر اہل بدر میں سے کسی سے کوئی موجب حد امر صادر ہوا تو اس کی حد لگائی گئی، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح بن اثاثہؓ کو حد لگائی حالانکہ وہ بدریین میں سے تھے۔

(۲) علامہ ابن الجوزیؒ نے "اعملوا ما شئتم" کو ماضی پر محمول کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سابقہ تمام گناہوں کو معاف فرمادیا ہے، لیکن یہ جواب تکلف سے خالی نہیں ہے اس لیے کہ امر کا صیغہ تو مستقبل کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے، ماضی پر محمول کرنا ناممکن ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۲۶۲/۵، بذل ۳/۴)

اشکال خامس

یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ جس طرح مسلمان اور کافرہ عورتوں سے زنا کرنا حرام ہے ایسے ہی ان کے ستر کو دیکھنا بھی حرام ہے، لیکن حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ کے اس قول (لتلقين الثياب) سے معلوم ہوتا ہے کہ کافرہ عورت کے ستر کو دیکھنا جائز ہے؟

جواب

علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں فرمایا ہے کہ جب کافرہ عورت کو ننگا کرنے کی طرف سخت ضرورت پیش آجائے تو اس کو ننگا کرنا جائز ہے اس لیے کہ ضروریات محظورات کو مباح کردیتی ہیں، اب یہاں پر چونکہ ضرورت شدید تھی

جس کی وجہ سے حضرت علیؓ نے لباس اتارنے کی دھمکی دی تھی۔ (عمدۃ القاری: ۷/۱۱۳)

مسلمان جاسوس کا شرعی حکم

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام اوزاعی، بعض مالکیہ اور جمہور علماء فرماتے ہیں کہ مسلمان جاسوس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ امام ضرباً یا حبساً تعزیر کرے گا اور امام مالک علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مسلمان جاسوس کو امام کے اجتہاد پر چھوڑ دیا جائے گا۔ (بذل: ۴/۵)

ترجمة الباب : حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ مسلمان تھے اور انھوں نے جاسوسی کی تھی اسی سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے۔

۲ ﴿حَدَّثَنَا وهبُ بنُ بَقِيَّةَ عن خالدٍ عن حُصَيْنٍ عن سعدِ بن عبيدةَ عن أبي عبدالرحمن السُلمي عن عَليٍ بهذه القِصَّةِ قال: إنطَلَقَ حاطبٌ فكتَبَ إلى أهلِ مكةَ أنَّ محمدًا قد سَارَ إليكم، وقال فيه: قالت: ما معي مِن كتابٍ، فأنَخنَاهَا فما وجَدْنا مَعَها كتابًا فقال عليٌ: والذي يُحلَفُ به لَأقتُلَنَّكِ أو لَتُخرِجِنَّ الكتابَ. وسَاقَ الحديثَ﴾

ترجمہ: حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی سے حضرت علیؓ نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ حضرت حاطبؓ (مجلس سے) چلے اور مکہ والوں کو لکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اوپر (حملہ کرنے) آرہے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس عورت نے کہا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے چنانچہ ہم نے اس کے اونٹ کو بٹھا کر اس کی تلاشی لی تو کوئی خط نہ پایا۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں) کہ میں نے کہا کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں) اس ذات کی قسم جس کی قسم کھائی جاتی ہے میں تجھ کو قتل کر ڈالوں گا ورنہ خط نکال کر دے دے، پھر پوری حدیث جو ماقبل میں گذر چکی ہے بیان کی۔

تشریح : مصنف علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو بہت اختصار سے بیان کیا ہے کیونکہ تفصیلی طور سے ماقبل میں گذر چکی ہے، لیکن چونکہ پہلی حدیث میں یہ ٹکڑا نہیں تھا کہ اولاً حضرت علیؓ نے اس کے اونٹ کو بٹھا کر تلاشی لی اور جب خط نہیں ملا تو اس کو قتل کی دھمکی دی، لہٰذا مصنفؒ نے اس ٹکڑے کو بیان کرنے کے لیے اس حدیث کو یہاں ذکر کر دیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے إنطلق حاطب" شارحین نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں ایک یہ کہ جب حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کی خبر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر حملہ کا ارادہ فرما چکے ہیں تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اٹھے اور گھر گئے تا کہ خط لکھیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ

انطلاق سے مراد انطلاق معنوی ہے کہ وہ مجلس میں ہی لکھنے کے اسباب پر آمادہ ہو گئے تھے۔ (بذل: ۳/۴) اس حدیث کی مزید تشریح گذشتہ حدیث کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

﴿بَابٌ فِي الجاسُوْسِ الذِّمِّي﴾

یہ باب ذمی کے جاسوسی کرنے کے بیان میں ہے

(یعنی ذمی کا کیا حکم ہے اس کو قتل کیا جائے گا یا نہیں)

۴ ﴿حَدَّثنا محمد بنُ بَشّارٍ قال حدثني محمد بن مُحَبَّبٍ أبو همّام الدلّال قال ثنا سفيانُ بن سعيدٍ عن أبي اسحاقَ عن حارثةَ بنِ مضرّبٍ عن فُراتِ بنِ حَيَّان أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلّى الله عليه وسلم أمَرَ بِقَتْلِهٖ، وكان عَيْنًا لأبي سُفْيانَ، وكان حَلِيْفًا لِرَجُلٍ مِنَ الأنصَارِ، فَمَرَّ بحَلَقةٍ مِن الأنصارِ فقال: إني مُسْلِمٌ، فقال رجلٌ مِن الأنصَار: يا رسول اللّٰه إنه يقولُ: إني مسلمٌ فقال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلَّم: إن مِنكم رِجالاً نَكِلُهم إلىٰ إيمانِهم، مِنهُم فراتُ بنُ حيّانَ﴾

ترجمہ: حضرت فرات بن حیانؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے (یعنی میرے) قتل کا حکم دیا اس لیے کہ وہ ابوسفیان کے جاسوس تھے اور ایک انصاری مرد کے حلیف (پناہ میں) تھے وہ انصار کی ایک جماعت سے گذرے اور کہنے لگے کہ میں مسلمان ہوں، تو ایک انصاری صحابی بولے کہ یارسول اللہ یہ شخص کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ ہم ان کو ان کے ایمان کی طرف سپرد کر دیتے ہیں، انہیں میں سے فرات بن حیان بھی ہیں۔ (لہٰذا یہ جو کہہ رہے ہیں اس کو ہم قبول کرتے ہیں)

تشریح: عَيْنًا بمعنی آنکھ، یہاں پر مجازاً جاسوس کو ''عین'' کہا گیا ہے اس لیے کہ جاسوس سارا کام اپنی آنکھ سے ہی کرتا ہے گویا یہ تسمیۃ الکل باسم الجز کی قبیل سے ہوا۔

نَكِلُهُمْ . وَكَلَ يَكِلُ وَكْلا ـ اليه الأمر بمعنی سپرد کرنا، کسی پر بھروسہ کر کے کام چھوڑ دینا، یہاں مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ایمان پر بھروسہ کر کے ان کو قتل کرنے سے چھوڑ دیا۔

ذمی جاسوس کا شرعی حکم

جمہور علماء کے نزدیک ذمی جاسوس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ امام کو اختیار ہوگا کہ اس کو معاف کر دے یا قید

کردے، لیکن امام مالک اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جاسوسی کرنے سے ذمی کا عہد ٹوٹ جائے گا اور اب امام کو اختیار ہے کہ غلام بنائے یا اس کو قتل کردے۔

ترجمة الباب : صحابہؓ کے تذکرے کی جو کتابیں ہیں مثلاً اصابہ، اسد الغابہ، الاستیعاب وغیرہ ان میں یہ صراحت ہے کہ فرات بن حیانؓ جس وقت گرفتار ہوئے تھے اس وقت حربی تھے، نیز امام بخاریؒ نے بھی جہاں یہ روایت نقل کی ہے وہاں یہ باب قائم کیا ہے: الحربی إذا دخل بغیر أمان لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے جو ترجمہ اس روایت پر قائم کیا ہے یہ روایت اس ترجمہ کے مطابق نہیں ہے۔ اس کا ایک جواب تو ''نیل الاوطار'' میں لکھا ہے کہ یہ اس وقت ذمی تھے اور حوالہ میں ابوداؤد اور مسند احمد کا نام ذکر کیا ہے لیکن جب ہم نے ان دونوں کتابوں میں تلاش کیا تو کان ذمیاً کے الفاظ نہیں ملتے۔ اس لیے راجح یہی ہے کہ حضرت فرات بن حیانؓ اس وقت حربی تھے لہٰذا روایت ترجمہ کے مطابق نہیں رہتی؟ (بذل:۴/۴)

اب اس اشکال کا ایک جواب ہی دیا جاسکتا ہے کہ حضرت فرات بن حیان انصار کے حلیف تھے اس لیے ان کو کم از کم ذمی کے حکم میں رکھا جائے گا۔ یہ جواب حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم نے دیا ہے۔

﴿بَابٌ في الجاسوسِ المُسْتأمِنِ﴾

یہ باب مستأمن جاسوس کے بیان میں ہے

۵ ﴿حَدَّثَنا الحَسَن بنُ علي قال ثنا أبُوُ نعيمٍ قال ثنا أبو عميسٍ عن ابن سَلَمَةَ بنِ الأكْوَعِ عن أبيه قال: أتى النبيَّ صلى الله عليه وسلم عَيْنٌ مِن المشركِين وهو في سَفرٍ فجلس عند أصْحابِهِ، ثم انْسَلَّ فقال النبيّ صلّى الله عليه وسلم: اُطْلُبُوْهُ فاقْتُلوه، قال: فسَبَقْتُهم إليه فَقَتَلْتُهُ وأخذْتُ سَلَبَهُ فَنَفَّلَنِي إيّاه﴾

ترجمہ : حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین کا ایک جاسوس آیا جس وقت آپ ﷺ سفر میں تھے، پھر وہ جاسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے پاس بیٹھ گیا پھر چپکے سے کھسک گیا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو تلاش کرو اور قتل کردو (حضرت سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں کہ) میں نے سب سے پہلے اس کو پکڑ لیا اور قتل کردیا اور اس کا سامان لے آیا، حضور نے وہ سامان مجھے ہی دیدیا۔

تشریح مع تحقیق: اِنْسَلّ از باب انفعال بمعنی چپکے سے کھسک جانا بولا جاتا ہے فلا اِنْسَلّ مِن الزِّحامِ۔ فلاں بھیڑ میں سے چپکے سے کھسک گیا۔

سَلَب ازباب(ن) زبردستی چھیننااوراصطلاح شرع میں: هو ثيابُ المقتولِ وسِلاحُهُ الذي معه و دابّتُه التي رِكبَهَا. بسَرجِها و آلاتِها و ما كان معه من مالٍ في حَقِيْبَةٍ على الدابة. (بدائع الصنائع:۸۶/۶)

یہ حدیث مختصر ہے آنے والی روایت مفصل ہے لہٰذا اسی پر مزید کلام کیا جائے گا۔ فانتظر .

۲ ﴿حَدَّثَنا هارون بن عبد الله أن هاشم بنَ القاسم وهشاماً حدثاهم قال ثنا عِكرمةُ بن عمّار قال ثنى اياس بن سَلَمة قال ثنى أبي قال: غَزَوْتُ مع رسول الله صلى الله عليه وسلم هَوَازِنَ، فَبَيْنَما نحنُ نَتَضَحّى وعَامَّتُنَا مُشَاةٌ وفِيْنَا ضَعْفَةٌ، إذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلى جَمَلٍ أحْمَرَ، فَانْتَزَعَ طَلَقًا مِنْ حَقْوِ البَعِيْرِ فَقَيَّدَ بِهِ جَمَلَهُ ثم جاء يَتَغَدّى مع القوم، فَلمّا رأى ضَعْفَتَهُمْ ورِقَّةَ ظَهْرِهم خَرَج يَعْدُوْ إلى جَمَلِهِ، فَأَطْلَقَهُ ثم أَنَاخَهُ فقَعَدَ عليه، ثم خرجَ يَرْكُضُهُ، واتْبَعَهُ رجُلٌ مِنْ أسْلَم على ناقةٍ وَرْقَاءَ هِي أمثَلُ ظَهْرِ القومِ قال: فخرجتُ أعْدُوْ فأدركْتُه ورأسُ الناقةِ عند وَرِكِ الجمل، و كنتُ عند ورك الناقةِ ثم تقدمتُ حتى كنت عند ورِكِ الجملِ، ثم تقدَّمْتُ حتّى أخذتُ بخِطامِ الجملِ، فأنختُهُ فلمّا وَضَع رُكْبَتَهُ بالأرضِ اِختَرَطتُ سَيفِي فأضرِبَ رأسَه فَنَدرَ فجئتُ براحِلَتِهِ وما عليها أقُوْدُها فاستَقْبَلَنِي رسولُ الله صلى الله عليه وسلم في الناسِ مُقبِلاً فقال مَنْ قَتَلَ الرجلَ ؟ فقالوا : سَلمةُ بنُ الأكوع ! فقال : له سَلَبُه أجْمَعَ . قال هَارونُ هذا لفظُ هاشمٍ﴾

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قبیلہ ہوازن سے جہاد کیا ہے ایک روز ہم چاشت کے وقت کھانا کھا رہے تھے اور ہم میں سے اکثر لوگ پیدل تھے نیز بعض لوگ کمزور تھے اتنے میں ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار ہوکر آیا اور ایک رسی اونٹ کی کمر سے نکال کر اس سے اونٹ کو باندھ دیا اور ہمارے ساتھ کھانا کھایا، جب اس نے ہماری ناتوانی اور سواریوں کی کمی کو دیکھا تو وہ دوڑتا ہوا اپنے اونٹ کی طرف گیا اور اونٹ کی رسی کھول کر اس کو بٹھایا پھر سوار ہوکر دوڑتا ہوا چلا گیا (اس وقت ہم کو یقین ہوا کہ وہ شخص جاسوس ہے) چنانچہ قبیلۂ اسلم کا ایک شخص اپنی مٹیالے رنگ کی اونٹنی پر جو ہماری تمام سواریوں میں اچھی تھی سوار ہوکر اس کے پیچھے چلا اور میں پیدل دوڑتا ہوا چلا جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس کی (قبیلہ اسلم کے شخص کی) اونٹنی کا سر اس کے یعنی جاسوس کے اونٹ کے پٹھے پر تھا (مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جاسوس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا) پھر میں آگے بڑھا یہاں تک کہ اونٹ کے پٹھے کے پاس آگیا، پھر اور آگے بڑھ کر میں نے جاسوس کے اونٹ کی نکیل پکڑلی اور اونٹ کو بٹھایا، جب اونٹ نے اپنا گھٹنا زمین پر ٹیکا تو میں نے تلوار میان

سے نکالی اور اس کے سر پر ماری تو وہ گر گیا۔ چنانچہ میں اس کے اونٹ کو مع مال واسباب کے کھینچتا ہوا لے آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ مل کر میرا استقبال کیا، اور فرمایا کہ اس جاسوس کو کس نے مارا ہے لوگوں نے جواب دیا کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے مارا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس مقتول کا سامان اس کو یعنی سلمہ بن اکوع کو ملے گا۔ ہارون جو راوی ہیں انھوں نے کہا ہے یہ الفاظ ہاشم کی روایت کے ہیں۔

تشریح : هَوازِنُ عرب کا ایک بڑا قبیلہ ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں، یہ قبیلہ ہوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ کی طرف منسوب ہے۔

نَتَضَحّٰی: تضحی یتضحی تَضَحِیًا بمعنی چاشت کے وقت کھانا کھانا۔

مُشَاۃٌ ماشی کی جمع ہے اور جمع الجمع ماشون آتی ہے، نیز یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

طَلَقًا ج اطلاق مضبوط بٹی ہوئی رسی، کھال کا بنایا ہوا بند۔

حَقْوٌ ج حِقاءٌ و اَحْقَاءٌ ہے بمعنی کوکھ، ازار رِقَّۃٌ بمعنی باریکی اور یہاں پر قلت مراد ہے۔

یَعْدُوْ ازباب (ن) بمعنی دوڑنا۔

مصنف علیہ الرحمہ کا مقصود ان دونوں روایتوں سے یہ ہے کہ مستامن اگر دار الاسلام میں جاسوسی کرے تو اس کا حکم کیا ہوگا؟

مستامن جاسوس کا حکم شرعی

ماقبل میں ذمی کا حکم گذر چکا ہے لہٰذا مستامن کا بھی یہی حکم ہے۔

ترجمة الباب : روایت سے تو بظاہر ترجمہ ثابت نہیں ہوتا، لیکن اس کا ترجمہ اس طرح ثابت ہوگا کہ جب وہ کافر صحابہ کے پاس آیا اور اس نے کھانا کھایا تو یقیناً صحابہ نے اس کو امان دیدیا ہوگا ورنہ وہ ساتھ میں کھانا کیسے کھاتا۔

مسئلہ: حربی جاسوس کو بالاتفاق قتل کر دیا جائے گا۔ (بذل:۴/۵)

﴿بَابٌ في أيِّ وقتٍ يُسْتَحَبُّ اللِّقاءُ﴾

یہ باب اس بیان میں ہے کہ کون سا وقت دشمن سے مقابلہ کرنے کیلئے بہتر ہے

۷ ﴿حَدَّثَنا موسىٰ بن إسماعيل قال ثنا حمّاد قال ابو عمران الجونيُّ عن علقمة بن عبدالله المزني عن معقِل بن يسار أن النعمان يعني ابن المقرن قال: شهدتُ

رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إذا لم یُقَاتِلْ مِنْ أوّلِ النهار أخّرَ القِتالَ ، حتی تَزُولَ الشَّمسُ، وتَهُبَّ الرِّیاحُ، و یَنْزِلَ النصرُ﴾

ترجمه : حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، تو اگر آپ ﷺ دن کے اول حصہ میں مقابلہ نہیں کرتے تو مقابلہ کرنے میں اتنی تاخیر فرماتے تھے کہ آفتاب ڈھل جاتا اور ہوائیں چلنے لگتیں اور مدد نازل ہونے لگتی۔

تشریح مع التحقیق : اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دن کے اول حصہ میں دشمن سے مقابلہ نہ کرتے تو پھر مقابلہ کو اور زیادہ مؤخر کر دیا کرتے تھے اور سورج کے ڈھلنے کے بعد ہی مقابلہ شروع فرماتے، ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقابلہ نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج مکمل طلوع ہو جاتا تھا۔ پھر نصف النہار تک مقابلہ کرتے تھے جب نصف النہار ہو جاتا تو سورج کے ڈھلنے تک رک جاتے پھر سورج کے ڈھلنے کے بعد عصر تک قتال فرماتے تھے اس کے بعد رک جاتے اور عصر کی نماز ادا فرماتے اس کے بعد غروب تک مقابلہ فرماتے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوقات صلوۃ میں مقابلہ نہیں فرماتے تھے۔ خصوصاً نماز کے اوقات میں فتح و نصرت لانے والی ہوائیں چلتی ہیں، نیز مؤمنین اپنی نمازوں میں مجاہدین کے لیے دعار کرتے ہیں جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔

(فتح الباری:۶/۱۲۰، بذل المجہود:۴/۵، تکملہ فتح الملہم:۳/۳۵)

ترجمۃ الباب : روایت سے ترجمۃ الباب کلی طور پر ثابت ہو رہا ہے۔

﴿بَابٌ فِیما یُؤمَرُ مِن الصَّمْتِ عند اللِّقَاءِ﴾

یہ باب اس بات کے بیان میں ہے کہ دشمن سے مقابلہ کے وقت میں خاموش رہنا چاہیے

۸ ﴿حدَّثنا مسلم بنُ إبراهیمَ قال ثنا هشام ح قال وحدثنا عبید اللّٰه بن عمر ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا هشام ثنا قتادةُ عن الحسن عن قیس بن عبّاد قال: کَانَ اَصْحَابُ النبيّ صلّی اللّٰهُ علیه وسلّم یَکْرَهُوْنَ الصَّوتَ عند اللِّقَاءِ﴾

ترجمہ: حضرت قیس بن عبادؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مقابلہ کے وقت بلند آواز کو برا سمجھتے تھے۔

تشریح: اس روایت سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ صحابۂ کرامؓ جنگ کے وقت رفع صوت کو برا سمجھتے تھے، اس لیے کہ مقابلہ کے وقت شور مچانا ہزیمت اور ناکامی کی دلیل ہے اور خاموشی ثابت قدمی کی دلیل ہے۔

اگر اللہ کا ذکر بلند آواز سے کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن صحابہ سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ وہ قتال کے وقت بلند آواز سے ذکر اللہ کیا کرتے تھے۔ (بذل:۶/۴)

ترجمة الباب: یکرھون الصوت عند اللقاء سے ثابت ہے۔

۹ ﴿حَدَّثَنَا عبيد الله بن عمَرَ قال ثنا عبد الرحمن عن همّامٍ قال ثني مَطَرٌ عن قتادة عن أبي بردةَ عن أبيه عن النّبيّ صلّى الله عليه وسلّم بمِثْلِ ذلكَ﴾

ترجمہ: حضرت ابو بردہ اپنے والد سے اور وہ حضور ﷺ سے اسی طرح روایت کرتے ہیں یعنی جس طرح اوپر کی روایت ہے۔

تشریح: محدث کبیر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ نے بذل المجہود میں تحریر فرمایا ہے کہ مصنفؒ نے اس سند سے جس حدیث مرفوع کی طرف اشارہ کیا ہے میں نے اس کو اس سند سے کسی دوسری کتاب میں نہیں پایا، ہاں البتہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ملی ہے جس میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر نکیر فرمائی جو چڑھتے اترتے اپنی آوازوں کو بلند کر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو ٹھہرو! یعنی اپنی آواز کو بلند مت کرو، اس لیے کہ تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ سمیع اور قریب کو پکار رہے ہو۔

اس روایت سے بھی صراحتاً یہ معلوم ہوا کہ مقابلہ کے وقت میں اپنی آواز کو بلند نہ کیا جائے۔ (بذل:۶/۴)

﴿بَابٌ في الرَّجُلِ يَترجَّلُ عند اللِّقَاءِ﴾

یہ باب ایسے شخص کے بیان میں ہے جو مقابلہ کے وقت سواری سے اتر کر نیچے چلے

۱۰ ﴿حَدَّثَنَا عثمان بن أبي شيبةَ قال ثنا وكيع عن إسرائيل عن أبي إسحٰق عن البراءِ قال: لَمَّا لَقِيَ النبيُّ صلّى الله عليه وسلم المشركينَ يومَ حُنَيْنٍ فَانْكَشَفُوا، نَزَلَ عن بَغْلَتِهِ فترجَّلَ﴾

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ حنین کے دن جب مشرکین سے ملاقات کی اور مسلمان بھاگ نکلے یعنی شکست کھانے لگے تو آپ ﷺ اپنے خچر سے اترے اور پیدل چلنے لگے۔

تشریح: اس روایت میں غزوۂ حنین کا ذکر ہے جس کا مختصر واقعہ یہ ہے: حنین طائف کے قریب ایک وادی ہے عرفات کی جانب سے مکہ اور حنین کے درمیان دس میل سے کچھ زائد کا فصل ہے یہاں قبیلہ ہوازن بھی بسا ہوا تھا، یہ لوگ مکہ کے اردگرد بھیڑ بکریاں چراتے تھے جب ان کو یہ خبر ہوئی کہ حضور ﷺ نے مکہ کو فتح کرلیا ہے تو انھوں نے قسمت آزمائی کا منصوبہ بنالیا کہ ہم سب مل کر اپنے ملک و مذہب کی حفاظت کریں گے، چنانچہ ان کے سردار مالک بن عوف نصری نے تمام قبیلۂ ہوازن، ثقیف اور دوسرے قبیلوں کے چار ہزار افراد کو وادی حنین میں جمع کیا اور لشکر کے ساتھ میں بیوی، بچے مویشی سب کو لیا، تاکہ ان کی حفاظت کے لیے جان دینا آسان ہوجائے اور کوئی بھی میدان چھوڑ کر نہ بھاگ جائے۔

جب حضور ﷺ کو اس بات کی خبر ملی تو آپ ﷺ ۶/شوال ۸ھ کو بارہ ہزار کی معیت میں وادی حنین کی طرف نکلے، مسلمان صبح کے وقت تہامہ کی ایک وادی سے تیز گذر رہے تھے، لیکن دشمن اس تنگ وادی میں پہلے سے چھپے ہوئے تھے، اسی حالت میں دشمنوں نے یکبارگی ایک ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ کردیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان ہوا اور کچھ مسلمان بھاگ نکلے، لیکن حضور ﷺ پیچھے نہیں ہٹے بلکہ اپنی سواری سے اترے اور اپنے چچا حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے پکارو "یا اهل الشجرة" چنانچہ انھوں نے آواز لگائی تو مسلمان دوڑتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دشمنوں پر حملہ کرو، اور آپ ﷺ نے زمین سے ایک مٹھی مٹی لی اور کفار کی طرف ہوکر شاهت الوجوه پڑھ کر کفار کی طرف پھینکی، تو کفار کا کوئی شخص ایسا نہیں بچا جس کی آنکھ میں یہ مٹی نہ پڑی ہو لہٰذا کفار بھاگے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، اس جنگ میں مسلمانوں کو بہت سے اموال غنیمت میں ملے، ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ اس جنگ میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چودہ ہزار اوقیہ چاندی اور بہت سی عورتیں، بچے غنیمت میں ملے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/۱۵۷، اصح السیر)

فائدہ

آپ ﷺ کے خچر سے اتر کر پیدل چلنے کی حکمت یہ تھی کہ مسلمان جب آپ ﷺ کو پیدل چلتے ہوئے دیکھیں تو کہیں کہ جب حضور اب تک ثابت قدم ہیں تو ہمیں بھی آگے بڑھ کر دشمن سے مقابلہ کرنا چاہیے، بعض لوگوں نے یہ حکمت بیان کی ہے کہ سواری پر بیٹھ کر صحیح تیر اندازی نہیں ہوسکتی، کیونکہ سواری بعض مرتبہ اِدھر اُدھر ہوجاتی ہے جس سے نشانہ نہیں لگتا، اور ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ سواری دوسری سواریوں کو دیکھ کر بھاگ جاتی ہے جس سے دیکھنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ شکست کھاگئے، ان وجوہات کے پیش نظر آپ ﷺ خچر سے نیچے اترے ہوں گے۔

ترجمة الباب: نزل عن بغلته فترجل سے ثابت ہے۔

﴿بَابٌ فِي الْخُيَلاَءِ فِيْ الْحَرْبِ﴾

یہ باب جنگ میں تکبر کرنے کے بیان میں ہے، یعنی لڑائی میں تکبر جائز ہے

۱۱ ﴿حَدَّثَنا مسلم بن ابراهيم و موسى بن اسمعيل المعنى واحدٌ قال ثنا أبان قال ثنا يحيى عن محمد بن ابراهيم عن ابن جابر بن عتيكٍ عن جابر بن عتيكٍ أنَّ نَبِيَّ اللّه صلى اللّه عليه وسلّم كان يَقُوْلُ: مِنَ الغَيْرةِ ما يُحِبُّ اللّهُ و مِنْهَا ما يُبْغِضُ اللّهُ ؛ فَأمَّا الَّتِي يُحِبُّها اللّهُ عَزَّ وجَلَّ فالغَيْرةُ فِي الرِّيْبَةِ؛ و أمَّا الَّتِي يُبْغِضُها اللّهُ فالغيرةُ فِي غيرِ رِيْبَةٍ، وإنَّ مِنَ الخُيَلاَءِ ما يُبْغِضُ اللّهُ و مِنْهَا ما يُحِبُّ اللّه، فامّا الخُيَلاَءُ التي يُحبُّ اللّهُ فَاخْتِيالُ الرَّجلِ نَفْسَه عِنْدَ القِتالِ، و اخْتِيَالُه عند الصَّدَقَةِ و أما التي يُبْغِضُ اللّهُ عَزَّ وَجَلَّ فَاخْتِيالُه في البَغْيِ، قال مُوْسٰى : وَالْفَخْرِ﴾

ترجمہ: حضرت جابر بن عتیکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ غیرت وحمیت دو قسم کی ہے، ایک وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دوسری وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے، اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ غیرت تو یہ ہے کہ شک کی جگہ پر ہو اور وہ غیرت جو اللہ کو پسند نہیں ہے یہ ہے کہ بغیر شک کے غیرت کرے، اسی طرح غرور اور تکبر بھی دو قسم پر ہے ایک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور ایک اللہ کو ناپسند ہے، پسندیدہ تکبر یہ ہے کہ انسان کافروں سے جہاد کرتے وقت تکبر کرے، نیز صدقہ دیتے وقت (یعنی خوشی خوشی صدقہ دے) اور جو ناپسند ہے وہ یہ ہے کہ ظلم و تعدی میں غرور کرے، موسیٰ نے کہا کہ فخر کرے (نسب میں)

تشریح : امام ابوداؤد علیہ الرحمہ اس حدیث پاک سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جنگ کے وقت میں تکبر کرنا جائز ہے، تکبر اگرچہ بری چیز ہے لیکن جنگ کے وقت برا نہیں ہے اور تکبر سے مراد یہ ہے کہ میدان جہاد میں خوشی اور قوت کا اظہار کرتے ہوئے اور کفار کو حقیر اور کمزور سمجھتے ہوئے اکڑ کر چلے، تا کہ دشمنوں کے دل میں خوف طاری ہو جائے، حدیث شریف میں دوسری چیز غیرت کو بیان کیا گیا ہے، غیرت کے اصل معنی ہیں محبوب شئے میں دوسرے کی شرکت کو برا سمجھنا اور یہ دو طرح کی ہوتی ہے: ایک پسندیدہ اور دوسری مبغوض، پسندیدہ کی مثال تو یہ ہے کہ کسی شخص کی بیوی کے پاس کوئی دوسرا شخص آ کر خوب مذاق کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ناگواری اور غیرت ہوتی ہے تو یہ غیرت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور مبغوضہ کی مثال یہ ہے کہ بغیر کسی قرینہ کے ہی شک میں مبتلاء ہو کر غیرت کرنے لگے، ایسے ہی تکبر اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہے تو پسندیدہ ہے ورنہ نہیں۔ اب اگر کوئی شخص کسی پر ظلم

کر کے تکبر کرتا ہے تو یہ نہایت ہی بری چیز ہے کیونکہ یہ اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہے۔
راوی کہتے ہیں کہ موسیٰ بن اسمٰعیل کی روایت میں لفظ بَغْيٌ کی جگہ لفظ فخر ہے یعنی دوسروں کو اسفل النسب اور حقیر سمجھے اور اپنے کو اشرف النسب سے تعبیر کرے۔ (بذل:۴/۷)

ترجمة الباب : فاحتيال الرجل نفسهٗ عند القتال سے ثابت ہورہا ہے۔

﴿بَابٌ في الرَّجُلِ يَسْتَاسِرُ﴾

یہ باب ایسے شخص کے بیان میں ہے جو اپنے آپ کو کفار کے ہاتھوں میں قیدی بنادے

۱۲ ﴿حَدَّثَنا موسى بن إسمعيل قال ثنا إبراهيمُ يعنى ابن سعيد قال أخبرنا ابن شهاب قال أخبرني عمرو بن جارية الثقفي حليف بني زُهرة عن أبي هريرة عَن النَّبِيّ صَلّى اللّٰه عليه وسلم قال: بعث رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عَشَرَةً عينًا و أَمَّرَ عَلَيهِم عَاصِمَ بْنَ ثابتٍ، فَنَفَرُوْا لهم هُزَيْلٌ بقريبٍ من مأةِ رجلٍ رامٍ، فلما أحسَّ بهم عاصمٌ لَجَاوُا إلى قَرْدَدٍ فَقَالُوْا: إنزلُوا فَاعْطُوا بأيديكم ولكم العَهْدُ والميثاقُ أن لا نَقْتُلَ منكم أحدًا فقال عاصِمُ: أمّا أنا فلا أنْزِلُ في ذِمَّةِ كافرٍ فرَمَوهم بالنَّبلِ، فقتلُوا عاصمًا في سبعةِ نفرٍ ونَزَلَ إليهم ثَلٰثَةُ نفرٍ على العَهْدِ والمِيثَاقِ مِنهُم خُبَيْبٌ و زَيْد بنُ الدَّثِنَة ورَجُلٌ آخرُ، فلمّا إستَمْكَنُوا مِنهُم أطْلَقُوا أوتارَ قِسِيِّهِم فربَطُوهم بِهَا قال الرَّجلُ الثالثُ: هذا اوّلُ الغَدْرِ واللّٰهِ لاَ أصْحَبُكُم إنْ لِيْ بهٰؤلاء لأسوةً، فَجرَّدَهٗ فَأَبٰى أن يَصْحَبَهم فَقتَلُوهٗ، فَلَبِثَ خُبَيْبٌ أسيرًا، حتى أجْمَعُوا قَتْلَهٗ، فاستَعَارَ موسٰى يَسْتَعِدُّ بِهَا، فلَمَّا خَرَجُوا بِهٖ لِيَقْتُلوهٗ قَالَ لَهُم خبيبٌ أرْكَعُ دَعُوْنِي رَكعَتَيْنِ ثم قَالَ: وَاللّٰهِ لَوْلَا أنْ تَحسبُوْنَ مَا بِيْ جَزَعًا لزِدْتُ. حدثنا ابنُ عَوْنٍ قال ثَنَا ابو اليمان أخبرنا شعيبٌ عَنْ الزُهْرِيّ قال أخبرني عَمروبنُ أبي سُفيَانَ بنِ أُسيدِ بْنِ جارِيةَ الثقفيُّ وهو حَلِيفٌ لِبَنِي زُهْرَةَ، وكانَ مِن أصحابِ أبي هريرةَ، فَذَكَرَ الحَدِيثَ﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس آدمیوں کو بھیجا اور حضرت عاصمؓ کو امیر مقرر کردیا، پس قبیلہٗ ہذیل کے تقریباً سو آدمی جو تیرانداز تھے ان سے لڑنے کے لیے نکلے، جب حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کو دیکھا تو ایک ٹیلہ پر چڑھ گئے (مگر کافروں نے ان کو گھیر لیا) کفار نے کہا کہ نیچے اتر

کر ہماری اطاعت کرو، ہم تم سے عہد کرتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کریں گے، حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے تو کافر کی پناہ میں اترنا پسند نہیں ہے، اس پر کافروں نے ان کو تیروں سے مارا اور مع حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کے کل سات افراد کو شہید کر دیا اور تین افراد کافروں کے عہد و اقرار پر نیچے اتر آئے، ان میں حضرت خبیبؓ، زید بن دثنہ اور ایک تیسرے شخص تھے (جن کا نام عبداللہ بن طارق تھا) جب یہ حضرات کفار کے قبضہ میں آ گئے تو ان کافروں نے اپنی کمانوں کے چلّے (تانت) کھول کر ان کو باندھنا شروع کیا تو ان میں سے تیسرے شخص نے کہا کہ یہ پہلی عہد شکنی ہے (یعنی تم نے تو اقرار کیا تھا کہ ہم قتل نہیں کریں گے تو پھر باندھ کیوں رہے ہو) خدا کی قسم میں تو تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا مجھے اپنے رفیقوں سے ملنا پسند ہے (یعنی جام شہادت مجھے محبوب ہے) کافروں نے ان کو کھینچنا چاہا لیکن انھوں نے بالکل انکار کر دیا کہ ان کے ساتھ (ایک قدم بھی) چلیں، چنانچہ ان کو بھی شہید کر دیا، اب حضرت خبیبؓ ان کے ساتھ میں قید رہے، جب کافروں نے ان کو بھی شہید کرنے کا ارادہ کر لیا تو حضرت خبیبؓ نے ایک استرہ مانگا تاکہ موئے زیر ناف صاف کر لیں (چونکہ محبوب حقیقی سے ملاقات کا وقت قریب ہے) جب کافر ان کو قتل کرنے کے لیے لے کر چلے تو حضرت خبیبؓ نے ان سے کہا کہ مجھ کو دو رکعت نماز کی مہلت دیدو (جب دو رکعتیں پڑھ لیں) تو کہا کہ اگر تم لوگ یہ گمان نہ کرتے کہ میں موت کے خوف سے نماز پڑھ رہا ہوں، تو میں اور زیادہ رکعتیں پڑھتا۔

حضرت عمرو بن ابی سفیان بن اسید بن جاریہ ثقفی جو بنی زہرہ کے حلیف تھے اور رسول اللہ ﷺ کے صحابی اور حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھی (مصاحب) تھے، انھوں نے بھی اسی طرح حدیث بیان کی ہے۔

تشریح مع تحقیق : فَنَفَرُوْا فعل ماضی صیغہ جمع غائب از باب (ض) بمعنی نفرت کرنا، ناپسند کرنا، لیکن جب اس کا صلہ ''الیٰ'' آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''دوڑنا'' اور جب اس کا صلہ 'لام' آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''چل پڑنا''، لہٰذا اس کے معنی یہاں ہونگے کہ وہ لوگ صحابہ سے لڑنے کے لیے چل پڑے۔ علامہ عینیؒ نے ''نَفروا'' بفتح الفاء پڑھا ہے جس کے معنی آتے ہیں غالب ہونا، بھگانا، تھکنا، تو اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ ''کفار صحابہ کو بھگانے نکلے'' یا خود تھکنے نکلے اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی پر حملہ کیا جائے تو تھکن آ ہی جاتی ہے۔

رَامٍ اسم فاعل کا صیغہ ہے از باب (ض، افعال) بمعنی تیر پھینکنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ سب تیر انداز تھے۔

قردد سخت اور بلند جگہ اس کی جمع ''قرادِدُ'' آتی ہے۔

اِستَمْكَنُوا صیغہ جمع مذکر غائب از باب (استفعال) اور اس کا صلہ ''مِنْ'' آتا ہے بمعنی قادر ہونا، فتح مند ہونا۔

موسیٰ ج مَوَاسِیْ و مُوْسِيَات بمعنی استرا۔

جنگ احد کے بعد ماہ صفر کی ابتدار میں عضل وقارہ (قبیلے ہیں) کے چند لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ آئے اور کہا کہ کچھ لوگ ہماری قوم میں مسلمان ہوئے ہیں، اس لیے آپ ﷺ کچھ آدمی بھیج دیجیے جو ان کو دین کی باتیں بتلائیں اور قرآن کی تعلیم دیں، چنانچہ حضور ﷺ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے ساتھ بھیج دیا، جب یہ لوگ مقام رجیع میں پہنچے تو ان لوگوں نے غدر کیا اور صحابہ کو گھیر لیا، صحابہ لڑنے کے لیے مستعد ہوگئے، مگر انھوں نے کہا کہ ہم تم کو قتل نہیں کریں گے۔ صرف اہل مکہ سے کچھ مال لینا چاہتے ہیں، تم خود ہمارے ساتھ آجاؤ، ہم خدا کو درمیان میں دے کر عہد کرتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو بھی قتل نہیں کریں گے، لیکن اس کے باوجود بھی ان کم بختوں نے سات صحابہ کو قتل کر دیا، اور تین ان کے امان میں آگئے، پھر ان تینوں کو باندھنا شروع کیا تو اسی وقت حضرت عبداللہ بن طارق ؓ نے کہا کہ یہ پہلی عہد شکنی ہے اور یہ کہہ کر اپنی تلوار نکال لی مگر کفار نے دور سے پتھر مار کر شہید کر دیا اور وہیں ان کو دفن کر دیا۔ حضرت خبیب ؓ اور زید بن دثنہ ؓ کو مکہ لے گئے اور قریش کے پاس ہذیل کے دو قیدی تھے ان کے بدلے ان کو بیچ دیا، حُجیر بن اہاب ؓ نے حضرت خبیب ؓ کو عقبہ بن حارث بن عامر کے لیے خریدا، تا کہ حارث کے بدلے ان کو قتل کرے، کیونکہ غزوۂ بدر میں حضرت خبیب ؓ نے حارث کو قتل کیا تھا، اور زید ابن دثنہ ؓ کو صفوان ابن امیہ نے خریدا تا کہ اپنے والد امیہ کے بدلے قتل کرے، جب زید بن دثنہ کو قتل کرنے لگے تو انھوں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم کو چھوڑ دیا جائے اور تمہاری جگہ "نعوذ باللہ" محمد ﷺ کی گردن اڑا دی جائے، حضرت زید ؓ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! ہمیں یہ بھی پسند نہیں ہے کہ ہم اپنے اہل میں آزاد ہوں اور حضور ﷺ کو اپنی جگہ ایک کانٹا بھی لگ جائے، اس وقت ابو سفیان نے کہا کہ میں نے ایسا محب کسی کو کسی کا نہیں دیکھا جیسا کہ محمد ﷺ کے اصحاب محمد ﷺ سے محبت کرتے ہیں، پھر نسطاس نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ انا للّٰه و انا إليه راجعون .

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ قید میں رہے اور پورا واقعہ پیش آیا جو حدیث شریف میں مذکور ہے کہ جب ان کو سولی دینے کے لیے حرم سے باہر لایا گیا تو انھوں نے اجازت لے کر بڑے خشوع و خضوع سے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر تم یہ نہ سمجھتے کہ میں موت کے ڈر سے نماز پڑھ رہا ہوں تو اور زیادہ نماز پڑھتا۔ (یا لمبی نماز پڑھتا) اس کے بعد حضرت خبیب ؓ نے اللہ سے دعا کی اَللّٰهم أحصهم عددًا = واقتلهُم بددًا = ولا تغادر منهم أحدًا اور چند اشعار پڑھے۔ ابن ہشام نے ان کو نقل کیا ہے ان میں سے دو شعر امام بخاری ؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیے ہیں وہی دونوں شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

وَلَسْتُ أبالِي حِيْنَ أُقتلُ مُسلِمًا ۔۔۔ عَلى أيِّ شِقٍّ كانَ في اللّٰه مَضْجَعِي

وَذلكَ في ذات الإلٰـهِ وإنْ يشأ ۔۔۔ يُبَـارِكْ على أوْصَالِ شلوٍ ممـزوع

اس کے بعد کفار نے اس پیکر رضا و صبر کو سولی پر چڑھایا اور نگرانی کے لیے ایک نگہبان مقرر کر دیا مگر کسی طرح

رات کے وقت حضرت عمرو بن امیہؓ ان کی نعش کو لے گئے اور دفن کر دیا۔ (اصح السیر: ۱۱۶)

اشکال اول

ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ چھ آدمیوں کو بھیجا اور مرثد بن ابوالمرثدؓ کو امیر مقرر فرمایا۔ اور بخاری وابوداؤد کی روایت میں ہے کہ دس آدمیوں کو بھیجا اور عاصم بن ثابتؓ کو امیر مقرر فرمایا: بظاہر یہ تعارض ہے؟

جواب

دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سات یا چھ آدمی اصل تھے اور تین یا چار آدمی خادم کی حیثیت سے تھے اور اصح یہی ہے کہ حضرت عاصمؓ کو امیر مقرر فرمایا تھا۔ (بذل المجہود: ۴/۷)

اشکال ثانی

ابوداؤد شریف کی اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ قبیلہ ہذیل کے سو آدمیوں نے صحابہ کو گرفتار کیا تھا، لیکن بخاری شریف، ج:۱، ص: ۴۲۷ پر روایت میں مذکور ہے کہ قبیلہ ہذیل کے دوسو آدمی صحابہ کو گرفتار کرنے کے لیے نکلے، اب دونوں روایتوں میں تعارض ہوا۔

جواب

اس تعارض کا دفعیہ یہ ہے کہ ابوداؤد شریف میں صرف بالفعل تیراندازوں کا ذکر ہے اور بخاری شریف میں مکمل تعداد کا ذکر ہے، جن میں سو تیرانداز تھے اور سو تیر لا لا کر دے رہے تھے، ان سو کو بھی تیر لانے کی وجہ سے تیر اندازوں میں شمار کر لیا گیا اور کل تعداد دوسو بتلا دی گئی۔ ابوداؤد شریف میں ان سو معاونین کا ذکر نہیں ہے۔ (بذل المجہود ۴/۷ وتقریر حضرت الاستاذ شیخ نصیر خاں صاحب مدظلہ العالی)

مسلمان کا کفار کے ہاتھوں قیدی بننا

حدیث باب سے صاف صراحت ہوتی ہے کہ مسلمان کافروں کے ہاتھ میں قیدی بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت خبیب اور حضرت زیدؓ نے کیا، اور یہ بھی اختیار ہے کہ قید گوارہ نہ کرے اور اسلام کے نام پر قربان ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اگر مغلوب ہونے کا خوف ہو تو قیدی بن جائے اور اگر غالب ہونے کا یقین ہو تو قید کو گوارہ نہ کرے، امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ قیدی بننا مکروہ ہے، مگر یہ کہ بالکل مجبور ہو جائے۔ (بذل: ۴/۸)

ترجمۃ الباب: نزل الیھم ثلثة نفر منھم خبیب و زید بن دثنه ورجل آخر الخ سے ثابت ہے۔

﴿باب في الكُمناء﴾

یہ باب کمین گاہوں میں بیٹھنے والوں کے بیان میں ہے

۱۳ ﴿حدَّثنا عبدُ اللهِ بنُ محمدّ النُفَيْلِيُّ نا زُهَيْرٌ قالَ ثنا أبو إسحٰق قالَ سمعتُ البَرَاءَ يُحدِّثُ قال: جَعَلَ رسولُ الله صلّى الله عليه وسلّم عَلَى الرّمَاةِ يومَ أحدٍ وكانوا خمسين رَجُلاً عبدَ الله بنَ جُبَيرٍ، وَقَالَ إنْ رأيتُمُونَا تَخطَفُنَا الطَيْرُ فلا تَبرحُوا مِنْ مكانِكم هذا، حَتّٰى أُرسِلَ إلَيكُم، وإنْ رأيتمونَا هَزَمْنَا القَوْمَ و أَوْطَانَهُمْ فَلَا تَبرحُوا حَتّٰى أُرسِلَ إلَيكُم ، قَالَ: فَهزَمَهُم اللّٰهُ، قالَ فإذَا واللّٰهِ رأيتُ النِسَاءَ يُسْنِدْنَ عَلَى الجَبَلِ فقالَ أصحابُ عَبْدِ الله بنِ جبيرٍ: الغنيمةُ، ظَهَرَ أصحابُكم فما تَنتَظِرُوْنَ؟ فَقَالَ عبدُ اللّٰهِ بنِ جُبَيْرٍ: أَنَسِيتُمْ ما قَالَ لكُم رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ؟ فقالَ وَاللّٰهِ لنَأتِيَنَّ الناسَ فَلَنُصِيبَنَّ مِنَ الغَنِيمةِ، فَأَتَوهم فصُرِفَتْ وُجُوهُهُمْ واقبلوا مُنْهَزِمِيْنَ﴾

ترجمہ: حضرت برار بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ احد میں سب تیر اندازوں کا جو پچاس نفر تھے، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو امیر مقرر فرمادیا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم ہم کو دیکھو کہ پرندے ہم پر اچک رہے ہیں (یعنی ہم مارے جائیں اور پرندے ہمارا گوشت نوچنے لگیں) جب بھی اپنی جگہ سے مت ہٹنا یہاں تک کہ تم بلائے جاؤ، اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے کافروں کو شکست دیدی ہے اور ان کو روند ڈالا ہے پھر بھی بلائے جانے تک اپنی جگہ سے مت ہٹنا۔ راوی کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کافروں کو شکست دی اور میں مشرکین کی عورتوں کو پہاڑ پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا (وہ بھاگنے لگی تھیں) حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے ساتھیوں نے کہا کہ غنیمت لوٹو، تمہارے آدمی یعنی مسلمان غالب آگئے ہیں اب تمہیں کس چیز کا انتظار ہے؟ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات کو بھول گئے جس کو رسول اللہ ﷺ نے تم سے فرمایا تھا، انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم تو جائیں گے اور غنیمت سے حصہ لیں گے، چنانچہ وہ گئے تو اللہ نے ان کے چہروں کو پھیر دیا اور وہ شکست خوردہ ہو کر واپس ہوئے۔

تشریح مع تحقیق: کُمناء کمینؔ کی جمع ہے اور کمین سے مراد وہ شخص ہے جو دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے چھپے۔

تَخطَفُنا واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے از باب (س) بمعنی اچک لینا، چھین لینا۔

اُوطانَهم جمع متکلم کا صیغہ ہے از باب (س) بمعنی روندنا، کچلنا۔
یُسندن جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے از باب (افعال) بمعنی چڑھنا۔
جعل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الخ جَعَلَ : فعل، رسول اللہ ﷺ: فاعل، عبداللہ بن جبیرؓ: مفعول بہ اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔
ای قوم الغنیمة : ای: حرف ندا، قوم: مضاف "ی" ضمیر متکلم کی تھی جس کو تخفیف کی وجہ سے گرادیا گیا ہے، گویا اب تقدیری عبارت یہ ہوئی: "یآقومي احضرو الغنیمة"
اس حدیث میں جنگ احد کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ نے احد کے دن پچاس تیراندازوں کو ایک پہاڑ پر بھیج دیا کہ تم اس پر رہنا اور حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو ان کا امیر مقرر کردیا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ دشمن کو اس طرف آنے سے روکو اور فوج کی جو بھی حالت ہو اس سے تم کو کوئی سروکار نہیں۔ جب دن کے اول حصہ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کفار شکست خوردہ ہوئے تو ان پچاس صحابہ میں سے کچھ نے کہا کہ اب تو فتح ہوگئی ہے لہٰذا غنیمت کو اکٹھا کیا جائے، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو روکا، مگر انھوں نے اس کا خیال نہیں کیا اور نیچے اتر آئے۔
جب قریش نے اس مقام کو تیراندازوں سے خالی دیکھا تو اس طرف سے اچانک حملہ کردیا اور مسلمان درمیان میں آگئے یہاں تک کہ ستر صحابہ شہید ہوئے اور حضور ﷺ کا چہرۂ انور زخمی ہوا اور "لوہے کی خود" آپ ﷺ کے سر مبارک میں اس طرح گڑ گئی کہ نشان ظاہر ہوگئے اس کے بعد مسلمان پلٹے اور دوبارہ فتح حاصل ہوئی۔ (اصح السیر مختصر:۱۰۴)

مسلمانوں کی شکست کے اسباب

(۱) آپ ﷺ کی نافرمانی (۲) مال کی حرص۔

ترجمة الباب : کفار نے مسلمانوں پر پیچھے سے چھپ کر حملہ کیا تھا جس سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے

﴿بَابٌ في الصفوف﴾

یہ باب جنگ کے وقت صفوں کو سیدھا کرنے کے بیان میں ہے

۱۴ ﴿حَدَّثنا أحمدُ بنُ سِنَانٍ ثنا أبو أحمدُ الزُّبَيْرِيُّ قَالَ ثَنا عبدُ الرحمٰن بنُ سُلَيمانَ ابنِ الغَسِيلِ عَنْ حَمزَةَ بنِ اَبِي اُسَيدٍ عَنْ اَبِيهِ قَالَ قال رسولُ اللّٰه ﷺ حِينَ اصْطَفَفْنَا يَومَ بَدْرٍ: إذَا اكثَبُوكُم يَعْنِي إذا غَشَوكُم فَارمُوهُم بالنَّبلِ واستَبقُوا نَبلَكُم﴾

ترجمه: حضرت حمزہ بن ابی اسیدؓ اپنے والد ابی اسید (مالک بن ربیعہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم نے بدر کے دن صف بندی کی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب وہ (مشرکین) تمہارے قریب ہو جائیں تو ان کو تیروں سے مارو (اور جب وہ دور ہوں) تو اپنے تیروں کو باقی رکھو۔

تشریح مع تحقیق: اصْطَفَفْنَا جمع متکلم کا صیغہ ہے از باب افتعال بمعنی صفوں میں کھڑا ہونا۔

اکثبُوکُم جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے از باب افعال بمعنی قریب ہونا۔

نَبلٌ ج نِبال ، أنبال، نُبلان بمعنی تیر۔

اس روایت میں جنگ بدر کے دن کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے صحابہ کی صف بندی فرمائی تو آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ دور سے تیروں کو مت پھینکنا، اس لیے کہ اگر دور سے تیروں کو پھینکا جائے گا تو اصل مقصد حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ تیر پھینکنے کا اصل مقصد دشمن کو زد پہنچانا ہے۔

بعض حضرات نے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ دور سے پتھر پھینکو، اور جب کچھ قریب ہو جاؤ تو تیر پھینکو اور جب دشمن کے بالکل قریب ہو جاؤ تو تلوار چلاؤ، یہاں پر روایت کو لاکر صف بندی کو بتلایا ہے، جس کی تعریف قرآن کریم میں بھی کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: یقاتلون فی سبیل اللہ صفا کأنهم بنیان مرصوص الخ نیز صف بندی قتال میں بیحد معین ومددگار ہے۔

ترجمة الباب: حین اصطففنا سے ثابت ہو رہا ہے۔

عبدالرحمٰن بن سلیمان بن غسیل

عبدالرحمٰن کے پردادا حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا لقب غسیل ہے، اس لیے کہ یہ جنگ احد میں حالت جنابت میں شریک ہوئے اور شہید ہو گئے، تو فرشتوں نے ان کو غسل دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کو غسیل الملائکہ کہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن سلیمان کی نسبت پردادا کی طرف کی جاتی ہے اور یہ ابن غسیل کے نام سے مشہور ہیں، متکلم فیہ ہیں امام ابوزرعہ رازی، دارقطنی اور ابن معین نے حضرت عباسؓ کی روایت میں ان کو ثقہ کہا ہے، نیز امام نسائیؒ نے ایک روایت میں ثقہ کہا ہے اور دوسری روایت میں "لیس به بأس" کہا ہے اور تیسری روایت میں "لیس بالقوی" کہا ہے۔ امام احمدؒ نے "صالح" کہا ہے، ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور مجروحین میں بھی ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بہت خطاء اور وہم کرتے ہیں اور قول فیصل کے طور پر یہ کہا ہے کہ میری طبیعت کا میلان یہ ہے کہ جن روایات میں ثقہ کی مخالفت کریں ان کو چھوڑ دیا جائے اور جن روایات میں ثقہ کی موافقت کریں ان کو قابل استدلال مانا جائے گا۔ (تحریر تقریب التہذیب للحافظ: ۲/۳۲۳، بذل: ۴/۸)

﴿ بَابٌ في سلّ السيوف عند اللقاء ﴾

یہ باب دشمن سے مقابلہ کے وقت تلواریں نکالنے کے بیان میں ہے

۱۵ ﴿حَدَّثَنا مُحمد بنُ عيسىٰ قال ثنا إسحٰقُ بنُ نَجِيحٍ - وَلَيسَ بالمُلطِيِّ - عَنْ مالِكِ بنِ حَمزةَ بنِ أبي أُسَيْدٍ السَاعِدِيِّ عَنْ أبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قال رسولُ اللّٰه ﷺ يَومَ بَدْرٍ: إِذَا اكْثَبُوكُم فارْمُوْا بِالنَبْلِ وَلا تَسلُّوا السيوفَ حَتّٰى غَشُوكُمْ﴾

ترجمہ: حضرت ابواسید ساعدی اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بدر کے دن فرمایا کہ جب کفار تمہارے قریب آجائیں تو ان کو تیر سے مارو اور جب تک وہ تم سے نہ مل جائیں تب تک اپنی تلواریں مت سونتو۔

تشریح مع تحقیق: تسلّوا امر حاضر کا صیغہ ہے از باب (ن) بمعنی کسی چیز میں سے کوئی چیز آہستہ آہستہ نکالنا، بولا جاتا ہے فلان سل السیف فلاں نے تلوار نکال لی۔

اس روایت میں تلوار کے استعمال کے وقت کو بتلایا گیا ہے کہ جب دشمن بالکل قریب ہوجائیں تو تلواروں کو میان سے نکال لو اور اگر دور ہوں تو پتھروں سے اور اگر کچھ دور ہوں تو یعنی نہ زیادہ قریب ہوں اور نہ زیادہ دور ہوں تو تیروں سے حملہ کرو (کما مر فیما مضیٰ)

اسحق بن نجیح

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ اسحٰق بن نجیح نام کے دو شخص ہیں، ایک ملطی سے مشہور ہیں، لیکن وہ ضعیف اور متروک ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ لوگوں نے اسحٰق بن نجیح ملطی کی تکذیب کی ہے۔ لہٰذا یہاں پر ملطی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ اسحٰق بن نجیح مراد ہیں لیکن یہ بھی مجہول ہیں۔ (تحریر تقریب التہذیب:۱/۱۲۴، بذل المجہود:۹/۴)

ترجمۃ الباب: ولا تسلو السیوف حتی غشوکم سے ثابت ہے۔

﴿ بَابٌ في المبازرة ﴾

یہ باب مدمقابل سے مقابلہ کرنے کے بیان میں ہے

(یعنی اس شخص سے مقابلہ جو صف سے باہر آجائے)

۱۶ ﴿حَدَّثَنا هارونُ بنُ عبدِ اللّٰهِ ثَنا عثمانُ بنُ عُمَرَ ثَنا إسرائيلُ عَن أبي اسحٰقَ عَنْ

حارِثَةَ بنِ مُضَرِّبٍ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: تَقَدَّمَ يَعْني عتبةَ بنَ رَبِيْعَةَ وتَبِعَهُ ابْنُهُ وَأخُوهُ فنَادَى مَنْ يُبَارِزُ؟ فَانْتَدَبَ لَهُ شَبَابٌ مِنَ الأنْصَارِ، فقَالَ مَنْ أنْتُم ؟ فَأخبَرُوهُ، فَقَالَ: لَا حَاجَةَ لَنَا فِيكُمْ إنَّما أرَدْنَا بَنِي عَمِّنَا ، فقَالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم : قُمْ يا حمزةُ؟ قُمْ يا عليُّ ؟ قُمْ يا عُبيدةُ بن الحارث ؟ فَأقبَلَ حمزةُ إلى عُتْبَةَ، وَأقْبَلْتُ إلىٰ شَيْبَةَ واختَلَفَ بَيْنَ عُبيدةَ وَالوَلِيدِ ضَرْبَتَانِ ، فَأثْخَنَ كُلُّ واحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ ثم مِلْنا عَلَى الوليدِ فَقَتَلْنَاهُ وَاحتَمَلنَا عُبَيْدَةَ﴾

ترجمه: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ عتبہ بن ربیعہ آگے بڑھا اور پیچھے سے اس کا بیٹا اور بھائی آیا، پھر اعلان کیا کہ کون ہے؟ جو میدان میں لڑنے کے لیے نکلے، انصار کے چند نوجوان صف سے میدان میں لڑنے کے لیے نکلے، عتبہ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انصار کے جوانوں نے اس کو اپنا پتہ بتلایا۔ اس نے سن کر کہا کہ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے ہم تو صرف اپنے چچا کی اولاد سے لڑنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے حمزہ! کھڑے ہوؤ اور اے علی! کھڑے ہوؤ اور اے عبیدہ بن الحارث! کھڑے ہوؤ، تو حضرت حمزہؓ عتبہ کی طرف اور میں شیبہ کی طرف متوجہ ہوا۔ عبیدہ اور ولید کی آپس میں چوٹیں ہوئیں، ہر ایک نے دوسرے کو زخمی کر دیا، پھر (جب ہم دونوں نے عتبہ اور شیبہ کو قتل کر دیا تو) ہم دونوں نے ولید پر حملہ کر کے اس کو مار ڈالا اور عبیدہ کو میدان جنگ سے اٹھالائے۔

تشریح مع تحقیق: مبارزة از باب مفاعلت بمعنی مقابلہ کرنا۔

فأثخن: أثخن فی الأمر إثخاناً۔ مبالغہ کرنا، أثخن فی الأرض : خونریزی کرنا۔

اس روایت میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے جس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھئے ''تکملہ فتح الملہم :۳/۱۶۴، اصح السیر :۸۴تا۹۸'' یہاں چند علمی بحثوں کو نقل کیا جاتا ہے۔

اشکال

باب کی مذکورہ روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''شیبہ'' کو قتل کیا ہے اور سیر کی کتابوں میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''ولید'' کو قتل کیا ہے بظاہر تعارض ہوا؟

جواب

اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بخاری شریف، ج:۲، ص:۵۶۵ کے حاشیہ میں قسطلانی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو اور حضرت علیؓ نے ولید کو قتل کیا ہے اور پھر دونوں نے عتبہ کو (جو کہ حضرت

عبیدہؓ کے مقابلہ میں تھا) قتل کیا، لیکن سند کے اعتبار سے ابوداؤد کی روایت اصح ہے اور حال کے اعتبار سے قسطلانی کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حضرت عبیدہؓ اور شیبہ دونوں بوڑھے تھے، جیسا کہ عتبہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ، چاروں جوان تھے، تو مناسب یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ولید بن عتبہ سے ہوا ہو۔ (حاشیہ بخاری: ۲/ ۵۶۵)

مبارزت کی شرعی حیثیت

مبارزت یعنی مقابلہ کے جواز پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے البتہ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ امام کی اجازت ضروری ہے جمہور کے نزدیک امام کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے۔ (بذل: ۴/ ۹) نیز جمہور علماء کے نزدیک مبارز کی مدد کرنا بھی جائز ہے۔

ترجمة الباب: حدیث پاک ترجمۃ الباب کے بالکل مناسب ہے، اس لیے کہ حضرت حمزہ، علی اور عبیدہ رضی اللہ عنہم تینوں حضرات مقابلہ کے لیے صف سے باہر نکلے۔

﴿ بَاب النهي عن المثلة ﴾

یہ باب مثلہ بنانے کی ممانعت کے بیان میں ہے

(ناک، کان اور ہاتھ، پاؤں وغیرہ کے کاٹنے کی ممانعت)

۱۷ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ عيسى وَ زِيادُ بنُ أيُّوبَ قَالاَ نا حميدٌ قال أنَا مغيرةُ عَنْ شِبَّاكٍ عَنْ إبْرَاهِيمَ عَنْ هُنَيِّ بنِ نُوَيْرَةَ عَنْ عَلقَمةَ عَن عبدِ اللّه قال قال رسولُ اللّه صلّى اللّه عليه وسلم : أعَفّ النَّاسِ قِتْلَةً أهلُ الإيْمَانِ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان والے بہتر قتل کرنے والے لوگ ہیں۔

تشریح مع تحقیق : مثلة : ناک کان کاٹنا، سزا، عذاب۔ ج مَثُلات ہے۔

أعف اسم تفضیل از باب (ض) حرام یا غیر مستحسن سے رکنا۔

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ جب مؤمنین قتل کرتے ہیں تو بری طرح قتل نہیں کرتے کہ مقتول کے ناک، کان اور دیگر اعضاء کو الگ الگ کردیں، بلکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے مطابق قتل کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم اچھی طرح قتل کرو یعنی (یکبارگی میں ہی قتل کردو) اور جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو (یعنی چھری کو

تیز کرو اور جلدی سے ذبح کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے قلوب میں شفقت رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ قتل میں حد سے تجاوز نہیں کرتے ہیں اور کفار بری طرح سے قتل کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مثلہ بنا دیتے ہیں جیسا کہ حضرت حمزہؓ کے ساتھ کیا۔ روایت کا مطلب تو فقط اتنا ہی ہے۔

اَعفُّ الناسِ قِتْلَةً اهلُ الإيمان الخ کی نحوی ترکیب: اعف : اسم تفضیل مضاف، الناس : مضاف الیہ، مضاف اپنے مضاف الیہ سے ملکر ممیز ہوا، قتلةً : تمیز، ممیز تمیز سے ملکر مبتدا ہوا، اَهل : مضاف، الایمان: مضاف الیہ، مضاف اپنے مضاف الیہ سے ملکر خبر؛ مبتدا، خبر سے ملکر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

مثلہ کا شرعی حکم

صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ جب تک دشمنوں پر کامیابی اور غلبہ حاصل نہ ہو تو مثلہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ مقابلہ کے لیے کوئی شخص نکلے اور اس نے اپنے مقابل کا کان کاٹ دیا پھر ہاتھ کاٹ دیا پھر ناک کاٹ دی وغیرہ۔

اور جب کفار پر غلبہ حاصل ہو جائے تو مثلہ کرنا جائز نہیں ہے، اسی کو شامی نے بھی نقل کیا ہے۔ (بذل:۱۰)

قصاص میں مثلہ کا حکم

اس مسئلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس لیے کہ ائمہ ثلثہ فرماتے ہیں کہ قصاص بالمثل لیا جائے گا، لہٰذا اگر کوئی کسی کا مثلہ بنا دے تو قصاصاً اس کو بھی مثلہ بنایا جائے گا۔ اور حنفیہ کے نزدیک قصاص بالمثل نہیں ہے، لہٰذا قصاص میں مثلہ بنانا جائز نہیں ہوگا۔

ائمہ ثلثہ کی دلیل

(۱) فإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به الخ.

(۲) جزاء سيئة سيئةٌ مثلها .

(۳) حدیث عرینہ، کہ حضور ﷺ نے ان لوگوں کا مثلہ بنایا تھا۔

فریق ثانی کے دلائل

(۱) النفس بالنفس الخ اس آیت میں نفس جان لینے میں مماثلت مطلوب ہے، نہ کہ جان لینے کے طریقہ میں مماثلت مطلوب ہے۔

(۲) حدیث باب اور تمام وہ احادیث جن میں آپ ﷺ نے مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔

فریق اول کے دلائل کا جواب

آیات کریمہ کا جواب تو یہی ہے کہ یہاں نفس جان لینے میں مماثلت مراد ہے۔

حدیث عرینہ کے چار جواب

(۱) ان لوگوں کا مثلہ ان کے جرم عظیم کی وجہ سے بنایا گیا تھا، اس لیے کہ اول تو یہ قبیلہ عرینہ کے لوگ مرتد ہوئے پھر حضور ﷺ کے چرواہے کو قتل کر دیا اور حضور ﷺ کے اونٹوں کو لوٹ کر لے گئے، ان تمام جرائم کی وجہ سے ان ملعونوں کے ساتھ ایسا کیا گیا تھا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اب بھی بہت نرمی کا برتاؤ کیا ورنہ یہ لوگ تو اس سزا سے بھی زیادہ کے مستحق تھے، لہٰذا اس روایت سے مثلہ کے ثبوت پر استدلال کرنا کافی نہ ہوگا۔

(۲) یہ حدیث تعزیر اور سیاست پر محمول ہے، لہٰذا سیاسۃ اور تعزیراً ایسا کرنا اب بھی جائز ہے۔

(۳) حدیث عرینہ منسوخ ہے اور ناسخ مثلہ سے ممانعت کی احادیث ہیں، اور ایک حدیث ترمذی شریف میں ہے کہ یہ حدیث حدود کے نزول سے پہلے کی ہے، لہٰذا منسوخ ہے۔ (تکملہ فتح الملہم ۲/۳۰۷)

(۴) صاحب بذل نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ جب محرم و مبیح میں تعارض ہو جائے تو محرم مقدم ہوگی۔ (بذل المجہود: ۴/۱۰ او قواعد الفقہ، ص: ۵۵)

اشکال

اشکال یہ ہے کہ بعض مرتبہ ایک شخص کئی جرم کر لیتا ہے مثلاً: اُس نے زید کا ہاتھ کاٹ دیا، حامد کی ناک کاٹ دی اور بکر کا ہاتھ کاٹ دیا وغیرہ۔ اب جب اس سے قصاص لیا جاتا ہے تو زید کے ہاتھ کے بدلے اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، جب اس کا زخم ٹھیک ہو جائے تو حامد کی ناک کے بدلے اس کی ناک کاٹی جاتی ہے الخ تو یہ صورت بظاہر مثلہ ہے؟

جواب

یہ مثلہ ضمناً ہوا ہے نہ کہ حقیقتاً اور قصداً، لہٰذا ممانعت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایسے ہی اگر کوئی مسلمان کسی کافر سے مقابلہ کے لیے میدان میں آئے اور کافر پر حملہ کر کے پہلے تو اس کے ہاتھ کو کاٹ دیا پھر کان کاٹ دیا اور پھر قتل کر ڈالا، تو بھی ممانعت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بذل: ۱۰)

ترجمة الباب: حدیث باب سے ضمناً ترجمہ ثابت ہو رہا ہے اس لیے کہ آپ ﷺ اس حدیث پاک سے مثلہ کی ممانعت ہی مسلمانوں کی تعریف کے انداز میں بیان فرما رہے ہیں۔

۱۸ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ المثنّى ثَنا معاذُ بنُ هشَام قَالَ ثَنِي أَبِيْ عَنْ قَتَادَةَ عَنِ الحَسَنِ عَنُ الهَيَّاجِ بنِ عِمُرَانَ أَنَّ عمرانَ أبقَ لهُ غُلامٌ، فَجَعلَ لِلّٰهِ عَلَيهِ لَئِنُ قَدَرَ عَلَيهِ ليَقُطَعَنَّ يَدَهُ، فَأرسَلَنِيْ لِأَسُئَلَ لهُ؛ فأتَيتُ سَمُرَةَ بنَ جُندُبٍ فَسَألتُهُ فقَالَ: كَانَ رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسَلَّم يَحُثُنَا عَلى الصَّدَقَةِ و يَنُهَانَا عَنِ المُثُلَةِ، فَأتَيتُ عِمُرانَ بنَ حُصَينٍ فَسَألتُهُ، فقَالَ كانَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ يَحُثُنَا عَلَى الصَّدَقَةِ ويَنُهَانَا عَنِ المُثلَةِ﴾

ترجمه: حضرت ہیاج بن عمرانؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمران کا ایک غلام بھاگ گیا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ نذر مانی کہ اگر میں نے اس کو پکڑ لیا تو اس کے ہاتھ کو کاٹ ڈالوں گا، (اس کے بعد عمران نے اپنے بیٹے ہیاج کو حضرت سمرۃ بن جندب کے پاس بھیجا تا کہ اس مسئلہ کے بارے میں ان سے دریافت کریں) پھر عمران نے مجھ کو حضرت سمرہ بن جندب کے پاس مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا چنانچہ میں نے حضرت سمرہ بن جندبؓ سے پوچھا تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ حضور ﷺ تو ہم کو صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور مثلہ سے منع فرماتے تھے۔ (ہیاج بن عمران کہتے ہیں کہ) پھر میں (مزید تحقیق کے لیے) عمران بن حصین کے پاس حاضر ہوا اور ان سے (بھی) سوال کیا تو انھوں نے (بھی) جواب میں فرمایا کہ حضور ﷺ ہم کو صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے اور مثلہ سے منع کرتے تھے۔

تشریح مع تحقیق: روایت مذکورہ میں حضرت عمرانؓ کا واقعہ مذکور ہوا ہے اِن کے بیٹے ہیاج کہتے ہیں کہ میرے والد کا ایک غلام فرار ہوگیا تو انھوں نے یہ قسم کھالی کہ اگر وہ غلام ہاتھ آ گیا تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا، مطلب یہ تھا کہ مثلہ بنادوں گا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کے دل کو آئینہ بنایا ہے، جس سے اچھے برے کو فوراً پہچان لیتا ہے، لہٰذا اسی وقت یہ خیال ہوا کہ نذر کا پورا کرنا ضروری ہے اور اگر نذر پوری کروں تو دوسرے کو ضرر شدید پہنچے گا، چنانچہ مسئلہ کی تحقیق کے لیے ہیاج کو حضرت سمرہؓ کی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے حضور ﷺ کی یہ حدیث پاک سنائی، اس کے بعد مزید توثیق کے لیے یہ حضرت عمران بن حصین کے پاس گئے تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ باقی تفصیل جو مسائل سے متعلق ہے ماقبل کی حدیث کے ذیل میں گذر چکی ہے۔ فارجع إليه .

ترجمة الباب: ينهانا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن المثلة سے ثابت ہے۔

ہیاج بن عمران

یہ راوی متکلم فیہ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ان کو مقبول کہا ہے۔ (تحریر تقریب التہذیب: ۵۰/۴) اور ابن حبان نے اپنی ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جس کو ابن حبان اپنی ثقات میں ذکر کردیں، تو ذکر کرنا ہی اس راوی کی توثیق ہے، لیکن علی بن مدینی نے ان کو مجہول کہا ہے، ابن سعدؒ نے کہا ہے کہ ثقہ ہیں لیکن قلیل الحدیث ہیں۔ (بذل المجہود: ۹/۴)

﴿بَابٌ في قتل النساء﴾

یہ باب عورتوں کو قتل کرنے (سے روکنے) کے بیان میں ہے

۱۹ ﴿حَدَّثَنا يَزِيْدُ بنُ خالدِ بنِ مَوْهَبٍ وقتيبةُ يَعْني ابنَ سَعِيْدٍ قَالاَ ثَنا اللَّيْثُ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّه أَنَّ إمرأةً وُجِدَتْ فِيْ بَعْضِ مَغَازِيْ رسولِ اللّه صلّى اللّه عليه وسلّم مقتولةً فأنكر رسول اللّه صلى اللّه عليه وسلم قتلَ النساء والصبيان﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے کسی جنگ میں ایک عورت کو مقتول دیکھ کر عورتوں اور بچوں کے قتل کرنے سے منع فرمادیا۔

تشریح: علامہ طبرانیؒ نے اپنی کتاب ''اوسط'' میں یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے اور اسی قول کو حافظ ابن حجرؒ نے ''فتح الباری'' میں بیان کرتے ہوئے آنے والی روایت کو دلیل میں پیش کیا ہے وہ روایت یہ ہے کہ جس غزوہ میں یہ عورت قتل کی گئی ہے اس کے امیر خالد بن ولیدؓ تھے۔ اور دوسری احادیث وتاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ صرف فتح مکہ کے موقع پر امیر لشکر بنائے گئے ہیں اس سے پہلے کبھی امیر نہیں بنائے گئے، تو معلوم یہ ہوا کہ یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے۔ (فتح الباری: ۶/۹۰، نیز بذل المجہود: ۴/۱۰، تکملہ فتح الملہم: ۳/۳۸)

لطیفہ: اسلام کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے صنف نازک، بچوں اور بوڑھوں کے قتل پر پابندی عائد کی ہے، اسلام سے پہلے لوگ جنگوں میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا کرتے تھے اور آج کے دشمنانِ اسلام بھی اس صنف نازک کے ساتھ انتہائی بربریت کا ننگا ناچ ناچ رہے ہیں۔

ترجمة الباب: فانكر رسول الله صلى الله عليه وسلم قتل النساء والصبيان سے ثابت ہے۔

۲۰ ﴿حَدَّثَنا أبو الوَلِيْدِ الطَّيَالِسِي قَالَ ثَنا عُمر بنُ المرقَّعِ بنِ صَيْفِي بن رَبَاحٍ قَالَ ثني أَبِيْ عَنْ جدِّهِ رَبَاحِ بنِ رَبِيْعٍ قَالَ كُنّا مَعَ رسولِ اللّه صلى اللّه عليه وسلم في غَزْوَةٍ، فَرأىٰ النَّاسَ مُجْتَمعِيْنَ عَلَى شَيْءٍ فَبَعَثَ رَجُلاً فقَالَ أُنْظُرْ عَلى مَا اجْتَمَعَ هؤلاءِ ؟ فَجاءَ عَلَى امْرأةٍ قتيل فقال : ما كَانَتْ هذِهِ لِتُقَاتِلَ ؟ قَالَ وَعَلَى المُقَدَّمةِ خَالِدُبْنُ الوَلِيْدِ فَبَعَثَ رَجُلاً فَقَالَ: قُلْ لِخَالِدٍ: لَا تَقْتُلَنَّ امْرأةً ولا عَسِيْفًا﴾

ترجمہ: حضرت رباح بن ربیع سے روایت ہے (وہ کہتے ہیں) کہ ہم ایک لڑائی میں حضور ﷺ کے ہمراہ تھے تو (اچانک) حضور نے لوگوں کو کسی چیز پر اکٹھا دیکھ کر ایک شخص کو بھیجا کہ دیکھو کیا بات ہے کہ لوگ اکٹھے ہیں۔

(اس شخص نے دیکھ کر) کہا کہ یہ لوگ ایک مقتولہ عورت پر اکٹھے ہو رہے ہیں، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس عورت کو کیوں قتل کیا گیا ہے؟ (راوی کہتے ہیں کہ) فوج کے اگلے حصہ کے امیر حضرت خالد بن ولید تھے، حضور ﷺ نے ایک مرد سے کہلا بھیجا کہ خالد بن ولید عورتوں اور مزدوروں کو قتل نہ کرو۔

تشریح مع تحقیق : مُقَدِّمَة لشکر کا اگلا حصہ۔ اس روایت میں عورتوں کے ساتھ مزدوروں کو بھی قتل کرنے سے روکا گیا ہے، عورتوں کو تو ان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اور بچوں کو افعال کفر سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور اجیروں، مزدوروں کو مسلح نہ ہونے کی وجہ سے قتل کرنے سے روکا گیا ہے۔ نیز مزدور خدمت کے لیے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے۔ یہ بھی اسلام کا بہترین اخلاقی نظام ہے۔ باقی مختلف فیہ مسئلہ باب کی آخری روایت کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

ترجمة الباب : لا تقتلن إمرأةً ولا عسيفًا سے واضح ہے۔

۲۱. ﴿حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بنُ مَنْصُوْرٍ قَالَ ثَنَا هُشَيْمٌ قَالَ ثَنَا حَجّاجٌ قَالَ ثَنَا قَتَادَةُ عَنِ الحسنِ عَنْ سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ قَالَ قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم : اُقْتُلُوا شُيُوْخَ المشرِكِيْنَ وَ اسْتَبْقُوْا شَرْخَهُمْ﴾

ترجمہ: حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بڑی عمر والے قوی مشرکوں کو قتل کرو اور کم عمر والوں کو باقی رکھو۔

تشریح مع تحقیق : شیوخ : شیخ کی جمع ہے اور جمع الجمع مشائخ آتی ہے۔ اور لفظ شیخ کا اطلاق استاذ، عالم، سردار قوم اور ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو لوگوں کے نزدیک علم و فضل اور مرتبہ کے لحاظ سے بڑا ہو، ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ یہاں شیخ فانی مراد نہیں ہے بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو قوی ہوں اور لڑنے کی طاقت رکھتے ہوں، ابو عبیدؒ نے کہا ہے کہ شیوخ سے مراد نوجوان ہیں۔ (بذل:۴/۱۱)

شَرْخ بفتح الشين المعجمة وسكون الراء : مصدر ہے بمعنی ابتدار جوانی، اولِ امر، ہم عمر، مراد کم سن بچے ہیں جو جنگ میں لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ شرخ مصدر نہیں ہے بلکہ شارِخ کی جمع ہے جیسے صاحب کی جمع صَحْبٌ ہے۔

ترجمة الباب : بظاہر تو حدیث میں عورتوں کا ذکر نہیں ہے جس سے ترجمۃ الباب ثابت ہو، لیکن امام ابوداؤد کی ذکاوت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انھوں نے صرف عورتوں کے قتل سے ہی ممانعت کا باب نہیں لگایا ہے بلکہ یہ باب بچوں، مزدوروں اور بوڑھوں کو بھی شامل ہے، لیکن چونکہ عورتوں کو زیادہ قتل کیا جاتا ہے اس لیے لفظ نساء لے آئے۔ "واللہ اعلم بالصواب"

٢٢ ﴿حَدَّثَنا عَبْدُ اللّٰهِ بنُ محمد النُّفَيْلِيُّ قَالَ ثَنَا محمدُ بنُ مَسلمةَ عَنْ محمدِ بنِ إسحٰقَ قَالَ ثَنَا مُحمد بنُ جعفر بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عُرْوَةَ بنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشة قَالَتْ: لَمْ تُقْتَلْ مِنْ نِسَائِهِمْ تَعْني بَنِيْ قُرَيْظَةَ إِلَّا إمْرَأةٍ، أنّها لَعِنْدِيْ تُحَدِّثُ تَضْحَكُ ظَهْرًا وَبَطْنًا وَرَسُوْلُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم يَقْتُلُ رِجَالَهُمْ بالسُّوْقِ إذْ هَتَفَ هَاتِفٌ بِإسْمِهَا، أيْنَ فُلَانَةٌ قَالَتْ: أنَا، قُلْتُ: وَمَا شَأنُكِ قَالَتْ حَدَثٌ أحْدَثْتُهُ قالت: فَانْطَلَقَ بِهَا فَضَرِبَتْ عُنُقُهَا؛ قَالَتْ : فَمَا أنسى عَجَبًا مِنهَا ؛ أنّهَا تَضْحَكُ ظَهْرًا وَبَطْنًا، وَقَدْ عَلِمَتْ أنّها تُقْتَلُ﴾

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ بنوقریظہ میں صرف ایک عورت جو میرے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کررہی تھی قتل کی گئی، وہ عورت اس طرح ہنس رہی تھی کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑ رہے تھے، جس وقت آپ ﷺ بنوقریظہ کے مردوں کو بازار میں قتل کرنے کا حکم دے رہے تھے، تو ایک آواز دینے والے نے اس عورت کا نام لے کر پکارا کہ فلانی عورت کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ہوں؛ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس عورت سے معلوم کیا کہ تجھ کو کیا ہوا (کہ تیرا نام پکارا جارہا ہے) وہ بولی کہ میں نے ایک نیا کام کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پھر وہ پکارنے والا اس کو لے گیا اور اس کی گردن اڑا دی گئی؛ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں اب تک نہیں بھولی ہوں جیسا اس وقت مجھے تعجب ہوا تھا کہ وہ عورت اپنے قتل کیے جانے کو جاننے کے باوجود اس طرح ہنس رہی تھی کہ اس کی پیٹھ اور پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

تشریح مع تحقیق : تضحك ظهرًا وبطنًا : وہ عورت آگے، پیچھے ہوکر اس طرح ہنس رہی تھی کہ اس کی کمر میں سلوٹیں پڑ جاتی تھیں۔

ھاتِف : اسم فاعل از (ض) بمعنی زور سے پکارنے والا بولا جاتا ہے "هتف فلان بفلان" کہ اس نے اس کو زور سے چلا کر پکارا۔

حَدَثٌ : ج أحداث بمعنی واقعہ، بدعت، نئی بات، جو بات سنت کے خلاف دین میں داخل کی جائے اس کو بھی حدث کہتے ہیں۔

جب حضور ﷺ جنگ احزاب سے واپس آئے تو حضرت جبرائیلؑ نے خبر دی کہ بنوقریظہ نے اپنا کیا ہوا عہد، کہ "ہم مسلمانوں سے جنگ نہیں لڑیں گے" توڑ دیا ہے، جب حضور ﷺ نے اس حیرت انگیز خبر کو سنا تو فوراً ہی حضرت سعد بن معاذ، خوات بن زبیر وغیرہ کو بھیج کر واقعہ کی تحقیق فرمائی، خبر صحیح تھی چنانچہ بحکم خداوندی آپ ﷺ تین ہزار مجاہدوں کے ہمراہ "بنوقریظہ" پہنچے اور ان کا محاصرہ کیا، جب وہ لوگ حضرت سعدؓ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے تو

حضرت سعدؓ کے فیصلہ کے مطابق ان کے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کے ذُریات کو گرفتار کیا گیا اور ان کے مالوں کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا، اس طرح اس قبیلۂ ملعونہ کا خاتمہ کیا گیا۔ یہ غزوہ بالاتفاق ۵ ہجری ماہ ذوالقعدہ میں ہوا۔
اس غزوہ میں صرف ایک عورت کو قتل کیا گیا ہے اس عورت کے مباح الدم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی تھی، اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس نے ایک صحابی جن کا نام خلاد بن سوید ہے، کے اوپر پتھر گرا کر شہید کر دیا تھا تو اس کو قصاصاً قتل کیا گیا، لیکن قوی بات یہ ہے کہ اس عورت نے حضور ﷺ کو گالی بھی دی ہو اور صحابی کو بھی شہید کیا ہو۔

شاتم رسول ﷺ کا شرعی حکم

اگر کوئی درندہ ذہن انسان، بدبخت نبی کی شان میں شاتم ہو تو وہ قرآن وحدیث کی رو سے معلون، ظالم اور کافر ہوگا۔ جو واجب القتل ہے۔
دلیل (۱) يَاَيُّها الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتكُم فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُم لبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكم وَأَنْتُم لَا تَشْعُرُوْنَ .
دلیل (۲) إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰه فِى الدُّنْيَا والآخِرةِ و أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينا.
علامہ ابن تیمیہ نے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ اور رسول کو اذیت دینے والا واجب القتل ہے۔ (بذل:۴/۱۱، الصارم المسلول اردو ترجمہ:۶۲) اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے رسم المفتی، ص: ۶۸

ہر حال میں واجب القتل ہے شاتم رسول
غیرت مسلم کا ہے یہ ازل سے اصول

ترجمة الباب : لم تقتل من نسائهم إلّا إمرأة سے ترجمۃ الباب ثابت ہو رہا ہے۔

۲۳ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ عَمْروبن السَّرحِ قَالَ ثَنا سُفيانُ عَنِ الزُّهرِيِّ عَنْ عُبَيدِ اللّٰهِ يَعْنِي بنَ عبدِ اللّٰهِ عَنْ بنِ عَبَّاسٍ عَنِ الصَّعْبِ بنِ جُثَامَةَ أَنَّهُ سَأَلَ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عَنِ الدَّارِ مِنَ الْمُشْرِكين يُبَيَّتُون فيُصابُ مِنْ ذرَارِيهِمْ وَنِسَائِهم فَقَالَ النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم : هُمْ مِنْهُم وَكَانَ عَمْرو يعنى بنَ دينارٍ يَقُوْلُ : هُم مِنْ آبائِهِمْ ، قَالَ الزهريُّ ثُمَّ نَهٰى رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ والوُلْدَانِ﴾

ترجمه: حضرت صعب بن جثامہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مشرکین کے گھروں کے بارے میں پوچھا (کہ جب ان پر) شب خوں کیا جاتا ہے تو ان کے بچے اور عورتیں بھی مارے جاتے ہیں (یعنی ایسے وقت میں ہم کیا کریں) آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ وہ ان ہی میں سے ہیں، حضرت عمرو بن دینار (ہم منہم کی جگہ) "ہم من آبائھم" کہتے تھے، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ پھر حضور ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمادیا۔

تشریح مع تحقیق: یُبَیَّتُون از باب (تفعیل) جمع مذکر غائب مجہول: بمعنی شب خون کرنا۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب رات میں حملہ کرتے ہیں تو عورتوں اور بچوں میں امتیاز نہیں کر پاتے جس کی وجہ سے عورتیں اور بچے بھی مقتول ہوجاتے ہیں، حالانکہ شرعاً ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے تو حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ جو حکم خود مشرکین کا ہے کہ ان کو قتل کیا جائے وہ ہی حکم عورتوں اور بچوں کا ہے۔

اشکال

مذکورہ تشریح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا جائز ہے، جیسا کہ خود روایت سے بھی مترشح ہے، حالانکہ مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے، نیز یہی روایت ابوداوٗد میں بھی ہے، اب بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض پیدا ہوگیا۔

جوابات

(۱) امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منسوخ ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ناسخ ہے جیسا کہ خود امام ابوداوٗد علیہ الرحمہ نے بھی امام زہریؒ کے قول کو ذکر کیا ہے۔

(۲) دو چیزیں الگ الگ ہیں ایک تو یہ ہے کہ قصداً عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جائے اور ایک یہ ہے کہ بغیر قصد و ارادہ کے قتل ہوجائے۔ اول الذکر کے بارے میں تو حدیث ابن عمرؓ ہے، اور ثانی الذکر کے بارے میں صعب بن جثامہ کی روایت ہے یعنی عورتوں اور بچوں کے قتل کو مقصود نہ بنایا گیا ہو اور پھر بھی عورتیں اور بچے مقتول ہوجائیں تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ (بذل:۴/۱۱، مرقاۃ:۷/۳۵۵، تکملہ:۳/۳۹) اور قول ثانی ہی زیادہ صحیح ہے جیسا کہ صاحب بذل نے فرمایا ہے۔

نوٹ: موجودہ زمانہ میں بم دھماکہ کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر عورتوں، بچوں کا قتل مقصود ہے تو ناجائز ہے اور اگر صرف مردوں کو قتل کرنا مقصود ہے لیکن عورتیں اور بچے بھی زد میں آجاتے ہیں تو پھر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (تکملہ فتح الملہم:۳/۳۹)

قوله: وكان عمرو يعني بن دينار الخ یہ سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے، اصل بات یہ ہے کہ سفیان بن

عیینہ اس روایت کو اپنے استاذ زہریؒ سے عمرو بن دینار کے واسطے سے بھی نقل کرتے ہیں اور بغیر عمرو بن دینار کے واسطے کے بھی نقل کرتے ہیں، لیکن جب واسطے سے نقل کرتے ہیں تو اس میں ھُمْ مِنْھُمْ کی جگہ "ھم من آبائھم" کہتے ہیں۔ یہاں پر اسی اختلاف کو بیان کرنا مقصود ہے۔

قال الزھریؒ الخ امام زہری کے قول کا مطلب یہ ہی ہے کہ یہ روایت منسوخ ہے لیکن ایسا نہیں ہے اس لیے کہ صعب بن جثامہؓ کی روایت سے مطلق اباحت قتل ثابت نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک حالت یعنی عدم قصد کے ساتھ مخصوص ہے۔ کما مر آنفاً (بذل:۱۱/۴)

ترجمة الباب : حضرت صعب بن جثامہؓ کا مشرکین کی عورتوں کے شب خون میں مارے جانے کے بارے میں سوال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اسی لیے تو سوال کیا۔

خلاصة ما فی الباب : اس باب میں کل پانچ روایتیں مذکور ہیں اور سب روایات سے صراحتاً یا ضمناً عورتوں، بچوں، مزدوروں اور بوڑھوں کے قتل کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ اب اس باب کے ذیل میں دو اختلافی مسئلے آتے ہیں جن کو بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے۔

﴿مسئلة اولى﴾

(۱) امام مالک اور امام اوزاعی علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ عورتوں اور بچوں کو کسی بھی حالت میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

(۲) امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور جمہور علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت یا بچہ جنگ میں شریک ہو کر قتل کرے یا عورت ملکہ اور قریب البلوغ بچہ بادشاہ ہو تو ان سب کو قتل کرنا جائز ہے۔

فریق اول کی دلیل

احادیث میں مطلقاً عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت ہے، کسی قید کے ساتھ مخصوص نہیں، لہٰذا ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

فریق ثانی کی دلیل

حضرت رباح بن ربیع کی حدیث ہے: كُنَّا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فی غزوة، فرأى النبي صلى الله عليه وسلم الناس مجتمعين، فرأى امرأة مقتولة فقال : ما كانت هذه لتقاتل ؟

اس حدیث سے یہ پتہ چلا کہ عورت کو قتل نہ کرنے کی علت عورت کا قتال میں شریک نہ ہونا ہے، اگر عورت

قتال میں شریک ہو اور مسلمانوں سے قتال کرے تو اس کو قتل کرنا جائز ہے۔

جواب

مطلق احادیث کو دوسری معلول احادیث پر محمول کیا جائے گا، تا کہ دونوں روایتوں میں تعارض نہ رہے۔

(تفصیل فتح الباری: ۶/ ۱۴۷، تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۴۰) واللہ اعلم بالصواب

﴿مسئلة ثانية﴾

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ شیخ فانی کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا خواہ ذی رائے ہو یا نہ ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شیخ فانی کو قتل نہیں کیا جائے گا مگر جب کہ وہ ذی رائے ہو تو قتل کیا جائے گا۔

فریق اول کی دلیل

حضراتِ شافعیہ فرماتے ہیں کہ مبیح قتل تو کفر ہے اور شیخ فانی میں کفر متحقق ہے لہٰذا اس کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا۔

فریق ثانی کی دلیل

حنفیہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ کرنا مبیح قتل ہے اور شیخ فانی میں جنگ کی طاقت ہی نہیں ہے لہٰذا اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، ہاں اگر وہ ذی رائے ہے تو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ حضور ﷺ نے درید بن صمہ کو ۱۲۰/ سال کی عمر میں قتل کرایا ہے اس لیے کہ وہ ذی رائے تھا، قتل کی اچھی اچھی تدبیریں بتلاتا تھا۔

جواب

قتل کی علت کفر نہیں ہے اگر قتل کی علت کفر محض ہوتا تو پھر ذمیوں میں تو کفر متحقق ہے نیز پھر تو جہاں بھی کافر نظر آتا تو اس کو فوراً قتل کرنا لازم ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ کافر کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ صرف میدان میں ہی قتل کیا جاتا ہے۔ (اشعہ: ۴۰۹، مرقاۃ: ۷/ ۳۵۴)

﴿بَاب في كراهية حرق العدو بالنار﴾

یہ باب دشمنوں کو آگ میں جلانے کے ناپسندیدہ ہونے کے بیان میں ہے

۲۴ ﴿حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بنُ مَنْصورٍ قَالَ ثَنَا مُغِيرَةُ بنُ عبدِ الرحمن الحُزامِيُّ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ

قَالَ ثَنِي مُحمدُ بنُ حمزةَ الأَسْلَمِيُّ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أَمَّرَهُ على سَرِيَّةٍ فَخَرجتُ فِيْهَا وَقَالَ: إِنْ وَجَدتُّم فُلَانًا فَاحْرِقُوْهُ بِالنَّارِ، فَوَلَّيْتُ، فَنَادَانِي، فَرَجَعْتُ إِلَيهِ، فَقَالَ: إِنْ وَجَدتُّم فُلَانًا فَاقْتُلُوْهُ وَلَا تَحْرِقُوْهُ، فَإِنَّهُ لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلَّا ربُّ النَّارِ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بنُ خَالِدٍ وَقُتَيْبَةُ أَنَّ اللَّيْثَ بنَ سَعْدٍ حَدَّثَهُمْ عَنْ بُكَيْرٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَنَا رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فِي بَعْثٍ فَقَالَ: إِنْ وَجَدتُّمْ فُلَانًا وفُلَانًا فَذَكَرَ مَعْنَاهُ﴾

ترجمہ: حضرت حمزہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا (صحابی کہتے ہیں کہ) میں سریہ میں گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر فلاں کافر کو پاؤ تو اس کو آگ میں جلا دینا (صحابی کہتے ہیں کہ) جب میں واپس چلنے لگا، تو آپ ﷺ نے مجھ کو آواز دی، میں حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فلاں کافر مل جائے تو قتل کر دینا اور آگ میں نہ جلانا، کیونکہ آگ کو پیدا کرنے والا ہی آگ کا عذاب دے سکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ہم کو ایک جنگ میں بھیجتے وقت ارشاد فرمایا کہ اگر فلاں فلاں کو پاؤ (تو قتل کر دینا جلانا مت) اور پہلی والی حدیث کی طرح ہی اس حدیث کو بھی ذکر کیا۔

تشریح مع تحقیق: سَرِیَّة وہ جماعت جو لشکر میں عمدہ سمجھی جاتی ہو۔ سریہ کی کم از کم تعداد چار شخص اور زیادہ سے زیادہ تین سو (۳۰۰) افراد ہیں۔ (معجم الوسیط: ۴۲۹)

باب کی دونوں روایتیں ایک ہی ہیں صرف سند کا فرق ہے، خلاصۂ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے قبیلۂ عذرہ کی طرف ایک سریہ روانہ کیا اور ارشاد فرمایا کہ فلاں فلاں اگر مل جائیں تو آگ میں جلا دینا، لیکن فوراً ہی آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آگ میں مت جلانا، کیونکہ اللہ رب العزت کو ہی آگ کا عذاب دینے کا حق ہے۔

اس روایت میں فلاں فلاں مطلق ہے کسی کا نام نہیں ذکر کیا گیا ہے لیکن ابن اسحٰق کی روایت میں یہ صراحت ہے کہ اگر تم ہبار بن اسود اور ایک دوسرے شخص کو پاؤ تو الخ۔ دوسرے شخص کا نام اس روایت میں بھی نہیں ہے، جب کہ "اصابہ" کی ایک روایت میں دونوں نام مذکور ہیں: (۱) ہبار بن اسود (۲) نافع بن عبد قیس۔ علامہ ابن الجوزی نے بھی ان دونوں ناموں کی صراحت کی ہے۔

اصل واقعہ یہ ہوا تھا کہ آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص جنگ بدر کے قیدیوں میں قید ہو کر آئے، آپ ﷺ نے ان کو اس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی لخت جگر کو مدینہ آنے دیں گے، جب ابوالعاص نے آپ ﷺ کی بیٹی حضرت زینبؓ کو روانہ کیا، تو ہبار بن اسود اور نافع بن عبد قیس ان کے پیچھے پیچھے ہو گئے، یہاں تک کہ حضرت زینبؓ کے اونٹ کو زخمی کر دیا، حضرت زینب نیچے گر گئیں، شدید چوٹ کی وجہ سے بیمار

ہوگئیں، یہاں تک کہ اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہوگئیں، اس وجہ سے آپ ﷺ نے ان دونوں کو آگے میں جلانے کا حکم دیا تھا، ہبار بن اسود تو حضور ﷺ کے بھیجے ہوئے سریہ کے پہنچنے سے پہلی ہی آغوش اسلام میں آگئے، اور نافع بن عبد قیس کا صحابہ میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا ہے، شاید وہ اسلام لانے سے پہلے ہی مرگیا۔ (بذل:۱۲/۴)

تحریق بالنار کا شرعی حکم

یہ مسئلہ صحابہؓ کے زمانے میں بھی مختلف فیہ رہا ہے، کہ آگ میں دشمن کو جلانا جائز ہے یا نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباسؓ مطلقاً عدم جواز کے قائل تھے، خواہ کفر کی صورت ہو یا حالت جنگ ہو یا قصاص، کسی صورت میں بھی تحریق بالنار کے جواز کے قائل نہیں تھے، اس کے برخلاف حضرت علی اور حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہما جواز کے قائل تھے۔'' ابن مہلب نے فیصلہ کن بات کہی ہے کہ حضور ﷺ کا پہلا حکم تو اصل تھا اور دوسرا حکم از راہ تواضع تھا، یعنی تحریق بالنار حرام نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ نے قبیلہ عرنیین کی آنکھوں میں گرم سلاخیں ڈالی تھیں، نیز حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے کے مرتدین کو آگ میں جلانے کا حکم فرمایا تھا، خالد بن ولیدؓ نے بھی چند مرتدوں کو آگے میں جلایا، حضرت علیؓ سے بھی آگ میں جلانا ثابت ہے۔ واللہ اعلم

حنفیہ کا مسلک مختار

تحریق بالنار کے بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ استعانت بالتحریق کفار پر غلبہ ہونے سے پہلے جائز ہے اور غلبہ ہونے کے بعد نا جائز ہے۔ (بذل المجہود:۱۲/۴، تراجم بخاری:۱۱۶/۴)

ترجمة الباب: روایت میں لا تحرقوهُ الخ سے ترجمۃ الباب بالکل واضح ہے۔

۲۵ ﴿حَدَّثَنا أَبُو صَالِحٍ مَحْبُوبُ بنُ موسٰى قَالَ أَخبَرَنَا أَبُو إِسْحٰقَ الفَزَارِيُّ عَنْ أَبِيْ إِسْحٰقَ الشَّيْبَانِيِّ عَنْ ابنِ سَعْدٍ قَالَ غَيْرُ أبى صالحٍ عَنِ الحسنِ بنِ سَعْدٍ عَنْ عَبْدِ الرحمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كُنَّا مَعَ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فِيْ سَفَرٍ فَانْطَلَقَ لِحَاجَتِهِ، فَرَأَيْنَا حُمَّرَةً ، مَعَهَا فَرْخَانِ، فَأَخَذْنَا فَرْخَيْهَا فَجَاءَ تِ الحُمَّرَةُ فَجَعَلَتْ تَفْرُشُ؛ فَجَاءَ النبيُّ صَلَّى اللّٰه عليه وسلم فَقَالَ : مَنْ فَجَعَ هذِهِ بِوَلَدِها رُدُّوا وَلَدَها إِلَيْهَا، وَرَأَىٰ قَرْيَةَ نملٍ قَدْ حَرقْنَاهَا فَقَالَ مَنْ حَرَّقَ هذِهِ؟ قُلْنَا نَحنُ، قَالَ إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي أَنْ يُعَذِّبَ بالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، آپ ﷺ قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے، تو ہم نے ایک چڑیا دیکھی جس کے دو بچے تھے، ہم نے

ان دونوں بچوں کو پکڑ لیا، چڑیا نے آکر زمین پر پھڑ پھڑانا شروع کر دیا (زمین پر منت اور عاجزی کرنے والے کی طرح اپنے پروں کو زمین پر بچھا دیا) اتنی ہی دیر میں حضور ﷺ تشریف لے آئے، اور ارشاد فرمایا کہ اس کو کس نے بے قرار کیا ہے اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔ (چنانچہ صحابہ نے واپس کر دیا) پھر حضور ﷺ نے چیونٹیوں کا ایک سوراخ دیکھا جس کو ہم نے جلا دیا تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو کس نے جلایا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ ہم لوگوں نے اس کو جلایا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آگ کے مالک یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے بھی آگ میں جلانا درست نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق : حُمَّرة چڑیا کی طرح چھوٹا سا پرندا۔

فَرخانُ : فرخ کا تثنیہ ہے بمعنی: پرندے کا بچہ، جمع فُرُوْخٌ ، فِرَاخٌ اور أفْرَاخٌ آتی ہے۔

تفرُشُ : (ن ض) بچھانا بولا جاتا ہے فَرَشَ الطائرُ : پرندے نے پروں کو زمین پر بچھایا۔ اور اگر باب تفعیل سے پڑھیں تو ترجمہ ہوگا پروں کا پھڑ پھڑانا، اور اس کی اصل تَتَفَرَّشُ ہوگی، ایک ''ت'' کو حذف کر دیا گیا ہے۔

فَجَعَ از باب تفعیل دردمند کرنا، مصیبت زدہ کرنا، دل دکھانا، تکلیف دینا۔

حدیث شریف کو اس جگہ ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آگ میں کسی کو بھی نہیں جلانا چاہیے۔ پہلی حدیث شریف میں انسانوں کا ذکر تھا، لیکن اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی آگ میں نہ جلایا جائے۔ (بذل المجہود: ۳۲۷/۵)

ترجمة الباب : لا ينبغي أن يعذب بالنار إلّا رب النار سے ثابت ہو رہا ہے۔

﴿بَابُ الرَّجُلِ يُكْرِي دَابَّتَهُ عَلَى النِّصْفِ أَوِ السَّهْمِ﴾

یہ باب اس شخص کے بیان میں ہے جو اپنے جانور کو (مالِ غنیمت کے) نصف پر یا پورے حصے پر کرایے پر دے

۲۶ ﴿حَدَّثَنا إِسْحٰقُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ الدِّمِشْقِيُّ أَبُو النَّضْرِ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بنُ شُعَيْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُوْ زُرْعَةَ يَحْيىٰ بنُ أَبِي عَمْرٍو السَّيْبَانِي عَنْ عَمْرِو بنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّهُ حَدَّثَهُ عَنْ وَاثِلَةَ بنِ الأَسْقَعِ قَالَ: نَادىٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَزْوَةِ تبوكَ فَخَرَجْتُ إِلىٰ أَهْلِيْ فَأَقْبَلْتُ وَقَدْ خَرَجَ أَوَّلُ صَحَابَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عليه وسلم فَطَفِقْتُ فِي الْمَدِيْنَةِ أُنَادِيْ أَلَا مَنْ يَحْمِلُ رَجُلًا لَهُ سَهْمُهُ فَنَادىٰ شَيْخٌ مِنَ

الأنصارِ فقالَ: لَنا سَهْمُهُ عَلٰى اَنْ نَحمِلَهُ عقْبَة وَطعَامُهُ مَعَنا قُلتُ: نَعَمْ قَالَ: فَسِرْ عَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ تَعالىٰ قَالَ: فَخَرَجْتُ مَعَ خَيرِ صَاحِبٍ حتّى أفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْنا فأصَابَنِي قَلَائِصُ فَسُقْتُهُنَّ حَتّٰى أتَيتُهُ فَخرَجَ فقَعَدَ عَلىٰ حَقِيبَةٍ مِنْ حَقَائِبِ إبِلِهٖ ثُمّ قَالَ سُقْهُنَّ مُدَبَّراتٍ ثُمَّ قال سُقْهُنَّ مُقبِلَاتٍ فَقالَ مَا أرىٰ قَلَائِصَكَ إلّا كِرامًا قَالَ إنَّما هِيَ غَنِيمَتُكَ التِي شَرَطتُ لَكَ قَالَ خُذْ قَلَائِصَكَ يَا ابنَ أخِي فَغَيْرَ سَهمِكَ أرَدْنَا﴾

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک کی لڑائی میں اعلان کرایا (مجاہدین کے جمع کرنے کے واسطے) میں اپنے گھر کو گیا، وہاں سے ہوکر آیا تو پہلے صحابی آپ کے نکل چکے تھے میں نے شہر میں پکارنا شروع کیا کہ کیا کوئی ایسا ہے جو ایک آدمی کو سوار کرے اور جو حصہ اس کو غنیمت میں سے ملے گا وہ لے لے، ایک بوڑھے انصاری بولے اچھا ہم اس کا حصہ لیں گے اور اس کو اپنے ساتھ بٹھالیں گے (باری باری سے) اور ساتھ کھانا کھلائیں گے میں نے کہا ہاں قبول ہے انھوں نے کہا کہ اچھا چلئے اللہ کی برکت پر بھروسہ کرکے واثلہ بن اسقع نے کہا کہ میں بہت اچھے رفیق کے ساتھ نکلا یہاں تک کہ اللہ نے ہم کو غنیمت کا مال دیا، میرے حصہ میں چند اونٹنیاں تیز رفتار آئیں میں ان کو ہنکا کر اپنے رفیق (انصاری) کے پاس لایا وہ نکلے اور اپنے اونٹ کی پچھلی طرف بیٹھے حقبہ پر پھر کہا کہ ہانک ان کو میری طرف پیٹھ کرکے پھر کہا کہ ہانک ان کو میری طرف منہ کرکے اس کے بعد کہا کہ تیری اونٹنیاں میرے نزدیک بہت عمدہ ہیں (نہیں دیکھتا ہوں میں تیری اونٹنیوں کو مگر عمدہ) واثلہ نے کہا کہ یہ تو تمہارا مال ہے جس کی میں نے آپ سے شرط لگائی تھی انھوں نے کہا کہ اے بھتیجے ہمارا مقصد یہ حصہ نہ تھا (بلکہ اخروی ثواب مراد تھا)

تشریح مع تحقیق : السَيْبَانِيّ : یہ قبیلہ حمیر کی طرف نسبت ہے اس کا استعمال ہر جگہ اہل عرب "شیبانی" کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن صرف یہ جگہ مستثنیٰ ہے اور یہاں سین مہملہ کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا۔

فَسِرْ از (ض) بمعنی چلنا امر کا صیغہ ہے۔

حَقِيبَة وہ چیز جس کو سوار اپنے گھوڑے پر اپنے پیچھے رکھے، مسافر کی خوراک پر بھی اطلاق ہوتا ہے اس کی جمع حقائب آتی ہے۔

قلائص قلوص کی جمع ہے بمعنی ٹانگوں والی اونٹنی۔ جوان اونٹنی۔ وہ اونٹنی جس پر پہلی مرتبہ سواری کی جائے۔

اس روایت میں جنگ تبوک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تبوک مدینہ سے چودہ منزل کے فاصلہ پر ملک شام کی ایک جگہ کا نام ہے یہ غزوہ بالاتفاق ۹ ہجری ماہ رجب میں واقع ہوا ہے اور اس غزوہ میں آپ ﷺ تیس ہزار فوج لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے ہیں اور اس میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ وہ لوگ جزیہ دینے پر مجبور ہوگئے۔ (تفصیل اصح

السیر : ۳۲۰ سے) بہر حال اس حدیث میں ایک قصہ جو غزوہ تبوک کی طرف جاتے وقت پیش آیا اس کو بیان کیا گیا۔ اب اس روایت میں دو اشکال ہیں۔

اشکال اول

یہ ہے کہ غزوۂ تبوک میں تو قتال نہیں ہوا جیسا کہ اوپر صراحت ہو چکی ہے پھر حضرت واثلہ کو اونٹ کہاں سے ملے تھے۔

جواب

یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تبوک سے حضرت خالد بن ولید کو دومۃ الجندل کی طرف بھیجا اس وقت اُکَیْدِر دومۃ الجندل کا حاکم تھا، جو نصرانی تھا۔ جب حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو چاندنی رات میں وہ اپنی بیوی کے پاس چھت پر بیٹھا ہوا تھا اسی دوران وہ وہاں سے گھوڑا لے کر شکار کے لیے نکل پڑا، مسلمانوں کی جماعت نے اس کو پکڑ لیا، ابن سعد کہتے ہیں حضرت خالد بن ولید نے کہا کہ دومۃ الجندل کا دروازہ کھول دو تو ہم تم کو حضور کے پاس پہنچنے سے پہلے قتل نہیں کریں گے، اس نے منظور کر لیا، لیکن قلعہ میں اس کا بھائی تھا اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا مگر جب اس نے اپنے بھائی اکیدر کو رسیوں میں بندھا ہوا دیکھا تو اکیدر نے خود ہی کہا کہ صلح کر لو یہاں تک کہ یہ دروازہ کھول دے چنانچہ حضرت خالد بن ولید راضی ہو گئے اور دونوں بھائیوں کو حضور کی خدمت میں لے گئے آپ ﷺ نے دو ہزار (۲۰۰۰) اونٹ، آٹھ سو (۸۰۰) گھوڑے، چار سو (۴۰۰) ذرہوں اور چار سو (۴۰۰) نیزوں پر صلح فرمائی۔ موسیٰ بن عقبہ کی روایت میں ہے کہ اکیدر اور اس کا بھائی حضور ﷺ کی خدمت میں جب پہنچے تھے تو اسلام پیش کیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور جزیہ دینا قبول کیا بہر حال تبوک میں تو لڑائی نہیں ہوئی لیکن دومۃ الجندل سے مال حاصل ہوا، اسی میں سے حضرت واثلہ کو اونٹنیاں ملی ہوں گی۔

اشکال ثانی

وہ یہ ہے کہ تیس ہزار کی فوج تھی اور اونٹ کل دو ہزار ملے تھے پھر تنہا حضرت واثلہ کو قلائص یعنی چند اونٹ کیسے مل گئے؟

جواب

صاحب بذل المجہود فرماتے ہیں کہ حضرت خالدؓ کا سریہ جو حضور نے دومۃ الجندل کی طرف بھیجا تھا اس میں حضرت واثلہ بھی شریک ہوں اور پھر حضور نے سریہ کو کل غنیمت کا ثلث یا ربع دیدیا ہو اور اصل غنیمت سے بھی حصہ ملا ہو اس وجہ سے حضرت واثلہ کو (قلائص حاصل ہو گئے) اونٹنیاں حاصل ہو گئیں۔

ترجمة الباب : ترجمۃ الباب اس طرح ثابت ہوگا کہ حضرت واثلہؓ نے کہا مَنْ يَحْمِلُ رجلاً لَهٗ سَهْمُهٗ غنیمت میں سے جو حصہ ملے گا اس میں سے اس کو حصہ دوں گا اور جب مجہول پر جائز ہے تو نصف غنیمت پر یا کل غنیمت پر سوار کرنا تو بدرجہ اولی جائز ہوگا۔

مسئلہ

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑے بعض غنیمت یا کل غنیمت پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے گھوڑے کو نصف غنیمت پر دے تو امید ہے کہ کوئی حرج نہ ہو، امام اوزاعیؒ بھی فرماتے ہیں کہ میں اس کو جائز سمجھتا ہوں، امام مالکؒ کراہت کے قائل ہیں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کو نصف غنیمت پر دینا جائز ہی نہیں ہے اور احناف کا بھی یہی مسلک ہے، کیونکہ اس میں اجرت مجہول ہے ہوسکتا ہے کہ جہاد میں غنیمت حاصل نہ ہو، نیز اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ روایت تو حسن سلوک کے بارے میں ہے۔ (بذل: ۴/۱۳)

﴿ بَابٌ فِي الأَسِيْرِ يوثق ﴾

قیدی کو باندھنے کا بیان

۲۷ ﴿حَدَّثَنَا مُوْسَى بنُ إِسْمٰعِيلَ ثَنَا حَمَّادٌ يَعْنِي بنَ سَلَمَةَ قَالَ أَنَا مُحَمَّدُ بنُ زِيَادٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلّى اللّٰه عليه وسلم يَقُوْلُ: لَقَدْ عَجِبَ رَبُّنَا تعالى مِن قَوْمٍ يُقَادُوْنَ إِلَى الجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ﴾

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوم پر تعجب کیا جو زنجیروں میں بندھ کر جنت میں داخل کیے جاتے ہیں۔

تشریح مع تحقیق : عجب ربنا : اللہ کو تعجب نہیں ہوسکتا ہے اس لیے کہ تعجب ایسے امر پر ہوتا ہے جس کا سبب مخفی ہو اور اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے تو تاویل کی جائے گی اور اس سے مراد رضا خداوندی ہے۔

مطلب اس روایت کا یہ ہے کہ کفار گرفتار ہوکر زنجیروں میں بندھ کر دارالاسلام میں آتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو ایمان کی دولت عطا فرمادیتا ہے جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیے جائیں گے تو چونکہ زنجیروں میں بندھ کر آنا ہی اسلام کا سبب بنا ہے اس لیے اس کی طرف نسبت کردی گئی ہے یعنی قید ہوکر آنا بظاہر اسلام کا سبب ہے اور اسلام جنت میں دخول کا سبب ہے نتیجہ ہوا کہ قید ہوکر آنا دخول جنت کا سبب ہے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کشش

الٰہی کی زنجیر مراد ہے یعنی جس کو خدا نے اپنی طرف کھینچ لیا وہ جنت میں داخل ہوگا، لیکن اس معنی سے ترجمۃ الباب ثابت نہیں ہوگا۔

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب یقادون الی الجنة سلاسل سے ثابت ہو رہا ہے۔

۲۸ ﴿حَدَّثَنا عبدُ اللّٰهِ بنُ عَمْرِو بنِ أبِي الحَجَّاجِ أبُو مَعْمَر قَالَ ثَنا عَبْدُ الْوَارِثِ ثَنا مُحَمَّدُ بنُ إسْحٰقَ عَنْ يَعْقُوبَ بنِ عُتْبَة عَنْ مُسْلِم بنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَن جُنْدُبِ بنِ مُكَيْثٍ قَالَ: بَعَثَ رسولُ اللّٰهِ صلّى الله عليه وسلّم عَبْدَ الله بنَ غالبٍ اللَّيْثِي فِي سَرِيَّةٍ وَكنتُ فِيهِمْ أمَرَهُمْ أنْ يَشُنُّو الغَارَةَ عَلٰى بَنِي المُلَوِّحِ بالكَدِيْدِ فَخَرَجْنَا حَتّٰى إذَا كُنَّا بالكَدِيْدِ لَقِيْنَا حَارِثَ بنَ البَرْصَاءِ اللَّيْثِي فأخَذْنَاهُ فَقَالَ: إنَّمَا جِئتُ أرِيْدُ الإسْلاَمَ وَإنَّمَا خَرَجْتُ إلٰى رَسُولِ اللّٰهِ صلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ فَقُلْنَا: إنْ تَكُنْ مُسْلِمًا لَمْ يَضُرَّكَ رِبَاطُنا يَوْمًا وَلاَ لَيْلَةً وإنْ تَكُنْ غَيْرَ ذلكَ نَسْتَوثِقُ مِنْكَ فَشَدَدْنَاهُ وِثَاقًا﴾

ترجمہ: حضرت جندب بن مکیثؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن غالب لیثی کو ایک سریہ کا سردار بنا کر بھیجا، میں بھی انہیں میں تھا، اور حضور ﷺ نے ان کو بنوملوّح پر حملہ کا حکم فرمایا، ہم لوگ نکلے اور مقام کدید میں پہنچ گئے، تو وہاں حارث بن برصار لیثی سے ہماری ملاقات ہوگئی، ہم نے اس کو پکڑ لیا تو اس نے کہا کہ میں تو اسلام لانے کے ارادے سے آیا ہوں، اور حضور ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں، ہم نے کہا کہ اگر تم مسلمان ہو تو ایک دن رات بندھے رہنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اور اگر تم مسلمان نہیں ہو تو ہم تم کو مضبوط باندھیں گے۔

تشریح مع تحقیق: بَنُو المُلَوِّح : بضم الميم وفتح اللام وكسر الواو المشدد، ایک قبیلہ کا نام ہے۔

كَدِيْد : ایک مقام کا نام ہے جو مکہ سے ۴۲ میل کے فاصلے پر ہے، بعض کتب میں لفظ "قدید" بھی وارد ہوا ہے۔

يُشِنُّوا الغارةَ عليهم : از (افعال) ہلّہ بولنا، چاروں طرف سے حملہ کرنا۔

اس حدیث پاک کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے مقام "کدید" کی طرف ایک سریہ بھیجا، یہ سریہ تقریباً دس (۱۰) افراد پر مشتمل تھا۔ جب یہ لشکر وہاں پہنچا اور حملہ کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ اسی دوران مسلمانوں نے حارث بن برصار کو گرفتار کیا اور باندھنا چاہا، حارث بن برصار نے کہا کہ میں تو خود ہی اسلام کا خواہش مند ہوں اور اسی غرض سے حضور ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہوں، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو نہیں چھوڑا اور باندھ لیا۔

ترجمة الباب : ترجمۃ الباب سے حدیث پاک کی مطابقت اس طرح ہے کہ صحابہؓ نے حارث بن

برصار لیثی کو رسی میں باندھا تھا اور باب کا مقصد بھی رسی میں باندھنے کے جواز کو ہی ثابت کرنا ہے، لہٰذا دونوں میں صراحتاً مطابقت موجود ہے۔

نوٹ: (۱) حدیث میں ایک راوی ''عبداللہ بن غالب لیثی'' ہیں اور ابوداؤد شریف کے اکثر نسخوں میں یہ نام اسی طرح نقل کیا گیا ہے، لیکن یہ غلط ہے صحیح نام ''غالب بن عبداللہ'' ہے۔ (بذل:۴/۱۴)

(۲) سند میں ایک راوی ''مسلم بن عبداللہ'' ہیں، یہ متکلم فیہ راوی ہیں، امام ازدیؒ نے ان کو ضعیف کہا ہے، البتہ یحیٰ بن معین نے صالح اور حافظ نے ثقہ کہا ہے۔

۲۹ ﴿حَدَّثَنا عِيسَى بنُ حَمَّادِ المِصرِيُّ وَقُتَيبَةُ، قَالَ قُتَيبَةُ ثَنا اللَّيثُ بنُ سَعدٍ عَن سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيرَةَ يَقُولُ بَعَثَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم خَيلًا قِبَلَ نَجدٍ، فَجاءَتْ بِرَجُلٍ مِنْ بَنِي حَنِيفَةَ يُقَالُ لَهُ ثُمَامَةُ بْنُ أُثَالٍ سَيِّدُ أَهلِ اليَمَامَةِ فَرَبَطُوهُ بسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِي المَسْجِدِ؛ فَخَرَجَ إِلَيهِ رسولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم فَقَالَ مَاذَا عِندَكَ يا ثُمَامَةُ ؟ قَالَ عِندِي يَا مُحَمَّدُ خَيرٌ ، إِنْ تَقتُلْ تَقتُلْ ذَا دَمٍ، وَإِنْ تُنعِمْ تُنعِمْ عَلَىٰ شَاكِرٍ، وَإِنْ كُنتَ تُرِيدُ المَالَ فَسَلْ تُعطَ مِنهُ مَا شِئتَ، فَتَرَكَهُ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حَتّٰى كَانَ الغَدُ، ثُمَّ قَالَ لَهُ مَاذَا عِندَكَ يا ثمامةُ ؟ فَأَعَادَ مِثلَ هذَ الكَلَامِ فتَرَكَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم، حَتّٰى كَانَ بَعدَ الغَدِ، فَذَكَرَ مِثلَ هذَا ، فَقَالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أَطلِقُوا ثُمَامَةَ فَانطَلَقَ إِلىٰ نَخلٍ قريبٍ مِنَ المَسْجِدِ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ دَخَلَ المَسْجدَ فَقَالَ أَشْهَدُ أن مُحَمَّدًا عَبدُهُ وَرَسُولُهُ، وَسَاقَ الحَدِيثَ؛ قَالَ عِيسَى أَخبَرَنَا اللَّيثُ وَ قَالَ ذَا ذِمٍّ﴾

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مقام نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا، اہل لشکر بنو حنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ کر لے آئے، جن کا نام ثمامہ بن اثال تھا، اور وہ اہل یمامہ کے سردار تھے، اور ان کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا، اس کے بعد حضور ﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا کہ یہ ثمامہ تمہارے پاس کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے پاس خیر و خوبی ہے (خوبی ہے یا مال ہے) اگر آپ مجھ کو قتل کرو گے تو ایک صاحب الدم (خونی) کو قتل کرو گے۔ اور اگر احسان کرو گے تو ایک قدر دان پر احسان ہوگا۔ اور اگر مال چاہتے ہو تو جتنا چاہے مانگ لو دیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا، جب اگلا دن ہوا تو آپ ﷺ نے ثمامہ سے کہا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تو انھوں نے وہی دوہرا کر کہا (جو پہلی مرتبہ کہا تھا) حضور ﷺ نے ان کو پھر اسی حال پر چھوڑ دیا۔ جب تیسرا دن ہوا تو حضور ﷺ نے ان سے وہی کہا، اس نے اسی طرح جواب دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو۔

(چنانچہ ان کو چھوڑ دیا گیا) ثمامہ مسجد کے پاس کھجور کے درخت کے قریب گئے، اور غسل کر کے مسجد میں آئے اور پڑھا أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُه پھر اس حدیث کو مکمل بیان کیا۔ عیسیٰ کہتے ہیں کہ لیث کی روایت میں ذا دم کی جگہ ذا ذمّ ہے۔

تشریح مع تحقیق : حدیث مذکور میں حضرت ثمامہ بن اثال کے اسلام لانے کے واقعے کا تذکرہ ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا یہ لشکر یمامہ کے ایک بہت بڑے قبیلے ''بنو حنیفہ'' کے ایک شخص کو پکڑ کر حضور ﷺ کی خدمت میں لایا۔ جب حضور ﷺ نے اس سے معلوم کیا کہ میرے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے اور میں تم سے کیا معاملہ کروں، تو جواب دیا کہ میرے پاس خیر ہے یعنی اچھا گمان ہے اور آپ سے معافی کی امید ہے کیونکہ آپ ﷺ معاف کرنے والوں میں سے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ (تکملہ فتح الملہم:۳/۱۲۰)

إنْ تقتل تقتل ذا دم : اس جملے کے دو مطلب ہیں: (۱) آپ ایسے شخص کو قتل کرو گے جو قتل کا مستحق ہے اور اس کا خون مطلوب ہے یعنی میں قتل کا مستحق ہوں لہٰذا آپ کا قتل کرنا درست ہوگا۔ اس معنی کے اعتبار سے اپنی تقصیر کا اقرار اور اعتراف ہے۔

(۲) دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ ایسے شخص کو قتل کرو گے جس کا خون معاف نہیں ہوگا۔ اور میری قوم میرا بدلا لے لے گی۔ اس معنی کے اعتبار سے اپنی ریاست اور شرافت کا دعویٰ ہے۔ صاحب بذل نے معنی اول ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی اگر آپ میرے مستحق قتل ہونے کے باوجود احسان فرمادیں تو میں قدردانی کروں گا اور قدردانی کا اظہار انھوں نے اسلام لا کر کر دیا۔ اس صورت میں دونوں جملوں - إن تقتل تقتل ذا دم اور إن تنعم تنعم علی شاکر - میں مناسبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

تین مرتبہ سوال و جواب کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ثمامہ کو کھول دو، صحابہ نے کھول دیا، اس حدیث پاک سے ائمہ ثلثہ استدلال کرتے ہیں کہ قیدی کو بغیر فدیہ کے چھوڑنا جائز ہے۔ انشاء اللہ اُسی باب کے تحت مفصل و مدلل بحث کی جائے گی۔ فانتظر.

قوله فاغتسل : یہاں سے ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد غسل کرنا چاہیے، البتہ اس کے وجوب و عدم وجوب میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

المسئلة الخلافية

امام مالکؒ، امام احمدؒ، ابو ثورؒ اور ابن منذرؒ فرماتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد غسل کرنا واجب ہے، امام شافعیؒ

فرماتے ہیں کہ اگر حالت جنابت میں اسلام قبول کیا ہے تو غسل اسلام واجب ہے ورنہ مستحب ہے، امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ہرصورت میں سنت ہے۔

ائمہ ثلثہ کا استدلال

(۱) ترمذی شریف میں ایک روایت ہے جس میں حضور ﷺ نے قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو ان کو غسل کا حکم فرمایا۔(ترمذی:۱/۱۳)

(۲) حدیث باب ہے۔اس میں بھی اس بات کا پتہ چلا کہ حضرت ثمامہ نے غسل کیا، اگر واجب نہ ہوتا تو غسل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔(ابوداؤد)

امام ابوحنیفہؒ کا استدلال

اگر غسل اسلام ضروری ہوتا تو روایات تواتر کے درجہ کو پہنچ جاتیں کیونکہ بہت بڑی بڑی جماعتیں اسلام لائیں اور کسی سے بھی غسل اسلام کے ضروری ہونے کی روایت منقول نہیں ہے۔

جواب

ترمذی شریف کی روایت استحباب پر محمول ہے۔(معارف السنن:۱۴۲/۵) اور جہاں تک باب کی روایت کا تعلق ہے تو وہ حضرت ثمامہ کا فعل ہے نہ کہ حضور ﷺ کا حکم۔جس سے صرف استحباب ہی ثابت ہوگا۔(المغنی لابن قدامہ:۱/۲۰۶)

اخبرنا الليث و قال ذا ذم : ای ذا حرمۃ ؛ لیث کی روایت میں "دم" کی جگہ "ذم" بالذال ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر آپ قتل کریں گے تو ایک ذمی کو قتل کریں گے، لیکن قاضی عیاض نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اس سے معنی ہی الٹ ہوجائیں گے کیونکہ ذمی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔اگرچہ امام نوویؒ نے اس قول کو بھی صحیح قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

ترجمة الباب : "فربطوه بسارية من سواري المسجد" سے ترجمۃ الباب بالکل واضح ہے۔

۳۰ ﴿حَدَّثَنا مُحَمَّدُ بنُ عَمرٍو الرَّازِيُّ قَالَ ثَنَا سَلَمَةُ يَعْنِي بنَ الفَضْلِ عَنْ ابنِ إسْحٰقَ قَالَ ثَنِي عَبْدُ اللّٰهِ بنُ أَبِي بَكْرٍ عَنْ يَحْيىٰ ابنِ عَبدِ اللّٰهِ بنِ عَبدِ الرَّحْمٰنِ ابنِ سَعدِ بنِ زُرَارَةَ قَالَ قُدِمَ بالأسَارىٰ حِينَ قُدِمَ بِهِمْ، وسَوْدَةُ بنتُ زَمْعَة عِنْدَ آلِ عَفْرَاءَ فِي مُنَاخِهِمْ عَلىٰ عَوْفٍ وَمَعُوذٍ ابْنَيْ عَفْرَاءَ قَالَ وَذٰلِكَ قَبْلَ أنْ يُضْرَبَ عَلَيهِنَّ الحِجَابُ؛ قَالَ تَقُولُ سَوْدَةُ : وَاللّٰهِ إنِّي لعِنْدَهُمْ إذْ أُتِيتُ، فَقِيلَ هٰؤلآءِ الأسَارىٰ قَدْ أُتِيَ بِهِمْ، فَرَجَعْتُ إلىٰ بَيْتِي وَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فِيهِ، وَإذَا أبُو يَزِيد

سُهَيْلُ ابنُ عَمْرٍو فِي نَاحِيَةِ الحُجْرَةِ مَجْمُوْعَةً يَدَاهُ إِلَى عُنُقِهِ بِحَبْلٍ، ثُمَّ ذَكَرَ الحَدِيْثَ قَالَ أَبو دَاؤدَ هُمَا قَتَلَا أَبَا جَهْلٍ ابنَ هِشَامٍ وَكَانَا اِنْتَدَبَا لَهُ وَلَمْ يَعْرِفَاهُ وَقَتَلَا يَوْمَ بَدْرٍ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ جب (جنگ بدر کے دن) قیدیوں کولایا گیاتو ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ، آل عفرار کے پاس تھیں، جہاں ان کے اونٹ بٹھائے جاتے تھے یعنی عوف بن عفرار اور معوذ بن عفرار کے پاس تھیں۔اور یہ واقعہ پردے کے حکم سے پہلے کا ہے۔حضرت سودہ فرماتی ہیں کہ جب میں ان کے پاس تھی تو اچانک ایک آنے والے نے آکر کہا کہ یہ قیدی ہیں، جن کو پکڑ کر لایا گیا ہے، جب میں اپنے گھر واپس آئی تو حضور ﷺ وہاں تشریف فرما تھے،اور ابو یزید سہیل گھر کے ایک کونے میں تھے رسی سے ان کے دونوں ہاتھ ان کی گردن سے بندھے تھے، پھر یہ پوری حدیث بیان کی۔امام ابوداؤد نے فرمایا کہ عوف بن عفرار اور معوذ بن عفرار نے ابوجہل کو قتل کیا ہے۔اور یہ دونوں اس کو جانتے بھی نہیں تھے،لیکن اسکی طرف بڑھے اور اس کو قتل کر دیا۔

تشریح مع تحقیق : مُناخ : مبرک الابل،اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ، جہاں اونٹ ٹھہرتے ہیں اس کو اہل عرب مناخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

انتدب : از (افتعال) بمعنی تردید کرنا۔ انتدب لأمرٍ : بلانے پر جواب دینا۔یہاں پرلڑنے کے لیے بلانے پر لبیک کہنا مراد ہے۔

حدیث بالا میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اپنا ایک واقعہ ذکر فرمارہی ہیں، کہ جب بدر کے قیدیوں کولایا گیاتو میں عوف اور معوذ۔ جو عفرار کے صاحبزادے ہیں۔ کے گھر میں تھی، میں نے بدری قیدیوں کو دیکھا اور فوراً ہی گھر واپس ہوگئی، کیونکہ حضور ﷺ بھی سفر میں تشریف لے گئے تھے، غالباً آپ ﷺ کی واپسی بھی ہوگئی ہوگی۔لہٰذا جب میں گھر پہنچی تو حضور ﷺ تشریف لا چکے تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ گھر ابو یزید سہیل موجود ہیں اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔حضرت سودہؓ نے جب یہ حال دیکھا،تو رہا نہ گیا اور فوراً فرمانے لگیں کہ اے ابو یزید تم نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔ یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے سودہ: علی اللہ و رسولہ . مستدرک حاکم میں یہ حدیث مکمل موجود ہے۔ چونکہ امام ابوداؤد کا مقصد صرف قیدی کے باندھنے کے جواز کو ثابت کرنا ہے اور وہ صرف اس حدیث سے ثابت ہو جاتا ہے۔اس لیے تلخیص سے کام لیا ہے۔

قال أبو داؤد : روایت مذکورہ میں عفرار کے دونوں صاحبزادوں کا تذکرہ تھا اس لیے امام ابوداؤد نے بطور استطراد کے ان دونوں کا مزید تعارف کرادیا کہ ان دونوں نے ابوجہل کو قتل کیا ہے۔ورنہ حدیث سے اس جملے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اشکال

یہاں امام ابوداوٗد نے قاتلین ابوجہل میں عوف بن عفراء کا تذکرہ فرمایا ہے حالانکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ابوجہل کو معاذ ومعوذ (عفراء کے بیٹے ہیں) اور معاذ بن عمرو بن جموح نے قتل کیا ہے۔ بظاہر دونوں باتوں میں تعارض ہے؟

جواب

(۱) عوف بن عفراء نے بھی قتل میں حصہ لیا ہوگا، جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں صراحت کی ہے۔ (۲) بخاری کی روایت راجح ہے۔

قاتلین ابوجہل کی صحیح تفصیل

حافظ ابن حجرؒ نے قاتلین ابوجہل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے معاذ بن عفراء اور معاذ بن عمرو بن جموح نے ایک ساتھ مل کر حملہ کیا، اس کے بعد معوذ بن عفراء نے حملہ کیا پھر جب ابوجہل کی روح لڑکھڑانے لگی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کا سر قلم کر دیا۔

ترجمة الباب: مجموعةً يداه إلى عنقه بحبل الخ سے ثابت ہو رہا ہے۔

﴿ بَابٌ في الأَسِيرِ يُنَالُ مِنْهُ ويُضْرَبُ ويقرر ﴾

یہ باب قیدی کو سب وشتم کرنے، مارنے اور زبردستی اقرار کرانے کے بیان میں ہے

۳۱ ﴿حَدَّثَنا مُوسٰى ابنُ إسْمَاعِيلَ ثَنَا حَمَّادٌ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم نَدَبَ أَصْحَابَهُ، فَانْطَلَقُوا إلٰى بَدْرٍ فإذَا هُمْ بِرَوَايَا قُرَيْشٍ؛ فِيهَا عَبْدٌ أَسْوَدَ لِبَنِي الحَجَّاجِ فَأَخَذَهُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلُوا يَسْئَلُوْنَهُ أَيْنَ أَبُو سُفْيَانَ ؟ فَيَقُوْلُ : وَاللّٰهِ مَا لِيْ بِشَيءٍ مِنْ أَمْرِهِ عِلْمٌ ، وَلٰكِنَّ هٰذِهِ قُرَيْشٌ قَدْ جَاءَ تْ فِيهِمْ أَبُوْ جَهْلٍ وَعُتْبَةُ وَشَيْبَةُ ابْنَا رَبِيْعَةَ ، وَأُمَيَّةُ بنُ خلفٍ ، فإذَا قَالَ لَهُمْ ذٰلكَ ضَرَبُوْهُ فَيَقُوْلُ: دَعُوْنِي دَعُوْنِي أُخْبِرُكُمْ فإذَا تَرَكُوْهُ فَقَالَ : وَاللّٰهِ مَا لِيْ بِأَبِي سُفْيَانَ مِنْ عِلْمٍ ، وَلٰكِنَّ هٰذِهِ قُرَيْشٌ قَدْ أَقْبَلَتْ فِيهِمْ أَبُو جَهْلٍ وعُتبةُ وشَيبةُ ابنَا ربيعةَ وَ أُمَيَّةُ بنُ خَلفٍ قَدْ أَقْبَلُوا والنَّبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم يُصَلِّي وهُوَ يَسْمَعُ

ذٰلِكَ ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّكُمْ لَتَضْرِبُوْنَهُ إِذَا صَدَقَكُمْ وَتَدَعُوْنَهُ إِذَا كَذَبَكُمْ هٰذِهِ قُرَيْشٌ قَدْ أَقْبَلَتْ، لِتَمْنَعَ أَبَا سُفْيَانَ، قَالَ أَنَسٌ : قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غداً وَ وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ، وَهٰذا مَصْرَعُ فُلَانٍ ؛ وَ وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ وهٰذا مَصْرَعُ فُلَانٍ غداً ، ووضع يَدَهُ على الْأَرْضِ ، فَقَالَ : وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا جَاوَزَ أَحَدٌ مِنْهُمْ عَنْ مَوْضِعِ يَدِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم . فَأَمَرَ بِهِمْ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فَأُخِذَ بِأَرْجُلِهِمْ فَسُحِبُوْا فَأُلْقُوْا فِيْ قليبِ بَدْرٍ﴾

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو بلایا، تمام صحابہؓ بدر کی طرف چلے تو اچانک ان کو قریش کے پانی والے اونٹ ملے، ان میں بنوحجاج کا ایک سیاہ غلام تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو پکڑ کر پوچھنے لگے کہ بتاؤ ابوسفیان کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ خدا کی قسم میں ابوسفیان کا حال نہیں جانتا، لیکن یہ قریش آئے ہوئے ہیں ان میں ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف ہیں۔ جب اس نے یہ جواب دیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو مارنے لگے وہ کہنے لگا کہ مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو میں ابھی بتلاتا ہوں۔ جب اس کو چھوڑ دیا تو کہنے لگا کہ خدا کی قسم مجھے ابوسفیان کا علم نہیں ہے۔ البتہ قریش آئے ہوئے ہیں جن میں ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف بھی ہیں۔ اس (معاملے کے) وقت حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور یہ (گفتگو) سن رہے تھے، جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ خدا کی قسم جب وہ سچ بولتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو، اور جب جھوٹ بولتا ہے تو تم اس کو چھوڑ دیتے ہو، ابوسفیان کو بچانے کے لیے قریش آگئے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ (جو حدیث کے راوی ہیں) فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کل یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے اور اس جگہ پر اپنا دست مبارک رکھا، اور یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے اور وہاں اپنا دست مبارک رکھا، اور یہ فلاں کے قتل ہونے کی جگہ ہے وہاں بھی آپ نے اپنا دست مبارک رکھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی اس (متعین) جگہ سے تجاوز نہ کرسکا جس جگہ حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک رکھا تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے ان کفار کے بارے میں حکم فرمایا، چنانچہ ان کے پیروں کو پکڑا گیا اور گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں ڈال دیا گیا۔

تشریح مع تحقیق : ندب : از (ن) میت پر رونا، لیکن جب اس کا صلہ ''الیٰ'' آتا ہے تو اس کے معنی ہونگے: بلانا، ندب إلى الحرب، جنگ کے لیے بلانا۔ یہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ (المعجم الوسیط: ۹۱۰)

مَصْرَعُ از (ف) زمین پر گرادینا، پچھاڑ دینا، اور یہ اسم ظرف ہے، جمع: مصارع آتی ہے۔

سحبوا: از (ف) جمع مذکر غائب مجہول کا صیغہ ہے: زمین پر گھسیٹنا۔

رَوَایا: راویة کی جمع ہے، وہ اونٹ جس پر پانی لایا جائے۔

حدیث بالا میں جنگ بدر کے واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کا تفصیلی بیان بخاری شریف اور مسلم شریف میں موجود ہے۔ یہاں پر روایت کو بہت ہی مختصر پیش کیا ہے، لیکن اس روایت کی سند مسلم شریف کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

واقعے کا حاصل یہ ہے کہ جب حضور ﷺ ابوسفیان کے قافلے سے مال کے حصول کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور مقام صفرار میں پہنچے، تو ابوسفیان مع قافلے کے ساحلی کنارے ہو کر نکل گیا تھا، پھر جب حضور ﷺ کو یہ خبر ملی کہ ابوسفیان کی حفاظت کے لیے کفار مکہ آرہے ہیں، تو آپ ﷺ نے صحابہ کو جمع فرمایا اور بدر کی طرف نکلنے کا حکم فرمایا (اس کا تفصیلی بیان باب فی المبارزہ میں گذر چکا ہے فانظر فإن فیه فائدة عظیمة) چنانچہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم بدر کی طرف پہنچے تو مقام بدر سے پہلے ہی ٹھہر گئے، شام کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ، زبیر ابن عوام اور چند صحابہؓ کو مقام بدر بھیجا گیا تاکہ وہاں سے اصل صورت حال کی خبر لائیں، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو دو غلاموں کو پایا (اس حدیث میں صرف ایک غلام کا تذکرہ ہے) اور پھر پورا واقعہ پیش آیا جو حدیث بالا میں مذکور ہے۔

(قوله) ولکن هذا أبو جهل الخ کیونکہ یہ غلام مکہ مکرمہ سے کفار کے لشکر میں آیا تھا، اس لیے کہا کہ مجھے ابوسفیان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا کہ یہ غلام جھوٹ بول رہا ہے اس کو ابوسفیان کی خبر ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مارا۔

(قوله) انصرف الخ یعنی جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غلام جب سچ بولتا ہے تو تم مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے کہ میں ابھی ابوسفیان کی خبر دوں گا تو تم چھوڑ دیتے ہو۔ اس جملے سے حضور ﷺ کا مقصد غلام کی سچائی کو بتلانا تھا، اس کے بعد حضور ﷺ سے ایک معجزے کا اظہار ہوا کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے مقتولین بدر میں سے رؤسار کے مقتل کی تعیین فرمائی اور وہ لوگ بعینہٖ اسی جگہ پر قتل کیے گئے، پھر ان کو ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے خطاب فرمایا کہ اللہ نے ہمارا وعدہ تو پورا کر دیا اور تم لوگ ذلیل ہو گئے۔

دو معجزے

اس حدیث میں آپ ﷺ کے دو معجزے مذکور ہیں:

(۱) غلام کے صادق ہونے کی خبر دینا۔

(۲) رؤسار قریش کے مقتل کی تعیین کرنا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱۶۴/۳)

ترجمة الباب: لفظ "ضربوه" سے ترجمۃ الباب ثابت ہو رہا ہے اور جب اس کو مارنا ثابت ہوا تو برا بھلا کہنا بدرجہ اولی ثابت ہو جائے گا اور جب مارا ہو گا تو ڈانٹا بھی ہو گا۔

﴿بَاب في الأسير يُكْرَهُ على الإسلام﴾

یہ باب قیدیوں کو اسلام پر مجبور (نہ) کرنے کے بیان میں ہے

۳۲ ﴿حَدَّثَنا مُحَمَّدُ بنُ عُمَر بنِ عَلِيٍّ المَقْدَمِيّ قَالَ ثَنا أشْعَثُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ يَعْنِي السِّجِسْتَانِي ح وَثَنا مُحَمَّد بنُ بَشَّارٍ ثَنا ابنُ أَبِي عَدِيٍّ وهذا لَفْظُهُ ح وَثَنا الحَسَنُ بنُ عَلِيٍّ ثَنا وَهْبُ بْنُ جَرِيرٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ أَبِي بِشْرٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَتِ الْمَرْأَةُ تَكُونُ مِقْلَاةً فَتَجْعَلُ عَلىٰ نَفْسِهَا إنْ عَاشَ لَهَا وَلَدٌ أَنْ تُهَوِّدَهُ فَلَمَّا أُجْلِيَتْ بَنُو النَّضِيرِ كَانَ فِيهِمْ أبناءُ الأَنْصَارِ فَقَالُوا: لَا نَدَعُ أَبْنَاءَ نَا، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ "لَا إكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الغَيِّ" قَالَ أَبُودَاوُدَ المِقْلَاتُ: التِيْ لَا يَعِيْشُ لَهَا وَلَدٌ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی عورت ایسی ہوتی کہ اس کا بچہ نہ جیتا تو وہ یہ نذر مان لیا کرتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنادے گی، جب بنونضیر کے یہودیوں کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے بچے بھی تھے، انصار نے کہا کہ ہم اپنی اولاد کو نہ چھوڑیں گے، تو اللہ نے یہ حکم نازل فرمادیا کہ "لا إكراه في الدين" کہ دین میں زبردستی نہیں ہوسکتی، گمراہی اور ہدایت واضح ہو چکی ہیں، جس کو چاہیں اختیار کریں۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ مقلاۃ وہ عورت ہے جس کا بچہ زندہ نہ رہے۔

تشریح مع تحقیق: مِقْلَاة: از (س) ہلاک ہونا أقلتت المرأة: بے اولاد ہونا، مقلات وہ عورت ہے جس کا ایک بچہ ہو اور پھر وہ حاملہ نہ ہو، نیز جو اونٹنی ایک مرتبہ بچہ جن کر دوبارہ حاملہ نہ ہو اس کو بھی مقلاۃ کہتے ہیں۔ امام ابوداؤد نے مقلات کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ ایسی عورت ہے جس کے بچے نہ جیتے ہوں۔

اس حدیث کی تین سندیں بیان کی ہیں، روایت بالکل صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہودی مذہب کو اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے جس عورت کا بچہ نہ جیتا تھا وہ نذر مان لیا کرتی تھی کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بنادوں گی۔ اسی وجہ سے انصار کی بہت سی اولاد یہودی تھی۔

لیکن جب ۴ ہجری میں حضور ﷺ نے بنونضیر کو ان کی بری حرکتوں کی وجہ سے جلاوطن کیا تو ان میں انصار کے

وہ بچے بھی شامل تھے جو یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے ہم نے ان کو اس وقت یہودی بنا دیا تھا جب ہم مذہب یہودیت کو اچھا سمجھتے تھے، مگر اب اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور تمام ادیان سے افضل دین ہمارے پاس ہے تو ہم اپنے بچوں کو یہودی نہ رہنے دیں گے، اور انھیں اسلام پر مجبور کریں گے اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ "لا إكراه في الدين" کہ ان کو جبراً مسلمان مت بناؤ الخ اس واقعے کو الفاظ اور مضمون کے جزوی اختلاف کے ساتھ ابوداؤد، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔

محمد ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک دوسری روایت نقل کی ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ انصار میں سے ایک شخص کے دو بیٹے نصرانی تھے اس نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے بیٹے نصرانیت کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے کیا میں ان کو مجبور کر سکتا ہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اعتراض

آیت کریمہ "لا إكراه في الدين" کو سامنے رکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام میں زبردستی نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن میں جہاد اور قتال کی آیات اس سے معارض اور مخالف ہیں؟

جوابات

(۱) اس اعتراض کے جواب میں آیت کریمہ کے مفہوم میں بہت کچھ کلام کیا گیا ہے بعض لوگ اس آیت کو منسوخ کہتے ہیں، اور قائلین نسخ کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ وہ اس آیت کو احکام قتال کی آیات کے ساتھ تطبیق نہیں دے سکتے ورنہ کوئی صحیح روایت اس کے نسخ کی تائید نہیں کرتی۔ اور نسخ کا دعویٰ بھی عہد رسالت سے بعد کی چیز ہے اگر عہد رسالت میں اس کا علم ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے شریعت کے نکتہ داں اپنے مملوک "اسبق" کو قبول اسلام سے انکار کرنے کی آزادی نہ دیتے؛ ابن ابی حاتم کی روایت ہے:

عن أسبق قال كنتُ في دينهم مملوكاً نصرانيًا لعمر بن الخطاب فكان يعرض عليّ الإسلام فأبي ، فيقول لا إكراه في الدين ويقول يا أسبق لو أسلمتَ لاستعنا بك على بعض أمور المسلمين .

"اسبق" کا کہنا ہے کہ میں حضرت عمرؓ کا نصرانی غلام تھا، آپ مجھے اسلام کی دعوت دیتے تھے مگر میں انکار کر دیتا تھا، اس پر آپ کہتے تھے کہ "لا إكراه في الدين" اور کہتے کہ اگر تو اسلام قبول کر لیتا تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے کام میں مدد لیتے۔ لہٰذا نسخ کا دعویٰ تو صحیح نہیں ہے۔

(۲) بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف اہل کتاب کے لیے ہے، لیکن ان کے پاس بھی اپنے دعوے

کے لیے کتاب وسنت کی تصریحات میں سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۳) حقیقت یہ ہے کہ آیات جہاد قبولِ اسلام پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہیں؛ ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے کے اُحکام کیسے اور کیوں جاری ہوتے؛ بلکہ آیات قتال دفع فساد کے لیے ہیں، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور کفار فساد کے درپے رہتے ہیں ویسعون في الارض فساداً اس لیے اللہ نے فساد کو دور کرنے کی غرض سے جہاد وقتال کا حکم صادر فرمایا۔ لہٰذا ان کافروں کا قتل ایسے ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کا قتل۔ اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج کے قتل کو میدان جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے کیونکہ یہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہوجاتا ہے کہ جہاد اور قتال لوگوں کو اسلام پر مجبور نہیں کرتا ہے بلکہ دنیا میں ظلم کو مٹا کر عدل وانصاف قائم رکھنا ہے۔ اور پھر جہاد کا تعلق تو ظاہری اعضاء سے ہے اور ایمان کا تعلق دل سے ہے لہٰذا جبراً اسلام قبول کروانا محال اور ناممکن ہے۔ (معارف القرآن بحوالہ تفسیر مظہری: ۱/ ۶۱۷)

ترجمة الباب: لا إكراه في الدين سے ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ باب کا مقصد اکراہ فی الدین کے عدم جواز کو بتلانا ہے اور حدیث میں بھی عدم اکراہ کا بیان ہے لہٰذا مطابقت ہوگئی۔

﴿بَاب في الأسير يقتل ولا يعرض عليه الإسلام﴾

اس باب میں ایسے قیدی کا بیان ہے جسکو بغیر اسلام پیش کیے قتل کر دیا جائے

۳۳ ﴿حَدَّثَنا عُثْمَانُ بنُ أبِي شَيْبَةَ ثَنَا أحمدُ بنُ المُفَضَّلِ ثَنَا أَسْبَاطُ بنُ نَصْرٍ قَالَ زَعَمَ السدي عن مُصْعَب بنِ سَعْدٍ عَنْ سَعْدٍ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ أَمِنَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَعْنِي النَّاسَ إلَّا أَرْبَعَةَ نَفَرٍ وامْرَئتَيْنِ وَسَمَّاهُمْ وَابنَ أَبِي سَرْحٍ فَذَكَرَ الحَدِيْثَ ؛ قَالَ وَأَمَّا بنُ أَبِي سَرْحٍ فَإنَّهُ اخْتَبَأَ عِنْدَ عُثْمَانَ بنِ عَفَّانَ فَلَمَّا دَعَا رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم الناسَ إلى البَيْعَةِ جَاءَ بِهِ حَتّٰى أَوْقَفَهُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم ، فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللهِ بَايِعْ عَبْدَ اللهِ ؟ فَرَفَعَ رَأْسَهُ فَنَظَرَ إلَيْهِ ثَلٰثًا كلّ ذلكَ يَأْبىٰ فَبَايَعَهُ بَعْدَ ثَلٰثٍ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلٰى أصْحَابِهِ فَقَالَ أمَا كَانَ فِيكُم رَجُلٌ رَشِيْدٌ يَقُوْمُ إلٰى هذا ؟ حَيْثُ رَآنِي كَفَفْتُ يَدَيَّ عَنْ بَيْعَتِهِ فَيَقْتُلَهُ ؟ فَقَالُوا : مَانَدْرِيْ يَارَسُوْلَ اللهِ مَا فِي نَفْسِكَ، أَلَّا أَوْ مَاتَ إلَيْنَا بِعَيْنَيْكَ ؟ قَالَ لا يَنْبَغِي لِنَبِيٍّ أَنْ تَكُوْنَ لَهٗ خَائِنَةُ الأعْيُنِ، قَالَ أبوداؤد : كَانَ عَبْدُ اللهِ أخا عُثْمَانَ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَ

كَانَ الْوَلِيْدُ بنُ عُقْبَةَ أَخا عُثمانَ لأُمِّهِ وَضَرَبَ عُثْمَانُ الحَدَّ إِذَا شَرِبَ الخَمْرَ﴾

ترجمہ: حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں کو امان دیدیا تھا، مگر چار مردوں اور دو عورتوں کو امن نہیں دیا تھا۔ اوران کا نام ذکر کیا ان میں ابن ابی سرح کا نام بھی ذکر کیا۔ ابن ابی سرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس چھپ گئے تھے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن ابی سرح کو حضور کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی ان کو بیعت کر لیجیے، آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور تین مرتبہ دیکھا لیکن بیعت نہیں کی، اس کے بعد بیعت لی، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں کوئی عقلمند آدمی نہیں تھا جو اٹھتا اور جب مجھ کو دیکھا کہ میں نے بیعت کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیا ہے تو اس کو قتل کر دیتا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہمیں آپ کے دل کا حال معلوم نہیں تھا، آپ ﷺ نے اپنی آنکھ سے اشارہ کیوں نہ فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کے لیے مناسب نہیں کہ اس کے خیانت کنندہ آنکھیں ہوں۔ امام ابوداؤد نے کہا کہ ابن ابی سرح حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا اور ولید بن عقبہ ان کے اخیافی بھائی تھے۔ انھوں نے شراب پی تھی تو حضرت عثمان نے ان کو حد لگائی تھی۔

تشریح مع تحقیق: اس باب کے تحت اس حدیث کو لاکر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ قیدی کو قتل کرنا جائز ہے اور اس پر اسلام نہ پیش کیا جائے تب بھی اس کو قتل کیا جاسکتا ہے اور اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی قیدی کو قتل کر دے تو قاتل پر کچھ لازم نہ ہوگا، جب حضور ﷺ کسی لشکر کو روانہ کرتے تو تین باتوں کی ہدایت فرماتے تھے کہ اول اسلام کو پیش کرنا اگر اسلام کو قبول نہ کریں تو جزیہ کو پیش کرنا اور اگر جزیہ بھی نہ دیں تو قتل کرنا اور غلام بنالینا۔ اگر کفار کو اسلام کی دعوت پہنچ جائے اور معلوم ہوجائے کہ دعوت پہنچ چکی ہے تو ان پر اچانک حملہ کرنا بھی جائز ہے۔

یہاں روایت میں چار مردوں اور دو عورتوں کا استثناء ہے اور سیر کی کتابوں میں گیارہ مرد اور چھ عورتوں کا استثناء ہے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے اولاً چار کے بارے میں فرمایا پھر گیارہ کے بارے میں فرمایا (بذل: ۴/۱۸) انہیں مستثنیٰ لوگوں میں سے ابن ابی سرح ہیں یہ اپنے دادا کی طرف منسوب ہیں جو مسلمان تھے پھر مرتد ہوکر اسلام لے آئے جیسا کہ روایت میں مذکور ہے کہ حضرت عثمان ان کو حضور کی خدمت میں لائے اور پھر انہوں نے اسلام کو قبول کیا۔

سوال

جب حضرت عثمان نے ابن ابی سرح کو پناہ دیدی تھی پھر حضور ﷺ کا قتل کو کہنا یہ کیسے جائز ہے؟

جواب

اس کے دو جواب ہیں: (۱) حضرت عثمان کے لیے پناہ دینا ممکن ہی نہیں تھا اس لیے کہ حضور نے اعلان کر دیا

تھا کہ ابن ابی سرح کا خون معاف نہیں ہے لہذا یہ پناہ میں نہیں تھا۔ (۲) اگر تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عثمان نے پناہ دیدی تھی تو پناہ دینا بغیر حضور کی اجازت کے نافع نہیں تھا کیونکہ حضور نے اعلان فرمادیا تھا کہ حل وحرم میں اس کا خون معاف نہیں ہے اس وجہ سے آپ ﷺ نے قتل کو فرمایا۔

خائنۃ الاعین: خائنۃ اسم فاعل مصدر کے معنی میں ہے یعنی خیانت کرنا یا صفت کی اضافت موصوف کی طرف کردی گئی ہے یعنی ''الاعین الخائنۃ'' پھر چونکہ مضاف پر الف لام نہیں ہوتا ہے اس لیے خائنۃ الاعین کردیا مطلب اس کا یہ ہے کہ دل میں ایسی بات چھپائے جس کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرے اس لیے کہ جب آنکھوں سے ایسی چیز کی طرف اشارہ کرے گا جس کو زبان پر نہیں لاتا تو گویا آنکھوں سے خیانت کی اس وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے۔

قال ابو داؤد الخ: یہاں بتلایا کہ عبداللہ بن ابی سرح حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے پھر جب رضاعی بھائی نام آیا تو امام ابوداؤد نے استطرادا ولید بن عقبہ کا بھی ذکر کردیا کہ یہ حضرت عثمان کے اخیافی بھائی تھے سیاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ایک بات نکل آئی تو ان کا نام بھی ذکر کردیا۔

ترجمۃ الباب: أمّا كان فيكم رجل رشيد يقوم الى هذا حيث رآني كففت يديّ عن بيعته فيقتله سے ثابت ہے کہ کیونکہ یہ قیدی تھے اور آپ نے قتل کرنے کو کہا معلوم ہوا کہ قیدی کا قتل کرنا جائز ہے۔

نوٹ: سند میں ایک راوی سُدّی کے نام سے مذکور ہیں ان کا اصل نام اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ ہے بعض لوگوں نے ان پر جرح کی ہے لیکن ابن حبان وغیرہ حضرات نے ان کی توثیق فرمائی ہے۔

۳۴ ﴿حَدَّثَنا مُحَمَّدُ بنُ العَلاءِ ثَنا زَيْدُ بنُ حُبَابٍ أنا عَمرو بنُ عُثمانَ بنِ عَبدِ الرحمٰنِ بنِ سَعِيْدِ بنِ يَرْبُوعٍ المَخْزُومِيُّ ثَنِي جَدِّي عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسولَ اللّٰهِ صلَّى اللّٰه عليه وسلم قَالَ يَوْمَ فَتحِ مَكَّةَ: أَرْبَعَةٌ لَا أُومِنُهُمْ فِي حِلٍّ وَلَا حَرَمٍ فَسَمَّاهُمْ قَالَ وَقِيْنَتَيْنِ كَانَتَا لِمَقِيْسٍ فَقُتِلَتْ إحداهُمَا وَافْتَلَتِ الأُخرىٰ فَأَسلَمَتْ قالَ أبو داوٗدَ : لَمْ أَفْهَمْ اِسْنَادَهٗ مِنْ ابنِ العَلاءِ كَمَا أُحِبُّ﴾

ترجمہ: حضرت سعید بن یربوع مخزومی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار مرد ہیں جن کو میں امان نہیں دیتا نہ حل میں اور نہ حرم میں پھر ان کا نام لیا اور دو لونڈیوں کا (نام لیا) جو مقیس بن ضبابہ کی تھیں ایک لونڈی ان میں سے قتل کردی گئی اور دوسری بھاگ گئی پھر وہ مسلمان ہوگئی۔ ابوداؤد نے کہا کہ میں اس حدیث کی اسناد ابن العلاء سے اچھی طرح نہیں سمجھا۔

تشریح مع تحقیق: یہ حدیث بھی فتح مکہ کے وقت کی ہے کہ آپ ﷺ نے چار آدمیوں کا استثناء

کیا کہ ان کو حل وحرم میں پناہ نہیں دوں گا وہ چار آدمی یہ تھے:

(۱) عکرمہ بن ابی جہل، جو مکہ سے بھاگ کر شام کی طرف جانے لگے ان کی بیوی حضور سے اجازت لے کر ان کے پیچھے گئی اور ان کو لے آئی پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

(۲) عبداللہ بن ابی السرح جو مرتد ہو کر اسلام لائے۔ ان کا تذکرہ پچھلی روایت کے تحت گذر چکا ہے۔

(۳) عبداللہ بن خطل یہ مسلمان تھا حضور ﷺ نے لشکر کا ان کو امیر بنا کر بھیجا اس نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ وہ ایک بکری ذبح کر کے کھانا تیار کرے اور میں سونے کے بعد کھاؤں گا، جب وہ سو کر اٹھا تو کھانا تیار نہیں تھا غصہ میں آکر ان صحابی کو قتل کر دیا اور قصاص کے خوف سے مرتد ہو گیا، فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ کے پردے سے لٹکا ہوا تھا چنانچہ اس کو قتل کر دیا گیا۔

(۴) مقیس بن ضبابہ اس کو بھی قتل کیا گیا ہے۔ اور دو عورتوں کو پناہ نہیں دی جو مقیس بن ضبابہ کی باندی تھیں ایک کا نام "قُریبہ" تھا اور دوسری کا نام "فرتنیٰ" تھا ان میں سے قریبہ قتل کر دی گئی اور فرتنیٰ مسلمان ہو گئی۔ یہ دونوں باندیاں حضور کی ہجو کرتی تھیں اور دونوں مغنیہ تھیں۔

سوال

اہل سیر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں باندیاں ابن خطل کی تھیں اور ابوداؤد میں ان کو مقیس بن ضبابہ کی باندیاں بتلایا ہے؟

جواب

اس کے دو جواب ہیں: (۱) دونوں کی مشترکہ باندیاں تھیں۔ (۲) پہلے ابن خطل ان کا مالک ہوگا پھر مقیس نے ان کو خرید لیا ہوگا یا اس کا عکس ہو۔ بقیہ مستثنین کی تعداد میں اختلاف ہے اس کو پہلی روایت میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

قال ابو داؤد الخ ابوداؤد کہتے ہیں کہ میں نے اس سند کو ٹھیک سے نہیں سنا بعد میں کسی ساتھی کے واسطے سے ٹھیک سنی ہے۔

ترجمة الباب: فَقُتِلَتْ إِحْدَاهُمَا سے ثابت ہے۔

﴿مسئلة خلافية﴾

حدیث کی تشریح سے معلوم ہوا کہ ابن خطل کو خانہ کعبہ میں قتل کیا گیا ہے اب ائمۂ کرام میں اختلاف ہو گیا کہ حرم پاک کسی کو پناہ دیتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں: (۱) اگر جنایت مادون النفس ہو تو بالاتفاق اس کا

قصاص حرم میں لیا جاسکتا ہے حرم اس کو پناہ نہیں دے گا۔ (۲) اگر جنایت قتل کی ہے اور حرم میں کی ہے تو بھی حرم پناہ نہیں دے گا۔ (۳) اور اگر حرم سے باہر کی جنایت ہے تو اس صورت میں اختلاف ہے۔

امام مالک اور امام شافعیؒ اس صورت میں حرم میں قصاص کو جائز قرار دیتے ہیں کہ حرم اس کو پناہ نہیں دیگا۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ حرم اس کو پناہ دیگا اور حرم میں قصاص نہیں لیا جائے گا۔

دلائل فریق اول

(۱) ابن خطل کو حرم میں قتل کیا گیا معلوم ہوا کہ حرم عاصی کو پناہ نہیں دیتا ہے۔

(۲) إن الحرم لا يعيذ عاصيًا ولا فاراً بخربة (بخاری:۱/۲۱)

دلائل فریق ثانی

(۱) إنَّهَا (مكة) لَمْ تَحِلَّ لِأحَدٍ قَبْلِيْ وَلاَ تَحِلُّ لِأحَدٍ بَعْدِيْ وَإِنَّها حلت لي سَاعَة (بخاری:۱/۲۲)

(۲) لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ أن يَسْفِكَ بهَا دمًا الخ (ترمذی:۱/۱۶۷)

(۳) حرم میں قتل کرنا آیت قرآنی "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمناً" کے بھی خلاف ہے۔

فریق اول کی روایات کے جوابات

(۱) علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ ابن خطل کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب مکہ میں حضور کے لیے قتال حلال کردیا گیا تھا یعنی فتح مکہ کے دن صبح سے عصر تک اس کے بعد پھر حرمت کو ثابت کردیا گیا جیسا کہ بخاری میں ہے حلت لي ساعةً۔

(۲) دوسری روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ عمرو بن سعید کا قول ہے نہ کہ حضور کا اور عمرو بن سعید ایک گورنر تھا اور ان کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے چنانچہ ان کو "لطيم الشيطان" (شیطان کا تھپڑ مارا ہوا، جس پر شیطان کا تھپڑ لگا ہو) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ (فتح الملہم:۳/۳۹۴، معارف السنن:۶/۷۰، الابواب والتراجم:۲/۹۷)

۳۵ ﴿حَدَّثَنا القَعْنَبِيُّ عَنْ مَالِكٍ عَنْ ابنِ شِهَابٍ عَنْ أنَسِ بنِ مَالِكٍ أنَّ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم دَخَلَ مَكَّةَ عَامَ الفَتْحِ وَعَلٰى رَأْسِهٖ مِغْفَرٌ فَلَمَّا نَزَعَهٗ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ: ابنُ خَطَلٍ مُعَلَّقٌ بأسْتَارِ الكَعْبَةِ، فَقَالَ: اقْتُلُوهُ، قَالَ أبو داوٗد إسْمُ ابنُ خَطَلٍ عَبْدُ اللّٰهِ وَكَانَ أبو بَرْزَةَ الأَسْلَمِيُّ قَتَلَهٗ﴾

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر لوہے کی ٹوپی تھی جب آپ ﷺ نے اس ٹوپی کو اتارا تو ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ

یارسول اللہ ابن خطل کعبے کے پردے سے چمٹا ہوا ہے، حضور نے فرمایا کہ اس کو قتل کر ڈالو۔ امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ ابن خطل کا نام: عبداللہ تھا۔ اور اس کو ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ہے۔

تشریح مع تحقیق : مِغْفَر : لوہے کی ٹوپی جو حفاظت کی غرض سے پہنی جاتی ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردے سے چمٹا ہوا ہے، یہ سن کر حضور ﷺ نے اس کے قتل کا حکم فرمادیا۔ اور اس معلون کو خانہ کعبہ میں ہی قتل کر دیا گیا۔

ابن خطل کے قاتلین

ابن خطل کے قاتلین کے سلسلے میں تین نام ہیں: (۱) ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ، (۲) سعید بن حریث مخزومیؓ، (۳) عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ ان تینوں ناموں میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ یہ تینوں حضرات اس کو قتل کرنے کے لیے چلے حضرت عمار رضی اللہ عنہ ضعیف تھے اس لیے پیچھے رہ گئے، حضرت ابو برزہؓ پہلے پہنچے اور ابن خطل کو مار کر گرادیا۔ پھر سعید بن حریث پہنچے انھوں نے بھی کئی وار کیے، لیکن عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کوئی وار نہ کر سکے، مگر چونکہ مارنے کے لیے گئے تھے اس لیے ان کی طرف بھی نسبت کردی گئی۔ ورنہ حقیقت میں تو ابو برزہ اسلمی ہی قاتل ہیں۔ امام ابوداؤد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ بعض حضرات نے علی بن ابی طالب اور شریک بن عبدہ عجلانی کی طرف نسبت کی ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔

(قوله) علی رأسه مغفر الخ: اس جملے کے بارے میں اعتراض کیا گیا ہے کہ حرم شریف کی حرمت تو خود پہننے سے مانع ہے لہٰذا صحیح عبارت "علی رأسه عمامة" ہے۔

جواب

اصل میں یہ اعتراض امام مالک پر کیا گیا ہے کہ امام مالک کو اس جگہ وہم ہو گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس نے امام مالک کی طرف وہم کی نسبت کی ہے اس کو خود وہم ہو گیا ہے۔ اولاً: تو اس لیے کہ امام مالکؒ اس کو اکیلے ہی روایت نہیں کرتے بلکہ دس سے زائد راوی اس جملے کو نقل کرتے ہیں۔ ثانیاً: اس لیے کہ اس دن مکہ کی حرمت اٹھالی گئی تھی، اور صبح سے عصر تک کے لیے مکہ میں قتل کرنا حلال ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہ جملہ بالکل صحیح ہے۔ (بذل: ۴/ ۱۸، فتح الباری: ۶/ ۲۱۴)

قال أبو داؤد : امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ابن خطل کا اصلی نام عبداللہ تھا۔ اور اس کو حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے جہنم رسید کیا ہے۔

ترجمة الباب : حدیث میں ہے اقتلوه . اس سے ترجمۃ الباب ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے قتل کا حکم فرمایا اور اس کو قتل کر دیا گیا اور اس پر اسلام کو پیش نہیں کیا گیا۔ (حاشیہ ابوداؤد شریف: ۲/ ۳۶۵)

﴿بَاب في قتل الأسير صبرًا﴾

یہ باب قیدی کو باندھ کر قتل کرنے کے بیان میں ہے

۳۶ ﴿حَدَّثَنا عَلِيُّ بنُ الحُسَيْنِ الرَّقِيُّ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بنُ جَعْفَرِ الرَّقِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللّٰهِ بنُ عَمْرٍو عَنْ زَيْدِ بنِ أَبِي أُنَيْسَةَ عَنْ عَمْرِو بنِ مُرَّةَ عَنْ إبراهِيمَ قَالَ أَرَادَ الضَّحَاكُ بنُ قَيْسٍ أَنْ يَسْتَعْمِلَ مَسْرُوْقًا، فَقَالَ لَهُ عُمَارَةُ بنُ عُقْبَةَ: أَتَسْتَعْمِلُ رَجُلًا مِنْ بَقَايَا قتلة عُثْمان؟ فَقَالَ لَهُ مَسْرُوْقٌ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بنُ مَسْعُوْدٍ وَكَانَ مِنْ أَنْفُسِنَا مَوْثُوْقَ الحديث، أَنَّ النبيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا أَرَادَ قَتْلَ أَبِيْكَ قَالَ مَنْ لِلصِّبْيَةِ قَالَ النَّارُ، قَالَ رَضِيْتُ لَكَ مَا رَضِيَ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ﴾

ترجمہ: حضرت ابراہیم سے روایت ہے کہ ضحاک بن قیس نے مسروق کو عامل بنانا چاہا تو عمارہ بن عقبہ نے ان سے کہا کہ آپ ایسے شخص کو عامل بنارہے ہیں جو قاتلین عثمانؓ میں سے باقی رہ گیا ہے۔ مسروق نے ان سے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان کی۔ اور وہ ہم میں بڑے معتبر ہیں۔ کہ جب حضور ﷺ نے تیرے باپ عقبہ بن ابی معیط کے قتل کا ارادہ فرمایا تو اس نے (تیرے باپ نے) کہا تھا کہ بچوں کی کفالت کون کرے گا؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا تھا کہ آگ (کفالت کرے گی) پس میں تیرے لیے اس چیز کو پسند کرتا ہوں جس کو رسول اللہ ﷺ نے تیرے لیے پسند کیا ہے۔

تشریح مع تحقیق: الصِّبْيَةُ: صبيّ کی جمع ہے۔ وہ بچہ جس کا ابھی دودھ چھڑایا گیا ہو۔ اس کی دوسری جمع ''صبیان'' بھی آتی ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب (صحابی صغیر، فاطمہ بنت قیس کے بھائی) ضحاک بن قیس نے حضرت مسروق کو عامل بنانا چاہا تو عمارہ بن عقبہ ابن ابی معیط۔ اسی عقبہ بن ابی معیط نے نماز پڑھتے ہوئے حضور ﷺ کے اوپر اوجھڑی رکھی تھی۔ نے کہا کہ آپ ایسے شخص کو عامل بناتے ہیں جو قاتلین عثمان میں سے ہے۔ یہ حضرت مسروق پر تہمت تھی اس کے جواب میں حضرت مسروق نے کہا کہ جب تیرے باپ کو جنگ بدر کے دن باندھ کر قتل کیا گیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میرے بچوں کی کفالت کون کرے گا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آگ کفالت کرے گی یعنی تمہاری کفالت حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق آگ کرے گی۔ پھر بھی مجھے تہمت لگاتے ہو پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، حضرت مسروق کا عمارہ بن عقبہ کو یہ کہنا کہ تمہاری کفالت آگ کرے گی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے

عمارہ میں کوئی ایسی علامت دیکھی جس کی وجہ سے وہ آگ کا مستحق ہو۔ ورنہ حضور ﷺ کا فرمان تو سامنے تھا ہی۔

من للصبية الخ اس کے معنی میں دو احتمال ہیں: (۱) حضور ﷺ نے جواب میں نار کہہ کر ضائع ہونا مراد لیا ہو یعنی تیری اولاد ضائع ہو جائے گی۔

(۲) حضور ﷺ نے بطور اسلوب حکیم کے جواب دیا ہو کہ تیرے لیے آگ تیار ہے اس کی فکر کر بچوں کے معاملے کو چھوڑ اللہ ان کا کفیل ہے۔

اعتراض

یہاں پر ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تو قتل بالصبر کا جواز معلوم ہوا جب کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا دونوں روایتیں بظاہر متعارض ہیں؟

جواب

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت اس صورت پر محمول ہے کہ زندہ جانور کو باندھ کر نشانہ بازی اور تیر اندازی کی جائے کیونکہ اس میں بلاضرورت جانور کو ایذاء دینا ہے۔

ترجمة الباب: اس باب میں حدیث مذکور کو لا کر قیدی کو باندھ کر قتل کرنے کے جواز کو بتلانا مقصود ہے، کیونکہ عقبہ ابن ابی معیط کو بدر کے دن باندھ کر قتل کیا گیا تھا۔

﴿بَاب في الأسير بالنبل﴾

یہ باب قیدی کو باندھ کر تیر سے مارنے کے بیان میں ہے

۴۷ ﴿حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بنُ مَنْصُوْرٍ ثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بنُ وَهْبٍ قَالَ أَخبَرَنِي عَمرو بنُ الحَارِثِ عَنْ بُكَيْرِ بنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الأَشَجِّ عَنِ ابنِ تِعْلِي قَالَ غَزَوْنَا مَعَ عَبْدِ الرحمنِ ابنِ خَالِدِ بنِ الوَلِيْدِ فَأُتِيَ بِأَرْبَعَةِ أَعْلَاجٍ مِنَ العَدُوِّ فَأَمَرَ بِهِمْ فَقُتِلُوا صَبْرًا، قَالَ أَبُوداؤدَ قَالَ لَنَا غَيْرُ سَعِيْدٍ عَنِ ابنِ وَهْبٍ فِي هذا الحَدِيْثِ قَالَ بالنَّبْلِ صَبْرًا فَبَلَغَ ذلكَ أبا أَيُّوبَ الأنصاريَّ فَقَالَ سَمِعتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يَنْهٰى عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ كَانَتْ دَجَاجَةٌ مَا صَبَرْتُهَا فَبَلَغَ ذلكَ عَبْدَ الرحمنِ بنَ خَالِدِ بنِ الوَلِيْد فأَعْتَقَ أَرْبَعَ رِقَابٍ﴾

ترجمہ: ابن تعلی رحمہ اللہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے ساتھ جہاد کیا، ان کے سامنے چار موٹے تازے عجمی کافر لائے گئے، انھوں نے حکم دیا اور ان کو باندھ کر قتل کر دیا گیا، امام ابوداوٗد نے کہا کہ سعید کے علاوہ اور لوگوں نے یوں بیان کیا ہے کہ ان کافروں کو تیروں سے مارا گیا، جب یہ خبر ابوایوب انصاریؓ کو پہنچی تو انھوں نے کہا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مرغی بھی ہو تو میں اس کو اس طرح قتل نہیں کروں گا، جب یہ خبر عبدالرحمٰن ابن خالد بن ولید کو پہنچی تو انھوں نے چار غلام آزاد کیے۔

تشریح مع تحقیق : أعلا ج عِلْجٌ کی جمع ہے، بمعنی موٹا اور طاقت ور عجمی کافر، بعض حضرات مطلق کافر کو بھی علج کہتے ہیں، معجم الوسیط میں ہے کہ علج کے معنی اکھڑ خشک مزاج آدمی کے ہیں، اس کی جمع علوج بھی آتی ہے۔

صبرًا : از (ض) جب صلہ "علیٰ" آئے گا تو اس کہ معنی بہادری کے ہونگے جیسے کہا جاتا ہے صَبَرْتُ علىٰ فُلانٍ : میں فلاں پر دلیر ہو گیا اور جب صلہ "عن" آئے تو اس کے معنی ہونگے حَبْسٌ کے، جیسے صَبَرْتُ عن الشيء : میں فلاں چیز سے رک گیا، اور حدیث پاک میں دوسرے معنی ہی تقریبا ملحوظ ہیں اور مراد یہ ہے کہ قیدی کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کو تیر سے قتل کرنا۔

نبل : ج نِبَالٌ و أنْبَالٌ آتی ہے بمعنی تیر۔

یہ روایت مسند احمد میں تین سندوں سے ذکر کی گئی ہے، جن میں سے دو سندوں میں بکير ابن الأشجع کے بعد عن أبيه کا واسطہ ہے، علامہ حافظ ابن حجر بھی یہی فرماتے ہیں لہٰذا ابوداوٗد کی مذکورہ سند منقطع ہے لیکن حدیث بالکل صحیح ہے جیسا کہ دوسری متصل اسناد والی حدیثوں سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔ (بذل:۴/۲۰)

مسئلہ

اس حدیث سے ایک مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ کسی جاندار کو باندھ کر تیر اندازی کر کے مارنا ممنوع ہے کیونکہ اس طرح جانور کو تکلیف بیجا دینا ہے جو کہ حضور ﷺ کے ذیلی فرمان کے صریح مخالف ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر چیز کے ساتھ اچھا سلوک کرو، یہاں تک کہ قتل بھی جلدی سے کرو کہ زیادہ اذیت نہ پہنچے۔

فائدہ

جب حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کو یہ حدیث پہنچی کہ حضور نے قتل بالصبر سے منع فرمایا ہے تو آپ نے چار کافروں کو صبراً قتل کرنے کی جنایت میں چار غلام آزاد کیے۔

ترجمة الباب : بالنبل صبراً سے ثابت ہو رہا ہے۔ (بذل:۴/۲۰)

باب في المنّ على الأسير بغير فداء

اس باب میں قیدی کو بغیر فدیہ کے احسان کر کے چھوڑنے کا بیان ہے

۳۸ ﴿حَدَّثَنَا موسى بنُ إسمعيلَ ثنا حَمّادٌ قالَ أَنَا ثَابِتٌ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ ثَمانِيْنَ رَجُلاً مِنْ أَهْلِ مَكَّةَ هَبَطُوا على النبيِّ صلى الله عليه وسلم وأصحابِهِ مِنْ جِبَالِ التَّنْعِيْمِ عِنْدَ صلاةِ الفجرِ لِيَقْتلوهُم، فأَخذَهم رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم سلماً فأعتقهم رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم، فأَنْزَلَ اللّٰهُ عز وجل: وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ إلى آخِرِ الآيَةَ﴾

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ مکہ کے اسّی آدمی آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو قتل کرنے کے ارادے سے (حدیبیہ کے سال) فجر کی نماز کے وقت جبل تنعیم کی طرف سے اتر آئے، آپ ﷺ نے ان کو گرفتار کرلیا جب وہ لوگ مطیع ہوگئے تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کردیا، اس پر یہ آیت: وَهو الذي كف أيديهم عنكم الخ نازل ہوئی، کہ وہ ایسی ذات ہے جس نے تم سے بطن مکہ میں ان کا ہاتھ روک دیا اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا، (ان کو تم سے بچایا کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا اور تم کو ان سے بچادیا کہ وہ قتل کرنے میں ناکام ہوگئے۔)

تشریح مع تحقیق: سَلَمًا: جب اس کو ''سین اور لام'' کے فتحہ کے ساتھ پڑھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تابعداری قبول کرتے ہوئے گرفتار ہوگئے۔

اور جب ''سین'' کے کسرے کے ساتھ پڑھیں گے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ صلح کر کے گرفتار ہوئے، ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے معنی کو ہی ترجیح دی ہے کیونکہ ان کو قہراً پکڑا گیا ہے اور صلح قہراً نہیں ہوا کرتی بلکہ جب وہ قتل کرنے میں ناکام ہوگئے تو انھوں نے گرفتاری دیدی۔

اس حدیث میں صلح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ ۶ ہجری میں عمرے کے ارادے سے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ کے قریب تقریباً تین میل کے فاصلے پر مقام تنعیم میں پہنچے جہاں سے عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے حضرت عائشہؓ کو عمرہ کرایا تھا اور آپ ﷺ اس وقت خاص وادی نعمان میں تھے کہ اچانک ۸۰ کفار آپ اور آپ کے صحابہ پر حملے کے ارادے سے جبل تنعیم سے اتر آئے، لیکن وہ اپنی ناپاک سازش میں نامراد ہوگئے اور قتل نہ کر سکے اتنے میں آپ کے جاں نثار صحابہ نے ان کو گرفتار کرلیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا اور ان سب کو آزاد کردیا۔

ترجمة الباب: فاعتقهم سے ثابت ہو رہا ہے کہ حضور نے ان کو بغیر کسی عوض کے آزاد کردیا۔

٣٩ ﴿حَدَّثَنا محمّد بنُ يحيیٰ بنِ فارسٍ قال ثنا عبدُ الرّزاق قالَ أنا مَعْمَرٌ عَنِ الزهريِّ عَنْ محمّد بنِ جُبَيْرِ بنِ مُطْعِمٍ عَنْ أبِيْهِ أنَّ النبيَّ صلّى اللّٰهُ عليه وسلّم قالَ لأسَارىٰ بدرٍ: لو كان مطعمُ بنُ عديٍّ حيًّا ثُمَّ كَلَّمَنِيْ في هؤلاء النَّتْنىٰ لأَطْلَقْتُهم له﴾

ترجمه: حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان ناپاک قیدیوں کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتا تو میں اس کی خاطر ان قیدیوں کو چھوڑ دیتا۔

تشریح مع تحقیق: النتنیٰ: نَتَنٌ کی جمع ہے بمعنی بدبودار اور گندہ، یہ لوگ اپنے عقیدے کے اعتبار سے گندے ہیں، اسی وجہ سے ان کو گندا فرمایا ہے۔

اصحاب سیر لکھتے ہیں کہ جبیر ابن مطعم حضور ﷺ کے پاس آئے جب کہ وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں سفارش کی تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تمہارے والد معطم بن عدی زندہ ہوتے تو میں ان کی سفارش قبول کر لیتا اور ان قیدیوں کو چھوڑ دیتا، شارحین کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان تین وجہ سے تھا:

(١) اس لیے کہ مطعم بن عدی نے شعب ابی طالب کے بائیکاٹ کو ختم کرنے میں بہت سعی کی تھی۔

(٢) جب آپ ﷺ طائف سے واپس آئے اور مکہ والوں نے مکے میں داخل نہ ہونے دیا تو معطم بن عدی نے آپ ﷺ کو اپنی پناہ دی اس احسان کی وجہ سے حضور نے یہ ارشاد فرمایا۔

(٣) جبیر بن مطعم کی تالیف قلب کے لیے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تا کہ وہ اسلام لے آئے، چنانچہ یہی ہوا کہ بعد میں وہ مشرف باسلام ہوئے۔

ترجمة الباب: لأطلقتُهم الخ سے ثابت ہے کیونکہ حضور نے فرمایا کہ اگر مطعم مجھ سے سفارش کرتے تو میں ان کو چھوڑ دیتا جس سے پتہ چلا کہ قیدی کو بغیر فدیہ کے چھوڑنا جائز ہے۔

﴿مسئلة خلافية مهمّة﴾

اس باب کے تحت ایک معرکۃ الآرٰی مسئلہ ہے، جس کی مختصر اور جامع صورت مندرجہ ذیل مذکور ہے:

قیدی تین طرح کے ہوتے ہیں: (١) مشرکین اہل کتاب (٢) مشرکین غیر اہل کتاب جن میں عورتیں اور بچے بھی ہوں (٣) مشرکین غیرِ اہل کتاب جو صرف بالغ مرد ہوں۔ پہلی دونوں صورتوں میں کسی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا حکم یہ ہے کہ ان کو یا تو غلام بنایا جائے گا یا احسان کر کے چھوڑ دیا جائے گا، یا مال لے کر چھوڑ دیا

جائے گا، البتہ تیسری صورت میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے اور اس مسئلے میں چار مذہب ہیں:

(۱) امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک قید کرنے کے بعد امام کو اختیار ہے کہ چاروں صورتوں (۱) قتل (۲) استرقاق (۳) اطلاق بالاحسان (۴) اطلاق بالفداء، میں سے جس کو چاہے اختیار کرلے۔

(۲) امام مالکؒ کے نزدیک صرف تین صورتیں جائز ہیں: (۱) قتل (۲) استرقاق (۳) اطلاق بالفداء یعنی مال لے کر چھوڑنا۔ باقی ایک صورت احسان کر کے چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

(۳) صاحبین کے نزدیک دو صورتیں تو علی الاطلاق جائز ہیں: (۱) قتل (۲) استرقاق، اور تیسری صورت میں تفصیل ہے کہ فدیہ بالمال تو جائز نہیں البتہ فدیہ بالنفس جائز ہے (اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمان کفار کے یہاں قید ہوجائیں اور کفار مسلمانوں کے یہاں قید ہوجائیں تو مسلمان قیدیوں کو کفار قیدیوں کے بدلے چھڑایا جاسکتا ہے) امام کرخیؒ فرماتے ہیں کہ امام اعظم کا بھی ایک قول یہی ہے، رہی چوتھی صورت تو صاحبین کے نزدیک بھی یہ صورت یعنی اطلاق بالاحسان جائز نہیں۔ (ہدایہ:۲/۵۴۲)

(۴) امام اعظمؒ کا اصل مسلک جو صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے کہ صرف دو صورتیں جائز ہیں: (۱) قتل (۲) استرقاق، باقی دو صورتیں: اطلاق بالفداء اور اطلاق بالاحسان جائز نہیں ہیں۔ (مذاہب کی تفصیل کے لیے دیکھئے الابواب والتراجم:۴/۱۱۷، بذل المجہود:۴/۲۱، مرقاۃ:۸/۸)

﴿دلائل أصحاب المذاهب﴾

فریق اول کے دلائل

(۱) قرآن کی آیت ہے: فإمّا منًّا بَعْدُ وإمّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الحربُ أوْزارَهَا. (سورہ محمد آیت:۴)

(۲) حدیث انسؓ: فأخذهم رسول الله صلى الله عليه وسلم سلماً فأعتقهم، (ابوداؤد:۲/۳۶۶)

(۳) حدیث ابن عباسؓ: أن النبي صلى الله عليه وسلم جَعَلَ فِداءَ أهلِ الجاهلية يوم بدرٍ أربع مائة . (ابوداؤد:۲/۳۶۶)

(۴) حدیث عائشہؓ: جس میں ہے کہ حضرت زینبؓ کے شوہر جو بدر کے قیدیوں میں سے تھے کو بغیر فدیہ کے چھوڑا گیا، نیز تمام وہ روایات بھی فریق اول کی مستدل ہیں جن سے اطلاق بالاحسان یا اطلاق بالفداء ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ثمامہؓ کو چھوڑنے کے واقعہ سے بھی فریق اول نے استدلال کیا ہے۔

فریق ثانی کے دلائل

(۱) حدیث ابن عباسؓ: أن النبي ﷺ جعل فداء أهل الجاهلية يومَ بدرٍ أربعُ مائة. (ابوداؤد:۲/۳۶۶)

(۲) حدیث عمرؓ: لمّا کان یوم بدرٍ فاخذ یعنی النبي صلی الله علیه و سلم الفداء (ابوداؤد:۲/۳۶۶)

فریق ثالث کی دلیل

(۱) حدیث حضرت عمران ابن حصینؓ: اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کو قبیلہ بنو عامر کے ایک قیدی کے بدلے میں چھڑایا ہے۔

(۲) حدیث ایاس ابن سلمہ: خرجنا مع أبي بكرٍ الخ فيه فبعث (النبي) بها (المرأة) إلى أهل مكة وفي أيديهم أسرىٰ (المسلمين) ففداهم بتلك المرأة. (ابوداؤد:۲/۳۶۸)

فریق رابع کے دلائل

(۱) فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم، وخذوهم واحصروهم واقعدولهم كل مَرصد.

(سورۂ توبہ، آیت:۵)

(۲) قاتلوا الذين لا يومنون بالله ولا باليوم الآخر "إلى قوله" حتى يعطوا الجزية عن يدٍ وهم صاغرون (سورۂ توبہ آیت:۲۸) یہ دونوں آیتیں وجوب قتل پر صریح دلالت کرتی ہیں اور فدار بالمال والاحسان اس کے منافی ہے۔

(۳) فاضربوا فوق الأعناق الخ اس سے معلوم ہوا کہ قید کرنے کے بعد ہی ضرب بفوق اعناق ہوگا اور یہ صرف قتل سے ہوگا فدیہ اس کے بھی منافی ہے۔

مخالفین کے دلائل کا مشترکہ جواب

آیت محمد کا نسخ ثابت ہے جیسا کہ تمام اہل سیر کہتے ہیں کہ سورہ محمد سورہ توبہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور کسی سورت کا مؤخر النزول ہونا ناسخ بننے کا صریح قرینہ ہے اور وہ تمام احادیث جن سے فدار الاسیر ثابت ہوتا ہے وہ بھی اس آیت سے منسوخ ہیں۔ (مرقاۃ:۸/۸، بذل:۴/۲۱، حاشیہ بخاری:۱/۴۲۳)

﴿بَاب في الأسير بالمال﴾

اس باب میں قیدی کو مال لے کر چھوڑنے کا بیان ہے

۴۰ ﴿حَدَّثنا أحمدُ بنُ محمدِ بن حَنبَلٍ قالَ ثَنا أبو نُوحٍ قالَ أخبرنا عِكرمةُ بنُ عمّارٍ قال ثنا سمَّاكٌ الحَنَفِيُّ قال ثني ابنُ عباسٍ قالَ ثَنِي عمرُ بنُ الخطّابِ قال لمّا كانَ

يومَ بدرٍ فأخذَ يعني النبيَّ صلّى الله عليه وسلّم الفِدَاءَ أنزلَ اللّٰهُ عزّ وجلّ "ماكَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ "إلىٰ قوله" لَمَسَّكُمْ فِيْمَا أَخَذْتُمْ" من الفداء، ثم أحلَّ اللّٰهُ لهم الغنائمَ ، قال أبو داؤد سمعتُ أحمدَ بنَ حنبلٍ يُسْئَلُ عَن إسمِ أبي نُوحٍ ؟ فقالَ أيّ شيءٍ تَصنعُ باسْمِهٖ ؟ إسمُه شَنِيْعٌ ، قال أبوداؤد: اسمُه قُرادٌ ، والصحيحُ عبدُ الرحمٰن بنُ غَزْوانَ﴾

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ جب بدر کے قیدیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: ماكان للنبي أن يكون له أسرىٰ الخ نازل فرمائی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے غنیمت کو حلال کر دیا۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل سے ابونوح کا نام معلوم کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم ان کے نام کا کیا کروگے ان کا نام گھٹیا ہے، ابوداؤد فرماتے ہیں کہ ان کا نام قراد (چیچڑی) تھا اور صحیح عبدالرحمٰن بن غزوان ہے۔

تشریح مع تحقیق : قُراد : چیچڑی، ایک قسم کا کیڑا، جوجوں کی طرح جانوروں کے جسم میں پیدا ہوجاتا ہے، واحد قُرَادَةٌ ہے۔

پہلے زمانے میں تمام امتوں کے لیے مال غنیمت حرام تھا بلکہ مال غنیمت کو اکٹھا کیا جاتا تھا اگر غزوہ مقبول ہوتا تو آسمان سے ایک آگ آتی تھی اور اس مال کو جلادیتی تھی، جنگ بدر تک اس امت کے بارے میں بھی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، جب جنگ بدر میں بہت سے قیدی اور کثیر مال مسلمانوں کو حاصل ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ کیا کرنا چاہیے، صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائیں مختلف تھیں، حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ سب کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ سب کو قتل کر دیا جائے، بعض حضرات کی رائے تھی کہ جلا دیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے فدیہ والی صورت کو اختیار فرما کر چھوڑ دیا، کفار بھی پہلے سے قیدیوں کو فدیے میں چھوڑا کرتے تھے اس کے بعد آیت کریمہ: ماكان للنبي أن يكون له أسرىٰ الخ نازل ہوئی کہ نبی کے لیے قیدی بنانا مناسب نہیں یہاں تک کہ خوب خوں ریزی کرلے۔

اس آیت سے آگے ارشاد ہے کہ تُريدون عرضَ الدنيا والله يريد الآخرة یعنی اللہ تو آخرت کے نفع کو چاہتا ہے اور تم دنیا کے نفع کے خواہاں ہو، اس کے بعد دوسری آیت ہے لَوْلَا كتاب من الله سَبَقَ لمسّكم فيما أخذتم عذاب عظيم . یعنی اگر اللہ کی کتاب (مراد وعدہ ہے) نہ ہوتی تو تم کو بڑا عذاب پہنچتا، تمہارے اس چیز (فدیہ) کو لینے کی وجہ سے جس کو تم نے لیا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بدر کے قیدیوں کے بارے میں وحی لے کر آئے کہ تم کو اختیار

ہے چاہے بدری قیدیوں کو قتل کر دو چاہے فدیہ لے کر چھوڑ دو، لیکن فدیہ لے کر چھوڑنا اس شرط پر موقوف ہے کہ آئندہ سال یعنی احد میں اسیرانِ بدر کے برابر صحابہؓ شہید کیے جائیں گے، اب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسیرانِ بدر کے مسلمان ہونے کی رغبت اور حرص اور آئندہ سال درجۂ شہادت کے ملنے کی امید پر فدیہ لے کر چھوڑنے کو اختیار کیا، سوائے حضرت عمرؓ، سعد بن معاذ اور عبداللہ بن رواحہ کے، اس کے بعد آیت کریمہ ما كان للنبي أن يكون الخ نازل ہوئی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں حضور ﷺ کے پاس آیا تو دیکھا کہ آپ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ دونوں حضرات بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو اور آپ کے ساتھی کو کس چیز نے رُلایا ہے، آپ مجھے بتلائیں تاکہ میں بھی غم میں شریک ہو کر روؤں، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ساتھیوں کے فدیہ لینے سے اللہ کا عذاب اس درخت کے قریب تک آگیا تھا اور اللہ نے یہ آیت ما كان للنبي أن يكون له أسرىٰ الخ نازل فرمائی ہے، یہ روایت مشکوٰۃ شریف جلد ثانی میں مذکور ہے۔

ایک اہم اشکال

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ اسیرانِ بدر کو قتل کرنے اور فدیہ لے کر چھوڑنے کا اختیار وحی الٰہی کے ذریعہ دیا گیا تھا تو پھر یہ عتاب کی آیت کیوں نازل ہوئی؟

جواب

(۱) یہ اختیار دینا بطور امتحان کے تھا کہ صحابہ کرامؓ اللہ کی پسندیدہ چیز ''قتل'' کرنے کو اختیار کرتے ہیں یا دنیوی مفاد کو ترجیح دے کر فدیہ قبول کرتے ہیں، جب صحابہ نے اپنی علوشان کے خلاف کام کیا تو یہ عتاب نازل ہوا۔

(۲) بعض حضرات مال کی طرف مائل ہو گئے تھے اور یہ عذاب خاص طور سے انہیں کی طرف نازل ہوا تھا جیسا کہ تريدون عرض الدنيا الخ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) ملا علی قاریؒ نے تورپشتی کا ایک اور جواب نقل کیا ہے کہ یہ حدیث جس میں عذاب کے درخت تک آنے کا ذکر ہے غریب اور شاذ ہے جو صحیح احادیث کے مقابلے میں قابل استدلال نہیں ہے۔ (بذل:۴/۲۲، مرقاۃ: ۸/۱۷، التعلیق:۴/۲۸۳)

قال أبو داوٗد: یہاں سے امام ابوداوٗدؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ ابونوح روای کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان کا نام قُراد ہے اور اسی سے یہ مشہور ہیں اور بعض نے کہا کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن غزوان ہے اب امام ابوداوٗدؒ نے دونوں ناموں میں تقابل کر کے عبدالرحمٰن ابن غزوان کو ترجیح دی ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ قُرادان کا لقب تھا اور عبدالرحمٰن ابن غزوان اصل نام تھا۔

ترجمة الباب : فأخذ يعني النبي صلى الله عليه وسلم الفداءَ سے ثابت ہورہا ہے۔

۴۱ ﴿حَدَّثَنا عبدُ الرحمٰنِ بنُ المباركِ العَيْشِيُّ ثنا سفيانُ بنُ حَبيبٍ ثنا شعبةُ عَنْ أبي العَنْبَسِ عَن أبي الشعْثَاءِ عن ابنِ عباس أَنَّ النبيَّ صلّى الله عليه وسلّم جَعَلَ فِداءَ أهلِ الجاهليَّةِ يومَ بدرٍ أربعَ مائةٍ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اہل جاہلیت کا فدیہ بدر کے دن (فی آدمی) چارسو درہم رکھا۔

تشریح مع تحقیق : بدر کے قیدیوں کے ساتھ مختلف طریقہ سے برتاؤ کیا گیا تھا، عقبہ ابن ابی معیط اور نضر بن حارث خدا اور رسول کی دشمنی میں بڑے سخت تھے اس لیے ان دونوں کو قتل کر دیا گیا بعض قیدی جو مالدار تھے ان کا فدیہ چار ہزار درہم رکھا گیا، اور جو ان سے کم درجہ کے تھے ان کا فدیہ تین ہزار سے دو اور ایک ہزار تک رکھا گیا، بعض کا فدیہ چار سو درہم رہا، اور جس کے پاس مال نہیں تھا ان کو مدینے کے دس دس بچے دیئے گئے تاکہ ان کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، جب ان بچوں کی تعلیم ہوگئی تو وہ ہی ان لوگوں کا فدیہ رہا۔ حضرت ابن عباس جو جنگ بدر میں قید ہوئے تھے انھوں نے اپنی طرف سے چالیس اوقیہ چاندی دی، خلاصہ یہ ہے کہ اسیران بدر کا فدیہ مختلف تھا ان کے مال کی رعایت کرتے ہوئے اسی کی بقدر ان سے فدیہ لیا گیا تھا۔

ترجمة الباب : جعل فداءَ أهل الجاهلية يوم بدر أربع مائة سے ثابت ہے۔

۴۲ ﴿حَدَّثَنا عبدُ اللّٰه بنُ محمد النُفَيْليُّ ثنا مُحَمَّدُ بنُ سلمةَ عَن محمَّد بنِ إسحٰقَ عَن يحيىٰ بنِ عبّادٍ عَن أبيهِ عبّادِ بنِ عبدِ اللّٰه بنِ الزُبَيْرِ عَن عائشَةَ قَالَتْ: لَمَّا بَعَثَ أهلُ مكَّةَ في فِداءِ أسْراَء هُمْ بَعثَتْ زينبُ في فِداءِ أبي العاصِ بمالٍ، وبَعثت فيهِ بِقَلادَةٍ لَهَا كانَتْ عند خديجةَ أَدْخَلَتْها بها علىٰ أبي العاصِ قالَتْ : فلمّا رأها رسولُ اللّٰه صلّى عليه وسلّم رَقَّ لها رِقّةً شَدِيْدَةً ، وقال : إنْ رَأَيْتُمْ أن تُطْلِقُوْا لها أسيرَها، وتَرُدُّوا عليْها الذي لَهَا، فقالوا : نعم ، وكانَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أَخَذَ عليه أو وَعَدَهُ أن يُخَلِّيَ سبيلَ زينبَ إليه، وبَعَثَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم زيدَ بنَ الحارثة ورجلاً من الأنصارِ، فقال : كُونَا بِبَطْنِ يَاجِجْ حتّٰى تمرَّ بكُمَا زَينبُ فتَصْحَبَاهَا حتّٰى تأتيَا بها﴾

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مکے والوں نے اپنے قیدیوں کے فدیے بھیجے تو حضرت زینبؓ نے بھی حضرت ابوالعاصؓ کے فدیے میں کچھ مال بھیجا جس میں ان کا ایک ہار بھی تھا جو حضرت

خدیجہؓ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو جہیز میں دیا تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ نے اس ہار کو دیکھا تو آپ ﷺ کو بہت ترس آیا، اور صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کی خاطر اس کے قیدی کو چھوڑ دو، اور اُس کے مال کو اس کی طرف ہی واپس کر دو، صحابہؓ نے جواب دیا کہ ہاں، یعنی ہم مال کو واپس کر دیتے ہیں، اور ان کے قیدی کو بھی چھوڑ دیتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت ابوالعاص سے عہد لیا کہ وہ زینب کو میری طرف آنے سے نہ روکیں، اور آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ اور ایک انصاری صحابی کو بھیجا اور فرمایا کہ جب تک زینب تمہارے پاس نہ آئیں تو بطن یاجج میں رہنا، اور جب وہ آجائیں تو ان کو اپنے ساتھ لے آنا۔

تشریح مع تحقیق : رَقّ (ض) رحم کرنا، نرم دل ہو جانا، ترس آنا۔ شفقت کرنا۔

قِلادۃ : ج قلائد بمعنی ہار۔

بطن یاجج : بطن کہتے ہیں زمین کے نچلے حصہ کو اور یاجج ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حضرت زینبؓ حضور اکرم ﷺ کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں اور ابوالعاص جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے حضرت زینب کے شوہر تھے، جنگ بدر میں ابوالعاص قید ہو گئے تھے، حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص کو چھڑانے کے لیے کچھ مال بھیجا جس میں ان کا وہ ہار بھی تھا جس کو حضرت خدیجہؓ نے ان کو رخصتی کے وقت دیا تھا، جب حضور پاک ﷺ کی نظر اس ہار پر پڑی تو آپ ﷺ کو حضرت زینب کی غربت اور تنہائی پر بڑا ترس آیا، اور رقت آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا کہ اگر زینب کے قیدی ابوالعاص کو یوں ہی بغیر مال لیے چھوڑ دو تو مناسب ہے، صدق و وفا کے پیکروں کو انکار کی گنجائش کہاں تھی فوراً عرض کیا یا رسول اللہ ہم بالکل تیار ہیں، چنانچہ ابوالعاص کو چھوڑ دیا گیا البتہ ان سے یہ عہد لیا کہ تم زینب کو میری طرف آنے کی اجازت دیدینا، پھر آپ ﷺ نے ساتھ میں دو صحابہ کو بھیجا اور یہ ارشاد فرمایا کہ جب تک زینبؓ تمہارے پاس نہ آجائیں تو اس وقت تک بطن یاجج میں ٹھہرے رہنا، اور جب وہ آجائیں تو ان کو مدینہ لے کر واپس آجانا، یہ دونوں حضرات روانہ ہو گئے اور بطن یاجج میں جا کر ٹھہر گئے، ادھر سے ابوالعاص نے حضرت زینب کو روانہ کر دیا۔

جب حضرت زینبؓ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئیں تو کفار قریش میں سے دو آدمیوں نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ ان کے اونٹ کی کونچ کاٹ ڈالی جس کی وجہ سے حضرت زینبؓ اونٹ سے نیچے گر پڑیں اور بہت چوٹ لگی حتیٰ کہ حمل بھی ساقط ہو گیا، پھر کسی طرح بطن یاجج تک پہنچیں اور دونوں صحابہؓ کے ساتھ مدینہ آگئیں۔

ابوالعاص اب تک مکہ میں ہی رہے جب تجارت کی غرض سے ملک شام کا سفر کیا تو چونکہ راستہ میں مدینہ بھی پڑتا تھا اس لیے واپسی میں مدینہ میں چند صحابہؓ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی، حضرت ابوالعاصؓ

نے کلمہ شہادت لا إله الا الله محمد رسول الله پڑھا اور مشرف باسلام ہو گئے، اور مدینے کی طرف ہی ہجرت کر کے آ گئے۔ حضور ﷺ نے اپنی لخت جگر حضرت زینبؓ کو پھر انھیں کے نکاح میں واپس کر دیا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے اس روایت کو اس جگہ ذکر فرمایا ہے تاکہ اطلاق بالاحسان اور فدیہ بالمال کے جواز پر استدلال کر سکیں۔

سوال: حضور کو حضرت زینب پر اتنا زیادہ ترس کیوں آیا؟

جواب: دو وجہ سے: (۱) غربت کی وجہ سے۔

(۲) آپ ﷺ کو ہار دیکھ کر حضرت خدیجہؓ کی یاد آ گئی تھی۔

ترجمة الباب: أن تطلقوا لها أسيرها وتردّوا عليها الذي لها سے ثابت ہو رہا ہے۔

۴۳ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ أبي مريمَ ثنا عمّي يَعْني سَعِيْدَ بنَ الحكمِ أنَا اللَّيْثُ عَن عقيلِ بنِ شِهَابٍ وذَكَرَ عُرْوَةُ بنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ مَرْوَانَ والمِسوَرَ بنَ مِخْرَمَةَ أَخْبَرَاهُ أَنَّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قَالَ: حين جاءهُ وفد هوازن مسلمين، فَسَألوهُ أَنْ يَرُدَّ إِلَيهِم أموالَهم، فقال لهم رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: مَعِيَ مَنْ تَرَوْنَ، وأحبّ الحديثِ إليَّ أَصْدَقُهُ، فاخْتَارُوا إمّا السَّبْيَ وإمّا المالَ، فقالوا: نختارُ سَبْيَنَا، فقامَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فاثنىٰ على اللّٰهِ، ثم قال: أما بعد؛ فإنَّ إِخْوَانَكُمْ هٰؤلاءِ جَاؤُوا تَائِبِينَ، وإِنّي قد رأيتُ أَنْ أَرُدَّ إِلَيهِمْ سَبْيَهُمْ، فَمَنْ أَحَبَّ مِنكُمْ أَنْ يَطِيْبَ ذٰلِكَ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ مِنكُمْ أَنْ يكونَ على حَظِّهِ حتى نُعْطِيَهُ إِيَّاهُ مِن أَوَّلِ مَا يَفِيئُ اللّٰهُ عَلَيْنَا فَلْيَفْعَلْ، فقال الناسُ: قَدْ طَيَّبْنَا ذلكَ لهم يا رسول الله! فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا نَدْرِيْ مَنْ أَذِنَ مِنكُم مِمَّنْ لَمْ يَأْذَنْ، فَارْجِعُوْا حتّٰى يَرْفَعَ إلينا عرفاءُكم أَمْرَكُمْ؟ فَرَجَعَ النَّاسُ وكَلَّمهم عرفاؤُهم فاخبروا أنهم قد طيبوا وأذِنوا﴾

ترجمہ: حضرت مروان اور مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا جب کہ آپ ﷺ کی خدمت میں قبیلۂ ہوازن کے لوگ مسلمان ہو کر آئے اور یہ سوال کیا کہ ان کو ان کے مال کو واپس کر دیں، آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جن کو تم دیکھ رہے ہو (یعنی صحابہ موجود ہیں اس مال میں ان کا حق اور حصہ ہے) اور میرے نزدیک سچی بات ہی پسندیدہ ہے، لہٰذا تم دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کر لو یا تو قیدی یا مال۔ قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے اپنے قیدیوں کو اختیار کر لیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ تمہارے بھائی (کفر و شرک سے) توبہ کر کے آئے ہیں، میری رائے یہ

ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دو، لہٰذا تم میں سے بھی جو شخص خوش دلی کے ساتھ ان کے قیدیوں کو واپس کرنا چاہے وہ واپس کر دے، اور جو شخص تم میں اپنا حصہ لینا چاہے یہاں تک کہ ہم اس کو اس کا حصہ دے دیں اس مال سے جو اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرمائے گا، تو وہ ایسا کر لے، (جس کو جو منظور ہو اس کو اختیار کر لے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم تو اس پر خوش ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح ہمیں معلوم نہیں کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں؟ اس لیے (اپنے اپنے گھروں یا خیموں کی طرف) واپس جاو (اور مشورہ کرنے کے بعد) تمہارے سردار ہمارے پاس تمہارے معاملے کو لائیں، سب لوگ واپس چلے گئے، پھر ان کے سرداروں نے ان سے گفتگو کی، اور حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ سب راضی ہو گئے۔

تشریح مع تحقیق : أحب الحديث إليَّ أصدقه : اس کا ترجمہ ہوتا ہے: مجھے سچ بات ہی پسند ہے۔

يَرْفَعُ إِلَيْنَا : (ف) رَفع الأمر إلى أحدٍ : کسی کے پاس معاملہ لے کر جانا، اپیل کرنا۔

عُرفَاء : عریف کی جمع ہے بمعنی سردار، ذمے دار۔

ہوازن ایک مشہور و معروف اور انتہائی تیر انداز قبیلہ تھا، جب ان لوگوں سے لڑائی ہوئی تو مسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا، لڑائی کے ختم ہونے کے بعد آپ ﷺ اور تمام مجاہدینؓ مقام حنین سے روانہ ہو کر "نخلہ" وغیرہ مقامات پر ہوتے ہوئے طائف پہنچے، اور طائف سے جعرانہ تشریف لائے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد آیا اس وفد میں بارہ یا چوبیس آدمی تھے اور سب مسلمان ہو کر آئے تھے، آکر درخواست کی کہ آپ ہم پر احسان فرما دیجئے اللہ آپ پر احسان فرمائے گا، اور ہم کو ہماری عورتیں بچے اور اموال واپس کر دیجئے، آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو سن کر ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ صحابہ کی یہ پوری جماعت ہے اور اس مالِ غنیمت میں ان سب کا حق ہے۔ اس لیے دونوں چیزیں تو ممکن نہیں البتہ ایک چیز کو اختیار کر لو انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو ہماری عورتیں اور بچے ہی زیادہ پیارے ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو عورتیں اور بچے میرے یا بنی عبد المطلب کے پاس ہیں ان کو تو میں تمہاری طرف واپس کر رہا ہوں، اور جو دوسرے مسلمانوں کے پاس ہیں ان کے بارے میں سفارش کرتا ہوں۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو ظہر کی نماز میں نماز کے بعد اٹھ کر تم اپنی حالت بیان کرنا کہ ہماری یہ حالت ہے، اس کے بعد میں کچھ کہوں گا، چنانچہ انھوں نے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ظہر کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر اپنی حالت لوگوں کے سامنے بیان کر دی، پھر آپ ﷺ نے تقریر فرمائی جس کا تذکرہ حدیث شریف میں موجود ہے۔

آپ کی تقریر کو سن کر اکثر لوگوں نے قیدیوں کو واپس کر دیا، صرف اقرع بن حابس اور عینہ بن حصین نے اس پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا، لیکن دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے بھی قیدیوں کو واپس کر دیا تھا، مزید وضاحت آئندہ صفحات پر آئے گی۔ (اصح السیر: ۲۹۴)

ترجمة الباب: بالکل واضح ہے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے قیدیوں کو بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا تھا، یا یہ کہیے کہ مال کے بدلے چھوڑا تھا یعنی جو مال ان کو واپس نہیں کیا وہ ہی ان کا فدیہ تھا۔ واللہ اعلم

۴۴ ﴿حَدَّثَنا موسىٰ بنُ إسمعيلَ ثنا حَمَّادٌ عَن محمد بنِ إسحٰقَ عَنْ عَمروبنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جدّهِ في هذه القصة قَالَ: فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم رُدُّوْا عَلَيْهِم نساءَ هم و أبناءَ هم فمن تَمَسَّكَ بِشَيْءٍ مِن هذا الفَيْئِ فإنَّ لَهُ عَلَيْنَا بِهِ سِتُّ فَرائِضَ مِنْ أوّلِ شَيْءٍ يَفِيئُهُ اللّٰهُ تعالىٰ عَلَيْنَا، ثم دَنَا يعني النبيُّ صلى الله عليه وسلم مِنْ بعيرٍ فأَخَذَ وَبَرَةً من سَنَامِهِ ثم قال: أَيُّهَا الناسُ! إنَّهُ لَيْسَ لِيْ مِنْ هذا الفيئِ شَيْءٌ وَلَا هذا، وَرَفَعَ إصْبَعَيْهِ، إلّا الخُمُسُ، وَالخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ، فَأَدُّوْا الخِيَاطَ وَالْمِخْيَطَ، فقامَ رجلٌ في يدِهِ كُبَّةٌ مِن شَعْرٍ، فقال أخذتُ هذه لأُصْلِح بها بَرْذَعَةً لِيْ، فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: أمَّا مَا كانَ لِي وَلبني عبدِ المطّلِبِ فَهُوَ لَكَ، فقال: أما إذا بَلَغَتْ ما أرىٰ فلا أَرِبَ لِيْ فِيهَا ونَبَذَهَا﴾

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت ہے۔ اس قصہ (ہوازن) کے بارے میں، چنانچہ عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو واپس کر دو، اور جو شخص ان سے کچھ روکنا چاہے (بغیر عوض کے نہ دے) تو اس کے بدلے میں ہم اسکو چھ اونٹ دیں گے اس مال سے جو اللہ تعالیٰ ہم کو عنایت فرمائے گا، اس کے بعد حضور ﷺ ایک اونٹ کے قریب گئے اور اس کے کوہان سے ایک بال لے کر ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! اس مال میں سے میرے لیے خمس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور خمس بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جائے گا، اور (یہ بھی فرمایا کہ) نہ یہ بال میرے لیے ہے (یہ جملہ بطور مبالغہ ارشاد فرمایا ہے) پس ادا کرو تم سوئی اور تاگے کو بھی، یہ سن کر ایک صحابی کھڑے ہوئے جن کے ہاتھ میں بالوں کا ایک گولا تھا اور عرض کیا کہ میں نے اس کو پالان کے نیچے کی کملی ٹھیک کرنے کے لیے لیا تھا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو میرے واسطے ہے وہ تیرے لیے ہے اسی طرح جو بنو عبدالمطلب کے لیے ہے وہ بھی تیرے لیے (ہدیہ) ہے ان صحابی نے عرض کیا کہ جب یہ رسی اس حد کو پہنچ گئی جو میرے سامنے ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں، اور اس کو پھینک دیا۔

تشریح مع تحقیق: مَسَّكَ (تفعیل) روک کر رکھنا، فَرائِضَ فریضة کی جمع ہے بمعنی زکوۃ،

زکوۃ میں دیئے جانے والے اونٹ کو بھی فرائض کہتے ہیں، بعد میں اس کا استعمال اتنا عام ہوگیا کہ ہر قسم کے اونٹ کو فریضہ کہا جانے لگا، اور یہاں پر یہی عام اور آخری معنی مراد ہیں۔

وَبَرَةٌ جمع "اوبار" آتی ہے۔ اونٹ اور خرگوش کے بالوں کو وبرۃ کہا جاتا ہے۔

سَنَام ج أسنمة یعنی اونٹ کی کوہان، خِيَاط و مِخْيَط بمعنی سوئی، قرآن میں ہے حتّٰی یلج الجملُ في سَمِّ الخِيَاط۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے سوراخ (ناکہ) میں داخل ہو جائے۔

كُبَّةٌ اس کی جمع "كُبَبٌ" ہے بمعنی گولہ، تاگے کی نلکی وغیرہ۔

أَرِبَ (س) جب اس کا صلہ "الیٰ" آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں محتاج ہونا، ضرورت مند ہونا اور جب "فی" اور "ب" صلہ آئے تو اس کے معنی ہونگے ماہر ہونا۔ یہاں پہلے معنی ہی مراد ہیں۔

فئی بمعنی لوٹنا، وہ مال جو کافروں سے بغیر لڑائی کے حاصل ہو، مجازاً مال غنیمت کو بھی فئی کہتے ہیں۔

اس روایت میں بھی قبیلہ ہوازن کا تذکرہ ہے، مگر اس میں تھوڑی زیادتی ہے جو پہلی حدیث میں نہیں تھی۔

سوال

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو مال غنیمت کا صرف خمس ملتا تھا جب کہ دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کو تین حصے ملتے تھے، ایک "خمس"، دوسرے "صفی"، تیسرے بیت المال سے "تمام مسلمانوں کی طرح حصہ"۔ دونوں روایات بظاہر متعارض ہیں؟

جواب

آپ ﷺ کا یہ حصہ عام نہیں ہے بلکہ صرف غزوۂ حنین کے بارے میں تھا کیونکہ اس غزوے میں آپ نے صرف خمس ہی لیا تھا۔ (بذل:۲۴/۴)

ترجمة الباب: اس حدیث میں بھی وفد ہوازن کا ذکر ہے جن کے قیدیوں کو بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا گیا تھا جس سے قائلین جواز استدلال کرتے ہیں۔ مسئلہ پیچھے گزر چکا ہے۔ فلیراجع.

﴿بَاب في الإمام يقيم عند الظهور على العدو بعرصتهم﴾

یہ باب دشمنوں پر غلبہ کے وقت میدان جنگ میں ٹھہرنے کے بیان میں ہے

۴۵ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ المثنّٰی ثنا معاذُ بنُ معاذٍ ح و ثنا هارونُ بنُ عبدِ اللّٰهِ ثنا رَوْحٌ قالاَ ثنا سَعِيدٌ عَنْ قتادةَ عَن أنسٍ عَنْ أبِي طَلْحَةَ قَالَ كانَ رسولُ الله ﷺ إذَا غَلَبَ عَلٰى قَوْمٍ أَقَامَ بالعَرْصَةِ ثلثًا، قال ابنُ المثنّٰی : إذا غلبَ قَوْمًا أَحَبَّ أن يُقِيمَ

بعرصتهم ثلثًا، قال أبو داؤد: كان يحي بنُ سعيدٍ يَطْعَنُ في هذا الحديث، لأنَّهُ لَيسَ مِنْ قديم حديثِ سعيدٍ، لأنَّه تغيَّر سَنَةَ خمسٍ وأربعينَ، ولم يُخرِجْ هذا الحديثَ إلَّا بآخِرِهِ، قال أبوداؤد :يُقالُ إن وكيعًا حَمَلَ عَنْهُ في تَغَيُّرِهِ﴾

ترجمه: حضرت ابوطلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی قوم پر غلبہ پاتے تھے تو تین دن رات تک میدان جنگ میں ٹھہرے رہتے تھے۔ابن المثنی کی روایت میں ہے کہ تین دن رات آپ ﷺ وہاں ٹھہرنا اچھا سمجھتے تھے،امام ابوداؤدفرماتے ہیں کہ یحیٰی بن سعید اس حدیث میں طعن کرتے تھے کیونکہ یہ حدیث سعید کی (تغیر حافظے سے) پہلی حدیثوں میں سے نہیں ہے، کیونکہ ۴۵ سال کی عمر میں ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا،اوراس حدیث کو ان سے آخری عمر (زمانۂ تغیر حافظہ) میں ہی لیا ہے،امام ابوداؤدفرماتے ہیں کہ وکیع نے سعید سے ان کے آخری زمانے میں ہی حدیث حاصل کی ہے۔

تشریح مع تحقیق : عرصة ج عرصات و أعراص آتی ہے یعنی وہ چٹیل میدان جہاں آبادی نہ ہو،اور پہلے زمانے میں عموماً جنگ ایسے ہی میدان میں ہوتی تھی اس لیے یہاں میدان سے مراد میدان جنگ ہی ہے۔ ثلثًا ای ثلثة أيام ولياليهن یعنی تین دن اور تین راتیں وہاں ٹھہرتے تھے۔

حدیث بالا سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ ﷺ کو فتح حاصل ہوتی تو فتح کے بعد آپ ﷺ مع صحابہؓ کے تین روز تک میدان جہاد میں ٹھہرے رہتے تھے۔شراح اس کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں،جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجرؒ نے مہلب کا قول نقل کیا ہے کہ سواریوں اور مجاہدین کے آرام کی وجہ سے آپ ﷺ وہیں قیام کرتے تھے تاکہ زخمی حضرات کو آرام مل جائے پھر دارالاسلام روانہ ہوں۔

(۲) ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ دشمنوں پر رعب اور دبدبہ جمانے کے لیے وہیں پر تین دن قیام فرماتے تھے گویا کہ دشمنوں کے لیے چیلنج ہوتا تھا کہ اگر ہمت ہوتو دوبارہ ہی آجاؤ ہم ابھی تمہاری ہی زمین میں ہیں۔

(۳) ابن منیرؒ فرماتے ہیں کہ اس زمین کی ضیافت کے لیے آپ ﷺ وہاں ٹھہرتے تھے کہ اس زمین پر ان کافروں نے اللہ کی نافرمانی کی ہے اس لیے یہاں ٹھہر کر اللہ کا خوب ذکر کیا جائے،اور چونکہ ضیافت عموماً تین دن ہی ہوتی ہے اس لیے آپ ﷺ بھی تین دن ہی ٹھہرتے تھے۔(بذل:۴/۲۵)

ایک اہم اشکال کا ازالہ

قال ابو داؤد : یہاں سے امام ابوداؤدؒ یحیٰی بن سعید قطان کے اعتراض کو نقل فرمارہے ہیں جوانھوں نے اس حدیث پر کیا ہے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کا حافظہ آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا اور یہ حدیث

ان سے حافظہ کے خراب ہونے کے بعد ہی سنی گئی ہے، لہٰذا یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اور اس کی دوسری دلیل یہ بھی دی ہے کہ وکیع نے جو احادیث سعید بن ابی عروبہ سے سنی ہیں وہ اختلاط کے زمانے کی ہیں۔

جواب

یحییٰ بن سعید اگر چہ بہت بڑے آدمی ہیں اور اپنے فن کے ماہر ہیں لیکن ان کی یہ جرح ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ تو ثابت ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کا حافظہ آخری عمر میں خراب ہوگیا تھا، جیسا کہ حافظ بن حجر کی ''تحریر تقریب التہذیب'' میں صراحت ہے۔ (۳۸/۲) لیکن روح بن عبادہ اور معاذ بن معاذ نے ان سے تغیر حافظہ کے زمانے میں حدیث سنی ہے یہ بات ثابت نہیں ہے بلکہ حافظہ کے خراب ہونے سے پہلے ان کا حدیث لینا ثابت ہے، پھر امام بخاریؒ جیسے محدث کبیر نے اس سند سے روایت لی ہے جس میں روح بن عبادہ کے دو متابع پیش کیے ہیں ایک معاذ بن معاذ اور دوسرے عبدالاعلیٰ ہیں، پھر امام مسلم نے اس حدیث کو دوسرے طریق سے نقل کیا ہے جس سے اس حدیث کے صحیح ہونے کا ثبوت ملتا ہے، لہٰذا یحییٰ بن سعید قطان کا حدیث بالا پر طعن کرنا غلط ہے جہاں تک وکیع کا آخری زمانے میں سعید بن ابی عروبہ سے حدیث سننے کا تعلق ہے تو ان کا آخری عمر میں حدیث سننا یہاں پر مضر نہیں اس لیے کہ وہ اس سند میں ہیں ہی نہیں۔

ترجمة الباب: قام بالعرصة ثلثًا الخ سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے۔

﴿بَاب فِي التفريق بين السبي﴾

قیدیوں کے درمیان تفریق (جدائی) کرنے کا بیان

۴۶ ﴿حَدَّثَنَا عثمانُ بنُ أبي شَيْبَةَ ثنا إسحٰقُ بنُ منصورٍ ثنا عبدُ السَّلام بنِ حَرْبٍ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ عبدِ الرحمن عن الحَكَمِ عَنْ مَيْمُوْنِ بنِ أبي شَبِيْبٍ عَنْ عَلِيٍّ أَنَّهٗ فَرَّقَ بَيْنَ جَارِيَةٍ وَ وَلَدِهَا، فَنَهاهُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عَنْ ذلك، وَرَدَّ البَيْعَ، قال أبوداؤد: مَيْمُوْنٌ لَمْ يُدْرِكْ عَلِيًّا، قُتِلَ بالجَمَاجِمِ وَالجَمَاجِمُ سنةَ ثلثٍ وثمانينَ، قال أبو داؤد: والحَرَّةُ سنةَ ثَلٰثٍ وسِتِّيْنَ و قُتِلَ ابنُ الزُّبَيْرِ سنةَ ثلثٍ و سبعين﴾

ترجمہ: حضرت میمون بن ابی شبیب سے روایت ہے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ایک لونڈی اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کردی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس سے منع فرمادیا، اور بیع کو رد کردیا، امام ابوداؤد نے کہا کہ میمون بن شبیب نے حضرت علیؓ کو نہیں پایا اور میمون ۸۳ھ جنگ جماجم میں

شہید کیے گئے۔امام ابوداؤد نے کہا کہ واقعہ حرہ ۶۳ھ میں ہوااور ابن زبیر کی شہادت ۷۳ھ میں ہوئی ہے۔

تشریح مع تحقیق : حَمَاجِمُ کوفہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے، یہاں اشعث اور حجاج کے درمیان جنگ ہوئی تھی، جس میں میمون بھی شہید ہوئے تھے۔

حَرّة مدینہ منورہ کے قریب کی زمین جہاں اکثر سیاہ پتھر ہیں۔

چونکہ جہاں کفار سے لڑائی ہوتی ہے تو وہاں مسلمانوں کو کچھ قیدی بھی ہاتھ آجاتے ہیں جن میں ذی رحم محرم بھی ہوتے ہیں، تو امام ابوداؤدؒ نے تبعاً ان ذی رحم محرم کا حکم بھی بیان فرمادیا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ قیدی جن کے درمیان آپس میں ذی رحم محرم کا تعلق ہوان کے درمیان جدائی کرانا یا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً ماں اور اس کے چھوٹے بچے کے درمیان تفریق کرنا، یا دو بھائیوں کے درمیان جدائی کرنا جب کہ دونوں صغیر ہوں یا ایک صغیر ہو، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں اپنے چھوٹے بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے اور بچے کو اپنی والدہ سے انسیت ہوتی ہے ایسے ہی جب دونوں بھائی چھوٹے ہوں تو ان میں سے ایک دوسرے سے الفت اور انسیت رکھتا ہے اب اگر ان کے درمیان تفریق ہوگی تو یہ تفریق کرانے والا حدیث من لم يرحم صغيرنا ولم يؤقر كبيرنا فليس منا کا مصداق ہو جائے گا۔

البتہ اگر یہ تفریق کسی دوسرے شخص کے استحقاق کی وجہ سے ہو تو پھر مکروہ نہیں ہوگی۔

﴿مسئلة خلافية﴾

اس مسئلے میں تو تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ صغیرین کے درمیان جدائی کرنا جائز نہیں ہے لیکن صغیر کس کو کہیں گے اس میں اختلاف ہے اور یہ مسئلہ اجتہادی مسئلہ ہے۔

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک سات آٹھ سال تک صغیر شمار ہوگا۔

(۲) امام مالکؒ کے نزدیک جب بچے کے دوسرے دانت نکل آئیں تو کبیر ہوگا اور اس سے پہلے صغیر ہوگا۔

(۳) امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ جب تک بچہ اپنے امور میں ماں کا محتاج ہے تو صغیر ہے اور جب وہ اپنا کام خود کرنے لگے تو کبیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً خود کھا پی سکے، پائخانہ پیشاب کر سکے۔

(۴) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلوغ تک صغیر ہے اور جب بالغ ہو جائے تو کبیر ہو جائے گا، امام صاحب کے قول کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے قال عليه السلام : حتى يبلغ الغلام والجارية الخ .

﴿مسئلة خلافية﴾

اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی ذی رحم محرم کے درمیان جدائی کردے مثلاً دونوں میں سے ایک کو بیچ

دے یا ہبہ کردے تو بیع اور ہبہ کا تحقق اور نفاذ ہو جائے گا یا نہیں؟

(۱) امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوگا، اگر دونوں کے درمیان قرابت ولادت کی ہو۔

(۲) امام ابو حنیفہ اور امام محمد علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ فی نفسہ بیع کا انعقاد ہو جائے گا، اگر چہ فساد کی وجہ سے بیع کا توڑنا واجب ہے۔

فریق اول کی دلیل

حضرت علیؓ کی حدیث ہے جس میں ہے: أردد أردد یعنی حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیع کو ختم کرو بیع کو ختم کرو، اور رد کرنا عدم انعقاد کی صورت میں ہی ضروری ہوتا ہے۔

فریق ثانی کی دلیل

ایجاب وقبول کا اس کے اہل کی طرف سے پایا جانا بیع کا رکن ہے اور یہاں پر ایجاب وقبول اس کے اہل کی طرف سے محل میں پایا گیا لہٰذا بیع کا رکن ادا ہو گیا اور بیع منعقد ہوگئی۔ البتہ مکروہ ہوگی عارض کی وجہ سے اور وہ ہے بچوں کا وحشت میں پڑنا، لہٰذا اس عارض کی وجہ سے اس کو توڑنا واجب ہوگا۔

جواب دلیل فریق اول

حضرت علیؓ کی روایت ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ کراہت پر دلالت کرتی ہے اور کراہت کے ہم بھی قائل ہیں، نیز لفظ اُردُدْ سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بیع تو ہو چکی البتہ اس کا اِقالہ کرنا ضروری ہے، یا دوسرے ذی رحم محرم کو بھی اسی مشتری کے ہاتھ فروخت کردو۔

قال أبو داؤد : یہاں سے امام ابوداؤدؒ فرمانا چاہتے ہیں کہ سند منقطع ہے اس لیے کہ میمون جو اس حدیث کے راوی ہیں انھوں نے حضرت علی کا زمانہ نہیں پایا اور دونوں کے درمیان لقا نہیں ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی ہے اور میمون ۸۳ھ جنگ جماجم میں قتل کیے گئے ہیں، دونوں میں ۴۳ سال کا فرق ہے لہٰذا یقینی طور پر درمیان سے کوئی راوی حذف کر دیا گیا ہے۔

لیکن یہ روایت سنداً ثابت ہے امام حاکمؒ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے نیز دار قطنی نے بھی اس کو متصل قرار دیا ہے پھر اس کے علاوہ اس روایت کے شواہد بھی ہیں مثلاً:

(۱) حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی حدیث ہے مَن فَرَّقَ بين والدة وولدها فرق الله بينه وبين أحبته.

(۲) حضرت سلیم الغدری کی روایت ہے: من فرق بينهم فرق الله بينه و بين أحبته يوم القيامة .

(۳) عمران بن حصین کی روایت ہے: ملعون من فرق بين والدة و ولدها اس کو دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ ان شواہد کی وجہ سے روایت قابل استدلال ہے۔ (حاشیہ ہدایہ:۳/۵۱)

قتل بالجماجم یہاں سے امام ابوداؤد نے میمون کے سن وفات کو بتلایا ہے نہ کہ حضرت علیؓ سے عدم لقاء کی دلیل کو۔

قال أبو داؤد الحرّة الخ : واقعہ حرہ یزید ابن معاویہ اور اہل مدینہ کے درمیان ہوا تھا اور یہ ۶۳ھ میں ہوا ہے، ابن زبیر ۷۳ھ میں شہید ہوئے۔ امام ابوداؤد نے اس کو استطراداً ذکر کر دیا ہے یعنی بات سے بات نکل آئی تو ان کا نام اور سن وفات وغیرہ بھی ذکر کر دیا ورنہ حدیث سے اس جزء کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ترجمة الباب: أنه فرق بين جارية وولدها فنهاه النبي صلى الله عليه وسلم الخ سے ثابت ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم

﴿بَاب في الرخصة في المدركين يفرق بينهم﴾

بالغ قیدیوں کے درمیان جدائی کرنے کے جواز کا بیان

۴۷ ﴿حَدَّثَنا هارونُ بنُ عبدِ اللّٰهِ ثنا هاشم بنُ القاسمِ ثنا عِكرِمَةُ قال ثني إِياسُ بنُ سلمةَ قال ثنيْ أبي قال خرجْنا مع أبي بكرٍ و أَمَّرَهُ علينا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فَغَزَوْنَا فَزارَةَ فشننا الغارةَ ثم نظرتُ إلى عُنقٍ مِنَ النَّاسِ فيه الذُّرِيَّةُ والنساءُ، فرمَيْتُ بسَهْمٍ فَوَقَعَ بينهم وبين الجبل ، فقاموا فجئتُ بهم إلى أبي بكرٍ فيهم امْرأةٌ مِنْ فَزَارَةَ، عليها قَشْعٌ مِنْ أدمٍ، مَعَهَا بِنْتٌ لها من أحسنِ العَرَبِ، فَنَفَّلَنِيُ أبوبكرٍ بِنْتَها، فَقَدِمْتُ المدينةَ، فلقِيَنِيْ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فَقَالَ لي : يا سلمةُ هَبْ لي المرأةَ، فقلتُ واللّٰهِ لَقَدْ أَعْجَبَنِيْ، وما كشفتُ لها ثوبًا فَسَكَتَ حتّى إذا كان مِن الغد لقيني رسولُ الله صلّى الله عليه وسلّم فى السُّوقِ فقال لي: يا سلمةُ هَبْ لي المرأةَ لله أبوكَ، فقلتُ يا رسولَ اللّٰهِ واللّٰه ما كَشَفْتُ لها ثوبًا، وهي لك، فَبَعَثَ بها إلى أهلِ مكّةَ وفي أيديهم أسرىٰ فَفداهم بتلك المرأةِ﴾

ترجمہ: حضرت سلمہؓ سے روایت ہے کہ ہم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ نکلے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے ہمارا امیر بنایا تھا، ہم نے قبیلہ فزارہ سے جہاد کیا اور ان پر حملہ کیا، اس کے بعد چند لوگوں پر میری نظر

پڑی جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے، میں نے ایک تیر مارا جوان کے اور پہاڑ کے درمیان جا کر گرا، وہ سب کھڑے ہوگئے، میں نے ان کو پکڑا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا، ان لوگوں میں قبیلہ فزارہ کی ایک عورت تھی جو پوستین پہنے ہوئے تھی اس کے ساتھ ایک خوبصورت عربی لڑکی تھی حضرت ابوبکر نے اس کو مجھے دیدیا، جب میں مدینہ منورہ آیا اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے سلمہ! یہ لڑکی مجھے ہبہ کردو، میں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ تو مجھے پسند ہے اور میں نے ابھی تک اس کا کپڑا ابھی نہیں کھولا ہے (یعنی اس سے صحبت نہیں کی ہے) اس پر حضور ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا، جب دوسرا دن ہوا تو حضور ﷺ کی مجھ سے بازار میں ملاقات ہوگئی پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سلمہ یہ لڑکی مجھے ہبہ کردو۔ تمہارے والد کی قسم۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ خدا کی قسم میں نے ابھی تک اس کا کپڑا نہیں کھولا ہے اور یہ آپ کے واسطے ہبہ ہے آپ ﷺ نے اس لڑکی کو مکہ بھیج دیا، اور مکہ والوں کے پاس جو مسلمان قید تھے ان کو اس کے بدلے میں چھڑا لیا۔

تشریح مع تحقیق: قَشْعٌ ج قُشُوعٌ بمعنی پرانی پوستین، چمڑے کا ٹکڑا، پرانی مشک۔

فَشَنَنَّا الغارةَ: (ن) چاروں طرف سے ہلا بولنا، حملہ کرنا۔

للّٰہ أبوك یہ مدحیہ جملہ ہے جو اہل عرب کے یہاں بکثرت بولا جاتا ہے۔

عُنُقٌ ج اعناق بمعنی گردن لیکن یہاں اس سے مراد جماعت اور قوم کے بڑے لوگ ہیں، بہتر ترجمہ یہ ہوگا کہ میں نے لوگوں کی ایک جماعت کو دیکھا۔

حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا یہ سریہ مطلوبہ جگہ پر پہنچا اور حملہ کردیا، جس کے نتیجے میں بہت سا مال اور قیدی ملے، ان میں ایک عورت اور اس کی بیٹی بھی تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ لڑکی سلمہ بن اکوع۔ بہت ہی بہادر صحابی ہیں آگے ان کا تذکرہ آئیگا۔ کو ان کی حسن کارکردگی کی وجہ سے بطور نفل دیدی، جب سلمہ بن اکوع اس کو لے کر مدینہ آئے تو حضور ﷺ نے ان سے اس خوبصورت ترین لڑکی کو لے لیا، پھر اس کو اہل مکہ کے حوالے کردیا تا کہ اس کے بدلے میں وہ مسلمان قیدی چھڑا لیے جائیں جو مکے والوں کے پاس ہیں، اور چونکہ یہ لڑکی بڑی حسین وجمیل تھی اس لیے کافروں نے اس کے بدلے میں کئی مسلمان قیدی چھوڑ دیئے۔

امام ابوداؤد اس روایت کو یہاں ذکر کر کے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اگر ذی رحم محرم قیدی بڑے ہیں اور حد بلوغ کو پہنچ چکے ہیں تو ان کے درمیان جدائی کی جاسکتی ہے جیسا کہ اس مذکورہ لڑکی کو اس کی ماں سے جدا کردیا گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو بالغ ذی رحم محرم قیدیوں کے درمیان جدائی کے جواز پر دلالت کرتی ہیں، امام بیہقی نے ان کی تخریج "دلائل النبوۃ" میں کی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت حاطب

بن اَبی بلتعہؓ کومقوقس بادشاہ کے پاس اسلام کا پیغام لے کر بھیجا، اس بادشاہ نے حضور ﷺ کے اس دعوت نامے کا بڑا احترام کیا، اور اعزاز و اکرام کے طور پر حضور اکرم ﷺ کے لیے کپڑے، ایک سواری اور دو باندیاں ہدیتاً بھیجیں، آپ ﷺ نے ان کو قبول فرمالیا اور پھر ان میں سے ایک کو جہم بن قیس کو ہدیہ کردیا، اور ایک کو اپنے پاس رکھا جن کا نام ام ابراہیم حضرت ماریہؓ تھا۔ اس کے علاوہ امام مسلمؒ نے بھی حدیث بالا کی مزید تفصیل کے ساتھ تخریج کی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے رجوع کرلیا جائے۔ (ہدایہ: ۵۲/۳)

ایک اشکال اوراس کا جواب

اشکال یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ سریہ کے امیر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر سریہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے بظاہر دونوں میں تعارض اور تضاد معلوم ہوتا ہے؟

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت امیر سریہ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی تھے البتہ حضرت زید بن حارثہ اس سریہ کو بھیجے جانے کا اصل سبب تھے۔

ترجمة الباب : فنفلني أبوبكر بنتها الخ سے واضح طور پر ثابت ہورہا ہے۔۱۲

﴿ بَابٌ في المال يصيبه العدوُّ من المسلمين ثم يدركه صاحبُه في الغنيمة ﴾

اس مال کا بیان جسکو کفار مسلمانوں سے لے جائیں پھر وہ مال اسکے مالک (مسلمان) کو حاصل ہو جائے (یعنی اس مال کو اسکے مسلمان مالک کو واپس دیدیا جائے گا یانہیں؟)

نوٹ : اس باب میں کل دو حدیثیں ہیں اولاً ہم دونوں کا ترجمہ اور مطلب بیان کریں گے اس کے بعد ان احادیث شریفہ سے مستنبط ایک اہم اور معرکۃ الآرا مسئلہ ذکر کریں گے۔

۴۸ ﴿حَدَّثَنا صالحُ بْنُ سُهيلٍ ثنا يحىٰ يَعْني ابنَ أبي زَائِدةَ عن عُبيدِ اللّٰهِ عَنْ نافعٍ عَنْ ابنِ عُمَرَ أن غُلامًا لِابنِ عُمَرَ أَبقَ إلى العَدُوِّ ، فظَهر عليه المسلمونَ، فَرَدَّهُ رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم إلى ابنِ عُمَرَ ولَمْ يُقسِّمْ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ان کا ایک غلام بھاگ کر کفار کے پاس چلا گیا، پھر مسلمان اس پر غالب آگئے (اور اس غلام کو قبضہ کر کے حضور کے پاس لے آئے) حضور ﷺ نے اس کو تقسیم نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عمرؓ کو ہی واپس کر دیا۔

۴۹ ﴿حدَّثنا محمد بنُ سليمانَ الأنباريُّ والحسنُ بنُ عليّ المعْنيُّ قالاَ ثنا ابنُ نُميرٍ عَنْ عبيدِ اللّٰه عَنْ نافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قال : ذَهَبَ فرسٌ لَهُ ، فأخَذَهَا العَدُوُّ ، فظَهَرَ عَلَيْهِم المسلمونَ فَرُدَّ عليه في زمنِ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، وَأَبِقَ عبدٌ لهٗ فَلَحِقَ بأرضِ الرُّومِ فظَهَرَ عليه المسلمونَ فَرَدَّهٗ عليه خالد بنُ الوليدِ بَعْدَ النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ان کا ایک گھوڑا بھاگ گیا اس کو دشمنوں نے پکڑ لیا جب مسلمان ان دشمنوں پر غالب آئے (اور یہ گھوڑا بھی چھین لیا) تو یہ گھوڑا حضرت ابن عمر کو ہی واپس کر دیا گیا اور یہ واقعہ حضور ﷺ کے زمانے کا ہی ہے۔ نیز ان کا ایک غلام بھاگ کر (دار الحرب) روم میں چلا گیا پھر مسلمان اس پر غالب آگئے تو خالد بن ولید نے حضور ﷺ کے بعد ان کو یہ غلام واپس کر دیا۔

تشریح مع تحقیق : أبق (س،ن،ض) فرار ہونا، غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔

ظهر عليه: غالب آنا۔

دونوں روایتوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کو چھین کر یا کسی اور طریقہ پر لے لیں اور پھر وہ ہی مال دوبارہ مسلمانوں کو جہاد وغیرہ کے ذریعہ مل جائے تو اس مال کو تمام مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا جائے گا یا صرف اس کے مالک ہی کو دیدیا جائے گا، دونوں حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس مال کو صرف مالک کو ہی دیدیا جائے گا، تمام مجاہدین میں اس کو تقسیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ حضور ﷺ نے خود ابن عمرؓ کے غلام کو واپس کیا جو کہ بھاگ کر کفار سے جاملا تھا، اسی طرح آپ کے زمانے میں اور آپ ﷺ کے بعد بھی حضرت خالد بن ولیدؓ نے بھاگا ہوا غلام مالک کی طرف ہی واپس کر دیا۔

ایک اہم اختلافی مسئلہ

اب فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ وہ مال جس پر مسلمان جہاد کے ذریعہ قابض ہوئے ہیں مسلمان مالکوں کو واپس کیا جائے گا یا غنیمت میں شامل کر کے تقسیم کر دیا جائے گا۔

اس مسئلے کا حاصل یہ ہے کہ اگر کفار دار الاسلام میں داخل ہو کر مسلمانوں کے مال پر قبضہ کر لیں اور اس کو

دارالحرب نہ لے جائیں تو وہ اس کے مالک نہیں ہوں گے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس مال پر غالب آجائیں تو وہ مال اس کے مالک کو واپس کردیا جائے گا، یہاں تک تو کسی امام کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور اگر کفار مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کر کے دارالحرب منتقل کرلیں تو وہ اس مال کے مالک ہونگے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ کرام کے مابین زبردست اختلاف ہوگیا، اصل اس مسئلے میں تین مذہب ہیں: (بدائع الصنائع: ۶/ ۱۰۷)

(۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کفار مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرلیں تو وہ اس کے مالک نہیں ہونگے، خواہ دارالحرب منتقل کرلیں، بلکہ مسلمانوں کی ملکیت بدستور باقی رہے گی، چنانچہ جب بھی وہ مال مسلمانوں کے پاس آئے گا تو اس کو اسکے مالکان کی طرف واپس کیا جائے گا، تقسیم بین المجاہدین نہیں ہوگا۔

(۲) امام مالک ولیث اور فقہاء سبعہ کا مذہب یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرتے ہی مالک ہوجائیں گے، احراز کی کوئی قید نہیں ہے۔ پھر اگر مسلمان اس مال پر غالب آجائیں تو اس مال کا مالکِ قدیم تقسیم بین المجاہدین سے قبل بغیر قیمت کے لے سکتا ہے اور تقسیم کے بعد قیمت ادا کر کے لے سکتا ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کی اصل روایت یہ ہے کہ مشرکین مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرلیں اور اس کو دارالحرب منتقل بھی کرلیں تو وہ اس مال کے مالک ہوجائیں گے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: بذل: ۴/ ۲۲، اوجز المسالک: ۴/ ۵۰، فتح الباری: ۶/ ۲۲۶، الابواب والتراجم: ۴/ ۱۲۵، بدائع: ۶/ ۱۰۷)

فریق اول کے دلائل

(۱) باب کی دونوں حدیثیں امام شافعی کی مستدل ہیں کیونکہ کفار نے ابن عمرؓ کے غلام پر قبضہ کرلیا تھا لیکن جب وہ مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اس کے اصل مالک کی طرف واپس کردیا گیا معلوم ہوا کہ وہ اس مال کے مالک نہیں ہوئے تھے۔

(۲) مسلم شریف کے حوالے سے اوجز المسالک میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے مسلمانوں کی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ اونٹنیوں کو پکڑ کر لے گئے، نیز ایک عورت کو بھی گرفتار کر کے لے گئے، ان اونٹنیوں میں حضور ﷺ کی ''عضباء'' نامی اونٹنی بھی تھی، راستہ میں یہ لوگ سوگئے اور اونٹنیوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا، اب یہ عورت جس کو گرفتار کر کے لائے تھے چپکے سے اٹھی اور اپنے ہاتھوں کو کھول لیا اور بھاگنے کی کوشش کی، اب صورت حال یہ تھی کہ وہ عورت جس اونٹنی کے پاس جاتی تھی وہ فوراً ہی بدک جاتی تھی لیکن جب یہ عورت حضور ﷺ کی اونٹنی ''عضباء'' کے پاس پہنچی تو وہ بالکل ساکن رہی چنانچہ وہ اس پر سوار ہوکر بھاگ نکلی، کفار نے پکڑنے کی کوشش بھی کی لیکن پکڑ نہ سکے، اس عورت نے نذر مانی کہ اگر میں صحیح سالم مدینہ پہنچ گئی تو اس اونٹنی کو اللہ کی راہ میں قربان کرونگی، اب

جب یہ عورت مدینہ پہنچی تو لوگوں نے اونٹنی کو پہچان لیا کہ یہ تو حضور ﷺ کی اونٹنی ہے۔ معاملہ حضور ﷺ کی خدمت میں گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی ہو اس نے تو تم کو نجات دی اور تم اس کو ذبح کر رہی ہو، اور فرمایا: لا نذر في معصية ولا فيما لا يملك ابن آدم. اور اس اونٹنی کو حضور نے واپس لے لیا۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے شوافع کہتے ہیں کہ دیکھئے اونٹنی پر کفار کا استیلاء ہو گیا تھا مگر پھر بھی کافر اس کے مالک نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ بدستور حضور ﷺ کی ملکیت میں ہی رہی۔ (اوجزالسالک: ۴/۴۹)

(۳) دلیل عقلی ہے: شوافع کہتے ہیں کہ مسلمان کے مال پر کفار کا استیلاء، ایک امر محظور ہے اور کسی چیز کا مالک بننا ایک نعمت ہے اور قاعدہ ہے کہ امر محظور نعمت کے حصول کا سبب نہیں بنتا ہے لہٰذا کفار کا استیلاء بھی ان کے مالک ہونے کا سبب نہیں بنے گا، جیسے حرمت مصاہرت ایک نعمت ہے جو کہ زنا سے ثابت نہیں ہوتی، اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے مال پر قابض ہو جائے تو وہ اس کا مالک نہیں بنتا، کیونکہ ایک مسلمان کا دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا امر محظور ہے جو دوسرے مسلمان کے لیے نعمت ملکیت کا سبب نہیں بنتا، اس کی اور بھی بہت سی مثالیں پائی جاسکتی ہیں۔

دلائل امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ

ان تینوں ائمہ کا مسلک تقریباً ایک ہی ہے اس لیے تینوں حضرات کے دلائل بھی مشترک ہی ہیں۔

(۱) آیت قرآنی ہے: للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم و أموالهم . وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں مہاجرین کو فقراء کہا گیا ہے، جب کہ مکہ مکرمہ میں مشرکین کے پاس ان کے بہت سے اموال موجود تھے اور فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، تو اگر ان مہاجرین کی ملکیت ختم نہ ہوتی اور کفار اس کے مالک نہ ہوتے تو ان کو فقراء نہ کہا جاتا، معلوم ہوا کہ اگر کفار مسلمانوں کے مال پر قابض ہو جائیں اور دارالحرب میں لے جائیں تو وہ اس کے مالک ہو جاتے ہیں۔ یہ استدلال بطریق اقتضاء النص ہے۔

(۲) عن أسامة بن زيد أنه قال: يا رسول الله اين تنزل فى دارك بمكّة، فقال وهل ترك عقيل من رباعٍ أو دُوْرٍ. (بخاری شریف: ۱/۲۱۲)

وجہ استدلال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ سے معلوم کیا گیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ اپنے مکان میں ٹھہریں گے، تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہمارے لیے تو عقیل نے کچھ بھی نہیں چھوڑا، اب دیکھئے کہ حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کے مکان پر ان کے بھائی عقیل قابض ہو گئے تھے جو اسلام نہیں لائے تھے، اگر کافر مالک نہ ہوتے تو وہ گھر حضور ﷺ اور حضرت علیؓ کی ملکیت میں بدستور باقی رہتا، لیکن حضور ﷺ خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ اس مکان

میں ہمارا اب کچھ بھی نہیں ہے عقیل ہی سب کا مالک بن گیا۔

(۳) عقلی دلیل یہ ہے کہ ملکیت نام ہے کسی چیز پر تصرف کامل کی قدرت کا پایا جانا، اور جب کفار اس مال کو دارالحرب لے گئے تو مالک کا اس مال سے انتفاع ممکن نہیں رہا اور جب انتفاع ممکن نہ رہا تو ملکیت بھی باقی نہ رہی، بلکہ زائل ہوگئی اور ظاہر ہے کہ جب ایک مسلمان مالک کی ملکیت ختم ہوگئی تو کفار اس کے مالک ہوجائیں گے۔ (بدائع الصنائع:۶/۱۰۸)

امام شافعیؒ کے دلائل کا جواب

(۱) باب کی دونوں روایتوں کا جواب یہ ہے کہ ابھی احراز نہیں پایا گیا تھا اس لیے اصل مالک کی طرف واپس کردیا گیا۔

(۲) دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ شوافع حضرات کا اس روایت سے استدلال کرنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ جو مشرکین اونٹنیاں لے گئے تھے وہ ابھی دارالحرب میں نہیں پہنچے تھے بلکہ راستہ میں سو گئے تھے لہٰذا یہاں بھی احراز نہیں پایا گیا۔

(۳) عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ استیلاء، مال پر ہوتا ہے اور مال کی اصل مباح ہونا ہے اس لیے کہ قاعدہ ہے الأصل في الأشياء الإباحة، اور مباح چیز ملکیت کا سبب بن جاتی ہے، لہٰذا ملکیت مال پر ہے نہ کہ استیلاء پر۔ (تفصیل اوجز المسالک:۴/۵۰)

﴿بَاب في عبيد المشركين يلحقون بالمسلمين فيُسلمون﴾

مشرکین کے ان غلاموں کا بیان جو بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آجائیں اور مسلمان ہوجائیں

۵۰ ﴿حَدَّثَنا عبد العزيز بنُ يحيىٰ الحَرَّانيُّ قال ثني محمدٌ يعني ابنَ سَلَمةَ عن محمد بن إسحٰقَ عن أبانَ بن صالحٍ عَنْ منصور بنِ المُعْتَمِرِ عَنْ ربيعي بن حراشٍ عن عليِّ بنِ أبي طالبٍ قال خَرَجَ عِبْدَانٌ إلىٰ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يَعْنِي يومَ الحُدَيبيّةِ قَبْلَ الصُلْحِ ، فَكَتَبَ إِلَيْهِ مَوالِيهِم، فقالوا يا محمد! واللّٰهِ ما خَرَجُوا إلَيْكَ رغبةً في دينكَ، وإنَّمَا خرجوا هَرَبًا مِنَ الرِقِّ، فقال ناسٌ صَدَقُوا يا رسول اللّٰه رُدَّهُمْ إليهم، فَغَضِبَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وقال : مَا أُرَاكُمْ تَنْتَهُوْنَ يَا

مَعْشَرَ قُرَيْشٍ حتّٰى يَبْعَثَ اللّٰه عليكم مَنْ يَضْرِبُ رِقَابَكُمْ عَلٰى هٰذا، وأبٰى أنْ يَرُدَّهم، وقال هم عُتَقَاءُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ﴾

ترجمہ: حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن صلح سے پہلے حضور ﷺ کے پاس کئی غلام بھاگ کر آئے ان غلاموں کے مالکوں نے حضور ﷺ کو لکھا کہ واللہ یہ غلام تمہارے پاس تمہارے دین میں رغبت کی وجہ سے نہیں آئے ہیں بلکہ غلامی سے بھاگ کر تمہاری طرف آئے ہیں، لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان لوگوں نے سچ کہا ہے ان غلاموں کو ان کے مالکوں کی طرف ہی بھیج دیجئے، اس پر آپ ﷺ ناراض ہوگئے اور فرمایا کہ اے قریش کی جماعت تم کو میں نہیں دیکھتا ہوں کہ تم باز آؤ (نافرمانی سے) جب تک اللہ تعالیٰ تم پر ایسے شخص کو مسلط نہ کردے جو اس (کام یعنی غلاموں کو کفار کی طرف واپس کرنے کی سفارش) پر تمہاری گردنوں کو اڑادے، پھر آپ ﷺ نے ان غلاموں کو واپس کرنے سے انکار فرمادیا، اور فرمایا کہ یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں۔

تشریح مع تحقیق: هَرَبًا (ن) بھاگنا، فرار ہونا، یہ مصدر ہے۔

الرِقُّ (ض) مصدر ہے۔ بمعنی غلام ہونا۔

تَنْتَهُونَ جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے (افتعال) رکنا، باز رہنا۔

عُتَقَاء عَتِیق کی جمع ہے بمعنی آزاد کردہ غلام، اس کی دوسری جمع عُتُقٌ بھی آتی ہے۔

عِبْدَان عَبْدٌ کی جمع ہے بمعنی غلام، محکوم، بعض لوگوں نے اس کو عِبِدّان اور عُبْدان بھی پڑھا ہے۔

اس باب کو قائم کر کے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ جس مسئلے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس مشرکین کے غلام بھاگ کر آجائیں اور اسلام کو قبول کرلیں تو وہ آزاد ہوجاتے ہیں، ان کو مشرکین کی طرف واپس نہیں کیا جائے گا؛ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔

جہاں مسلمانوں کا لشکر قیام پذیر ہو خواہ وہ دارالاسلام ہو یا دارالحرب ہو وہ جگہ دارالاسلام کے حکم میں ہوتی ہے لہٰذا جہاں بھی مشرکین کے غلام مسلمانوں کے پاس بھاگ کر آجائیں اور مسلمان ہوجائیں تو وہ سب آزاد ہونگے۔ اس باب کا مقصد صرف اتنا ہی بتلانا ہے۔

ایک اہم اشکال اور اس کا جواب

اشکال یہ ہے کہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث میں مذکور واقعہ کو حدیبیہ کا واقعہ قرار دیا ہے حالانکہ تمام اہل سیر کا اتفاق ہے کہ یہ طائف کا واقعہ ہے مثلاً:

(۱) امام حاکمؒ نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کو طائف کا واقعہ مانا ہے۔ (مستدرک للحاکم: ۲/۱۲۵)

(۲) علامہ ابن ہمام نے کتاب العتق میں اس حدیث کو نقل کیا ہے اس میں طائف کا ذکر ہے۔(فتح القدیر:۳/۳۷۲)
اس لیے عین ممکن ہے کہ امام ابوداؤدؒ کی اس روایت میں کہیں وہم ہوگیا ہو اور کسی راوی سے نقل میں غلطی ہوگئی ہو۔اس بات کی تین دلیلیں ہیں:

(۱) تمام اہل سیر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کفار کے غلام غزوۂ طائف ہی میں آئے ہیں، حدیبیہ کا کسی نے ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

(۲) اگر حدیبیہ کا واقعہ تسلیم کرلیں تو "فقال الناس" میں "الناس" سے مراد صحابہ تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ طبیعت سلیمہ اس بات کو قبول ہی نہیں کرتی کہ کبار صحابہ محض ظن کی وجہ سے ایسا کلام کریں جو حضور ﷺ کی انتہائی ناراضگی کا سبب بنے، نیز آپ ﷺ نے کبھی بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے "یا معشر قریش" کا لفظ استعمال ہی نہیں فرمایا۔اور نہ ہی صحابہ پر اتنے غصہ کا اظہار کرتے تھے، جیسا کہ اسید بن حضیرؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے عرض کیا کہ ہم یہود کی مخالفت کرتے ہوئے حالت حیض میں ہی وطی کیوں نہ کرلیا کریں تو آپ ﷺ کو غصہ تو آیا لیکن اتنے عتاب کا اظہار نہیں فرمایا۔

(۳) حدیث میں لفظ "یوم الحدیبیة" راوی حدیث حضرت علیؓ سے منقول نہیں ہے بلکہ بعض رواۃ کی تفسیر ہے جس کی دلیل لفظ "یعنی" ہے۔

اور اگر ہم اس کو طائف کا واقعہ مان لیں تو ان تینوں اعتراضوں میں سے کوئی بھی اعتراض لازم نہیں آئے گا، چونکہ اہل سیر کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ طائف کا ہے اور "الناس" سے مراد نو مسلم صحابہ ہیں جن سے ایسے کلام کا صدور ممکن ہے اور دوسری روایات میں بھی طائف کی صراحت ہے۔واللہ اعلم (بذل:۴/۲۷)

ترجمة الباب: خرج عبدان إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ سے ثابت ہے۔

﴿بَاب في إباحة الطعام في أرض العدوّ﴾

دارالحرب میں طعام کے مباح ہونے کا بیان

۱۵ ﴿حَدَّثَنا إبراهيم بنُ حمزةَ الزبيريُّ ثنا أنسُ بنُ عِيَاضٍ عنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ نافعٍ عن ابنِ عُمَرَ أنَّ جيشًا غنموا في زمنِ رسولِ اللّٰه صلى الله عليه سلم طعاماً و عَسَلاً، فَلَمْ يُوخَذْ مِنْهُمُ الخُمُسُ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک لشکر نے حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں طعام اور شہد کو حاصل کیا تو (اس میں سے) ان مجاہدین سے خمس نہیں لیا گیا (یعنی جس مال کو استعمال کرلیا تھا)

تشریح مع تحقیق : خُمُسٌ ج اخماس، پانچواں حصہ(۱/۵) مرادغنیمت میں سے پانچواں حصہ ہے۔
طعام، ج أطعمة کھانا، ہر وہ چیز جو کھائی جائے اور جس پر جسم کی بقا کا مدار ہو، اہل حجاز اور اہل عراق عام طور پر اس کا اطلاق گیہوں پر کرتے ہیں۔

فتح القدیر میں حافظ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ مشرکین کی زمین میں اگر مسلمان مجاہدین کو مال حاصل ہو تو اس کی دوصورتیں ہیں:

(۱) مطعومات کی قبیل سے ہو۔

(۲) غیر مطعومات کی قبیل سے ہو۔

پھر اگر مطعومات کی قبیل سے ہے تو اس کی بھی دوصورتیں ہیں:

(۱) یا تو اس کو علاجاً کھایا جاتا ہوگا۔

(۲) یا غذاءً کھایا جاتا ہوگا۔

اب اگر اس مطعوم کو صرف علاجاً ہی کھایا جاتا ہے تو مریض کے لیے کھانا درست ہوگا عام لوگوں کے لیے تقسیم سے پہلے درست نہیں ہے۔ اور اگر اس کو غذاءً کھایا جاتا ہے خواہ وہ پکی ہوئی چیز ہو جیسے روٹی یا پکی ہوئی نہ ہو جیسے گائے بکری وغیرہ تو ضرورت کے وقت عام لوگ بھی تقسیم سے پہلے استعمال کر سکتے ہیں۔

اور اگر وہ مال قسم ثانی یعنی غیر مطعومات کی قبیل سے ہے تو تقسیم غنائم سے پہلے استعمال کرنا درست نہیں ہے البتہ اگر کسی مجاہد کو اس کی اشد ضرورت پڑ جائے مثلاً تلوار کی ضرورت پڑ جائے تو اس کو استعمال کی اجازت ہے لیکن استعمال کرنے کے بعد غنیمت میں واپس کر دے گا۔ نقشہ:
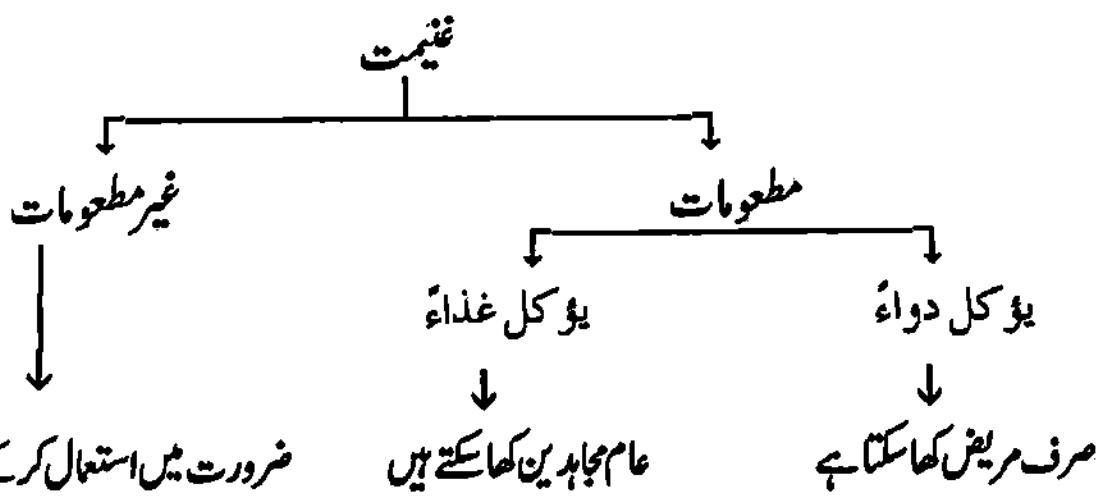
تمام فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ بقدر ضرورت دار الحرب میں امام کی اجازت کے بغیر کھانا تو جائز ہے البتہ بیچنا جائز نہیں ہے۔ (بذل:۴/ ۲۸، فتح الباری: ۶/ ۳۱۴، فتح الملہم: ۳/ ۱۳۸، حاشیہ ابی داود)

ترجمة الباب : روایت بالا سے بالکل واضح ہے۔

۵۲ ﴿حَدَّثَنا موسى بنُ إسمعيلَ والقعنبيُّ قالاَ ثنا سليمانُ عن حُمَيْدٍ يعني ابنَ هلالٍ عَنْ عبدِ اللّٰه بنِ مُغَفَّلٍ قَالَ دُلِّيَ جِرابٌ مِنْ شَحْمٍ يومَ خَيْبَرَ، قال فأتيتُهُ فَالْتَزَمْتُهُ، قال ثم قلتُ لا أُعْطِي مِنْ هذا أحدًا اليوم شيئًا، قال فالتفتُّ فإذا رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يَتَبَسَّمُ إليَّ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ خیبر کے دن ایک چمڑے کی تھیلی لٹک رہی تھی، حضرت عبداللہ بن مغفل کہتے ہیں کہ میں اس کی طرف بڑھا اور اسکو اپنے سے چمٹالیا، اور (دل ہی دل میں) کہا کہ آج اس میں سے کسی کو کچھ نہیں دوں گا، راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو آپ ﷺ مسکرا رہے تھے۔

تشریح مع تحقیق: دُلِّيَ (تفعیل) ماضی مجہول کا صیغہ ہے بمعنی لٹکانا۔

جِرَابٌ ج جُرُبٌ بمعنی چمڑے کا برتن، تلوار کا میان۔

تَبَسَّم (تفعل) اس طرح ہنسنا جس کی آواز نہ خود سنے اور نہ کوئی دوسرا، کیونکہ اگر خود کو ہنسنے کی آواز آئی تو یہ ضحک ہے اور اگر دوسرا بھی سن لے تو یہ قہقہہ ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جنگ خیبر کے موقع پر کسی یہودی نے چربی سے بھری ہوئی تھیلی قلعہ کے اوپر سے پھینکی، حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی اس پر نگاہ پڑی تو وہ کسی چیز میں اٹک کر لٹک گئی تھی انھوں نے اس تھیلی کو جلدی سے اٹھایا اور اپنے بدن سے چمٹالیا، جب نبی کریم ﷺ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو آپ ﷺ نے تبسم فرمایا، تبسم کی اصل وجہ یہ تھی کہ دیکھو یہ لوگ بھوک سے کس قدر پریشان ہیں کہ تھوڑا سا صبر بھی نہیں ہورہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ حالت یؤثرون علی أنفسهم کے خلاف بھی نہیں تھی، کیونکہ بھوک کی اتنی شدت تھی کہ بڑی عجلت سے اس تھیلی کو اٹھالیا۔ امام ابوداؤدؒ اس روایت سے صرف یہ استدلال کریں گے کہ غنیمت میں سے کھانے کی چیز کو استعمال کیا جاسکتا ہے، اگر استعمال جائز نہ ہوتا تو حضور ﷺ تبسم نہ فرماتے بلکہ اس تھیلی کے اٹھانے سے بھی منع فرمادیتے۔

ترجمة الباب: آپ ﷺ کا سکوت بلکہ تبسم فرمانا جواز کی صریح دلیل ہے۔

﴿بَاب في النَهْيِ عن النُهْبىٰ إذا كان في الطعام قلّة في أرض العدو﴾

جب دار الحرب میں قیام کے وقت غلہ کم ہو تو لوٹ کرنے سے ممانعت کا بیان

۵۳ ﴿حَدَّثَنا سليمانُ بن حَرْبٍ ثنا جريرٌ يعنيُ بنَ حازِمٍ عَنْ يعلى بنِ حَكِيمٍ عَنْ أبيْ

لبيدٍ قالَ : كنّا مَعَ عبدِ الرحمٰنِ بنِ سَمُرةَ بكابُل، فأصابَ الناسُ غَنيمةً، فانتَهبُوهَا، فقَامَ خطيبًا، فقال: سمعتُ رسولَ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم يَنْهٰى عَنِ النُهبٰى، فَرَدُّوا ما أخَذُوا، فقَسَّمَهٗ بينهم﴾

ترجمہ: حضرت ابولبید سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم ''کابل'' میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ کے ساتھ تھے وہاں لوگوں کو مال غنیمت ملا، انھوں نے اس کو لوٹ لیا، پھر عبدالرحمٰن بن سمرہ نے کھڑے ہوکر تقریر فرمائی اور فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کو لوٹنے سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے۔ (یہ سن کر) جس نے جو کچھ لیا تھا واپس کردیا، اس کے بعد اس سارے مال کو حضرت عبدالرحمٰن نے تقسیم فرمادیا۔

تشریح مع تحقیق : أبولبید ان کا نام: لمازہ بن زیاد الازدی ہے ابن سعد نے ان کو ثقہ راوی بتایا ہے نیز ابن حبان نے بھی ثقات میں ان کا شمار کیا ہے۔ یہ بڑے نیک صالح الحدیث تھے۔

کابل : پہلے یہ ہندوستان ہی کا ایک شہر تھا، لیکن اب یہ افغانستان کی راجدھانی ہے، اور مشہور ومعروف شہر ہے۔

النُهبٰى (ف) بمعنیٰ لوٹنا، یہ عمریٰ کے وزن پر ہے۔

امام ابوداؤدؒ اس حدیث سے یہ وضاحت فرمانا چاہتے ہیں کہ مال غنیمت میں تقسیم سے پہلے ہرگز مال نہ لیا جائے، اور لوٹ مار نہ کی جائے، بلکہ امام کی تقسیم تک انتظار کیا جائے۔ کیونکہ لوٹ میں آدمی اپنی قوت اور طاقت کے اعتبار سے مال کو حاصل کرتا ہے، نہ کہ ضرورت اور حاجت کے اعتبار سے، جس میں دوسروں (کمزوروں) کے حقوق کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اب اگر کھانے کی قلت ہے تو طاقت ور تو لوٹ کر کھالیں گے اور کمزور لوگ بھوکے رہ جائیں گے اس لیے ایسی صورت میں لوٹ کرنا درست نہیں ہے۔

ترجمة الباب : سمعتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ينهٰى عن النهبٰى الخ سے ثابت ہے۔

۵۴ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ العَلاءِ ثنا أبو مُعَاوِيَةَ ثنا أبو إسحٰقَ الشَّيْبَانِيُّ عَنْ محمد بنِ أبي مُجَالِدٍ عَنْ عبدِ اللّٰه بنِ أبي أوْفٰى قال : قلتُ هَلْ كنتم تَخْمِسُونَ يعني الطعَامَ في عَهْدِ رسولِ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم فقال أصَبْنَا طعاماً يَوْمَ خَيْبَرَ، فكانَ الرجلُ يجيءُ فيأخذُ مِنْهُ مِقْدَارَ ما يكفِيهِ ثم يَنْصَرِفُ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے بعض صحابہ سے کہا کہ کیا تم طعام سے پانچواں حصہ نکالا کرتے تھے زمانۂ رسول اللہ ﷺ میں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کو خیبر کے دن غلہ ملا، اور ہر شخص آکر اپنی حاجت کے بقدر لے لیتا اور واپس چلا جاتا تھا۔

تشریح مع تحقیق : محمد بن ابی مجالد : حافظ بن حجرؒ نے ''تحریر تقریب التہذیب'' میں

ان کا نام عبداللہ بن ابی مجالد ذکر کیا ہے۔ امام شعبہ کو ان کے نام میں تردد تھا اس لیے کبھی بخاری شریف میں شعبہ کی سند سے محمد بن ابی مجالد آتا ہے اور کبھی عبداللہ بن ابی مجالد اور کبھی محمد أو عبداللہ بن ابی مجالد آتا ہے۔ (تحریر تقریب التھذیب: ۲/۲۶۱)

قال قلتُ : بعض لوگ اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ محمد بن ابی مجالد یہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے کہا، اور بعض حضرات اس کا مطلب یہ لکھتے ہیں محمد بن ابی مجالد کہتے ہیں کہ میں نے بعض صحابہ سے پوچھا کہ کیا حضور ﷺ کے زمانے میں تم پانچواں حصہ نکالتے تھے یا نہیں؟

لیکن امام محمدؒ نے اپنی مسند میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ مسجد والوں نے محمد بن ابی مجالد کو عبداللہ بن ابی اوفی کے پاس بھیجا تاکہ خیبر کے غلہ کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے جب محمد بن ابی مجالد نے ان سے جاکر پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ خمس نہیں نکالا تھا کیونکہ طعام کم تھا۔ (الحدیث)

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سوال عبداللہ بن ابی اوفی سے کیا گیا تھا اور یہی معنی بہتر ہیں، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے بقدر مالِ غنیمت سے کھانا لینا امام کی اجازت کے بغیر بھی جائز ہے۔

ترجمة الباب : حدیث مذکور کی بظاہر ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نہیں ہے البتہ تکلفاً مناسبت کو ثابت کیا جاسکتا ہے وہ اس طرح کہ حدیث شریف سے اخذ یعنی لینے کا ثبوت ہے اور لینا کبھی کبھی بطور "نہبی" یعنی لوٹ کے بھی ہوتا ہے لہٰذا جب نہبی کی نیت ہو تو ممانعت لازم آئے گی ورنہ نہیں۔ (بذل: ۴/۲۹)

۵۵ ﴿حَدَّثَنا هنّاد بنُ السَرِيُّ ثنا أبو الأَحْوَصِ عَنْ عَاصِمٍ يَعْنِي ابنَ كُلَيبٍ عَنْ أبِيهِ عَنْ رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ قال خَرَجْنَا مَعَ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم في سَفَرٍ، فأَصَابَ النَاسُ حاجةٌ شَدِيْدَةٌ وجهدٌ وأصابوا غنماً، فَاكْتَهَبُوْهَا، فَإِنَّ قُدُوْرَنَا لَتَغْلِيْ إذْ جَاءَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يَمْشِيْ علىٰ قَوْسِهٖ، فأَكْفَاءَ قُدُوْرَنَا بِقَوْسِهٖ ثُمَّ جَعَلَ يُرَمِّلُ اللَّحْمَ بالتُرابِ، ثُمَّ قَالَ: إنّ النُهْبَةَ لَيْسَتْ بِأَحَلَّ مِنَ المَيْتَةِ، أَوْ أَنّ المَيْتَةَ لَيْسَتْ بأحَلّ مِنَ النُهْبَةِ الشَكُّ مِنْ هَنّادٍ﴾

ترجمہ: ایک انصاری صحابیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ گئے لوگوں کو اس سفر میں بہت پریشانی اور تکلیف ہوئی، پھر ان کو کچھ بکریاں مل گئیں، جس شخص کو جو ملا اس نے اس کو لے لیا، (سب کے لوٹ لینے کے بعد سب نے پکانا شروع کردیا) گوشت ہماری ہانڈیوں میں ابل رہا تھا کہ اتنے میں آپ ﷺ اپنی کمان کا سہارا لیتے ہوئے تشریف لے آئے اور ہماری ہانڈیوں کو الٹ دیا، بوٹیوں کو مٹی میں ملادیا اور ارشاد فرمایا کہ لوٹ کا مال مردار سے کچھ کم نہیں ہے یا یہ ارشاد فرمایا کہ مردار لوٹ کے مال سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہ شک

ہناد (جو اس حدیث کے راوی ہیں) کی طرف سے ہے۔

تشریح مع تحقیق: جُهْدٌ (ف) مصدر ہے کوشش، محنت، مشقت۔

لتَغْلِيَ (ض) جوش مارنا۔

يُرْمِلُ (ض) مٹی میں ملانا۔

علامہ عینی کے بقول یہ واقعہ جنگ حنین کا ہے۔

دو اشکال اور ان کے جواب

اشکال اول

جب مطعومات کو کھانے کی اجازت ہے خواہ وہ مطعومات پکی ہوئی ہوں جیسے روٹی یا بغیر پکی ہوئی جیسے بکری، اور یہاں پر حاجت بھی ہے کیونکہ "فاصاب الناس حاجة شديدة" سے حاجت کا ہونا متحقق ہے تو پھر آپ ﷺ نے اس کو حرام کیوں فرمایا کہ جس طرح مردہ حرام ہے اسی طرح یہ بھی حرام ہے؟

جواب

اس وقت پورا لشکر ضرورت مند تھا اور جب پورا لشکر محتاج و ضرورت مند ہو تو غانمین کے لیے بغیر امام کی اجازت کے استعمال کرنا جائز نہیں۔

دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے ضرورت سے زائد مال لیا ہوگا جس کی وجہ سے حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

دوسرا اشکال

آپ ﷺ نے گوشت کو مٹی میں ملایا حالانکہ اس میں مال کو ضائع کرنا ہے اور حضور ﷺ سے مال کا ضیاع ممکن نہیں ہے؟

جواب

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں لحم سے مراد گوشت نہیں ہے بلکہ شوربہ مراد ہے قرب کی وجہ سے اس کو گوشت کہہ دیا گیا ہے۔

دوسرا جواب ابن منیر نے دیا ہے کہ جب ذبح کرنا تعدی کے طریقہ پر ہو تو وہ مذبوح مردار کے حکم میں ہوتا ہے اور مردار مال متقوم نہیں ہے لہٰذا مال کا ضائع کرنا نہ ہوا۔ (فتح الباری: ۲۳۲/۶)

الشك مِن هناد یعنی ہناد راوی کو شک ہے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ "لوٹ کا مال مردار سے کچھ کم نہیں"،

یا یہ فرمایا تھا کہ ''مردار لوٹ کے مال سے کچھ کم نہیں'' مطلب دونوں جملوں کا ایک ہی ہے کہ جس طرح مردار حرام ہے اسی طرح مال منہوب بھی حرام ہے دونوں کی حرمت برابر ہے۔

ترجمة الباب: إن النهبة ليست بأحل من الميتة سے ثابت ہے۔

﴿ بَاب في حمل الطعام من أرض العدوّ ﴾

دارالحرب سے کھانے کی چیزوں کو اپنے ساتھ دارالاسلام لانے کا بیان

۵۲ ﴿حَدَّثَنا سعيد بنُ منصورٍ ثنا عبدُ اللّٰه بنُ وَهْبٍ قالَ أخبرني عَمرو بنُ الحارثِ أنَّ ابنَ حَرشَفٍ الأزديَّ حدَّثَهُ عَنِ القاسمِ مَوْلٰى عَبْدِ الرحمٰنِ عَن بعضِ أصْحَابِ النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال كنّا نأكُلُ الجَزُرَ في الغَزْوِ ولا نُقَسّمهُ، حتّى أن كنّا لنَرْجِعَ إلى رِحالِنا، وأخْرِجَتُنا مِنْهُ مَمْلاَۃٌ﴾

ترجمہ: عبدالرحمٰن کے غلام قاسم بعض صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ جہاد میں ہم اونٹ کھایا کرتے تھے اور اس کو تقسیم نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ جب ہم ٹھکانوں کی طرف لے جاتے تھے تو ہمارے بورے گوشت سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔

تشریح مع تحقیق: ابن حرشف بعض لوگوں نے ان کا نام ابن خرشب بتلایا ہے، علامہ شوکانی نے ان کو مجہول بھی کہا ہے۔

قاسم مولٰی عبدالرحمٰن ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے اور نام قاسم ہے باپ کا نام بھی عبدالرحمٰن ہے اور یہ غلام بھی عبدالرحمٰن کے ہی ہیں اس لیے بعض لوگوں کو سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے ان کو فقہاء دمشق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۴۰ مہاجرین سے ان کی ملاقات ہوئی ہے لیکن بعض لوگوں نے ان پر کلام کیا ہے جس کی حافظ بن حجرؒ نے تردید کی ہے۔

جَزُرٌ جمع ہے جزور کی بمعنی وہ بکری جس کو ذبح کیا جائے۔ قابل ذبح اونٹ کو بھی جزر کہا جاتا ہے۔

مَمْلاۃٌ (افعال) مملورۃ کے معنی میں ہے بھرا ہوا.

أَخْرِجَتُنَا: أخرجة ج خُرُج وہ تھیلے اور بورے جو سواری کی دونوں جانبوں میں لٹکے ہوئے ہوں۔

رِحَالُهُمْ: رَحْلٌ کی جمع ہے بمعنی کجاوہ۔

امام ابوداؤدؒ اس باب میں یہ بیان فرما رہے ہیں کہ دارالحرب میں مال غنیمت سے جو کچھ کھایا جائے اس سے

بچا ہوا مالِ قلیل دارالاسلام میں لانا ضروری ہے یا نہیں؟ کیونکہ اگر مال کثیر بچ گیا ہے تو اس کو واپس لانا دارالاسلام میں ضروری ہے، مالِ قلیل کے لانے اور نہ لانے میں فقہاء کرام کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔

(۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں اور یہ ہی ایک قول امام احمدؒ کا بھی ہے کہ اگر مال کثیر بچ جائے تو اس کو مالِ غنیمت میں لوٹا دیا جائے گا، اور اگر مالِ قلیل بچ جائے تو اس کو دارالاسلام میں اپنے ساتھ لانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲) امام شافعیؒ اور امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مال چاہے قلیل بچے یا کثیر دونوں صورتوں میں اس کو مال غنیمت میں شامل کر دیا جائے گا، اور بچے ہوئے مال کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، امام احمدؒ کی بھی ایک روایت یہ ہی ہے۔

امام مالک کی دلیل

حدیث باب ہے کہ جب صحابہ واپس آتے تھے تو ان کی سواریوں پر لدے ہوئے بورے سامان سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ (ابوداؤد:۲/۲۶۹)

امام اعظم اور امام شافعی کی دلیل

حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ أدُّوا الخياط والمخيط . اور باب فی تعظیم الغلول کی تمام روایات ہماری مستدل ہیں۔

امام مالکؒ کی دلیل کا جواب

"إلى رحالنا" میں رحال سے مراد خیمے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ بچے ہوئے سامان کو اپنے خیموں میں لے آتے تھے، یا مطلب یہ ہے کہ وہ تقسیم کے بعد اپنے گھروں کو سامان لے آتے تھے لہٰذا یہ روایت ہمارے خلاف نہیں ہے۔

ترجمة الباب : كنا لنرجع إلى رحالنا واخرجتنا منه مملأة سے ثابت ہو رہا ہے۔

﴿بَاب في بيع الطعام إذا فضل عن الناس فى أرض العدوّ﴾

دارالحرب میں لوگوں سے بچے ہوئے کھانے کو فروخت کرنے کا بیان

۵۷ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ الْمُصَفّٰى ثنا محمد بنُ الْمُبارَكِ عن يحيىٰ بنِ حمزةَ ثنا أبو عبدِ العَزِيْزِ (شيخ مِن أهلِ الأردن) عَن عبادة بنِ نُسَيّ عَنْ عبدِ الرحمٰن بنِ غنمٍ قَالَ رابَطنَا مدينة قِنَّسرِيْنَ مَعَ شُرَحْبِيْلَ بنِ السَمْطِ، فلمّا فتحَهَا أصابَ فيها غَنَمًا وبقَرًا

فَقَسَّم فِينَا طائفةً مِنهَا وَجَعَلَ بَقِيَّتَهَا في الْمَغْنَمِ ، فلقيتُ معاذَ بنَ جبلٍ فحدثتُهُ، فقالَ معاذ: غَزَوْنَا مَعَ رسولِ اللّه صلى اللّه عليه وسلم خَيْبَرَ، فأَصَبْنَا فِيهَا غَنمًا فَقَسَّمَ فينا رسولُ اللّه صلى الله عليه وسلم طائفةً وَجَعَلَ بَقِيَّتَها في المَغْنَمِ﴾

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے شرحبیل بن سمط کے ساتھ شہر "قنسرین" کا محاصرہ کیا، جب اس شہر کو فتح کیا تو ہمیں گائیں اور بکریاں ملیں، شرحبیل نے ان میں سے کچھ بکریاں تقسیم کردیں (ہماری ضرورت کے بقدر) اور باقی مال غنیمت میں شامل کردیں، پھر معاذ بن جبلؓ سے میری ملاقات ہوگئی تو میں نے ان سے (اس واقعہ کو) بیان کیا، اس پر انھوں نے فرمایا کہ ہم نے حضور ﷺ کے ساتھ جہادِ خیبر کیا، وہاں کچھ بکریاں حاصل ہوئیں تو آپ ﷺ نے ان میں سے کچھ ہم کو تقسیم کردیں اور باقی کو مالِ غنیمت میں شامل کردیا۔

تشریح مع تحقیق : أبو عَبْدِ العَزِيْزِ ان کا نام یحیٰ بن عبدالعزیز ہے ابوزرعہ دمشقی نے ان کو بڑے نیک، عبادت گزار اور صلحاء میں شمار کیا ہے، ابوحاتم نے بھی ان کی حدیث کے بارے میں کہا ہے: ما لحدیثہ بأس ، اسی طرح حافظ بن حجر نے تقریب میں ان کی حدیث کو مقبول کہا ہے اور یہ ضابطہ ہے کہ جب کسی راوی سے دو یا تین روایت کرنے والے موجود ہوں تو ان کی جہالتِ عینی ختم ہوجاتی ہے۔ اب اگر ایسے شخص کو "لا أعرفه" کہا جائے تو وہ مجہول العین نہیں ہوگا۔ اب دیکھئے یحیٰ بن معین نے "لا أعرفه" کہہ دیا، اسی طرح علامہ شوکانیؒ نے بھی کہا ہے، لہٰذا ان کے اس قول سے جہالت ثابت نہیں ہوگی۔

مزید یہ کہ ان سے روایت کرنے والے تین شخص ہیں ایک تو اسی سند میں ہیں: (۱) یحیٰ بن حمزہ (۲) عمرو بن یونس (۳) علم بن ولید، لہٰذا یہ راوی ضعیف نہیں ہے ان سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔

رَابَطْنَا (مفاعلت) دشمن کی سرحد پر قیام کرنا۔

قِنَّسْرِيْنَ ایک مشہور شہر ہے جس کو جنگ "یرموک" کے بعد ۱۷ھ میں فتح کرلیا گیا تھا۔

امام ابوداودؒ نے اس باب سے پہلے ایک باب قائم کیا تھا "باب في إباحة الطعام الخ" اب اس باب کو قائم کرکے یہ بتلارہے ہیں کہ ضرورت کے وقت میں امام غلہ کو بیچ بھی سکتا ہے، یعنی دارالحرب میں رہتے ہوئے ہی کوئی شدید ضرورت پیش آجائے تو اس غلہ کو بیچ کر اس ضرورت کو پورا کیا جاسکتا ہے۔

ترجمة الباب : بظاہر حدیث کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ روایت میں کہیں بھی بیچنے کا ذکر ہی نہیں لہٰذا مناسبت ثابت نہیں ہوئی۔

اصل میں اس ترجمۃ الباب کا تعلق امام ابوداودؒ کے تفقہ سے ہے ان کے تفقہ کو سمجھنے کے لیے دو چیزوں

(صورتوں) کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہے تب امام ابوداؤدؒ نے جس طرح مناسبت ثابت کی ہے مناسبت ثابت ہوگی۔

(۱) ضرورت کے وقت عام لشکر دارالحرب میں دشمن کا مال استعمال کرسکتا ہے البتہ اس مال کا مالک نہیں ہوگا کہ اس کو فروخت کرسکے بلکہ استعمال کرنے کے بعد غنیمت میں ہی واپس کردیگا۔

(۲) اگر امیر ضرورت کی وجہ سے تقسیم سے پہلے ہی غانمین کو کچھ بانٹ دے تو اس صورت میں امیر کے بانٹنے کی وجہ سے وہ چیز غانمین کی ملکیت ہوجاتی ہے۔

ان دونوں باتوں کے بعد یہ سمجھو کہ جب امیر کے دینے سے غانمین کی ملکیت ثابت ہوگئی اور جب ملکیت ثابت ہوگئی تو اس کو بیچ بھی سکتے ہیں لہٰذا دلالۃً بیع کے جواز کا ثبوت ہوا اور باب کی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امیر نے تقسیم سے پہلے ہی غانمین کو مال بانٹ دیا تھا لہٰذا وہ اس کو بیچ بھی سکتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے اس کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ مال غنیمت کے ہر ہر جزو میں ہر ایک کی ملکیت ہے اور جب تقسیم ہوئی تو گویا ہر ایک نے اپنا حصہ دوسرے کو دیا اور یہ مبادلۃ المال بالمال ہے جو بیع کی تعریف ہے معلوم ہوا کہ دلالۃً بیع کے معنی پائے گئے، اسکی مثال ایسے ہے کہ مثلاً زید وعمر نے مل کر ۲ بیگھے زمین خریدی تو اب اس دو بیگھے زمین میں ہر ایک کا ہر ہر جز میں حصہ ہے جب دونوں نے ایک ایک بیگھہ تقسیم کی تو زید کا جو حصہ عمر کی طرف تھا اس کو زید نے چھوڑ دیا اور عمر کا جو حصہ زید کی طرف تھا اس کو عمر نے چھوڑ دیا اور یہی مبادلۃ المال بالمال ہے۔ بعینہ یہی صورت یہاں بھی ہے۔ (مستفاد از درس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ وبذل المجہود: ۳۱/۴)

یا یوں کہہ لیجئے کہ جب حدیث سے اتنی بات ثابت ہوگئی کہ امام تقسیم سے پہلے لوگوں کو ضرورت کی وجہ سے کچھ دے سکتا ہے تو وہ ضرورت کی وجہ سے مال غنیمت کو بیچ بھی سکتا ہے۔ مثلاً مال غنیمت میں کھانے کی کوئی چیز نہ ہو اور لشکر کے پاس بھی کھانے کا سامان بالکل ختم ہوجائے اور سب بھوکے ہوں تو اس صورت میں امام مال غنیمت سے بقدر ضرورت بیچ کر کھانا خرید سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

﴿بَاب في الرجل ينتفع من الغنيمة بشيءٍ﴾

ایسے شخص کا بیان جو مال غنیمت سے کچھ نفع حاصل کرے

۵۸ ﴿حَدَّثَنا سعيدُ بنُ منصورٍ وعثمانُ بنُ أبي شيبةَ المَعْنِيُّ قال أبو داؤد وأنا لحديثه أتْقَنُ، قالاَ ثنا أبو معاويةَ عن محمد بن إسحق عن يزيد بنِ أبي حبيبٍ عن أبي مَرْزُوقٍ تجيب عن حنشٍ الصَنعاني عن رُوَيْفَع بنِ ثابتٍ الأنصارِيِّ أن النبيَّ صلى

اللّٰہ علیه وسلم قال: مَنۡ كَانَ يؤمنُ باللّٰه واليَوۡمِ الآخرِ فلا يَرۡكَبۡ دابّةً مِن فيءِ المسلمينَ ، حتّی إذا أعۡجَفَها ردَّها ، ومَنۡ كانَ يُؤمِنُ باللّٰه وباليوم الآخرِ فلا يَلۡبَسۡ ثوبًا مِن فَيءِ المسلمينَ حتّی إذا أخۡلقَهٗ رَدَّہٗ فيه﴾

ترجمه: حضرت رویفع بن ثابت انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھے تو وہ مسلمانوں کی غنیمت کے کسی جانور پر سوار نہ ہو حتیٰ کہ اس جانور کو (استعمال کرنے کے بعد) دبلا کر کے غنیمت میں لوٹا دے، اور جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے مال غنیمت کے کسی کپڑے کو نہ پہنے، یہاں تک کہ جب اس کپڑے کو پرانا کر دے تو غنیمت میں واپس کر دے۔

تشریح مع تحقیق : أعۡجَفَها مجرد میں (ن ض) سے ہے بمعنی لاغر ہونا اور یہاں (افعال) سے ہے بمعنی لاغر اور کمزور کرنا۔

أخۡلَقَهَا (افعال) أخلق الثوبَ کپڑے کو پرانا کرنا۔

ماقبل میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے کہ جو چیزیں از قبیل مطعومات ہیں ان کا استعمال بالاتفاق جائز ہے؛ لیکن جو چیزیں از قبیل مطعومات نہیں ہیں ان کے استعمال میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

ایک مختلف فیہ مسئلہ

امام ابوداوٗدؒ حنبلی ہیں ان کا اور امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ غیر مطعوم اشیاء کا استعمال مطلقاً ناجائز ہے اور مطعوم اشیاء کا استعمال مطلقاً جائز ہے۔

امام اعظم، امام مالک اور امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اشیاء غیر مطعومہ کا استعمال بھی ضرورت کے وقت جائز ہے، البتہ امام شافعی صرف ہتھیاروں کے استعمال کے جواز کے قائل ہیں۔

امام احمد کی دلیل

حدیث باب ہے من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يركب دابةً الخ یہ حدیث اشیاء غیر مطعومہ کے عدم جواز پر مطلقاً دلالت کرتی ہے۔

امام اعظمؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ کی دلیل

آنے والے باب کی روایت سے ان ائمہ کرام نے استدلال کیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب ابوجہل کو قتل کیا تو ان کی تلوار میں دھار نہیں تھی جس کی وجہ سے خود ابوجہل کی تلوار لیکر اس کو قتل کیا، معلوم ہوا کہ

استعمال جائز تھا ورنہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ابوجہل کی تلوار استعمال نہ کرتے۔

امام احمد کی دلیل کا جواب

جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی سامان لے کر اس کو واپس نہ کرے یہاں تک اس کو بالکل بیکار اور کمزور کر دے، یہ تو ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، بلکہ استعمال کر کے فوراً واپس کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا یہ حدیث تعدی فی الاستعمال یا بغیر ضرورت کے استعمال کرنے پر محمول ہے۔ (خلاصہ از بدائع الصنائع: ۱۰۱/۶)

ترجمة الباب: حدیث مذکور سے واضح طور پر ثابت ہے۔

﴿باب في الرخصة في السلاح يقاتل به فى المعركة﴾

میدان جنگ میں (غنیمت کے) جنگی ہتھیاروں کے استعمال میں اجازت کا بیان

۵۹ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ العلاءِ قال أنا إبراهيمُ يَعْني بنَ يوسفَ قال أبو داؤد هُوَ إبراهيمُ بنُ يُوسُفَ بنِ إسحٰقَ بنِ أبي إسحٰقَ السَبِيعيُ عَنْ أبيهِ عَنْ أبي إسحٰق السبيعيِّ قال ثني أبو عبيدةَ عن أبيه، قالَ مَرَرْتُ فإذا أبو جهلٍ صَرِيعٌ قَدْ ضُرِبَتْ رِجلُهُ فقلتُ يا عدوَّ اللّٰهِ، يا أبا جهلٍ قَدْ أخزَى اللّٰهُ الأخِرَ، قال ولاَ أَهَابُهُ عِنْدَ ذلك، فقال أبْعَدُ رجلٍ قَتَلَهُ قومُه، فَضَرَبْتُهُ بِسَيْفٍ غَيْرِ طَائِلٍ، فَلَمْ يُغْنِ شَيْئًا، حَتّٰى سَقَطَ سيفُه من يدِهِ، فضربتُ بهِ حتّٰى بَرَدَ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں گزرا تو اچانک دیکھا کہ ابوجہل پڑا ہوا ہے، اس کے پیر پر تلوار کی ضرب لگی ہوئی تھی، میں نے دیکھ کر کہا کہ اے اللہ کے دشمن! اے ابوجہل! آخر اللہ نے اس شخص کو رسوا ہی کر دیا جو اس کی رحمت سے دور تھا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت اس سے ڈرتا نہیں تھا، وہ بولا کہ اس سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے جس کو خود اس کی قوم نے قتل کیا ہو، پھر میں نے اس پر فوراً تلوار ماری تو اس نے کچھ فائدہ نہیں دیا حتیٰ کہ ابوجہل کی تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی تو میں نے اس کو اسی کی تلوار سے مارڈالا حتیٰ کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا یعنی مر گیا۔

تشریح مع تحقیق: الأخِرَ وہ شخص جو رحمت خداوندی سے دور ہو۔

أَهَابَہٗ (ف) ڈرنا۔

غیر طائل (ن) بمعنی بے سود، بغیر نفع کے، بے فائدہ، بیکار، کہا جاتا ہے "لا طائل فیه" اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

أبعد من رجل قتَلَه قومُه : اس کا مطلب یہ ہے کہ ابو جہل کہتا ہے "کہ اس شخص سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا جس کو اس کی قوم نے قتل کیا ہے یا اس شخص کے بارے میں تعجب کرنے کی کیا بات ہے یا اس میں زیادہ ہلاکت کی کیا بات ہے" علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ابو جہل پر ہلاکت کا جو منظر تھا اس کو ہلکا کرنے کے لیے وہ اس طرح کا کلام کر رہا تھا۔

حاصل یہ ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم نے جو مجھے قتل کیا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہ ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا اور اس میں تمہارے لیے فخر کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ میرے لیے شرم وحیا کی بات ہے۔ اور یہاں پر ابعد اعمِدُ کے معنی میں ہے۔

حتی برد صاحب بذل نے اس کے معنی "مات" کے لکھے ہیں البتہ مسلم شریف میں سمرقندی کی روایت میں "بَرَدَ" کی جگہ "بَرَكَ" آیا ہے بمعنی سَقَطَ۔ حضرت گنگوہیؒ نے بَرَدَ بمعنی "سَكَنَ اضطرابُه" یعنی ٹھنڈا ہو گیا کے لیے ہیں، اور یہ معنی بہتر بھی ہیں کیونکہ عرف میں اس طرح بولا جاتا ہے کہ میں نے اس کو مارا تو وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یعنی مرنے کے بالکل قریب ہو گیا۔

ترجمة الباب : امام ابوداوٗدؒ ضرورت کے وقت غنیمت کے ہتھیاروں کے استعمال کے جواز کو بتلا رہے ہیں اسی سے ترجمۃ الباب بھی ثابت ہو رہا ہے۔

﴿ بَاب في تعظيم الغلول ﴾

مال غنیمت میں خیانت کی سنگینی کا بیان

۲۰ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ أَنَّ يحيىٰ بنَ سعيدٍ وبِشْرَ بنَ المفضَّلِ حدَّثَاهُم عَنْ يحيىٰ بنِ سعيدٍ عَنْ محمدِ بنِ يحيىٰ بنِ حِبَّانٍ عَنْ أبي عُمْرَةَ عَنْ زيدِ بنِ خالِدٍ الجُهَنِيِّ أَنَّ رَجُلاً مِنْ أصحابِ النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلم تُوُفِّيَ يومَ خيبرَ، فذَكَرُوا ذلك لرسولِ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلّم، فقالَ: صَلُّوا علىٰ صَاحِبِكُم، فتَغَيَّرَتْ وُجوهُ النّاسِ لِذلك، فقالَ : إنّ صَاحِبَكم غَلَّ في سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَفَتَّشْنا مَتاعَهُ، فوَجَدْنا خَرَزًا مِن خَرَزِ يَهُوْدَ لا يُسَاوِيْ دِرْهَمَيْنِ﴾

ترجمہ: حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ خیبر کے دن ایک صحابی کی وفات ہوگئی، صحابہؓ نے حضور ﷺ کے پاس آکر اس کا تذکرہ کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم ہی اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھوں گا) آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے صحابہ کے چہرے متغیر ہوگئے، (اس کیفیت کو دیکھ کر) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ساتھی نے اللہ کی راہ میں خیانت کی ہے (صحابہ کہتے ہیں کہ) ہم نے اس کے سامان کی تلاشی لی تو ہم کو ایک پوتھ ملا، جو یہودیوں کا تھا، جس کی قیمت دو درہم بھی نہیں تھی۔

تشریح مع تحقیق : غُلُوْل (ن) مصدر ہے بمعنی مال غنیمت میں خیانت کرنا، بعد میں اس کے معنی میں وسعت ہوگئی اور ہر قسم کی خیانت کو غلول کہنے لگے۔

خَرَزٌ: ج خُرُزٌ بمعنی تسبیح کا دانہ، مہرہ، سوراخ دار دانہ، پتھر کا نگ۔ اسکو تاگے میں پروکر یہود کی عورتیں پہنتی تھیں جسکی قیمت بہت کم ہوتی تھی۔

تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ مال غنیمت میں خیانت کرنا اکبر کبائر میں سے ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ومن يغلل يأت بما غلّ يوم القيامة" اگر کسی نے اونٹوں میں خیانت کی تو وہ قیامت کے دن اونٹ لائے گا، اور حضور ﷺ سے درخواست کرے گا کہ یا رسول اللہ میری مدد فرمایئے، حضور ﷺ جواب میں ارشاد فرمائیں گے کہ آج میں کچھ نہیں کرسکتا میں نے تو دنیا میں ہی تم کو اس کی خبر دیدی تھی، اور اگر کسی نے بکری کو مال غنیمت سے لیا ہوگا تو وہ شخص بکری کے ساتھ لایا جائے گا، اور حضور سے درخواست کرے گا کہ یا رسول اللہ مدد فرمادیجئے، حضور ﷺ جواب میں یہ ہی فرمائیں گے کہ میں نے تو تم کو دنیا ہی میں باخبر کردیا تھا، اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مال غنیمت میں خیانت کرنا بڑا سنگین جرم ہے، اصل میں غنیمت کے ساتھ دوسروں کے حقوق متعلق ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ حقوق العباد کا مسئلہ بڑا نازک اور خطرناک ہے۔

مسئلہ: باب مذکور کی روایت سے معلوم ہوا کہ فاسق مُعلِن کی نماز جنازہ میں امام اور مقتدیٰ کو شرکت نہیں کرنی چاہیے، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو، اور فسق وفجور سے اجتناب کریں۔ یہاں حضور ﷺ کی ان صحابی کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ یہ ہی تھی ورنہ مردے کو کیا معلوم کہ حضور نے میری نماز جنازہ پڑھی ہے یا نہیں۔

ترجمة الباب : صلّوا على صاحبكم الخ سے ثابت ہے کیونکہ آپ ﷺ کا نماز جنازہ میں شرکت نہ فرمانا مال غنیمت میں خیانت کے جرم کی سنگینی کو بتلاتا ہے۔

نوٹ: یہاں سے امام ابوداؤدؒ یکے بعد دیگرے تین باب قائم فرمارہے ہیں اور ان تین ابواب میں چار مسئلے اہم ہیں، ایک مسئلہ متفق علیہ ہے اور تین مختلف فیہ ہیں۔ مذکورہ باب میں جو مسئلہ ہے وہ متفق علیہ کہ مال غنیمت میں خیانت کرنا جرم عظیم ہے۔ باقی تین مسئلوں کی تفصیل اپنے مقام پر آرہی ہے۔

۶۱ ﴿حَدَّثَنا القعنبيُّ عن مالكٍ عن ثورِ بنِ زَيْدِ الدَيْلِيِّ عَنْ أبي الغَيْثِ مَوْلٰى ابنِ مطيعٍ عَنْ أبي هريرةَ أنّهٗ قال: خَرَجْنَا مَعَ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عامَ خَيْبَرَ فلم نَغْنَمْ ذَهَبًا ولا وَرِقًا إلّا الثيابَ والمتاعَ والأموالَ، قال: فَوَجَّهَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم نَحْوَ وادي القُرىٰ - وقد أُهْدِيَ لرسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عَبْدٌ اَسْوَدُ يقال له مُدْعِمٌ - حتى إذا كانوا بوادي القُرىٰ فبينما مدعم يَحُطُّ رحلَ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذ جاءَهٗ سَهْمٌ، فقتَلَهٗ، فقال الناسُ: هَنِيئًا لهُ الجنة، فقالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: كلّا والذي نفسي بِيَدِهٖ أن الشَمْلَةَ التي أخذها يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ المغَانم لم تُصِبْها المقاسمُ لتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نارًا، فلما سمعوا ذلك، جاء رجلٌ بِشِراكٍ أو شِرَاكَيْنِ إلى رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فقالَ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: شِراكٌ مِنْ نارٍ، أو قال شِراكَانِ مِنْ نارٍ﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم خیبر کے سال حضور ﷺ کے ہمراہ جہاد میں گئے تو غنیمت میں سونا چاندی حاصل نہیں ہوا، بلکہ کپڑے، سامان اور مال حاصل ہوا، حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ وادی القریٰ کی طرف متوجہ ہوئے - آپ ﷺ کو ایک کالا غلام ہدیہ میں دیا گیا تھا جس کو مدعم کہا جاتا تھا - جب وادی قریٰ میں آپ ﷺ پہنچے تو مدعم حضور ﷺ کے اونٹ کا پالان تیار کر رہا تھا اتنے میں اس کو ایک تیر آ لاگا، اور مدعم کو قتل کر دیا گیا، لوگوں نے کہا کہ اس کے لیے جنت مبارک ہو، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں، اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ کمبل جو اس نے خیبر کے دن مال غنیمت سے لیا تھا تقسیم سے پہلے ہی، وہ اس پر آگ بن رہا ہے جب لوگوں نے یہ سنا تو ایک شخص ایک تسمہ یا دو تسمے لے کر حضور کی خدمت میں آیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تسمہ آگ کا تھا یا یہ فرمایا کہ یہ دو تسمے آگ کے تھے۔ (اگر ان کو غنیمت میں داخل نہ کیا جاتا)

تشریح مع تحقیق: ذَهَبٌ سونا۔ وَرِقٌ چاندی، عرب کے شہری لوگ سونے اور چاندی کو مال کہتے ہیں، اور اونٹ وغیرہ پر مال کا اطلاق نہیں کرتے، اور دیہاتی عرب اونٹ بکری وغیرہ کو مال کہتے تھے اور سونا چاندی کے اوپر لفظ مال کا اطلاق نہیں کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہ چونکہ دیہات کے تھے اس لیے انھوں نے سونے اور چاندی کے مقابلے میں لفظ مال بولا ہے۔

وادی القُریٰ: شام اور مدینے کے درمیان واقع ایک وادی ہے ۶ ھ میں حضور ﷺ نے اس کو فتح کیا تھا لیکن اس وقت یہ ویران ہے۔

مُدْعِمٌ: بضم الميم وسكون الدال وكسر العين أو بفتح العين، یہ حضور ﷺ کا غلام تھا رفاعہ بن زید

نے آپ ﷺ کو ہدیہ میں دیا تھا۔

هنيئًا (تفعیل) مبارک باد دینا، بولا جاتا ہے هنيئًا لكَ : آپ کو مبارک ہو۔

شَمْلَةٌ ج شملاُت بمعنی کمبل، وہ چادر جس سے جسم کو ڈھانپا جائے۔

يَحُطُّ (ن) اترنا۔

شِرَاكٌ ج أشرِكة بمعنی تسمہ، جوتے کا فیتا۔

امام ابوداوُدؒ اس روایت کو اس باب میں لا کر یہ ہی بتلانا چاہتے ہیں کہ مال غنیمت میں خیانت کرنا بہت سنگین گناہ ہے۔ روایت بالا میں جو واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے وہ جنگ خیبر کا قصہ ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کو سونا چاندی تو نہیں ملا تھا بلکہ مویشی کافی تعداد میں ملے تھے، جنگ خیبر سے واپسی میں حضور ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ وادی القریٰ میں تھے، اور آپ کے ساتھ آپ کا وہ غلام بھی تھا جس کو رفاعہ بن زید نے ہدیہ میں دیا تھا، یہ غلام حضور ﷺ کے کجاوے کو اتار رہا تھا کہ اچانک کہیں سے تیر آیا اور اس کو لگ گیا اس غلام نے فوراً ہی دم توڑ دیا، اس پر صحابہؓ نے کہا کہ اس غلام کو جنت مبارک ہو، کیونکہ ایک تو شہادت نصیب ہوئی، دوسرے وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مصروف تھا۔ حضور ﷺ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس کو جنت کی خوش خبری سنا رہے ہو حالانکہ اس نے جو عمل کیا ہے یعنی ایک کمبل کو مال غنیمت میں سے اٹھایا ہے وہ اس کے لیے آگ کا شعلہ بنا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ غلول بہت بڑا گناہ ہے۔

نوٹ : بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس غلام کا نام مدعم نہیں تھا بلکہ کرکرہ تھا، لیکن صحیح بات یہ ہی ہے کہ اس کا نام مدعم تھا، کرکرہ حضور ﷺ کے دوسرے غلام کا نام تھا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ (تقریر درس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہ)

ترجمة الباب : اس حدیث شریف سے بھی مال غنیمت میں خیانت کی سنگینی اور جرم عظیم ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ ہی ترجمۃ الباب کا مقصد ہے۔

﴿باب في الغلول إذا كان يسيرًا يترك الإمام ولا يحرق رحله﴾

جب خیانت قلیل اور کم ہو تو امام اس کو چھوڑ دیگا اور اسکے کجاوے کو نہیں جلائیگا

۶۲ ﴿حدَّثنا أبو صالحٍ محبوبُ بنُ موسٰى قال أنا أبو إسحٰق الفَزَاريُّ عَنْ عبدِ الله بنِ شَوْذَبٍ قال ثني عامر يعني ابن عبد الواحدِ عَن ابن بُرَيدةَ عن عبد الله بن عَمْرو قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اصابَ غنيمةً اَمَرَ بلالاً ، فنادىٰ في

الناس فَيَجيئون بغنائِمِهِمْ، فَيَخْمِسَهُ ويُقسِّمُه، فجاء رجُلٌ بعد ذلك بزمام مِن شعرٍ فقال : يارسول الله ! هذا فيما كنّا أصبنا ه منَ الغنيمة ،فقال : أسَمِعتَ بلا لاً ينادي ثلثاً ؟ قال: نعم ، قال: فما مَنَعَكَ أن تجيئى به؟ فاعتذر اليه، فقال: كُن أنت تجيئ به يوم القيامة ، فلن اَقْبَلَهُ عنك ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ کو مال غنیمت حاصل ہوتا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے کہ وہ یہ اعلان کریں (کہ سب مال غنیمت کو ایک جگہ جمع کردو) چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اعلان کرتے اور لوگ غنیمت کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے خمس نکال کر باقی مال کو تقسیم فرمادیا کرتے تھے، (ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ) ایک شخص تقسیم کے بعد بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ مال غنیمت کا ہے (جس میں تقسیم نہیں ہوئی تھی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے بلال کو اعلان کرتے ہوئے نہیں سنا؟ اس نے تین بار اعلان کیا تھا، اس شخص نے کہا کہ ہاں سنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم کو کس چیز نے اس کے لانے سے منع کیا؟ اس شخص نے آپ کے سامنے عذر پیش کیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ٹھہرو تم ہی اس کو قیامت کے دن لاؤ گے میں اسکو تم سے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

تشریح مع تحقیق :اِعتَذَرَ إلٰی احدٍ معذرت کرنا، زِمَامٌ ج أزِمَّةٌ بمعنی، لگام، ٹائی، اونٹ کی مہار، اقبل عن احدٍ : قبول کرنا۔

اس حدیث میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد اعلان کراتے کہ سارے مال غنیمت کو ایک جگہ جمع کرلیا جائے، جب یہ سارا مال جمع ہو جاتا تو مجاہدین کے درمیان خمس نکالنے کے بعد تقسیم فرمادیتے تھے، اب ایک روز ایسا ہوا کہ حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ سے تین مرتبہ اعلان کرایا کہ سب لوگ غنیمت کو اکٹھا کر کے لے آئیں چنانچہ سب حضرات مالِ غنیمت کو اکٹھا کر کے لے آئے اور حضور ﷺ نے خمس نکالنے کے بعد باقی مال کو تقسیم فرمادیا، سب حضرات اپنا اپنا حصہ لے کر چلے گئے، اب ایک شخص ایک لگام جو بالوں کی بنی ہوئی تھی لے کر حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ لگام مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے لے لی تھی، حضور نے فرمایا کہ پہلے سے کیوں نہیں لائے ان صحابی نے معذرت پیش کی، لیکن شاید یہ عذر قابل قبول نہیں تھا اس لیے حضور ﷺ نے اس کو قبول نہیں فرمایا، یا اس لیے قبول نہیں فرمایا کہ تمام مجاہدین اپنا اپنا حصہ لے کر تو چلے گئے اب سب کی طرف اس کو کس طرح پہنچایا جائے، صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمانِ خداوندی: و من یغلل یأت بما غلّ یوم القیامة، کی وجہ سے اس کے قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔

ترجمة الباب : امام ابوداوُدؒ اصل میں باب قائم کرکے اس طرف اشارہ فرمار ہے ہیں کہ اگر کوئی مال غنیمت میں سے مالِ کثیر کو چرالے تو اسکے کجاوے کوجلایا جائے گا۔ اب حدیث باب سے پتہ چلا کہ مالِ غنیمت میں سے لیاہوامال کم تھااس لئے حضور ﷺ نے ان کے کجاوے کونہیں جلایا،لہٰذاترجمۃ الباب ثابت ہوگیا۔

اختلافی مسئلہ

(۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ شئے یسیر غلول میں شامل ہی نہیں ہے بلکہ وہ معاف ہے۔
(۲) ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ مال غنیمت میں سے لی ہوئی شئی قلیل ہو یا کثیر ہو کسی صورت میں بھی معاف نہیں ہے۔

امام مالکؒ کی دلیل

حضرت جابرؓ کی حدیث ہے:رخَّص لنا رسو ل الله صلى الله عليه وسلم فى العصا و الحبل والسوط و اشباهه يلتقط الرجلُ و ينتفع به(اوجز المسالک ص۸۴ ج۴) اس سے استدلال اس طرح کیا کہ جس طرح مال لقطہ میں سے شئے یسیر سے انتفاع جائز ہےاسی طرح مال غنیمت میں سے شئی یسیر سے بھی انتفاع جائز ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل

(۱) حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث ہے أدوا الخياط و المخيط
(۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے:شراك من نار أو شراكان من نار،یہ دونوں روایتیں اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ شئی یسیر بھی معاف نہیں ہے

امام مالکؒ کی دلیل کا جواب

حضرت جابرؓ کی حدیث موقوف ہے اور موقوف حدیث مرفوع کے مقابلے میں قابل استدلال نہیں ہے۔ (نعمۃ المنعم ص۳۷۵) نیز مال غنیمت کو مالِ لقطہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ قیاس اسی چیز کو کیا جائے گا جس کے بارے میں کوئی نص نہ ہو اور یہاں مال غنیمت کے سلسلے میں حدیث مرفوع موجود ہے۔ واللہ اعلم

﴿باب في عقوبة الغال﴾

مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی سزا کا بیان

۶۳ ﴿حدَّثَنا النفيليُّ وسعيدُ بنُ منصورٍ قالا ثنا عبد العزيز بنُ محمدٍ قال النُفَيْليُّ الأَنْدَرَاوَرْدِيُّ عن صالحِ بن محمدِ بن زائدة ، قال ابوداؤد صالح هذا ابو واقدٍ ،

قال دخلتُ مع مَسلَمةَ ارضَ الروم ، فاتى برحلٍ قد غلّ ، فسأل سالماً عنه ؟ فقال: سمعت ابى يُحدثُ عن عمر بن الخطاب عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: إذا وَجدتم الرحلَ قد غلّ فاحرقوا متاعَه واضربوه ، قال فوجَد نا في مَتَا عِه مُصحفاً فسال سالماً عنه ، فقال بعه و تصدَّق بِثَمَنِهِ﴾

ترجمه: حضرت ابوواقد صالح بن محمد سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں مسلمہ بن عبدالملک کے ساتھ ملک روم گیا، وہاں ایک شخص کولایا گیاجس نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی، اب مسلمہ بن عبدالملک نے اس کا مسئلہ سالم سے پوچھا کہ اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے انہوں نے حضرت عمر سے اور حضرت عمر نے حضور اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگرتم ایسے کسی شخص کو پاؤ جس نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہو تو اس کا سامان جلادو اور اس کی پٹائی کرو، راوی نے حضرت مسلمہ سے پوچھا کہ اس شخص کے سامان میں ایک قرآن شریف بھی تھا، انہوں نے جواب دیا کہ قرآن شریف کو بیچ دو اور اس کی قیمت کوصدقہ کردو۔

تشریح مع تحقیق : الاندراوردی: یعنی نفیلی نے عبدالعزیز بن محمد کی نسبت ''اندراورد'' کی طرف کی ہے اور سعید بن منصور نے بغیر نسبت کے ذکر کیا ہے۔

اس حدیث کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے اس کے سامان کو جلا دیا جائیگا، جیسا کہ امام احمد اور امام اوزاعیؒ کا مسلک ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس میں صالح بن محمد ضعیف ہیں، یحیٰ بن معین نے کہا ہے کہ صالح بن محمد ضعیف ہیں اور کہتے ہیں ''ولیس حدیثه بذلك'' امام عجلی فرماتے ہیں: ''لیس بالقوی'' امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے، امام نسائی نے ''لیس بالقوی'' کہا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرنا بالکل غلط ہے بلکہ یہ سالم کا قول ہے۔ ان وجوہات کے پیش نظر حدیث بالا قابل استدلال نہیں ہے۔

ترجمة الباب: فاحرقوا متاعه واضربوه الخ سے ثابت ہو رہا ہے۔

۶۴ ﴿حَدَّثَنا ابو صالحٍ محبوبُ بْنُ موسٰى الأنْطاكِيُّ قَالَ أنا ابو اِسحٰقَ عَنْ صالحِ بنِ محمدٍ قال: غَزوْنَا مَعَ الوليدِ بنِ هشامٍ وَمَعَنَا سالمُ بْنُ عبدِاللهِ بنِ عُمَرَ وعُمربْنُ عبد العزيزِ، فغلَّ رجلٌ متاعاً فَأمر الوليدُ بمتاعِهٖ، فـأُحْرِقَ وطِيفَ بِهٖ ، ولَمْ يُعطِهٖ سهمهٗ قالَ ابُوْدَاؤد: هذا اصح الحديثين رواهُ غيرُ واحدٍ أنَّ الوليدَ بنَ هشامٍ أَحْرَقَ رَحْلَ زِيادِ بنِ سَعْدٍ ، و كانَ قَدْ غَلَّ، وَ ضَرَبَهٗ﴾

ترجمه: حضرت صالح بن محمد سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ہم نے ولید بن ہشام کے ساتھ جہاد کیا اور ہمارے ساتھ سالم بن عبداللہ بن عمر اور عمر بن عبدالعزیز بھی تھے، ایک شخص نے مال غنیمت میں خیانت کی تو ولید بن ہشام نے حکم دیا کہ اس کے سامان کو جلا دیا جائے چنانچہ اس شخص کے سامان کو جلا دیا گیا، اور اس کو راستوں میں (تعزیرا) گھمایا گیا نہ ہی اس کو مال غنیمت سے حصہ دیا گیا، امام ابوداؤد نے کہا کہ یہ روایت دونوں روایتوں میں سے زیادہ صحیح ہے (مرفوع اور موقوف میں سے یہ موقوف روایت زیادہ صحیح ہے) اس کو کئی آدمیوں نے روایت کیا ہے کہ ولید بن ہشام نے زیاد بن سعد کا سامان جلایا اور اس کو مارا، کیونکہ اس نے مال غنیمت میں خیانت کی تھی۔

تشریح مع تحقیق: طِيفَ (ن) گھومنا، مجہول کا صیغہ ہے یعنی گھمایا گیا، یعنی تشہیر اور تعزیر کی غرض سے اس خائن شخص کو شہر کی گلیوں اور راستوں میں گھمایا گیا۔

متاعَه: متاع سے مراد وہ سامان نہیں ہے جس کو چرایا گیا تھا بلکہ اس کے علاوہ دیگر سامان ہے۔

یہ روایت بھی صالح بن محمد سے ہی مروی ہے لیکن ان کی پہلی روایت مرفوع تھی اور یہ روایت موقوف ہے امام ابوداؤدؒ خود فرمارہے ہیں کہ موقوف روایت ہی زیادہ صحیح ہے اس سے معلوم ہوا کہ صالح بن محمد کی پہلی روایت امام ابوداؤدؒ کے نزدیک بھی ضعیف ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ صالح بن محمد کی یہ موقوف روایت بھی ضعیف ہے اولاً تو اس لیے کہ صالح بن محمد ضعیف راوی ہیں۔ ثانیاً یہ روایت موقوف ہے جو مرفوع کے درجہ کی نہیں ہوسکتی، ثالثاً اس لیے بھی کہ اس موقوف روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خائن کو مال غنیمت میں سے حصہ بھی نہیں دیا جائے گا، حالانکہ یہ دیگر مرفوع روایات کے خلاف ہے۔ اس لئے اس روایت سے بھی احراق یعنی خائن کے اموال کو جلانے پر استدلال درست نہیں ہے۔

ترجمة الباب: فاحرقِ وطيف به الخ سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔

۶۵ ﴿حَدَّثَنا محمدُ بنُ عَوفٍ ثنا موسٰى بْنُ أَيُّوبَ قال ثنا الوَلِيدُ ابنُ مسلمٍ ثنا زُهَيرُبنُ محمدٍ عَن عَمرو بنِ شُعَيبٍ عَن أَبِيهِ عَنْ جَدِّه أنَّ رسولَ اللّٰه صلى الله عليه وسلم وَأَبَا بكرٍ وعُمَرَ حَرَّقُوا متاعَ الغَالِّ وضَرَبوهُ، قال أبوداؤد: وزادَ فِيه على بنُ محمدٍ عَنِ الوليدِ - وَلَمْ اَسمَعْهُ مِنْهُ - وَمَنَعُوهُ سَهمَهُ، قال ابوداؤد: حدثنا به الوليدُ بنُ عتبةَ وعبدُ الوهاب بنُ نجدةَ قالاَ حدثنا الوليدُ عنْ زهيرِ بنِ محمدٍ عَنْ عَمرو بنِ شعيبٍ قولَهُ ولم يذكر عبدُ الوهابِ بنُ نجدةَ الحوطيىُّ مَنعَ سَهْمَهُ﴾

ترجمه: حضرت شعیب کے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے غنیمت میں خیانت کرنیوالے کا سامان جلایا اور اس کی پٹائی کی، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ علی بن

بحر نے ولید کے واسطے سے اس روایت میں یہ زیادتی نقل کی ہے کہ غال کو اس کے حصہ سے بھی محروم کردیا جائے گا (امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ) میں نے یہ زیادتی نہیں سنی ہے، امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ حدیث اس سند سے بھی پہنچی ہے کہ ولید بن عتبہ اور عبدالوہاب بن نجدہ سے مسلم کے واسطہ سے اور انہوں نے زہیر بن محمد سے اور انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہی کا قول نقل کیا ہے یعنی یہ قول عمرو بن شعیب کا ہے نہ کہ مرفوع، اور عبدالوہاب نے اس میں حصہ سے محروم کردینے کی زیادتی نقل نہیں کی ہے۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث میں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خائن کے سامان کو جلایا ہے۔ اس کی عبارت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، اس سے آگے کی عبارت گنجلک معلوم ہوتی ہے اس لیے اس کی وضاحت ناگزیر ہے۔

قال ابو داؤد اول: اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ کے ایک استاذ علی بن بحر ہیں انہوں نے اس روایت کو ولید بن مسلم سے سنا ہے اور اس روایت میں ,ومنعوه سهمه، کی زیادتی نقل کی ہے لیکن ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ زیادتی میں نے براہ راست اپنے استاذ علی بن بحر سے نہیں سنی،

قال ابو داؤد ثانی: یہاں سے امام ابوداؤدؒ نے اسی حدیث کی دوسری سند لاکر یہ بتلایا ہے کہ یہ روایت عمرو بن شعیب پر موقوف ہے اور اس میں, منعوه سهمه، کی زیادتی بھی نہیں ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ,و منعوه، کی زیادتی ابوداؤد کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ دوسری سند سے اپنی اس رائے کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔

امام ابوداؤدؒ اس روایت کو ذکر فرما کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ خائن کے مال کو جلایا جائے گا جیسا کہ حضرت عمر اور حضرت ابوبکرؓ نیز خود نبی کریم ﷺ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن امام ابوداؤد کا اس روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے اولاً تو اس لئے کہ اس میں ایک راوی زہیر بن محمد ہیں جو مجہول ہیں امام بیہقیؒ نے ان کو مجہول کہا ہے دوسرے اس لیے کہ اس روایت کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے علامہ حافظ بن حجرؒ نے فتح الباری ص: ۲۳۰، ج ۶ پر کہا ہے کہ یہ روایت موقوفاً ہی صحیح ہے اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے اس وجہ سے بھی اس سے استدلال ٹھیک نہیں ہے۔ اب دیکھئے کہ اس باب میں تین روایتیں ہیں اور تینوں قابل استدلال نہیں، جیسا کہ ہر ایک حدیث کے ذیل میں صراحت کردی گئی ہے، اب ایک اختلافی مسئلہ ہے جس کا سمجھنا ضروری ہے۔

﴿مختلف فیه مسئله﴾

(۱) امام ابوداؤد و امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے اور اس کا خیانت کرنا معلوم ہوجائے تو اس کے سامان کو جلادیا جائے گا اور اس کو مال غنیمت سے حصہ نہیں ملے گا، یہی مسلک امام اوزاعی اور

مکول کا بھی ہے۔

(۲) ائمۂ ثلثہ امام اعظم، امام مالک اور امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کے مال کو جلایا نہیں جائے گا۔ اور نہ ہی اس کو غنیمت میں سے اس کے حصہ سے محروم کیا جائے گا، بلکہ امام اس کو تعزیر کرے گا، تعزیر بھی اتنی کہ کسی حد شرعی کو نہ پہنچے یعنی چالیس کوڑوں سے کم تعزیر کرے گا۔ کیونکہ اس میں شریعت کی طرف سے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ (بذل ص ۳۴، ج ۴)

امام احمدؒ کی دلیل

باب کی تینوں روایتیں فریق اول کی مستدل ہیں، پہلی حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر کسی غال کو پاؤ تو اس کے سامان کو جلادو، اور اس کو سزا دو، دوسری روایت ہے کہ ولید نے غال کے سامان کو جلایا، اور تیسری حدیث ہے کہ حضور ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے غال کے سامان کو جلایا ہے۔

فریق ثانی یعنی ائمہ ثلثہ کی دلیل

(۱) حضرت زید بن خالد جہنی کی حدیث کہ حضور ﷺ نے غال کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرمادیا تھا، لیکن روایت میں اس کے سامان کو جلانے کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ہے، اگر جلانا ضروری ہوتا تو آپ ﷺ اس کے سامان کو جلانے کا حکم فرماتے۔

(۲) بخاری شریف میں ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ کے ایک غلام جس کا نام کرکرہ تھا کا انتقال ہوا حضور ﷺ نے فرمایا کہ "هو في النار" دیکھئے اس روایت میں بھی غال یعنی کرکرہ کے سامان کو جلانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۳) حضرت جابرؓ کی حدیث ہے ,ليس في الغلول قطع ولا نكال ، اس کے علاوہ بھی وہ تمام روایات جن میں جلانے کا کوئی ذکر نہیں ہے ائمہ ثلثہ کی مستدل ہیں۔

امام احمدؒ کی دلیل کا جواب

(۱) پہلی اور دوسری روایت میں صالح بن محمد ہیں جو ضعیف ہیں جیسا کہ روایت کے تحت ان پر کلام گزر چکا ہے۔ نیز دوسری روایت کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے حافظ ابن حجر، اور خود امام داؤدؒ نے روایت موقوفہ کو ہی ترجیح دی ہے، اور موقوف مرفوع کے مقابلے میں قابل استدلال نہیں ہے۔

(۲) تیسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت بھی دو وجہ سے قابل استدلال نہیں اولاً تو اس لیے کہ اس میں زہیر بن محمد مجہول راوی ہیں۔

(۳) یہ روایت موقوف اور مرفوع دونوں طرح ہے حافظ ابن حجر نے ص۲۳۰، ج۶ فتح الباری میں اس کے موقوف ہونے کو ہی راجح قرار دیا ہے۔لہٰذا مرفوع روایات کے مقابلہ میں یہ بھی قابل استدلال نہیں ہے۔ واللہ اعلم

اختلافی مسئلہ

اس باب کے تحت اور ایک مسئلہ زیر بحث آتا ہے کہ جس شخص نے مال غنیمت میں خیانت کی ہو اور وہ شخص تقسیم غنائم کے بعد توبہ کر کے اس کو واپس لائے تو اس مال کا کیا کیا جائے، اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

(۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس مال کو جس کو توبہ کر کے تقسیم غنائم کے بعد لائے امام کو دینا واجب ہے جیسا کہ تمام اموال ضائعہ امام کو ہی دیے جاتے ہیں۔

(۲) امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی اور جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ اس میں سے خمس امام کو دیا جائے گا اور باقی مال صدقہ کر دیا جائے گا۔

(۳) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام مناسب سمجھے تو اس میں سے خمس لے کر ان مصارف میں خرچ کر دے جو کتاب اللہ میں مذکور ہیں، اور باقی مال کو صدقہ کر دے یا بیت المال میں جمع کر دے اور اگر چاہے تو غال یعنی خائن سے مال نہ لے اور کہہ دے کہ اس میں جن کا حق ہے اس کو ان ہی لوگوں کو واپس کر دو۔

امام شافعیؒ کی دلیل

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ مال خائن کی ملکیت میں آ گیا ہے اور وہ اس کا مالک ہے تو اس پر صدقہ کرنا واجب نہیں، اور اگر اس کی ملکیت نہیں تو غیر کے مال سے صدقہ کرنا درست نہ ہوگا اس لیے اس مال کو امام کے حوالے کر دیا جائے گا۔

فریق ثانی اور ثالث کی دلیل

خائن کے پاس جو مال ہے وہ مال غنیمت ہے اور مال غنیمت میں سے امام کو خمس نکالنا چاہیے، اس لیے خمس تو امام لے لے گا، اور باقی مال غانمین کا ہے اور ان کی طرف اس کا پہنچانا مشکل ہے لہٰذا وہ مال مال لقطہ کے حکم میں ہوگا۔ جیسا کہ مال لقطہ کو اس کے مالک کی طرف پہنچانا مشکل ہو تو اس کو صدقہ کیا جائے گا۔

امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب

بظاہر مال جس کے ہاتھ میں ہو وہ ہی اس کا مالک ہوتا ہے اور اس کو شرعاً صدقہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

(بذل:۴/۴۳۳، معارف السنن:۱/۳۴)

﴿باب في النهي عن الستر على من غلّ﴾

مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کا بیان

۶۶ ﴿حَدَّثَنَا محمد بنُ داؤدَ بنِ سفيانَ ثنا يحيٰ بنُ حسّانَ ثنا سليمانُ بنُ موسٰى، أبوداؤدَ ثنا جعفر بنُ سعدِ بنِ سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ قَالَ ثنى خُبَيْبُ بنُ سليمانَ عن أبيه سُليمانَ بنِ سمرةَ عن سمرةَ بن جندبٍ قال أمابَعْد وكان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ:مَنْ كَتَمَ غالاً فانَّهٗ مثلُهٗ﴾

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کرے وہ بھی خیانت کرنے والے کی طرح ہے۔

تشریح مع تحقیق :أمابعد، حضرت سمرہ بن جندبؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں کچھ حدیثیں لکھی ہوئی تھیں، انہوں نے وہ حدیثیں لکھ کر اپنے گھر والوں کو بھیجیں تھیں، اوران احادیث کے شروع میں امابعد لکھا ہوا تھا۔ ان کے گھر والے بھی ان احادیث کو امابعد کہہ کر ہی روایت کرتے تھے امام ابوداؤدؒ نے بھی اس صحیفہ کی چھ احادیث نقل کی ہیں اور ہر ایک میں امابعد لکھتے ہیں۔

كَتَمَ (ن) بمعنی چھپانا، پوشیدہ رکھنا۔

اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مالِ غنیمت میں خیانت کرے اور دوسرے شخص کو معلوم ہو کہ اس نے خیانت کی ہے اور وہ امام لشکر کو اس کی اطلاع نہ دے بلکہ خیانت کرنے والے کی پردہ پوشی کرے تو جس طرح خیانت کرنے والا گنہ گار ہے اسی طرح اس کے اس عمل کو چھپانے والا بھی گنہ گار ہے کیوں کہ یہ معصیت پر مدد کرنا ہے اور فرمان خداوندی ہے "وَلَاتعاوَنُوا عَلَى الِاثْمِ" لہٰذا اگر کوئی خیانت کرے اور دوسرے کو اس کا علم ہو جائے تو فوراً امام کو اطلاع کرنی چاہیے۔

ترجمة الباب :مَنْ كَتَمَ غالاً فَاِنَّهٗ مِثْلَهٗ سے ثابت ہو رہا ہے۔

﴿باب في السلب يعطىٰ للقاتل﴾

قاتل کو سلب (مقتول کا سامان) دینے کا بیان

۶۷ ﴿حَدَّثَنَاعبدالله بنُ مَسْلَمَةَ القعنبيُّ عَن مالكٍ عَن يحيٰ بنِ سعيدٍ عن عمر بنَ كثيرِ

بنِ أفْلَحَ عن أبى محمدٍ مولىٰ ابى قتادةَ انه قال: خرَجْنا مَعَ رَسولِ الله صلى اللّٰه عليه وسلم فى عَامِ حُنَين، فلما الْتَقَيْنَا كانت للمسلمين جَوْلَةٌ ، قال فَرأَيْتُ رجلاً من المشركين قد عَلا علىٰ رجلٍ من المسلمين، قال فاسْتَدَرْتُ له، حتّٰى أتَيْتُه من ورائِه فَضَرَبْتُه بالسَّيْفِ علىٰ حَبْلِ عاتِقِهِ فأقبلَ عَلَيَّ فَضَمَّنِيْ ضَمَّةً وجَدْتُ مِنْها ريحَ المَوْتِ، ثمّ أدرَكه الموتُ، فأرسَلنِيْ، فلحقتُ عمرَ بنَ الخطاب فقلتُ له: مَا بَالُ الناس، قال: أمرُ اللّٰهِ ثُمَّ إنَّ النَاسَ رَجَعُوا وجَلَسَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال : مَنْ قَتَلَ قَتِيْلاً له عَلَيْهِ بَيِّنَةٌ فَلَهٗ سَلَبُه، قال: فَقُمْتُ ثم قُلْتُ: مَن يَشْهَدُ لِيْ؟ ثم جلستُ، ثم قال ذلك الثانية: من قتل قتيلاً له عليه بينة فله سلبه، فقمت ثم قلت من يشهد لي؟ ثم جلستُ، ثم قال ذلك الثالثة فَقُمْتُ فقال رسولُ اللّٰه ﷺ : مالكَ يا أبا قتادة، فَاقْتَصَصْتُ عليه القِصَّةَ، فقال رجل من القوم صَدَقَ يا رسولَ الله، وسَلَبُ ذلك القتيلِ عِنْدِيْ، فَارْضِهٗ مِنْهُ، فقال أبوبكر الصديق: لَاهَا اللّٰهِ اذاً يَعْمِدُ الى أسَد من أسُدِ اللّٰهِ يقاتل عَنِ اللّٰه وعَنْ رسولِهٖ فيُعْطِيْكَ سَلبَه، فقال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فاعْطِه إيّاه، فقال أبوقتادة: فأعطانيهِ فبعتُ الدرعَ فابْتَعْتُ به مَخْرِفاً في بني سَلَمَةَ، فإنّه لأوّلُ مالٍ تاثلتُه فى الاسلام ﴾

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ حنین میں گئے، جب کفار سے لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں میں گھوم پھیر تھی، ابوقتادہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مشرک کو دیکھا کہ اس نے ایک مسلمان کو مغلوب کر رکھا ہے، میں چاروں طرف گھومنے لگا یہاں تک کہ میں اس کے پیچھے سے آیا اور ایک تلوار اس کی گردن پر ماردی، وہ میری طرف متوجہ ہوا، اور مجھے ایسا دبایا کہ میں نے اس کے دبانے کی وجہ سے موت کی خوشبو یعنی موت کا مزہ چکھ لیا، پھر اس کو موت آگئی، اور مجھے چھوڑ دیا، میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ آج لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ پھر مسلمان لوٹے اور رسول اللہ ﷺ نے بیٹھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ جو کسی شخص کو قتل کرے اس مقتول کا سامان قاتل کو ملے گا، جب کہ قاتل کے پاس گواہ بھی ہوں، ابوقتادہ کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو کھڑا ہوا اور کہا کہ میرے حق میں کون گواہی دے گا۔ (جب کسی نے گواہی نہ دی) تو میں بیٹھ گیا، پھر آپ ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کرے تو مقتول کا سامان قاتل کو ہی ملے گا بشرطیکہ قاتل کے پاس گواہ ہوں، میں پھر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میرے لیے کون گواہی دے گا، میں پھر بیٹھ گیا، اس کے بعد تیسری مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ابوقتادہ کہتے ہیں کہ میں پھر کھڑا ہو گیا، اور کہا کہ میرے لیے کون گواہی دے گا، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

اے ابوقتادہ تم کو کیا ہوا، میں نے پورا قصہ سنایا، اس کے بعد ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ انھوں نے سچ کہا ہے، اس مقتول کا سامان میرے پاس ہے وہ سامان آپ مجھے دے دیجئے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم ایسا کبھی نہ ہوگا، حضور ﷺ اس کا ارادہ بھی نہیں فرمائیں گے کہ اللہ کا ایک شیر اس کے اور اس کے رسول کے راستہ میں جہاد کرے اور سامان تجھے مل جائے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ سچ کہتے ہیں اس کا سامان ابوقتادہ کو دیدو، چنانچہ اس شخص نے وہ سامان مجھے دیدیا، میں نے زرہ بیچ کر ایک باغ خریدا جو قبیلہ بنوسلمہ کے محلے میں تھا اور یہ پہلا مال ہے جس کو میں نے اسلام کے زمانے میں حاصل کیا ہے۔

تشریح مع تحقیق : سَلَبٌ : بفتح السین واللام مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں، ای المال المسلوب کفار سے چھینا ہوا مال۔ مراد وہ مال ہے جو مقتول کے پاس سے ملے جیسے ہتھیار وغیرہ۔

جَوْلَۃٌ یہ جولان سے ماخوذ ہے بمعنی ہزیمت، شکست، گھومنا، مختصر یہ ہے کہ رمضان ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا اس کے بعد حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قبیلۂ ہوازن اور ثقیف نے مسلمانوں سے لڑنے کی بہت تیاری کر لی ہے اس وقت مدینہ سے آئے ہوئے دس ہزار مجاہدین اور دو ہزار مکہ مکرمہ کے مجاہدین کل بارہ ہزار کا لشکر وادی حنین کی پیچیدہ گزرگاہوں میں گذر رہا تھا صبح کاذب کا وقت تھا کہ اچانک دشمن اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور مسلمانوں پر سخت ترین حملہ کیا، اس اچانک حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے لیکن حضور ﷺ اور آپ کے ساتھ چھوٹی سی جماعت بالکل ثابت قدم رہی، اس کے بعد مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر دوبارہ حملہ کیا اور دشمنوں کو بھگا دیا، اس اچانک حملے سے جو مسلمان ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے اسی کو یہاں پر "جَوْلَۃٌ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

عَلاَ (ن) غَلَبَ کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ ایک مشرک ایک مسلمان کے اوپر غالب آ گیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔

حَبْلٌ ج حِبَالٌ بمعنی رگ، رسّی، ڈوری، یہاں پہلے معنی ہی مراد ہیں۔

عَاتِق : بمعنی مونڈھا، حبل عاتق سے مراد یہاں پر مونڈھے کی رگ یعنی شہ رگ ہے جس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے۔

ضَمَّنِیْ (ن) ملانا، کھینچنا۔ مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے مجھے بہت زور سے کھینچا، اور دبایا یہاں تک کہ میں مرنے کے قریب ہو گیا، لیکن جب اس کی رگ سے خون نکل گیا تو وہ فوراً مر گیا۔

ما بال الناس : اس جملے کے دو مطلب ہیں:

(۱) لوگوں کو کیا ہو گیا کہ وہ شکست کھا رہے ہیں اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اللہ کے حکم سے یعنی قدر و قضا کا فیصلہ ہے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا اب کیا حال ہے یعنی شکست کے بعد اب لوگ کیا کر رہے ہیں؟ اس صورت میں حضرت عمرؓ کے جواب ''امر اللہ'' میں امر سے مراد نصرت اور مدد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہی غالب رہیگا۔

من يشهد لي : یعنی میں نے قتل کیا ہے میرے لیے کون گواہی دے گا؟

فقام رجل : حافظ بن حجرؒ نے کہا ہے کہ یہ شخص اسود بن خزاعی تھا۔

فَارْضِهٗ (افعال) خوش کرنا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ابوقتادہ کو اس مال کا عوض دے دیجئے اور اس کو خوش کر دیجئے اور اس مال کو میرے پاس ہی رہنے دیجئے۔ (اوجز المسالک: ۶۹/۴)

لا ها لله إذًا : یہ الفاظ قسم میں سے ہے اور اس کے معنی ہیں لا والله إذن . ''واؤ'' کی جگہ ''ها'' کو رکھ دیا گیا ہے قرب مخارج کی وجہ سے۔ اہل عرب کے نزدیک معروف یہ ہے کہ اس جیسی قسم میں آخر میں إذن وغیرہ لے آتے ہیں، اسی وجہ سے لفظ اذاً "ها لله" کے بعد ہے جس کے معنی ہیں "هذا قسمي"

يَعْمِدُ : (ض) يَقْصِدُ کے معنی میں ہے مسلم شریف کی روایت میں "لا يعمد" ہے اس لیے یہاں "اذن" سے پہلے حرف استفہام انکاری ماننا پڑے گا، اور پھر ترجمہ یہ ہوگا کہ حضور ﷺ اللہ کے بہادروں (شیروں) میں سے کسی بھی شیر کی طرف یہ ارادہ نہیں فرمائیں گے کہ اس کے حق کو لے کر تم کو دے دیں۔ (تکملہ فتح الملہم: ۵۹/۳، ایضاً ۲۸۵/۱)

أُسُدٌ : اَسَدٌ کی جمع ہے بمعنی شیر، بہادری اور شجاعت میں اسد سے تشبیہ دی گئی ہے۔

مَخْرِفًا : بفتح الميم والراء ويجوز كسر الراء، بمعنی باغیچہ عموماً کھجور کے باغ کو مخرف کہتے ہیں، کیونکہ ''اختراف'' کے معنی آتے ہیں چننا اور کھجوریں چنی ہی جاتی ہیں، علامہ واقدی فرماتے ہیں کہ ابوقتادہؓ نے یہ باغیچہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ سے سات اوقیہ چاندی کے عوض خریدا تھا۔

تَأَثَّلْتُهٗ (تفعل) مالک ہونا۔

نوٹ : اس حدیث کے طویل ہونے کی وجہ سے الفاظ کی تحقیق کے ساتھ ساتھ ان کے معنی مرادی اور تشریح بھی کر دی گئی ہے مزید وضاحت کی اب ضرورت نہیں ہے۔

فائدہ : اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ کی موجودگی میں فتویٰ دیا اور حضور ﷺ نے تصدیق فرمائی ایسے ہی حضرت ابوقتادہؓ کی منقبت بھی معلوم ہوئی کہ حضور ﷺ نے ان کو اللہ کا شیر کہا۔

ترجمة الباب : حضرت ابوقتادہ نے ایک مشرک کو قتل کیا تو اس کا سامان حضرت ابوقتادہ کو دے دیا گیا۔ نیز من قتل قتيلاً فله سلبهٗ الخ سے ترجمۃ الباب بالکل واضح ہے۔

۲۸ ﴿حَدَّثَنا موسى بنُ إسمعيلَ ثنا حمادٌ عَنْ إسحق بنِ عبدِ اللهِ بنِ أبي طَلْحَةَ عَنْ أنسِ بنِ مالكٍ قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يومئذٍ يعني يومَ حُنين:

مَنْ قَتَلَ كافرًا فَلَهُ سَلَبُهُ، فقتل أبو طلحة يومئذٍ عشرينَ رجلاً و أخذ أسلابَهُم، ولقِيَ أبو طلحةَ أمَّ سليمٍ ومَعَهَا خَنجَر، فقال : يا أمَّ سليمٍ ما هذا معكِ ؟ قالت : أردتُ وَالله إنْ دَنَا مِنّي بعضهُم أبعَجُ به بَطنَهُ، فأخبَرَ بذلك أبو طلحة رسولَ الله صلى الله عليه وسلم ، قال أبو داؤد هذا حديثٌ حسنٌ، قالَ أبو داؤد أَرَدْنَا بهذا الخَنْجَرِ فكانَ سِلاحَ العَجَمِ يومئذٍ الخَنجَرُ﴾

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حنین کے دن ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے تو اس کے لیے اس کافر مقتول کا سلب ہے حضرت ابوطلحہؓ نے جنگ حنین میں بیس کافروں کو قتل کیا اور ان کے سلب کو لے لیا، حضرت ابوطلحہؓ کی حضرت ام سلیم سے ملاقات ہوئی تو ام سلیم کے پاس ایک خنجر تھا حضرت ابوطلحہؓ نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ حضرت ام سلیم نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اگر کوئی کافر میرے قریب آئے گا تو میں اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ حضرت ابوطلحہؓ نے یہ قصہ حضور ﷺ کو سنایا، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ اس سے ہماری مراد خنجر ہے اور ان دنوں عجمیوں کے ہتھیار خنجر ہی تھے۔

تشریح مع تحقیق: أبعَجُ (ف) بمعنی پھاڑنا، چیرنا۔

حضرت ابوطلحہؓ اس حدیث میں اپنا ایک واقعہ بیان فرمارہے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے یہ اعلان فرمایا "من قتل کافراً فله سلبه" تو میں نے اس دن بیس آدمیوں کو قتل کرکے ان کے سلب کو لے لیا تھا، اس کے بعد اپنی بیوی جن کی کنیت ام سلیم ہے کی بہادری کا قصہ بیان کیا اور حضرت ابوطلحہؓ کا حضور ﷺ کے پاس جاکر اپنی اہلیہ کا قصہ بیان کرنا تحدیث نعمت کے طور پر تھا۔

قال أبو داؤد : اس جملے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

(۱) امام ابوداؤدؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ خنجر سے مراد یہی ہے جو عام لوگوں میں مشہور ہے اور اس کو اہل عجم استعمال کرتے ہیں۔

(۲) صاحب عون المعبود فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ کا مقصد خنجر کے جواز کو بتلانا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس حدیث سے خنجر کے جواز کو مراد لیا ہے۔ (بذل: ۴/ ۳۸)

ترجمة الباب : أخذَ أسلابَهُم الخ سے ثابت ہے۔

﴿مسئلة السلب للقاتل﴾

سلب کا مسئلہ فقہاء کرام کے درمیان معرکۃ الآراء مسائل میں سے سمجھا جاتا ہے اس لیے ہم اس پر انتہائی

جامع اور مختصر بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسئلہ کی حقیقی صورت ہمارے سامنے آجائے۔

(۱) امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام لیثؒ، امام ابوثورؒ اور امام اسحٰق وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ سلب چند شرائط کے ساتھ قاتل کا حق شرعی ہے خواہ امام "من قتل قتیلاً فله سلبهٗ" کے ذریعہ اعلان کرے یا نہ کرے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت کے مطابق قاتل سلب کا مستحق نہیں ہے مگر یہ کہ امام اعلان کردے کہ "من قتل قتیلاً فله سلبه" تو اس صورت میں سلب قاتل کو دیا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ فریق اول کے نزدیک سلب مجاہد کا حق ہے اور فریق ثانی کے نزدیک سلب امام کا حق ہے امام چاہے تو بطور نفل دینے کا وعدہ یعنی "من قتل قتیلاً فله سلبه" کے ذریعہ اعلان کرکے قاتل کو دیدے اور اگر چاہے تو اعلان نہ کرے اور سلب کو مال غنیمت میں ہی شامل کردے۔

امام شافعی، امام احمد وغیرہ کی دلیل

(۱) حضرت ابوقتادہؓ کی طویل حدیث ہے جس میں ہے: من قتل قتیلاً له علیه بینة فله سلبهٗ. متفق علیه (ابوداؤد:۲/۲/۳۷۲)

(۲) حضرت انسؓ کی حدیث ہے: أن النبي صلی الله علیه وسلم قال یوم حنین: "من قتل قتیلاً فله سلبه" فقتل أبو طلحة عشرین رجلاً وأخذ أسلابهم. (ابوداؤد:۲/۲/۳۷۲)

اب دیکھئے حدیث شریف میں ایک عام حکم بیان کیا ہے کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کردے تو قاتل کو اس مقتول کا سلب دیا جائے گا۔ امیر کے لیے یہ جملہ کہنے کی کوئی شرط مذکور نہیں ہے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے یہ ایک حکم شرعی بیان کیا ہے جو امام کے اعلان پر موقوف نہیں ہوگا۔ لہٰذا قاتل ہی سلب کا مستحق ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کے دلائل

(۱) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "واعلموا أنما غنمتم من شيء فأن لله خمسه" وجہ استدلال یہ ہے کہ سلب بھی مال غنیمت ہے اس لیے کہ یہ لشکر کی قوت سے حاصل ہوا ہے، کیوں کہ اگر لشکر نہ ہوتا تو سلب بھی حاصل نہ ہوتا، اور یہ بات معلوم ہے کہ مال غنیمت میں خمس نکالنے کے بعد تمام مجاہدین کا حق ہوتا ہے لہٰذا جب سلب مال غنیمت ہوا تو سب مجاہدین اس کے مستحق ہوں گے، نہ کہ صرف قاتل مستحق ہوگا۔

نیز آیت شریفہ میں لفظ "شیٔ" نکرہ ہے جو کافر سے حاصل شدہ تمام چیزوں کو شامل ہے اور "شیٔ" سے مراد جو بھی ہے وہ خمس کے بعد غانمین کا حق ہے لہٰذا قرآن کی اس آیت کے عموم کو خبر واحد سے خاص نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) بخاری اور مسلم شریف کی حدیث ہے: أن معاذ بن عمرو بن الجموح ومعاذ بن عفراء ضربا

أبا جهلٍ بسيفيهما حتى قتلاهُ، فأتيا رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: أيكما قتله ؟ فقال كلُّ واحدٍ منهما : أنا قتلتُه، فنظر في السيفين ، فقال : كِلاكُمَا قتله، وقضى بسلبه لمعاذ بن عمرو بن الجموح. (مسلم شریف:۲/۸۸)

یہ حدیث اس سلسلے میں نص ہے کہ سلب قاتل کا حق نہیں ہے بلکہ امام کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بطور نفل کے دے دے، اگر قاتل کا حق ہوتا تو حضور ﷺ دونوں کو ہی سلب دیتے نہ کہ صرف معاذ بن عمرو بن جموح کو۔

(۳) عن ابن عباس "السلب من النفل، والفرس من النفل، وفي النفل الخمس" (طحاوی:۲/۱۳۳، اعلاء السنن:۱۲/۲۷۵)

(۴) عوف بن مالک کی حدیث: "قتل رجل من حمير رجلاً من العدوّ فأراد سلبه فمنعه خالدٌ" (فيه) قال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لا تعطه يا خالد، لا تعطه يا خالد الخ (مسلم شریف:۲/۸۸، ابوداؤد:۲/۳۷۳)

(۵) عن جنادة بن أبي أمية أن حبيب بن مسلمة قتل قتيلاً فاراده أبو عبيدة أن يخمس سلبه، فقال له الحبيب : إن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قضى بالسلب للقاتل، فقال له معاذ: مهلاً يا حبيب سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول : "إنما للمرءِ ما طابت به نفس إمامه" (على هامش الشامي : ٦/٢٥٥)

(٦) ليس لك من سلب قتيلك إلا ما طابت به نفس إمامك . (حدیث)(درمختار:۶/۲۶۳زکریا)

ان روایات کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سلب بھی مالِ غنیمت ہے جو سب مجاہدین کا حق ہے نہ کہ صرف قاتل کا۔

حنفیہ اور مالکیہ کے دلائل پر اعتراضات

(۱) حنفیہ نے جو آیت سے استدلال کیا ہے وہ ٹھیک نہیں، اس لیے کہ یہ بات تو ہمیں بھی تسلیم ہے کہ سلب حقیقت میں مال غنیمت ہی ہے اور آیت کے عموم میں داخل ہے لیکن آپ ﷺ نے سلب کو مال غنیمت کے حکم سے خارج کردیا ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ کا عموم سلب کے علاوہ دیگر چیزوں سے بھی خاص کیا گیا ہے مثلاً اگر قاتل ذمی ہو یا بچہ ہو یا عورت ہو تو ان کو غنیمت میں سے حصہ نہیں ملتا ہے حالانکہ عموم میں یہ بھی شامل ہیں۔

(۲) حضرت معاذ بن عمرو بن الجموح کو جو سلب دیا گیا تھا وہ اس لیے تھا کہ اصل میں یہ ہی مثخن اور ابوجہل کو نڈھال کرنے والے تھے اور سلب مثخن اور کاری زخم لگانے والے کو ہی ملتا ہے۔ لہٰذا اس سے بھی استدلال تام نہیں ہوتا۔

(۳) حبیب بن مسلمہ کی جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس میں عمرو بن واقد راوی منکر الحدیث ہے

جیسا کہ امام بخاریؒ نے کہا ہے۔اور جس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہہ دیں وہ راوی ضعیف ہوتا ہے۔

جوابات: (۱) پہلے اعتراض کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث سَلَب سے آیت کو خاص اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ "من قتل قتیلاً فله سلبه" کو حکم شرعی مانا جائے، حالانکہ اس فرمان رسول کا حکم شرعی ہونا محل نزاع ہے۔لہٰذا آیت اپنے عموم پر باقی ہے اور جہاں خاص ہوئی ہے تو وہ حکم شرعی کی وجہ سے ہے جیسا کہ جب قاتل عورت ہو تو اس کو غنیمت نہیں ملے گی۔

(۲) دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ کہنا کہ مثخن اور نڈھال کرنے والے معاذ بن عمرو بن جموح ہی تھے اس لیے ان کو سلب ملا، حضور ﷺ کے قول: "كِلا كما قتله" کے خلاف ہے کیونکہ آپ ﷺ صراحتاً فرما رہے ہیں کہ تم دونوں نے ہی ابو جہل کو قتل کیا ہے اس کے باوجود سلب ایک کو دینا اس بات کی دلیل ہے کہ سلب میں امام کو اختیار ہے قاتل کا حق نہیں۔

(۳) تیسرے اعتراض کا جواب علامہ حصکفی صاحب ''درمختار'' نے دیا ہے کہ ضعیف روایت جب متعدد طرق سے آجائے تو وہ قابل استدلال ہوتی ہے۔لہٰذا عمرو بن واقد کا منکر الحدیث ہونا کوئی مضر نہیں۔

امام شافعی اور امام احمدؒ کے دلائل کا جواب

حضرت ابو قتادہ اور حضرت انسؓ کی حدیث سے استدلال تام نہیں، کیونکہ جس وقت آپ ﷺ نے "من قتل قتیلاً فله سلبه" ارشاد فرمایا تھا اس وقت آپ ﷺ امیر لشکر تھے اور امیر لشکر جب اعلان کر دے تو ہمارے نزدیک بھی سلب قاتل ہی کو دیا جائے گا۔لہٰذا یہ روایت ہمارے خلاف نہیں، اور اگر کسی حدیث میں امام لشکر کے اعلان کا ذکر نہ ہو اور پھر بھی قاتل کو سلب دیا گیا ہو تو وہ بھی امام کے اعلان پر محمول کیا جائے گا، تاکہ دوسری روایات سے تعارض لازم نہ آئے۔(مرقاۃ: ۸/۲۶)

اختلاف کی اصل وجہ

اب تک ہم نے جو بحث کی وہ ایک علمی بحث تھی اب ہم آپ کو فقہاء کے مابین اختلاف کی اصل وجہ کی طرف لے چلتے ہیں، تاکہ حقیقت مسئلہ واضح ہو جائے۔

حضور ﷺ کی تین حیثیتیں ہیں: (۱) رسول (۲) امام وحاکم (۳) مفتی۔اگر آپ ﷺ کوئی حکم منصب رسالت سے بیان فرمائیں تو وہ حکم حکم شرعی ہوگا، اور قیامت تک کے لیے ہوگا۔جیسا کہ آپ کا فرمان ہے: "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ"

اور اگر آپ ﷺ بحیثیت مفتی کوئی حکم فرمائیں تو وہ حکم حکم شرعی نہیں ہوتا ہے جیسا کہ ابو سفیان کی بیوی ہند بنت

عتبہ نے اپنے شوہر کے بخل کی شکایت حضور ﷺ سے کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: خذي ما يكفيك و ولدك بالمعروف آپ ﷺ کا یہ فرمان فتویٰ تھا نہ کہ حکم شرعی، کیونکہ فیصلہ تو اس طرح ہوتا ہے کہ مدعی دعویٰ کرے اور فریقین کو بلایا جائے، پھر مدعی سے بینہ طلب کیے جائیں اگر وہ بینہ پیش کرنے سے عاجز ہو جائے تو مدعی علیہ سے قسم لی جائے، حالانکہ یہاں آپ ﷺ نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ محض عورت کے دعوے کی بنیاد پر ایک مسئلہ بتا دیا۔

اور کبھی کبھی آپ ﷺ جو حکم فرماتے ہیں وہ منصب امامت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور وہ حکم اس وقت، اس حال، اور اس مکان کی مصلحت کے اعتبار سے ہوتا ہے دائمی حکم نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ ائمہ کو بھی اپنے اپنے زمان و مکان کے اعتبار سے اس حکم کی رعایت کرنی ہوتی ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے اس کی رعایت فرمائی ہے۔

اب اختلاف یہاں ہو گیا کہ آپ ﷺ نے "من قتل قتيلاً فله سلبه" جو حکم فرمایا ہے وہ کس حیثیت اور کس منصب سے فرمایا تھا، کہ اگر منصب نبوت ورسالت کے طور پر آپ کا یہ فرمان ہے تو قیامت تک کے لیے اس کو حکم شرعی مانا جائے اور اگر امام و مفتی ہونے کی حیثیت سے تھا تو اسی وقت، اسی حال اور اسی مکان کی مصلحت ہوگی اور یہ حکم صرف امام کے ساتھ خاص ہوگا۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان منصب نبوت سے تھا لہٰذا قیامت تک کیلئے حکم شرعی ہوگا۔

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک علیہما الرحمہ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ فرمان بحیثیت امام تھا۔ لہٰذا اس کو امام کے متعلق مانا جائے۔ حنفیہ اور مالکیہ نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مختلف احادیث سے استدلال کیا ہے؛ یہاں اس کو ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس مسئلے کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے (المغنی لابن قدامہ: ۱۰/۴۱۲، اعلاء السنن: ۱۲/۲۷۵، طحاوی شریف: ۲/۱۳۳، تکملہ فتح الملہم: ۳/۶۱، مرقاۃ المفاتیح: ۸/۲۶، فتاویٰ شامی: ۶/۲۵۴، زاد المعاد: ۲/۱۹۵، بذل المجہود: ۴/۳۷)

﴿باب في الإمام يمنع القاتل السلب إن رأى والفرس والسلاح من السلب﴾

اگر امام مناسب سمجھے تو قاتل سے سلب کو روک سکتا ہے، گھوڑے اور ہتھیار سلب ہی ہیں

۲۹ ﴿حَدَّثَنا احمد بنُ محمدِ بنِ حنبلٍ ثنا الوليدُ بنُ مسلمٍ قال ثني صَفوانُ بنُ عَمروٍ عَنْ عبدالرحمن بنِ جُبَيْرِ بنِ نُفَيْرٍ عَنْ أبيهِ عَنْ عوفِ بنِ مالكٍ الأشجعيِّ قالَ

خرجتُ مَعَ زيدِ بنِ حارثةَ في غَزْوَةِ مُوْتَة، ورَا فَقَنِيْ مَدَدِيٌّ مِنْ أهلِ اليَمَنِ لَيسَ مَعَهٗ غَيرُ سَيفِهٖ، فَنَحَرَ رجلٌ مِنَ المسلمين جزُوْرًا فسأله المدديُّ طائفةً مِن جلْدِهٖ، فاعْطَاهٗ إيّاهٗ، فاتَّخذهٗ كهيأة الدَّرَقِ، ومَضَيْنَا فلَقيْنَا جُموْعَ الرومِ وفيهم رجلٌ علٰى فرسٍ.لهٗ أشْقَر عليه سَرجٌ مُذْهَبٌ وسِلاحٌ مُذْهَبٌ، فَجَعَلَ الرُومِيُّ يَفْرِيْ بِالْمُسلِمِيْنَ فَقَعَدَ لَهٗ المدديُّ خَلفَ صَخرةٍ فَمَرَّ بِهٖ الرُوْميُّ فَعَرقَبَ فرسَهٗ، فَخرَّ وعَلاهٗ، فقتلَهٗ وحَازَ فرسَه وسلاحَهٗ فلمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عزّ وجلّ للمسلمين، بَعَثَ إليهِ خالدُ بنُ الوليد، فأخذ مِنَ السَلَبِ؛ قال عَوْفٌ : فَأَتَيْتُهٗ، فقلتُ : يا خالد ! أمَا عَلِمتَ أنَّ رسولَ اللّٰه ﷺ قَضٰى بالسلَب للقاتل؟ قال: بلٰى ولكِنّي اسْتَكْثَرْتُهٗ قلتُ : لتَرُدَّنَّهٗ إليه، أوْ لَأُعَرِّفَنَّكَهَا عِندَ رسولِ الله ﷺ ؛ فأبٰى أن يَرُدَّ عليه، قال: عوفٌ: فاجْتَمعْنَا عِندَ رسولِ اللّٰه ﷺ ، فقَصَصْتُ عليه قِصَّةَ المَدَدِيِّ وما فَعَلَ خالدٌ، فقال رسول الله ﷺ : يا خالد ! ما حَمَلَكَ علٰى ما صَنَعْتَ؟ قال: يا رسول الله اسْتَكْثَرْتُهٗ، فقال رسولُ الله ﷺ : يا خالد ! رُدَّ عَلَيْهِ ما أخذتَ منهٗ؛ قال عوفٌ فقلتُ له : دُونَكَ يا خالد ألم أفِ لَكَ؟ فقال رسول الله ﷺ : ومَا ذلك؟ قال: أخْبَرتُهٗ، قال: فَغَضِبَ رسولُ الله ﷺ، وقال يا خالد! لا تَرُدَّ عليه هَلْ أنْتُمْ تاركون لِيْ امرأيء لكُمْ صِفْوَةُ أمْرِهِمْ وَعَلَيْهِمْ كَدَرُهٗ﴾

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ میں زید بن حارثہ کے ساتھ غزوہ تبوک میں گیا، اور یمن کا ایک مددی ساتھی میرے ساتھ ہوگیا، جس کے پاس ایک تلوار تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، اس کے بعد ایک مسلمان شخص نے اونٹ ذبح کیا تو اس مددی نے اونٹ کی کھال کا ایک ٹکڑا مانگا، اس نے دیدیا، مددی نے اس کی ڈھال (ڈھال کی طرح) بنالی، اس کے بعد ہم لوگ چلتے رہے اور روم کے فوجیوں سے جاملے۔ (ہم نے ان فوجیوں میں دیکھا کہ) ایک شخص سرخ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا، اس کی زین اور ہتھیار سنہرے تھے، اور وہ مسلمانوں پر خوب حملہ کر رہا تھا، یہ مددی شخص (جو میرے ساتھ تھا) اس کی فکر میں ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا، جب اس کی طرف سے وہ شخص گزرا تو اس مددی نے اس کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے، اور یہ فوجی گر گیا مددی اس پر غالب آگیا اور اس کو قتل کر ڈالا، اور اس کے گھوڑے اور ہتھیار کو لے لیا، جب مسلمانوں کو فتح ہوئی تو خالد بن ولید نے مددی کی طرف کئی آدمیوں کو بھیجا، اور سامان میں سے کچھ لے لیا، عوف بن مالک کہتے ہیں کہ میں خالد بن ولید کے پاس آیا اور کہا کہ اے خالد! کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ حضور ﷺ نے قاتل کے لیے سلب کا فیصلہ

کردیاہے؟ حضرت خالد بن ولیدؓ نے جواب میں فرمایا کہ معلوم تو ہے لیکن یہ سامان بہت زیادہ تھا، میں نے کہا کہ تم یہ سلب اسی کو دے دو ورنہ میں تم کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے بتلاؤں گا، حضرت خالدؓ نے وہ لیا ہوا سامان واپس کرنے سے انکار کردیا، عُوف بن مالک کہتے ہیں کہ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور میں نے مددی کا پورا قصہ حضور ﷺ کے سامنے سناڈالا، نیز خالد بن ولید کے مددی کے ساتھ سلوک کو بھی سنادیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم کو اس کام کے کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا ہے؟ حضرت خالدؓ نے جواب دیا کہ یارسول اللہ میں نے اس سامان کو زیادہ سمجھا، حضور نے فرمایا کہ اے خالد تم نے جو کچھ لیا ہے اس کو واپس کردو، عوف بن مالک کہتے ہیں کہ میں نے خالد بن ولید سے کہا کہ لو میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کیا ہے؟ میں نے پورا قصہ سنایا، اس پر آپ ﷺ ناراض ہوگئے اور فرمایا کہ اے خالد! ہرگز مت واپس کرنا، کیا تم لوگ میرے امراء کو چھوڑ دوگے ان کے اچھے فیصلے میں تمہارا فائدہ ہے اور ان کے غلط فیصلے کا نقصان ان ہی پر پڑے گا۔

۷۰ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ محمد بنِ حنبلٍ ثنا الوليدُ قال سألتُ ثورًا عَنْ هذا الحديثِ فَحدَّثني عن خالد بن مَعْدانَ عَنْ جُبَير بنِ نُفَيرٍ عَنْ أبيهِ عَنْ عوفِ بنِ مالكٍ الأشجعيّ نحوهُ﴾

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک سے پہلی حدیث کی طرح ہی روایت ثابت ہے۔

تشریح مع تحقیق: رَافَقَنِيْ (مفاعلت) بمعنی ساتھی ہونا۔

دَرَق: چمڑے کی وہ ڈھال جس کو جنگ میں استعمال کرتے ہیں۔

جُمُوعٌ: جَمْعٌ کی جمع ہے بمعنی جماعت۔

أشْقَر: ج شُقر، صیغۂ صفت ہے (س ک) سرخ زرد رنگ کا ہونا۔

سَرْجٌ مُذْهَبٌ وہ زین جس پر سونے کا پانی چڑھادیا گیا ہو، مطلق سنہری زین پر بھی اس کا اطلاق کردیا جاتا ہے۔

حَازَ (ن) جمع کرنا، اکٹھا کرنا۔

لأعرفنّكها (تفعیل) واقف کرانا، کسی بات کی دوسرے کو اطلاع دینا، (مطلب یہ ہے کہ میں حضور ﷺ کو تمہاری خبر دوں گا)

صُفْوَةٌ مصدر ہے بمعنی خالص، عمدہ، چنیدہ، منتخب۔

كَدْرٌ تکلیف دہ ہونا۔

حدیث بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مقام موتہ کی طرف زید بن حارثہؓ کو امیر لشکر بنا کر روانہ فرمایا، ساتھ میں تین ہزار کا لشکر روانہ کیا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر یہ شہید ہوجائیں تو جعفر بن ابی طالب کو اپنا امیر بنالینا

اور اگر یہ بھی شہید ہوجائیں تو عبداللہ بن رواحہ کو امیر بنالینا، یہ لشکر ابھی راستہ میں ہی جارہا تھا کہ یمن کا ایک شخص بھی ساتھ ہولیا اس کے پاس تلوار بھی تھی، راستہ میں ایک اونٹ ذبح کیا گیا تو اس شخص نے اس اونٹ کا چمڑا لیکر ایک ڈھال بنائی، مسلمانوں کا یہ لشکر جب مقام ''معان'' میں پہنچا تو دیکھا کہ ہرقل ایک لاکھ فوج کے ساتھ موجود ہے ان کی اس کثرت کو دیکھ کر مسلمان حیران تھے کہ کیا کریں، بعض نے کہا کہ واقعہ کی اطلاع حضور ﷺ کو دی جائے اور آپ ﷺ کے فیصلے کا انتظار کیا جائے، لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ پیارا موقعہ ہے یا تو شہادت ہے یا فتح، ہم اللہ کے بھروسہ پر ضرور لڑیں گے، ان کا یہ اعلان کرنا تھا کہ سب لڑنے کے لیے تیار ہوگئے اور مقام موتہ پہنچ گئے اور حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر لڑتے رہے۔

اسی دوران اس مددی شخص نے یہ بہادری دکھلائی کہ ایک کافر کو قتل کرڈالا، اور اس کا جتنا سامان تھا اس کو لے لیا، چونکہ حضرت زیدؓ تو شہید ہوچکے تھے ان کے علاوہ اور بھی جن لوگوں نے علم اٹھایا وہ بھی شہید ہوگئے تھے، اخیر میں حضرت خالد بن ولید امیر رہ گئے تھے، حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس مددی سے کچھ سلب واپس لے لیا، حضرت عوف بن مالکؓ نے کہا کہ یہ تو سلب ہے جس کو حضور ﷺ نے قاتل کے لیے مقرر فرمادیا ہے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے کہا کہ یہ مال بہت زیادہ ہے سارا ایک ہی آدمی کو دینے میں مصلحت نہیں ہے۔ اس لیے کچھ مال میں نے لے لیا ہے۔ اس پر حضرت عوف بن مالک نے کہا کہ میں اس کی خبر حضور ﷺ کو کروں گا اور پھر تم کو بتلاؤں گا۔

اس کے بعد یہ پورا واقعہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے وہ سامان مددی کو واپس کرنے کا حکم فرمادیا۔ اب چونکہ عوف بن مالکؓ نے تو پہلے ہی مددی کو دیدینے کے لیے کہا تھا اور حضور ﷺ نے بھی ان ہی کے مطابق فیصلہ فرمادیا تو عوف بن مالک یہ کہنے لگے کہ دیکھو جو میں نے کہا تھا وہ ہی ہوا۔ جب حضور ﷺ نے حضرت عوف کا یہ کلام سنا تو فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ حضرت خالد بن ولید نے عوف بن مالکؓ کے ساتھ ہوا پورا قصہ سناڈالا۔ اس پر حضور ﷺ کو غصہ آیا اور فرمایا کہ اے خالد! تم مال مددی کو واپس مت کرنا، اور عوف بن مالک سے کہا کہ تم امراء سے جھگڑتے ہو، تمہارے مطلب کی بات ہوتی ہے تو اس کو قبول کرلیتے ہو اور جو بات تم کو اچھی معلوم نہ ہو اس کو چھوڑ دیتے ہو، حضور ﷺ کی یہ ایک تنبیہ ہے تاکہ لوگ اپنے امراء کے خلاف جری نہ ہوجائیں۔

یہ روایت احناف کی مستدل ہے کہ سلب قاتل کا حق نہیں ہوتا کیونکہ اگر قاتل کا حق ہوتا تو حضور ﷺ حق واجب کو کبھی نہ روکتے حالانکہ یہاں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ اے خالد! لا تَرُدَّ علیه.

امام ابوداؤد نے اس واقعہ کی دوسری سند بھی ذکر فرمائی ہے اور یہ روایت مسلم شریف (ج:۲/۸۸) پر بھی کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔

ترجمة الباب: فأخذ من السلب الخ سے ثابت ہورہا ہے۔

﴿ بَاب في السلب لا يخمس ﴾

سلب سے خمس نہ لینے کا بیان

۷۱ ﴿حَدَّثَنا سعيدُ بنُ مَنصورٍ ثَنا إسْمعيلُ بنُ عياشٍ عَنْ صَفْوَانَ بنِ عَمرٍو عَنْ عبدالرحمنِ بنِ جُبَيْرِ بنِ نُفَيْرٍ عن أبيه عَنْ عَوْف بنِ مالكٍ الأشجعيِّ وَ خالدِ بنِ الوليدِ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قَضٰى بالسَّلَبِ ولم يَخْمِسْ السَّلَبَ﴾

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اور خالد بن ولیدؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے قاتل کے لیے سلب کا فیصلہ فرمایا اور سلب سے خمس نہیں لیا۔

تشریح مع تحقیق: روایت بالا کا ظاہراً حاصل یہ ہے کہ مالِ سلب قاتل کو دیا جائے گا؛ اس میں سے خمس نہیں نکالا جائے گا، بخلاف مالِ غنیمت کے کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں گے ایک حصہ امام لیگا اور اس کو ان مصارف میں خرچ کردے گا جن کو واعلموا انّا غنمتم الخ سے ذکر کیا گیا ہے اور چار حصے مجاہدین کو دیدیۓ جائیں گے، لیکن سلب میں ایسا نہیں ہوگا۔

اختلافی مسئلہ

حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ سلب میں سے خمس نہیں لیا جائے گا۔

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ امام کو اختیار ہے کہ چاہے تو سلب میں سے خمس لے اور اگر چاہے تو نہ لے

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام نے یہ اعلان کردیا ہے کہ تم کو سلب خمس نکالنے کے بعد دیا جائے گا تو سلب سے خمس لیا جائے گا، اور اگر اعلان نہیں کیا ہے تو خمس نہیں لیا جائے گا۔

فریق اول کی دلیل

سلب قاتل کا حق ہے اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں ہے اگر اس میں سے خمس لیا جائے گا تو صاحب حق کے حق کو باطل کرنا لازم آئے گا جو شرعاً ممنوع ہے نیز حدیث باب بھی دلیل ہے۔

فریق ثانی وثالث کی دلیل

قل الأنفالُ لله والرسول الخ یعنی نفل میں اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ کو اختیار ہے یہی دلیل حنفیہ کی بھی ہے مگر امام پہلے سے وعدہ کرلے کہ خمس لیا جائے گا۔

فریق اول کی دلیل کا جواب

ہم سلب کو حق لازم ہی نہیں کہتے لہٰذا اس کو حق لازم ماننا ہمارے نزدیک ٹھیک نہیں تو ابطال حق بھی لازم نہیں آئے گا، اور حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جب کہ امام نے اعلان کر دیا ہو کہ خمس نہیں لیا جائے گا۔ واللہ اعلم

﴿ بَاب من اجار على جريحٍ مثخن ينفل من سلبه ﴾

جو شخص کسی زخمی نڈھال کو قتل کر دے تو اس کو اس کے سلب میں سے کچھ دیا جائیگا

۷۲ ﴿حَدَّثَنا هارونُ بنُ عبّادٍ ثنا وكيعٌ عَنْ أبِيهِ عن أبي إسحقَ عن أبي عبيدةَ عَنْ عبدِ اللهِ بنِ مسعودٍ قال: نَفَّلَنِيَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يَوْمَ بَدْرٍ؛ كَانَ قَتَلَهُ﴾

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے بدر کے دن ابو جہل کی تلوار نفل دی، عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو قتل کیا تھا۔

تشریح مع تحقیق : مُثْخَن (افعال) اسم مفعول کا صیغہ ہے بمعنی سخت زخمی۔

اس باب کو قائم فرما کر امام ابوداؤدؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی زخمی کافر کو قتل کر دے تو اس قاتل کو بھی اس زخمی مقتول کے سلب سے حصہ دیا جائے گا، لیکن اس مسئلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

مختلف فیہ مسئلہ

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان نے کسی شدید زخمی کافر کو قتل کر دیا تو اس قاتل کو اس کا سلب نہیں دیا جائے گا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان نے زخمی کافر کو قتل کر دیا تو امام کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو تحریضاً للقتال اس کو سلب دیدے اور اگر چاہے تو نہ دے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر پہلے حملہ کرنے والے نے ایسا زخمی کر دیا ہے کہ جس سے وہ کافر لڑنے پر قادر نہ رہے، اسی طرح رائے دے کر مدد کرنے پر بھی قادر نہ رہے تو پہلے حملہ کرنے والے کو ہی سلب دیا جائے گا ورنہ دوسرے قاتل کو سلب ملے گا، لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب کہ امام نے سلب دینے کا اعلان بھی کر دیا ہو۔

ایک اشکال اوراس کا جواب

اشکال یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ ابوجہل کی تلوار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دی گئی تھی حالانکہ صحیحین کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابوجہل کا سامان (جس میں تلوار بھی تھی) حضرت معاذ بن عمر بن الجموح کو دیا تھا۔

جواب: (۱) ابوداؤد کی یہ روایت منقطع السند ہے اس لیے کہ ابوعبیدہ کی ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ثابت نہیں ہے۔

(۲) ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن عمرو بن جموح کی رضامندی سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دی ہو۔ واللہ اعلم

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت ظاہر ہے کیونکہ جریح مثخن کو قتل کرنے والے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو سلب میں سے تلوار دی گئی۔

﴿بَاب مَنْ جاء بعد الغنيمة لا سهم له﴾

جوشخص غنیمت کے تقسیم ہونے کے بعد آئے اس کو حصہ نہیں ملے گا

۷۳ ﴿حَدَّثَنا سعيدُ بنُ منصورٍ ثنا إسمعيلُ بنُ عِيَاشٍ عَنْ محمد بنِ الوَليدِ الزُبَيْدِيّ عَنْ الزُّهْرِيّ أَنَّ عَنبَسَةَ بنَ سعيدٍ أخبَرَهُ أنه سمِعَ أبا هريرةَ يحدِّثُ سعيدُ بنُ العاصِ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم بَعَثَ أبانَ بنَ سعيدِ بنِ العَاصِ علىٰ سَرِيَّةٍ مِنَ المدينةِ قِبَلَ نَجْدٍ، فَقَدِمَ أبانُ بنُ سعيدٍ وأَصْحَابُهُ علىٰ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم بِخَيْبَرَ بَعْدَ أنْ فَتَحهَا، وإنَّ حُزُمَ خَيلِهِم لِيفٌ، فقال أبانُ : اقْسِمْ لَنَا يا رسولَ الله! فقال أبو هريرة فقلت: لا تُقَسِّمْ لهُمْ يا رسولَ الله، فقال أبان : أنتَ بها يا وَبْرُ تَحدَّرُ عَلَيْنَا مِنْ رأس ضَالٍ؛ فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: اِجْلِسْ يا أبانُ، ولم يُقَسِّمْ لَهُم رسولُ الله صلى الله عليه وسلم﴾

ترجمہ: حضرت سعید بن العاصؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ابان بن سعید کو مدینہ سے نجد کی طرف ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا، پھر ابان بن سعید اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیبر میں اس کے فتح ہونے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اوران کے گھوڑوں کے بندھن کھجور کی چھال کے تھے، حضرت ابان بن

سعید نے درخواست کی کہ یارسول اللہ! ہمیں بھی غنیمت میں سے تقسیم کر دیجئے، حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ یارسول اللہ! ان کو تقسیم کر کے نہ دیجئے، اس پر ابان بن سعید نے کہا کہ اے وبر! تم ہم سے ایسی باتیں کرتے ہو، اور ہمارے اوپر پہاڑ کی چوٹی سے اتر آئے ہو، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابان بیٹھ جایئے، پھر آپ ﷺ نے اس کو تقسیم کر کے نہیں دیا۔

تشریح مع تحقیق : حُزُمٌ : ج حِزَامٌ بمعنی جانور کا بندھ۔

لِيف : کھجور کے درخت کی چھال۔

وَبْرٌ بلی سے چھوٹا ایک جانور ہوتا ہے جس کے کان اور دم چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، یہ تشبیہ تحقیر اً دی ہے۔

تَحَدُرُ (ض ن) بمعنی اوپر سے نیچے کی طرف اترنا۔

ضَال : یا تو کسی جگہ کا نام ہے یا کسی متعینہ پہاڑ کو ضال کہتے ہیں، بعض نسخوں میں ضأن کا لفظ آیا ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قبیلہ دوس کا ایک پہاڑ ہے۔

روایت بالا کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ابان بن سعید (جو خیبر سے پہلے ہی اسلام لائے تھے) کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا، جب ابان بن سعید کا یہ سریہ واپس آیا تو اس وقت حضور ﷺ خیبر میں تھے اور خیبر فتح بھی ہو چکا تھا۔ انھوں نے آ کر کہا کہ یارسول اللہ! ہمیں بھی غنیمت میں سے حصہ دے دیجئے، وہاں حضرت ابو ہریرہؓ بھی موجود تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ ابان کو حصہ نہ دیجئے، کیونکہ مال تو تقسیم ہو چکا ہے اور یہ اس جنگ میں شریک بھی نہیں تھے۔ اس پر ابان بن سعید نے جواب دیا کہ اے وبر! تم ایسی بات کہتے ہو حضور ﷺ نے اس بات کو سن کر ابان بن سعید اور ان کے ساتھیوں کو مال تقسیم کر کے نہیں دیا۔

ترجمة الباب : ولم يقسم لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم سے ثابت ہو رہا ہے، کیونکہ ابان بن سعید مال غنیمت کے تقسیم ہونے کے بعد آئے تھے اس لیے ان کو غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا گیا۔

۷۴ ﴿حَدَّثَنَا حامدُ بنُ يحيَ البَلخيُّ قالَ نا سفيانُ نا الزهريُّ وَسَألَهُ إسمعيلُ بنُ أُمَيَّةَ فحدثناهُ الزهريّ أنَّه سَمِعَ عَنبَسَةَ بنَ سَعِيدٍ القرشيَّ يحدِّثُ عَنْ أبي هريرةَ قال: قدمتُ المدينةَ ورسولُ اللهِ ﷺ بخيبرَ حِينَ افْتَتَحهَا، فسألتُهُ أن يُسْهِمَ لي، فَتَكَلَّمَ بعضُ وُلدِ سعيدِ بنِ العاصِ فقال: لا تسهم لهُ يا رسول الله قال فقلت : هذا قاتلُ ابنِ قَوْقَلٍ؛ فقال سعيدُ بنُ العاصِ: يا عَجَبًا لِوَبَرٍ! قد تَدَلَّي عَلَيْنا مِن قَدُومِ ضَالٍ، يُعيِّرُني بقَتْلِ امرءٍ مسلمٍ أكرمَهُ اللّٰهُ تعالى على يديَّ، ولم يهني على يَدَيه﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ جس وقت حضور ﷺ خیبر کے فتح ہونے کے بعد

خیبر ہی میں تھے تو میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے بھی غنیمت میں سے حصہ دے دیجئے، اس پر سعید بن عاص کے کسی صاحبزادے (مراد ابان بن سعید ہیں) نے کہا کہ یارسول اللہ ابو ہریرہ کو حصہ نہ دیجئے، حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا یہ تو ابن قوقل کا قاتل ہے سعید بن العاص نے کہا کہ تعجب ہے ایک ایسے وبر پر جو ضال پہاڑ کی چوٹی سے اتر آیا ہے اور مجھے ایک ایسے مسلمان کے قتل کے بارے میں عار دلاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں عزت دی اور مجھے اس کے ہاتھوں ذلیل نہیں کیا۔

تشریح مع تحقیق : یا عَجَبا (س) بمعنی تعجب کرنا، اس کی اصل: یا عجبی ہے ''ی'' کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

قَدُوم: ج قُدُمٌ پیش کرنے والا، بہت آگے بڑھنے والا، بہادر، جنگجو۔

یُعَیِّرُنِي (تفعیل) کسی کو برے فعل سے شرم دلانا، طعنہ دینا، کسی کے فعل کو قابل مذمت قرار دینا بولا جاتا ہے:

عَيَّرَهُ الجهلَ وبالجهلِ : اس نے اسے جہالت کا طعنہ دیا۔

اس روایت کی وضاحت فتح الباری: ۷/۳۴۳ پر مسند احمد کے حوالے سے یہ کی گئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں اپنے یہاں سے جب مدینہ آیا تو اس وقت حضور ﷺ خیبر روانہ ہو گئے تھے چنانچہ میں مدینہ منورہ سے خیبر کی طرف ہی چلا گیا اور جا کر دیکھا تو خیبر فتح ہو چکا تھا، اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ میں نے غنیمت سے حصہ طلب کیا تو ابان بن سعید نے کہا کہ یارسول اللہ ان کو حصہ نہ دیجئے کیونکہ یہ لڑائی میں شریک نہیں تھے، اس پر ابو ہریرہؓ نے کہا کہ یہ ابان بن سعید جو مجھے حصہ دینے سے منع کر رہا ہے یہ تو ایک صحابی کا قاتل ہے یعنی اس نے تو ابن قوقل کو قتل کر رکھا ہے — ابن قوقلؓ کو ابان بن سعید نے جنگ بدر میں شہید کر دیا تھا — ایسے شخص کو جو ایک صحابی کا قاتل ہو خاموش رہنا چاہیے، حضرت ابو ہریرہؓ اپنے اس کلام سے ابان ابن سعید کو عار دلا رہے ہیں، ابو ہریرہؓ کے اس کلام کا جواب ابان بن سعید نے بڑی سمجھ داری کے ساتھ دیا کہ اس میں شرم کی کیا بات ہے بلکہ اس میں تو میرے لیے عزت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابن قوقل کو میرے ہاتھوں شہید کرا کے عزت بخشی ہے اور جس شخص کے ہاتھوں اللہ کسی کو عزت عطا فرمائے وہ شخص خود معزز ہوتا ہے البتہ اگر ابن قوقل اس دن مجھے قتل کر دیتے تو میرے لیے شرم کی بات ہوتی کیونکہ اس وقت میں مسلمان نہیں تھا۔ یہ ہے اصل روایت کا خلاصہ، اب ہم حدیث مذکور سے متعلق کچھ علمی بحث کرنا چاہتے ہیں۔

تین اہم اشکالات اور ان کے جوابات

پہلا اشکال: اس روایت سے معلوم ہوا کہ سائل حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور منع کرنے والے ابان بن سعید

ہیں اور پہلی روایت سے اس کے برعکس معلوم ہوا یعنی سائل ابان بن سعید ہیں اور منکر حضرت ابو ہریرۃؓ ہیں۔ اب دونوں روایتوں میں بالکل تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب: (۱) امام ذہلیؒ حضرت زبیدی کی روایت کو راجح قرار دیتے ہیں اور سفیان بن عیینہ کی روایت کو مرجوح، اور وجہ ترجیح یہ بیان کی جاتی ہے کہ زبیدی کی روایت میں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابان یہاں بیٹھو، جب کہ یہ صراحت سفیان بن عیینہ کی روایت میں نہیں ہے۔

(۲) دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے کہ ہوسکتا ہے کہ دونوں نے ہی سوال کیا ہو اور دونوں نے ہی ایک دوسرے کے لیے منع بھی کیا ہو، حضرت ابو ہریرۃؓ نے یہ دلیل پیش کی ابان ابن سعید تو ابن قوقل کا قاتل ہے لہٰذا ان کو حصہ نہ دیا جائے۔ اور ابان بن سعید نے یہ دلیل پیش کی کہ ابو ہریرہ نے جنگ میں کوئی کام نہیں کیا لہٰذا ان کو حصہ نہ دیا جائے۔ اب دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا۔ (بذل:۴/۴۱)

دوسرا اشکال

اشکال یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اگر کوئی شخص احراز غنیمت سے پہلے اور لڑائی ختم ہونے کے بعد دارالحرب میں پہنچ جائے تو اس کو غنیمت میں شریک کیا جاتا ہے اور یہاں حضرت ابو ہریرہ احراز سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے کیونکہ ابھی تک مال غنیمت دارالحرب میں ہی تھا پھر ان کو حصہ کیوں نہیں دیا گیا۔

جواب

جب حضرت ابو ہریرۃؓ اور ابان بن سعیدؓ خیبر میں پہنچے تو خیبر اس وقت فتح ہو چکا تھا اور وہ دارالاسلام کے حکم میں ہو گیا تھا لہٰذا احراز پایا گیا اس لیے حصہ نہیں دیا گیا۔ اور مسند احمد کی روایت سے جو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ کے لیے مسلمانوں نے سفارش کی اور حضور ﷺ نے ان کو حصہ دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے خمس میں سے ان کو حصہ دیا ہوگا۔

تیسرا اشکال

آنے والی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب سفینہ کو غنیمت میں سے حصہ دیا گیا حالانکہ یہ لوگ بھی خیبر کے فتح ہونے کے بعد آئے تھے۔

جواب

(۱) حضور ﷺ نے اصحاب سفینہ کو غنیمت سے حصہ نہیں دیا بلکہ خمس میں سے دیا تھا۔

(۲) اور اگر اصل غنیمت سے حصہ دیا ہے تو تمام مجاہدین کی رضامندی سے دیا ہوگا۔

(۳) یہ بھی احتمال ہے کہ اصحاب سفینہ جس وقت خیبر پہنچے ہوں تو خیبر کی فتح مکمل نہ ہوئی ہو بلکہ بعض قلعے فتح ہوگئے ہوں اور بعض باقی ہوں لہٰذا اب یہ کہنا پڑے گا کہ اصحاب سفینہ خیبر کے دارالاسلام بننے سے پہلے ہی آگئے تھے۔ (بذل:۴/۴۱)

ترجمة الباب: حدیث بالا سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا، لہٰذا ترجمۃ الباب سے روایت کی مناسبت ثابت ہوگئی۔

۷۵ ﴿حَدَّثَنَا محمد بنُ العَلاءِ نا أبو أُسَامَةَ حَدَّثَنَا بُرَيْدٌ عَنْ أبي بُرْدَةَ عن أبي موسٰى قال: قدِمْنَا فوافَقْنَا رسولَ الله صلى الله عليه سلم حينَ افتتح خيبرَ فأسْهَم لنا، أو قال فأعطانا منها، ومَا قَسَّمَ لأحدٍ غابَ عَنْ فتحِ خَيْبَرَ مِنْهَا شَيْئًا إلاّ مَنْ شهد مَعَه، إلا أصحابَ سفِيْنَتِنَا جَعْفَرَ وأصحابَهُ، فأَسْهَمَ لَهُم معهم﴾

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ہم (یمن سے) آئے، اور حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے جب کہ آپ ﷺ خیبر کو فتح کر چکے تھے، پھر حضور ﷺ نے ہم کو خیبر کی غنیمت میں سے حصہ دیا۔ (راوی کو شک ہے کہ "أسهم لنا" کا لفظ ہے یا "أعطانا منها" کا لفظ ہے) فتح خیبر سے غائب رہنے والوں میں سے حضور ﷺ نے کسی کو حصہ نہیں دیا سوائے ان لوگوں کے جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے، مگر ہماری کشتی والوں کو حصہ دیا، یعنی حضرت جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کو حصہ دیا۔

تشریح مع تحقیق: حضرت ابوموسیٰ اشعری مکہ مکرمہ سے یمن تشریف لائے اور اسلام قبول کیا پھر ہجرت کر کے حبشہ روانہ ہوگئے وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی نیز ان لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ جب ان سب حضرات کو یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما چکے ہیں تو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے ساتھی ــــ جن کی تعداد "اسعد الغابۃ" میں چالیس لکھی ہے، جن میں سے ۳۲ حبشہ کے تھے اور ۸ شام کے تھے ــــ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھی ــــ ۵۲ یا ۵۳ ــــ سب ایک کشتی میں سوار ہوئے اور خیبر آپہنچے اس لیے ان حضرات کو اصحاب سفینہ کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو حضور ﷺ کے مجاہدین کی رضامندی سے حصہ دیا۔ (اصح السیر: ۲۰۰، ابوداؤد مترجم: ۲/۳۷۷)

ترجمة الباب: ولا قسم لأحدٍ غاب عن فتح خيبر الخ سے ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ جو لوگ فتح خیبر کے بعد خیبر پہنچے ان کو حصہ نہیں دیا گیا جیسا کہ ابان بن سعید وغیرہ۔

۷۶ ﴿حَدَّثَنَا محبوبُ بنُ موسٰى أبو صالح قال أنا أبو إسحٰقَ الفزاريُّ عَن كُلَيْبِ بنِ وَائلٍ عن هاني بنِ قَيْسٍ عن حَبِيبِ بنِ أبي مُلَيْكَةَ عن ابنِ عُمرَ قال: إنَّ رسولَ الله

صلى الله عليه وسلم قامَ يعني يومَ بَدْرٍ فقال: إنَّ عثمانَ انْطَلَق في حاجةِ اللّٰهِ وحاجةِ رسولِهِ، وإنّي أُبَايِعُ لَهُ، فَضَرَبَ لَهُ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بسهمٍ، ولَمْ يَضْرِبْ لأحدٍ غَابَ غيرَه﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر یہ ارشاد فرمایا کہ عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام سے گئے ہیں میں ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں، اور آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے لیے حصہ مقرر فرمایا ان کے علاوہ غائبین میں سے کسی کو حصہ نہیں دیا۔

تشریح مع تحقیق : ضَرَبَ أحدٌ لأحدٍ بِسَهْمٍ أو سَهْمًا : مال وغیرہ میں حصہ مقرر کرنا۔

کلیب بن وائل : یہ راوی متکلم فیہ ہیں، امام ابوزرعہ ان کے ضعف کے قائل ہیں، البتہ ابن حبان نے ان کو اپنی ثقات میں ذکر فرما کر اس ضعف کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

هاني بن قيس : کوفہ کے رہنے والے تھے، تقریب التہذیب میں ان کو مستور الحال کہا گیا ہے لیکن ابن حبان نے ان کو بھی ثقات میں ذکر کیا ہے۔

انطلق فی حاجة الله ... اللہ کے کام سے مراد اس کی رضامندی کے لیے کوئی عمل کرنا ہے اور حضور ﷺ کی حاجت سے مراد آپ ﷺ کی بات مان کر آپ ﷺ کی صاحبزادی کی خدمت کے لیے جانا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کا اصل قصہ یہ تھا کہ جب حضور ﷺ مدینہ منورہ سے بدر کے لیے روانہ ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کی لخت جگر حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، حضرت عثمانؓ چونکہ حضرت رقیہ کے شوہر تھے اس لیے حضور ﷺ نے مناسب سمجھ کر حضرت عثمانؓ کو ہی حضرت رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا۔ فتح کے بعد جب غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام سے گئے ہیں میں ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں (لیکن عون المعبود میں لکھا ہے کہ بدر کے موقع پر تو بیعت ہی نہیں لی گئی تھی، بلکہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی تھی اس لیے اس روایت میں وہم ہے) اس کے بعد حضور ﷺ نے مال غنیمت سے حضرت عثمانؓ کو حصہ دیا، ان کے علاوہ کسی غائب کو حصہ نہیں دیا گیا۔

حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول بظاہر ان روایات کے خلاف معلوم ہوتا ہے جن سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے بدر کے دن بہت سے لوگوں کو غنیمت میں سے حصہ دیا مثلاً: صاحب خمیس: ۱/۳۷۱ پر لکھتے ہیں کہ بدر کے دن تین مہاجرین اور پانچ انصاری صحابہ کو غنیمت میں سے حصہ دیا گیا۔ حالانکہ یہ حضرات جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ بخاری شریف جلد ثانی کی کتاب المغازی میں ان آٹھ حضرات کے نام بھی مذکور ہیں، اس لیے ابن عمرؓ کے اس قول مذکور کی تاویل ضروری ہے کہ حضرت عثمانؓ کے علاوہ بدر کے مال غنیمت میں سے کسی کو حصہ نہیں دیا گیا تھا،

اس کی دوتاویلیں کی جاسکتی ہیں:

(۱) حضرت ابن عمرؓ کا یہ ارشاد ان کے عدم علم پر محمول ہے۔

(۲) یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کی تخصیص اس لیے کی کہ یہ غزدے سے متعلق کام سے نہیں گئے تھے بلکہ حضور ﷺ کی بیٹی کی تیمارداری کے لیے گئے تھے، بخلاف اور حضرات کے، اس لیے کہ یہ دیگر لوگ جنگی کام کی وجہ سے ہی جنگ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے جیسے: حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو حضور ﷺ نے قریش کے قافلہ کی جاسوسی کی غرض سے بھیجا تھا۔(بذل:۴۲/۴)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو حکماً شریک مانا جاتا ہے اگرچہ وہ لوگ لڑائی میں بظاہر اور حقیقتاً شریک نہ ہوں، مثلاً امام کسی کو دارالحرب سے دارالاسلام بھیج دے کہ جاؤ ہتھیار اور دوسرے مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے آؤ، اب یہ شخص چلا جائے اور مال غنیمت حاصل ہوجائے تو اس کو بھی حصہ ملے گا۔(وقس علی ہذا)

خلاصہ یہ ہے کہ امام جس کو بھی مصالح مسلمین میں لگادے اس کو غنیمت میں شریک کیا جائے گا۔

ترجمة الباب: "ولم یضرب لأحدٍ غاب غیره" سے ثابت ہے۔

ایک اختلافی مسئلہ

اس باب کے تحت ائمہ کرام کے مابین ایک مختلف فیہ مسئلہ آتا ہے کہ اگر کوئی شخص جنگ ختم ہونے کے بعد احراز سے پہلے دارالحرب میں آکر لشکر المسلمین میں شامل ہوجائے تو اس کو مال غنیمت میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

(۱) ائمہ ثلثہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جنگ میں شریک ہوگا صرف اسی کو حصہ دیا جائے گا، اور جو لڑائی میں شریک نہ ہو خواہ احراز سے پہلے ہی لشکر کے ساتھ مل جائے اس کو غنیمت میں سے حصہ نہ ملے گا۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص احراز سے پہلے دارالحرب میں پہنچ کر مسلمانوں کے لشکر میں مل جائے، یا امام نے اس کو مصالح مسلمین کے لیے بھیجا ہو تو اس کو غنیمت سے حصہ ملے گا۔

ائمہ ثلثہ کے دلائل

(۱) إنّ عُمَرَ كَتَبَ إلى عَمَّارٍ أنَّ الغَنِيمَةَ لِمَنْ شَهِدَ الوَقْعَةَ (فتح الباری:۲۷۶/۶)

(۲) حضرت ابوہریرہؓ اور ابان بن سعیدؓ جب فتح خیبر کے بعد خیبر میں پہنچے تو مال غنیمت میں سے ان کو حصہ نہیں دیا گیا حالانکہ ابھی احراز بھی نہیں پایا گیا تھا، اس کے باوجود ان کو حصہ نہ دیا جانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ لڑائی میں شریک ہونے والے شخص کو ہی غنیمت میں سے حصہ ملے گا۔(ابوداؤد:۳۷۳/۲)

حنفیہ کے دلائل

(۱) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے: إنّما تغَيَّبَ عثمان عن بدر وأسهم له. (بخاری شریف)

(۲) اصحاب سفینہ کو بھی حصہ دیا گیا تھا کیونکہ وہ لوگ احراز سے پہلے آگئے تھے۔(ابوداؤد)

ائمہ ثلثہ کی پہلی دلیل کا جواب

جواب یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے اور حدیث موقوف شافعیہ کے یہاں حجت نہیں -لأنه لا يرىٰ بتقليد الصحابي ولا الأخذ برأيه - لہٰذا استدلال تام نہیں ہے۔ نیز یہ موقوف روایت مرفوع کے مقابلہ میں قابل استدلال نہیں ہے۔

دوسری دلیل کا جواب

جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور ابان بن سعید خیبر میں پہنچے ہیں تو اس وقت خیبر فتح ہو چکا تھا اور وہ دارالاسلام کے حکم میں ہو گیا تھا، لہٰذا احراز پایا گیا، نیز جب حضرت ابان بن سعید کو نجد کی طرف روانہ کیا تھا تو خیبر کا کوئی ذکر نہیں تھا بلکہ ان کے جانے کے بعد خیبر کا معاملہ پیش آیا تو خیبر میں حاضر ہونے سے حضور ﷺ نے نہیں روکا اس لیے ان کو حصہ نہیں ملا۔ (حاشیہ ابوداؤد) واللہ اعلم بالصواب

﴿باب المرأة والعبد يحذيان من الغنيمة﴾

عورت اور غلام کو مال غنیمت سے حصہ دینے کا بیان

۷۷ ﴿حَدَّثَنا محبوبُ بنُ موسىٰ أبو صالحٍ نا أبو اسحٰقَ الفَزارِيُّ عَنْ زائدةَ عن الأعمَشِ عَنْ المختار بنِ صَيْفِيٍّ عَن يَزِيْدِ بْنِ هُرْمُز قال: كَتَبَ نجدةُ إلى ابنِ عباسٍ يَسْأَلُهٗ كذا وكذا، ذكر أشياءً، وعنِ الْمَمْلُوْكِ أَلَهٗ في الفَيءِ شيءٌ، وعنِ النساءِ هَلْ كُنَّ يَخرجْنَ مع النبي صلى الله عليه وسلم؟ وهَلْ لَهُنَّ نَصِيْبٌ؟ فقال ابنُ عباسٍ: لَوْلَا أَنْ يأتيَ أُحْمُوقَةً ما كَتَبْتُ إِلَيْهِ، أما الْمَمْلُوكُ فكَانَ يُحذىٰ، وأما النسَاء فكُنَّ يُداوِيْنَ الجَرحىٰ ويَسْقِيْنَ الماءَ﴾

ترجمہ: حضرت یزید بن ہرمزؒ سے روایت ہے کہ نجدہ (جو خارجیوں کا رئیس تھا) نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس خط لکھا اور بہت سی باتیں ان سے پوچھیں، غلام کے بارے میں بھی پوچھا کہ کیا غلام کو حصہ ملے گا اور کیا

حضور ﷺ کے ساتھ عورتیں بھی جہاد میں جایا کرتی تھیں اوران کوبھی حصہ ملتا تھا؟ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ وہ حماقت کر بیٹھے گا تو میں اس کو جواب نہ لکھتا (پھر حضرت ابن عباسؓ نے لکھا کہ) غلام کو کچھ بطور انعام کے دیا جاتا تھا اور عورتیں زخمیوں کی دوا کرتی تھیں اوران کو پانی پلاتی تھیں۔

تشریح مع تحقیق : يُحْذٰى : (افعال) بمعنی حصہ دینا۔

أحموقة : حماقت میں پڑنا، بے وقوف جیسے کام کرنا۔

امام ابوداوٗدؒ یہاں سے یہ بیان فرمارہے ہیں کہ جنگ میں عورتیں اور غلام شریک ہوجائیں تو ان کوغنیمت سے حصہ ملے گا یا نہیں؟ اصل میں باب کی روایت مختصر ہے مسلم شریف میں یہی روایت مفصلاً ذکر کی ہے۔ روایت یہ ہے کہ نجدہ بن عامر حروری جو خوارج کی جماعت کا سردار تھا ۶۶ھ میں ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر ''بحرین'' میں جاکر رہنے لگا، اس کی جماعت اس کو امیر المؤمنین کہتی تھی، اس نے ایک فرقہ بنالیا تھا، جس میں بہت سے لوگوں کے گمراہ ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے میں اس کو قتل کردیا گیا۔ (البدر:۲/۱۲۹)

اسی نجدہ نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک خط بھیجا تھا اوراس میں پانچ باتوں کے بارے میں سوال کیا تھا:

(۱) حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں جہاد کرتی تھیں یا نہیں؟

(۲) عورتوں کوغنیمت سے حصہ دیا جاتا تھا یا نہیں؟

(۳) حضور ﷺ کے زمانے میں جہاد میں بچے قتل کیے جاتے تھے یا نہیں؟

(۴) خمس — جو مال غنیمت سے نکالا جاتا ہے — کس کو دیا جاتا تھا؟

(۵) لڑائی میں شریک ہونے والے غلاموں کو حصہ دیا جاتا تھا یا نہیں؟

ان پانچ سوالوں کے جواب میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص بیوقوفی اور حماقت کے کام نہ کرتا یعنی مجھے اس کا خوف ہے کہ وہ بیوقوفی کا کام کر بیٹھے گا اگر میں نے جواب نہ لکھا، اور لوگوں کو غلط باتیں اور مسائل بتادے گا جو ان کی گمراہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے اس کے سوالات کے جواب لکھے: ''عورتیں لڑائی میں جاتی تھیں، اور زخمیوں کی خدمت کرتی تھیں، مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں، اور آپ ﷺ ان کو کچھ بطور انعام وعطیہ کے دے دیا کرتے تھے، مجاہدین کی طرح حصہ نہیں دیتے تھے۔

جہاد میں بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔

غلاموں کو بھی بطور عطیہ کے کچھ دے دیا جاتا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے خمس کی تفصیل بھی لکھ دی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مسلم شریف باب نساء الغازيات يرضخ لهنّ)

روایت بالا سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ عورتوں اور غلاموں کو مال غنیمت سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ جمہور ائمہ حضرات اسی کے قائل ہیں کہ ان کو دیگر مجاہدین کی طرح حصہ نہیں دیا جائے گا، البتہ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ عورتوں کو حصہ دیا جائے گا، اور استدلال میں حشرج بن زیاد کی روایت پیش کرتے ہیں، جس میں ہے: إذا فتح اللّٰهُ خَيْبَرَ أَسْهَمَ لنا كما أسهم للرّجالِ (ابوداؤد:۲/۳۷۴)

لیکن جمہور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ روایت نہایت ضعیف اور کمزور ہے، کیونکہ اس کی سند میں حشرج بن زیاد مجہول ہیں، نیز مردوں کی طرح دینے سے مراد یہ نہیں کہ برابر برابر حصہ دیا گیا ہو بلکہ یہ تشبیہ نفس دینے میں ہے کہ جیسے مردوں کو حصہ دیا تو ہمیں بھی دیدیا تھا البتہ مردوں کو اصل غنیمت سے ان کا حصہ دیا تھا اور ہمیں یعنی عورتوں کو بطور عطیہ کے حصہ دیا تھا، جمہور ائمہ حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں۔

ترجمة الباب: إن الملوك فكان يُحذىٰ الخ سے ثابت ہورہا ہے۔

۷۸ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ يحيىٰ بنِ فارسٍ نا أحمدُ بنُ خالدٍ يَعْني الوهبيَّ، قال نا ابنُ اسحٰق عَنْ أبي جَعْفر والزهريِّ عَنْ يزيد بنِ هُرْمزٍ قال: كَتَبَ نجدةُ الحروريُّ إلى ابنِ عباسٍ يَسْأَلُهُ عَنِ النِّسَاءِ هَلْ كُنَّ يَشْهَدْنَ الحربَ مَعَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم وهَلْ كَانَ يُضْرَبُ لَهُنَّ بِسَهْمٍ؟ فأَنَا كَتَبْتُ كتابَ ابنِ عباسٍ إلى نجدة: قد كُنَّ يَحْضُرْنَ الحربَ مَعَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فأمّا أن يُضْرَبَ لهنَّ بسَهْمٍ فَلاَ، وقَدْ كانَ يُرْضَخُ لَهُنَّ﴾

ترجمہ: حضرت یزید بن ہرمز کہتے ہیں نجدہ حروری نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس خط لکھا اور سوال کیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں عورتیں جہاد میں جاتی تھیں یا نہیں؟ اور کیا حضور ﷺ ان کے لیے حصہ مقرر فرماتے تھے؟ (یزید بن ہرمز کہتے ہیں کہ) میں نے حضرت ابن عباسؓ کا خط لکھا تھا اس میں تھا کہ عورتیں حضور ﷺ کے ساتھ جہاد میں جاتی تھیں لیکن حضور ﷺ نے ان کا حصہ مقرر نہیں فرمایا، بلکہ انعام کے طور پر کچھ دے دیا جاتا تھا۔

تشریح مع تحقیق: شهد الحربَ: (س) جنگ میں حاضر ہونا، شریک ہونا۔

يَرْضَخُ: (ض ف) تھوڑا سا دینا، بولا جاتا ہے رَضَخَ لَهُ فلانٌ: اس نے اس کو تھوڑا سا دیا۔

الرضخ بمعنی تھوڑا عطیہ۔

اس روایت کی مکمل وضاحت ماقبل کی روایت میں گذر چکی ہے البتہ اس میں کچھ اضافہ ہے کہ نجدہ کو جواب لکھنے والے حضرت یزید بن ہرمز ہی تھے، ابن عباسؓ نے یہ جواب نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابن عباسؓ کی بینائی اس وقت جاتی رہی تھی، اور جہاں حضرت ابن عباسؓ کی طرف لکھنے کی نسبت ہے تو وہ آمر ہونے کی حیثیت

سے ہے، اس حدیث سے بھی یہ ہی معلوم ہوا کہ عورتوں کو غنیمت میں سے باقاعدہ کوئی حصہ نہیں دیا جائے گا، بلکہ بطور عطیہ کے کچھ دیدیا جائے گا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو جو عطیہ دیا جائے گا وہ خمس الخمس سے دیا جائے گا، کیوں کہ باقی غنیمت تو مجاہدین کا حق ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ خمس سے دیا جائے گا۔

امام احمدؒ کی اس بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک روایت میں وہ امام شافعیؒ کے ساتھ ہیں اور دوسری روایت میں امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں کہ اصل غنیمت سے ان کو بھی دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

(تفصیل کے لیے دیکھئے: بذل:۴/۴۲، اوجز المسالک:۴/۳۶، شامی:۶/۲۴۱)

ترجمة الباب: وقد كان يَرْضَخُ لهُنَّ سے ثابت ہو رہا ہے۔

٧٩ ﴿حَدَّثَنا إبراهيمُ بنُ سعيدٍ وغيرُهُ قالا أنا زيدٌ يَعْني ابنَ الحبَابِ نا رافعُ بنُ سَلَمةَ بنِ زيادٍ قال حدثني حَشْرَجُ بنُ زيادٍ عَن جدَّتِهِ أمِّ أبِيْهِ إنّها خَرَجَتْ مع رسولِ الله صلى الله عليه وسلم في غَزْوةِ خَيْبَرَ سَادِسَ ستّ نِسْوةٍ فَبَلَغَ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم فَبَعَثَ إلينا، فَجِئْنَا فرأَيْنَا فِيه الغضبَ، فقال: مع مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِإذْنِ من خرجتنَّ؟ فقلنا: يا رسول الله! خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشَعْرَ ونُعِيْنَ بِهِ في سبيل الله، ومَعَنَا دواءٌ للجرحىٰ ونُنَاوِلُ السهامَ، ونَسْقِيْ السَوِيْقَ؛ فقال: قُمْنَ حتّى إذا فَتَحَ اللّٰهُ عليه خَيْبَرَ أَسْهَمَ لَنَا كما أَسْهَمَ لِلرِّجَالِ، قال: فقُلْتُ لَهَا يا جدةُ! وما كان ذلك؟ فقالَتْ تَمْرًا﴾

ترجمہ: حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ جنگ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئیں، یہ چھ عورتیں تھیں۔ ام زیاد کہتی ہیں کہ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے ہم کو بلا بھیجا، ہم سب عورتیں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، تو دیکھا کہ آپ ﷺ غصہ میں تھے، اور ہم سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کس کے ساتھ اور کس کی اجازت سے آئی ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اس لیے آئی ہیں تاکہ بالوں کو بٹیں (رسیاں بنائیں) اور ان رسیوں کے ذریعہ اللہ کی راہ میں مدد پہنچائیں؛ ہمارے پاس زخمیوں کے لیے دوا ہے، اور ہم تیر دیا کرتی ہیں، مجاہدین کو ستو گھول کر پلاتی ہیں؛ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا ٹھہر جاؤ، اب جب خیبر فتح ہوا تو آپ ﷺ نے ہم کو بھی ایسا ہی حصہ دیا جیسا کہ مردوں کو حصہ دیا۔ حشرج بن زیاد کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی سے پوچھا کہ وہ حصہ کیا تھا؟ تو انھوں نے کہا کہ کھجوریں تھیں۔

تشریح مع تحقیق : نَغْزِلُ (ض) کاتنا، دھاگے بنانا، رسی بنانا۔
نُنَاوِلُ : نَاوَلَ الشيءَ بمعنی دینا۔
نَسْقِي (ض) پلانا۔

رافع بن سلمه : یہ راوی مستور الحال ہیں، حافظ بن حجر نے مجہول کہا ہے (تحریر تقریب التہذیب:۱/۳۸۹)

حشرج بن زیاد : مجہول ہیں، یحیٰ بن قطان کہتے ہیں کہ حشرج سے رافع بن سلمہ ہی روایت کرتے ہیں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ان سے روایت نہیں کرتا ہے اس لیے یہ مجہول ہیں۔ امام خطابی کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (بذل:۴/۴۳، تحریر تقریب التہذیب:۱/۲۹۶)

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ چھ عورتیں مل کر جنگ خیبر میں گئیں، ان ہی چھ عورتوں میں حشرج کی دادی بھی تھیں، انھوں نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ جب ہم خیبر پہنچے اور حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو کس نے اجازت دی ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ ہم رسیاں بٹنے کے لیے آئی ہیں تا کہ ان رسیوں میں قیدیوں کو باندھا جائے؛ اس کے بعد حضور ﷺ نے ان عورتوں کو شرکت کی اجازت دے دی؛ جب لڑائی ختم ہوگئی اور غنیمت کی تقسیم شروع ہوئی تو ان عورتوں کو بھی بطور انعام کے کچھ کھجوریں دے دی گئیں؛ معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کو دیگر مجاہدین کی طرح حصہ نہیں دیا گیا بلکہ صرف کھجوریں ہی بطور انعام کے دے دی گئیں۔

ترجمة الباب : حدیث اور باب میں "أسهم لنا كما أسهم للرجال الخ" سے مناسبت ثابت ہوجاتی ہے۔

۸۰ ﴿حَدَّثَنَا أحمدُ بنُ حَنْبَلٍ نَا بِشْرٌ يَعْنِي ابنَ المُفَضَّلِ عَنْ محمد بنِ زيدٍ قال: حدثني عُمَيْرٌ مولىٰ أبي اللحم قال : شهدتُ الخيبرَ مع سَادَتِي، فكلَّمُوا فِيَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم، فأَمَرَ بي، فَقَلَّدَتُ سَيْفًا فإذا أنا أَجُرُّهُ، فَأخبرَ أنّي مملوكٌ، فأَمَرَنِي بِشَيءٍ مِنْ خُرْثِي المتَاعِ﴾

ترجمه: حضرت عمیر سے روایت ہے کہ جنگ خیبر کے موقع پر میں مالک کے ساتھ خیبر گیا، انھوں نے میرے بارے میں حضور ﷺ سے گفتگو کی کہ اس کو ساتھ لے جائیں، اس پر آپ ﷺ نے مجھے ہتھیار اٹھانے کا حکم فرمایا: میں نے ایک تلوار کو لٹکا لیا، اور میں اس کو کھینچ رہا تھا پھر آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ میں غلام ہوں تو آپ ﷺ نے مجھے گھر کے سامان میں سے کچھ دیا۔

تشریح مع تحقیق : خُرْثِيُّ المَتَاعُ : الشيء القليل ، تھوڑی چیز۔ عرف میں گھر کے معمولی سامان کو "خرثي المتاع" کہا جاتا ہے جیسے ہانڈی، چمچا وغیرہ۔

حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ جب عمیرؓ غلام تھے تو حضور ﷺ کے ساتھ لڑائی میں چلے گئے، جب حضور ﷺ کو علم ہوا کہ یہ غلام ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو غنیمت سے حصہ نہیں دیا بلکہ گھر کا معمولی سامان بطور عطیہ کے دیا۔ امام ابوداوٗدؒ اس حدیث سے بھی یہ ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غلام اور عورت وغیرہ کو غنیمت سے دیگر مجاہدین کی طرح حصہ نہیں دیا جائے گا۔

ترجمة الباب: فامرني بشيء من حرثي المتاع سے ثابت ہو رہا ہے۔

۸۱ ﴿حَدَّثَنا سعيدُ بنُ منصورٍ قال ثَنَا أبو معاوية عنِ الأعمشِ عَنْ أبي سُفْيَانَ عَنْ جابرٍ قال: كنتُ أَمِيحُ أَصْحابي الماءَ يومَ بدرٍ﴾

ترجمه: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں بدر کے دن مسلمان ساتھیوں کے لیے پانی بھر رہا تھا۔

تشریح مع تحقیق: أَمِيحُ: (ض) پانی کی کمی کے باعث ڈول بھرنے کے لیے کنویں میں اترنا، "مَاحَ الماءَ" پانی نکالنا، "مَاحَ أَصْحابَهٗ" ساتھیوں کے لیے پانی بھرنا۔

روایت کا مطلب بالکل واضح ہے مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ترجمة الباب: بظاہر حدیث مذکور کی ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت ثابت نہیں ہوتی، لیکن امام ابوداوٗدؒ کے تفقہ سے ترجمۃ الباب سے مناسبت ثابت ہو سکتی ہے وہ اس طرح کہ جب وہ خدمت کر رہے تھے تو ان کو حصہ بھی دیا ہوگا، یا یہ کہو کہ غزوہ میں شرکت کرنا ہی عطیہ کا سبب ہوتا ہے۔ (كما قال استاذنا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی)

﴿بَاب في المشرك يسهم له﴾

مشرک کو حصہ ملنے (اور نہ ملنے) کا بیان

۸۲ ۔﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ ويحيىٰ بنُ مَعِينٍ قَالَا نا يحيىٰ عن مالكٍ عَنِ الفَضْلِ عَنْ عبدِ الله بنِ نَيَارٍ عَنْ عروةَ عَن عائشةَ قال يحيىٰ إنَّ رجلًا مِنَ المُشْرِكينَ لحِقَ بالنَّبِيِّ صلّى الله عليه وسلم يقاتِلُ مَعَهٗ، فقال: ارْجِعْ، ثم اتَّفَقَا فقالَا: إنَّا لَا نَسْتَعِينُ بِمُشْرِكٍ﴾

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مشرک رسول اللہ ﷺ سے جا ملا، اور ان کے ساتھ قتال کرنے لگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ واپس چلے جاؤ، پھر دونوں متفق ہو گئے (یعنی اس روایت کو نقل کرنے والے یحییٰ بن معین اور مسدد ہیں، اب تک کے الفاظ یحییٰ بن معین کے تھے، اور اس سے آگے دونوں کے الفاظ متفق

ہیں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیتے۔

تشریح مع تحقیق : نستعين بمشرك (استفعال) مدد مانگنا، مدد لینا۔

یہ جنگ بدر کا قصہ ہے کہ جب آپ ﷺ مقام بدر کی طرف روانہ ہوئے اور مقام "وبر" سے گزر رہے تھے تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس کی بہادری اور قوت کا چرچا تھا، جب صحابہؓ نے اس شخص کو دیکھا تو بڑے خوش ہوئے، اس لیے اس شخص نے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ لڑوں گا، اور غنیمت میں سے حصہ پاؤں گا، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں؛ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم مشرکین سے مدد نہیں لیتے، لہٰذا تم یہاں سے چلے جاؤ، آپ ﷺ آگے روانہ ہو گئے جب مقام "شجرہ" میں پہنچے تو اس شخص نے پھر کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ مل کر لڑوں گا، آپ ﷺ نے پھر یہی جواب دیا کہ ہم مشرکین سے مدد نہیں لیتے، اس کے بعد جب آپ ﷺ مقام "بیدار" میں پہنچے تو اس نے پھر کہا کہ میں آپ کے ساتھ لڑوں گا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں ایمان رکھتا ہوں، حضور ﷺ نے اجازت دیدی اور فرمایا کہ چلو۔ (مسلم:۲/۱۱۸)

ترجمۃ الباب : امام ابوداؤدؒ نے باب قائم کیا ہے کہ مشرک اگر جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے شریک ہو تو اس کو حصہ ملے گا یا نہیں؟ لیکن یہ مسئلہ ایک دوسرے مسئلہ پر موقوف ہے کہ کافر سے استعانت جائز ہے یا نہیں؟ امام ابوداؤد کا رجحان یہ ہے کہ جائز ہے اس لیے اس کو حصہ ملے گا، لہٰذا امام ابوداؤد کے رجحان کے مطابق جب استعانت بالمشرک جائز ہے تو اس کو حصہ دیا جائے گا اس سے ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا۔

مسئلہ استعانت بالمشرک

جنگ کے موقع پر کسی کافر سے مدد لینے کے حوالے سے فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہے:

(۱) ابن منذر اور جوزجانی فرماتے ہیں کہ کافر سے استعانت جائز نہیں ہے۔ فتاوی شامی کے محشی "شیخ عادل احمد عبدالموجود" نے امام مالک اور صاحب "میزان" نے امام احمد کا مذہب بھی عدم جواز ہی کا لکھا ہے۔ (فتاوی شامی:۶/۲۲۲ زکریا، میزان:۲/۲۰۵، بیروت)

(۲) صاحب "تکملہ فتح الملہم" نے ائمہ اربعہ کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ استعانت بالکفار جائز ہے۔ البتہ ہر امام کے نزدیک کچھ شرائط ہیں۔

امام شافعیؒ کے نزدیک دو شرطوں کے ساتھ استعانت بالکفار جائز ہے: (۱) ضرورت محقق ہو۔ (۲) کافر مسلمانوں کے بارے میں حسن رائے رکھتا ہو اس سے خیانت کا خوف نہ ہو (شرح نووی مسلم شریف:۲/۱۱۸)

امام احمدؒ کے نزدیک ایک شرط ہے "حاجت کا پایا جانا" (تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۲۶۸، بذل: ۴/ ۴۴)
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر امام کے حکم کی فرماں برداری کرے تو جائز ہے۔ (اعلاء السنن: ۱۲/ ۵۱)
خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں دو مذہب ہیں:
(۱) عدم جواز کے قائلین۔
(۲) جواز کے قائلین۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل

(۱) مسلم شریف کی حدیث ہے: عن عائشة قالت : خرج النبي صلى الله عليه وسلم قِبَلَ بدرٍ، فلما كان "بِحَرَّةِ" كان الوبرة أدركه رجل كانت تذكر منه جُرأةٌ و نَجْدَةٌ، ففرح به أصحاب رسول الله ﷺ حين رأوه، فلما أدركه قال : جئتك لأتبعكَ وأصيب معك، قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم : "تؤمن بالله و رسوله" قال : لا، قال: ارجع فلن أستعين بمشركٍ الخ (مسلم شریف: ۲/ ۱۱۸)

(۲) عن أحمد عن خبيب بن عبد الرحمن عن أبيه جده قال: أتيتُ النبي صلى الله عليه وسلم، وهو يريد غزواً، أنا و رجل من قومي، ولم نسلم ، فقلنا: أنا نستحي أن يشهد قومنا مشهداً، لا نشهده معهم، فقال: أَسْلَمْتُمَا؟ فقلنا: لا، فقال: إنا لا نستعين بالمشركين على المشركين فاسلمنا وشهدنا معه. (شامی: ۶/ ۲۴۲)

(۳) ابوداؤد کی حدیث باب: (فيه) إنا لا نستعين بالمشرك (ابوداؤد: ۲/ ۳۷۵)
ان احادیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ مشرکین سے استعانت جائز نہیں، کیونکہ لفظ مشرک نکرہ تحت النفی ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے، اسی طرح جہاں "مشرکین" جمع معرف باللام ہے تو اس میں "الف لام" استغراق کا ہے اس سے بھی عموم کا فائدہ ہوتا ہے معلوم ہوا کہ مشرکین سے مدد نہیں لی جائے گی، نیز حضور ﷺ نے ان حضرات سے بغیر اسلام قبول کیے مدد نہیں لی حالانکہ یہ لوگ مدد کرنے کے انتہائی مشتاق تھے۔
(۴) کافر کے مکر وفریب پر اطمینان بھی نہیں ہوتا ہے اور جنگ میں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا کامیابی کا سبب ہے اس اعتبار سے بھی کافر سے مدد لینا درست نہ ہونا چاہیے۔

قائلین جواز کے دلائل

(۱) عن ابن عباس قال : استعانَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بيهود بَنِيْ قينقاع، فَرَضَخَ لهم ولم يسهم. (حاشیۃ علی الشامی: ۶/ ۲۴۳)

(٢) ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں زہری سے روایت کیا ہے: أن النبي صلى الله عليه وسلم استعان بناسٍ من اليهود في خيبر في حربه فَأَسْهَمَ لَهُمْ. (کتاب المراسیل)

(٣) عن ذي مخبر قال: سمعت رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول: "ستصالحون الروم صلحًا تغزون أنتم، وهم عدوًا من وراء كم" وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم رومیوں سے صلح کروگے اور ایک ساتھ مل کر دشمنوں سے لڑوگے اور وہ (رومی) تمہاری مدد کریں گے، اب دیکھو یہ رومی کافر ہوں گے اور پھر بھی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور حضور ﷺ نے اس سے منع بھی نہیں فرمایا کہ تم رومیوں سے مدد نہ لینا، معلوم ہوا کہ استعانت بالکفار جائز ہے۔

(٤) رُوِيَ عنه صلى الله عليه وسلم أنه استعان بصفوان بن أمية.

(٥) قوله عليه السلام: لا يدخل الجنة إلا نفس مسلمة، وإنّ الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (بخاری:١/٤٣١)

اس حدیث میں فاجر سے مراد کافر ہے کیونکہ مسلمان کے مقابلہ میں بولا گیا ہے معلوم ہوا کہ کافر سے مدد لی جاسکتی ہے۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل کے جوابات

جو احادیث عدم جواز استعانت بالکفار کے سلسلے میں پیش کی گئی ہیں وہ جنگ بدر کے موقع کی ہیں، اور یہ حق و باطل کا سب سے پہلا غزوہ تھا اس لیے آپ ﷺ نے اس غزوہ میں مشرکین سے مدد لینا اچھا نہیں سمجھا، اور یہ چاہا کہ یہ غزوہ صرف مسلمانوں کے ہاتھوں ہی ہو۔ (تکملۃ فتح الملہم:٣/٢٦٩)

(٢) دوسرا جواب حافظ ابن حجرؒ نے "فتح الباری" میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ان مذکورہ اشخاص کے اسلام کی رغبت کرتے ہوئے ان سے کہا تھا کہ ہم کفار سے مدد نہیں لیتے اور آپ ﷺ کی یہ رغبت اور خواہش بارآور و نتیجہ خیز بھی ثابت ہوئی کہ یہ لوگ اسلام لے آئے۔ (فتح الباری:٦/١٨٠)

(٣) تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت خبیب اور حضرت عائشہؓ کی احادیث منسوخ ہیں، کیونکہ ٦ھ جنگ خیبر کے موقع پر آپ ﷺ کا کفار سے مدد لینا ثابت ہے جو نسخ کی واضح دلیل ہے۔

قائلین جواز کے دلائل پر اعتراضات

(١) پہلی حدیث کی سند میں حسن بن عمارہ ضعیف ہیں جس کی وجہ سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں۔

(٢) دوسری حدیث "زہری" کی مراسیل میں سے ہے، یحییٰ بن قطانؒ امام زہری کی مراسیل کو کوئی حیثیت

نہیں دیتے تھے بلکہ کہتے تھے: هِيَ بمنزلة الريح ۔

(۳) ذی مخبر کی حدیث استعانت بالکفار کے سلسلے میں وارد ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس سے تو رومیوں کے ساتھ معاہدے کو بتلانا مقصود ہے۔

(۴) چوتھی حدیث جو صفوان بن امیہ سے مدد لینے کے بارے میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے خود صفوان سے مدد نہیں لی تھی بلکہ ان سے ہتھیار لیے تھے اور استعانت بالسلاح سب کے نزدیک جائز ہے۔

(۵) پانچویں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کافر خود مسلمانوں کی طرف سے لڑے تو امام کے لیے جائز ہے کہ خاموش رہے اس سے استعانت جائز نہیں۔

ان اعتراضات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ استعانت بالکفار کے عدم جواز کے دلائل، جواز کے دلائل سے زیادہ قوی ہیں۔ واللہ اعلم

نوٹ: ائمہ کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے جب کہ مسلمانوں کو یہ خوف ہو کہ اگر کافر سے مدد لیں گے تو یہ کافر راز فاش کر دے گا تو اس سے مدد لینا بالاتفاق ناجائز ہے۔ اس لیے کہ ایسے وقت میں کافر سے مدد لینا جہاد کے مقصد کے خلاف ہے۔ اسی طرح ہتھیاروں کی درستگی اور خندقوں کے کھودنے میں بھی کفار سے مدد نہیں لی جائے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

ایک اور مختلف فیہ مسئلہ

جو حضرات استعانت بالکفار کے جواز کے قائل ہیں ان کے مابین بھی اس بات میں اختلاف ہے کہ اس کو (کافر) حصہ دیگر مجاہدین کی طرح دیا جائے گا یا نہیں؟

(۱) امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو غنیمت سے دیگر غانمین کی طرح حصہ نہیں دیا جائے گا۔ امام احمد کی بھی ایک روایت یہ ہی ہے۔

(۲) امام اوزاعی اور امام احمد کی دوسری روایت یہ ہے کہ ان کو دیگر مجاہدین کی طرح حصہ دیا جائے گا۔

فریق ثانی کی دلیل

إن النبي ﷺ استعان بناس من اليهود في خيبر في حربه وأسهم لهم . (تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۲۸۸)

فریق اول کی دلیل

إن عليه السلام استعان باليهود على اليهود ولم يعطهم شيئًا من الغنيمة (بذل: ۴/ ۴۱)

فریق ثانی کی دلیل کا جواب:

یہاں پر حصہ دینے سے مراد نفس دینا ہے البتہ مسلمان مجاہدین کو ان کا حق غنیمت دیا جائے گا، اور کفار کو بطور عطیہ دیا جائے گا۔

(استعانت بالکفار کے سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: میزان: ۲/ ۲۰۵، شرح نووی مسلم شریف: ۲/ ۱۱۸، بذل المجہود: ۴/ ۴۴، اعلاء السنن: ۱۲/ ۵۱، تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۲۶۸، حاشیہ فتاویٰ شامی: ۶/ ۲۴۲، حاشیہ ابی داؤد: ۲/ ۳۷۵، فتح الباری: ۶/ ۱۸۰)

﴿بَاب في سهمان الخيل﴾

گھوڑوں کو حصہ دینے کا بیان

۸۳۔ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ حنبلٍ نا أبو معاويةَ نا عُبَيدُ اللّٰهِ عن نافعٍ عن ابنِ عُمَرَ أنَّ رسولَ الله ﷺ أسْهَمَ لِرَجُلٍ وَلِفَرَسِهٖ ثلثةَ أسْهُمٍ، سَهْمًا لَهٗ و سَهْمَيْنِ لفرَسِهٖ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو مع اس کے گھوڑے کے تین حصے دیئے، ایک اس شخص کا اور دو حصے گھوڑے کے۔

۸۴ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ حَنبلٍ نا عبدُ الله بنُ يَزِيْدٍ نا المَسعُوْدِيُّ حدّثني أبو عَمْرَةَ عَنْ أبيهِ قال: أتَيْنَا رسولَ الله صلى الله عليه وسلم أربعةُ نفرٍ و مَعَنَا فَرَسٌ، فأعْطَانَا كلَّ إنسانٍ مِنَّا سَهْمًا و أعْطىٰ الفَرَسَ سَهْمَيْنِ﴾

ترجمہ: حضرت ابوعمرہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم چار آدمی حضور ﷺ کے پاس آئے اور ہمارے ساتھ ایک گھوڑا تھا تو حضور ﷺ نے ہم میں سے ہر ایک کو ایک حصہ دیا اور گھوڑے کو دو حصے دیئے۔

۸۵ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ نا أُمَيَّةُ بنُ خالدٍ نا المَسْعُوْدِيُّ مِنْ رجلٍ مِن آلِ أبي عَمْرَةَ عن أبي عمرة بمعناهُ، إلّا أنَّهٗ قالَ: ثَلثَةُ نَفَرٍ زَادَ فكَانَ لِلْفارِسِ ثَلثَةَ أسْهُمٍ﴾

ترجمہ: حضرت ابوعمرہ سے پہلی روایت کی طرح روایت ہے مگر اس میں یہ زیادتی ہے کہ ہم تین آدمی تھے اور گھوڑسوار کے لیے تین حصے تھے۔

تشریح مع تحقیق: ان تینوں روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے "فارس" کو تین حصے دیئے۔ ایک حصہ مجاہد کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔

یہ باب ائمہ ثلثہ اور صاحبین کا مستدل ہے کہ جنگ میں شریک ہونے والوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں

ایک وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر آئیں اور دوسرے وہ جو پیدل آئیں۔ تو جو لوگ گھوڑوں کے ساتھ میدان جنگ میں آئیں ان کو تین حصے ملیں گے اور جو پیدل شریک ہوں ان کو ایک حصہ ملے گا۔

امام اعظمؒ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ''فارس'' کو دو حصے اور ''راجل'' کو ایک حصہ ملے گا۔ امام اعظمؒ کا مستدل آنے والا باب ہے اس کے بعد مسئلہ کی مکمل وضاحت کی جائے گی۔ (فانتظر)

﴿بَاب في مَنْ أسهم له سهم﴾

گھوڑے کو ایک حصہ دینے کا بیان

۸۲ ﴿حَدَّثَنا محمدُ بْنُ عيسى نا مُجَمِّعُ بنُ يَعْقوبَ بنِ مجمّعِ بنِ يَزِيْدِ الأنْصَارِيُّ قالَ سمعْتُ أبي يعقوبَ بنَ المجمّعِ يَذْكُرُ عَنْ عمِّهِ عبدِ الرحمٰنِ بنِ يَزِيْدِ الأنصاريِّ عَنْ عَمِّهِ مجمّعِ بنِ جَارِيَةَ الأنصاريِّ قال: وكانَ أحدَ القُرّاءِ الذِيْنَ قرأُوا القرآنَ، قالَ: شَهِدْنَا الحديبيةَ مَعَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فلما انْصَرَفْنَا عَنْها إذَا النَّاسُ يَهُزُّوْنَ الأبَاعِرَ، فقال بعضُ الناسِ: ما للناسِ؟ قالوا أُوْحِيَ إلى النبيِّ صلى الله عليه وسلم؛ فخَرجنا مَعَ النَّاسِ نُوْجِفُ، فوَجدْنَا النبيَّ صلى الله عليه وسلم وَاقِفًا على راحلتِهِ عِنْد كُرَاعِ الغَمِيْمِ، فَلَمَّا اجْتَمَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ قرأَ عَلَيْهِم "إنّا فَتَحْنَا لَكَ فتحاً مُبِيْنًا" فقال رجلٌ يا رسول الله! أَفَتْحٌ هُوَ؟ قال: نعم، والذِي نفسُ محمدٍ بيدِهِ إنه لفَتْحٌ، فقُسِّمَتْ خيبرُ على أهلِ الحديبيةِ، فقَسَّمَهَا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم على ثمانيةَ عَشَرَ سهمًا وكان الجيش ألفًا وَخمسمائةٍ، فِيْهِم ثلثُ مائةِ فارس، فأعطىٰ الفارسَ سَهْمَيْنِ وأعطىٰ الرَّاجلَ سَهْمًا﴾

ترجمہ: حضرت مجمع بن جاریہؓ سے روایت ہے — عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ مجمع بن جاریہ ان قراء میں سے ہیں جو قرآن پڑھتے تھے — مجمع بن جاریہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں شریک ہوئے، جب ہم وہاں سے واپس ہوئے تو لوگ اپنے اپنے اونٹ جلدی جلدی بھگانے لگے اور ایک دوسرے کو کہا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، (اونٹوں کو جلدی جلدی کیوں بھگا رہے ہیں) جواب دیا گیا کہ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی ہے، چنانچہ ہم بھی لوگوں کے ساتھ چل دیئے، اور ہم نے حضور ﷺ کو کراع الغمیم (ایک جگہ کا نام ہے) کے پاس اونٹنی پر سوار پایا، جب لوگ آپ ﷺ کے ارد گرد جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے پڑھا: "إنّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِيْنًا" ایک شخص نے عرض

کیا کہ یارسول اللہ یہ فتح ہے، آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ہاں! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے مراد فتح ہی ہے۔ پھر خیبر کے مال کولوگوں پر تقسیم کردیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مال کے اٹھارہ حصے کیے اوراہل لشکر پندرہ سو تھے جن میں سے تین سوفارس تھے جن کودودو حصے ملے اور راجل کوایک ایک حصہ ملا۔

تشریح مع تحقیق : یَهُزّونَ (ن) حرکت دینا، اونٹ کونشاط میں لانا۔

الأَبَاعِرَ بعیر کی جمع ہے نوسال کا اونٹ یا اونٹنی، یہاں مطلق سواری مراد ہے۔

نُوجِفُ (ض، افعال) تیز چلنا، أَوجَفَ الدَّابَّةَ : سواری کوتیز دوڑانا۔

کُرَاعُ الغَمِیمِ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک وادی ہے۔

حدیث بالا کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ مع اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ٦ھ میں عمرہ کے ارادے سے ''مکہ مکرمہ'' روانہ ہوئے، لیکن دشمنان اسلام نے آپ ﷺ کو عمرہ کرنے سے روک دیا، اور آئندہ سال چند شرائط کے ساتھ عمرہ کرنے پر صلح ہوگئی۔ صلح کے بعد ماہ ذی الحجہ ٦ھ کو وہاں سے آپ ﷺ کی واپسی ہوئی۔ جب حضور ﷺ راستہ میں ہی تھے تو سورہ ''فتح'' کی چند آیات نازل ہوئیں، جن میں "وَأَثَابَهم فَتحاً قَرِيبًا وَمَغَانِمَ كثيرة" آیت بھی تھی، حضور ﷺ نے یہ آیات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سنائیں، حضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! کیا یہ ہی فتح ہے؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشادفرمایا کہ ہاں یہی فتح ہے۔

(حضور ﷺ کا یہ فرمان تین باتوں کا احتمال رکھتا ہے اول تو یہ کہ اس فتح سے مراد ''صلح حدیبیہ'' ہے اور اس کو فتح اس لیے کہا گیا ہے کہ اس صلح میں انجام کے اعتبار سے مسلمانوں کا بہت بڑا فائدہ تھا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس فتح سے مراد ''فتح مکہ'' ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کا اصل سبب ہے۔ تیسرا احتمال جوراجح ہے یہ ہے کہ اس فتح سے مراد ''فتح خیبر'' ہے، کیونکہ آیت "وَأَثَابَهُمْ فَتحاً قَرِيبًا وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً" سے مال کثیر کے حصول کی طرف اشارہ ہے اور صلح حدیبیہ کے بعد سب سے پہلے خیبر ہی فتح ہوا جس میں مال کثیر مسلمانوں کو ملا، لہٰذا آیت شریفہ کا مصداق خیبر ہی بنتا ہے)

اس کے بعد آپ ﷺ ''مدینہ منورہ'' تشریف لے گئے، اور اوائل محرم تک مدینہ میں ہی قیام کیا، محرم ۷ھ میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے اور خیبر کو فتح کیا۔

خیبر کے مال غنیمت کی تقسیم

خیبر سے جو مال غنیمت حاصل ہوا اس کو آپ ﷺ نے اس طرح تقسیم فرمایا کہ اولاً اس مال کے چھتیس (٣٦) حصے کیے، اس میں سے اٹھارہ (١٨) حصے آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے لیے اور نوائب مسلمین کے لیے رکھے،

اور اٹھارہ (۱۸) حصوں کو اس طرح تقسیم فرمایا کہ ایک حصے میں سو (۱۰۰) آدمیوں کو شریک کیا، جس کے نتیجے میں کل اٹھارہ سو حصے بن گئے، اور غزوہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد پندرہ سو (۱۵۰۰) تھی۔ بارہ سو (۱۲۰۰) راجل اور تین سو فارس۔ اب بارہ سو (۱۲۰۰) راجلین کو بارہ سو (۱۲۰۰) حصہ مل گئے، اور باقی چھ سو (۶۰۰) حصے ان تین سو (۳۰۰) فارسین کو مل گئے۔ اس حساب سے راجل کا ایک حصہ ہوا اور فارس کے دو حصے ہوئے ایک خود مجاہد کا اور ایک اس کے گھوڑے کا، اسی تفصیلی روایت سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ فارس کو دو سہام ملیں گے۔

ایک معرکتہ الآرار مختلف فیہ مسئلہ

اگر مجاہد راجل (پیدل) ہے تو اس میں تمام فقہار کرام کا اتفاق ہے کہ اس کو ایک حصہ دیا جائے گا، اور اگر مجاہد فارس (گھوڑے کے ساتھ) ہے تو اس کے حصہ دینے میں فقہار کے مابین زبردست اختلاف ہے کہ اس "فارس" کو غنیمت سے تین حصے ملیں گے یا دو حصے ملیں گے۔

(۱) امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام اوزاعی وغیرہ جمہور علمار فرماتے ہیں کہ فارس کو تین حصے ملیں گے، ایک خود مجاہد کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ "فارس" کو دو حصے ملیں گے، ایک حصہ مجاہد کا اور ایک اس کے گھوڑے کا۔

فریق اول کے دلائل

(۱) باب سابق کی تینوں حدیثیں۔ (ابوداؤد: ۲/ ۳۷۵)

باب سابق کی ان تینوں احادیث سے ائمہ ثلثہ وغیرہ حضرات استدلال کرتے ہیں کہ فارس کو تین حصے دیئے جائیں گے۔

(۲) ابن ماجہ میں ہے: أسهم يوم حنين للفارس ثلثة أسهم، للفرس سهمان وللرجل سهم. (ابن ماجہ/ حوالہ شامی: ۶/ ۲۲۸)

(۳) گھوڑے کو دوگنا حصہ دینے میں ایک حکمت بھی ہے کہ گھوڑے کو چارے وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور اس میں بہت خرچ ہوتا ہے تو اگر گھوڑے کو بھی ایک ہی حصہ دیا جائے گا اور وہ ہی حصہ اس کے کھانے کی چیزوں پر خرچ کر دیا جائے تو کچھ بھی نہیں بچتا، پھر گھوڑے کی وجہ سے دشمنوں پر ایک ایسا رعب طاری ہوتا ہے جو پیدل مجاہدین کی وجہ سے نہیں ہوتا، اس لیے حضور ﷺ نے گھوڑے کے لیے دو حصے مقرر فرمائے ہیں۔

فریق ثانی کے دلائل

(۱) حضرت مجمع بن جاریہ کی حدیث: قُسِّمَتْ خيبر على أهل الحديبية على ثمانية عشر سهمًا، فأعطى الفارس سهمَيْن وأعطى الراجلَ سهمًا. (ابوداؤد:۲/۳۷۵)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم جَعَلَ للفارس سهمين وللراجل سهمًا (بذل بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ:۴/۴۴)

(۳) عن زبير بن عوام قال شهدت بني قريظة، فضرب لي بسهم ولِفَرسي بسهم. (رواہ الواقدی فی المغازی حاشیہ ابی داؤد:۲/۳۷۵)

ائمہ ثلثہ کے دلائل کے جوابات

(۱) بہت ممکن ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت فتح خیبر سے پہلے کی ہو اور خیبر میں چونکہ گھوڑے کا ایک حصہ ہی دیا گیا تھا، لہٰذا احتمال نسخ کی وجہ سے قابل استدلال نہیں۔

(۲) یہ بھی احتمال ہے کہ جس وقت حضرت ابن عمرؓ نے روایت کی اس وقت تقسیم غنائم رسول اللہ ﷺ کی طرف مفوض ہو کہ جس کو چاہیں جتنا دیں۔

(۳) ہوسکتا ہے کہ فارس کو حصے تو دو ہی ملتے ہوں تیسرا حصہ حضور ﷺ نے بطور نفل کے دیا ہو، کیونکہ بطور نفل آپ ﷺ سے ثابت بھی ہے۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کو غزوہ ''ذی قرد'' میں دوگنا حصہ دیا تھا۔

(۴) بخاری شریف میں اسی حدیث کو دو جگہ لایا گیا ہے، ایک ''باب سہام الفرس'' میں اور دوسرے ''کتاب المغازی'' میں۔ ''باب سہام الفرس'' میں ہے: إن عليه السلام جَعَلَ للفرس سهمين ولصاحبه سهمًا، اور کتاب المغازی میں ہے: قسم النبي ﷺ يوم خيبر للفرس سهمين وللراجل سهماً.

ان دونوں روایتوں کے صحیح معنی یہ ہیں کہ "للفرس سهمين" "للفرس مع صاحبه" معنی میں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری روایت میں ''فرس'' کو ''راجل'' کے مقابلے میں لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ فرس سے مراد ''فارس'' ہے۔

(۵) عربی کتابت میں عموماً الف کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے لہٰذا اس صورت میں بھی مطلب یہ ہی ہوگا کہ "للفرس سهمين" اصل میں "للفارس سهمين" تھا الف کو حذف کر کے کھڑا زبر دیدیا گیا، لیکن راوی نے اس کو فرس بغیر الالف ہی سمجھا اور تفسیر بیان کردی کہ: سهماً له وسهمين لفرسه، اور راوی کا فہم کسی کے یہاں بھی حجت نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کا مشہور قول ہے: العبرة بما روى لا بما رأى .

(۶) اس باب میں دو متعارض قسم کی حدیثیں جمع ہوگئیں اور جب روایات میں باہم تعارض ہوجائے تو قیاس کی طرف رجوع کیا جائے گا، لہٰذا یہاں بھی ہم قیاس ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ گھوڑے کو بھی ایک ہی حصہ ملے کیونکہ مجاہد اصل ہے اور فرس آلہ جہاد یعنی فرع ہے اور مجاہد کے تابع ہے اس لیے کہ بغیر گھوڑے کے جہاد ہوسکتا ہے لیکن بغیر مجاہد کے جہاد نہیں ہوسکتا، اور اصل کو فرع اور تابع پر فضیلت ہوتی ہے اب اگر فرس کو دو حصے دیئے جائیں اور مجاہد کو ایک حصہ دیا جائے تو یہ اصل پر فضیلت دینا ہوا جو قیاس کے خلاف ہے۔

(بذل:۴/۴۴،اوجز المسالک:۴/۷۸،مرقاۃ:۸/۳۰)

احناف کی دلیل پر اعتراض

احناف کی سب سے قوی ترین دلیل حضرت مجمع بن جاریہ کی حدیث ہے، لیکن اس حدیث پر چار زبردست اعتراضات کیے جاتے ہیں، ہم اولاً ان اعتراضات کو نقل کرتے ہیں اس کے بعد ان کے معقول جوابات ذکر کریں گے۔

پہلا اعتراض

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ مجھے مجمع بن جاریہ کی روایت نقل کرنے میں وہم ہورہا ہے کہ فارسوں کی تعداد تین سو تھی یا دو سو تھی۔

دوسرا اعتراض

ابن قطان فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں یعقوب بن مجمع بن یزید مجہول ہیں، اس لیے کہ یعقوب سے صرف ان کے بیٹے مجمع نے ہی روایت کی ہے۔

تیسرا اعتراض

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجمع بن جاریہ مجہول ہیں۔

چوتھا اعتراض

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت شاذ ہے کیونکہ دوسری روایات میں اہل حدیبیہ کی تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) ہے اور اس روایت میں پندرہ سو (۱۵۰۰) ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب

امام ابوداؤدؒ نے جو جرح کی ہے وہ جرح مبہم ہے اور اس کی کوئی دلیل امام ابوداؤد کے پاس نہیں ہے لہٰذا یہ قابل اعتبار نہیں۔ (الرفع والتکمیل،ص:۷)

دوسرے اعتراض کا جواب

ابن قطان کا یعقوب بن مجمع بن جاریہ کو مجہول کہنا ان کا اپنا وہم ہے، کیونکہ ''تہذیب الکمال'' میں یعقوب کے تین شاگردوں کا تذکرہ موجود ہے۔(۱) مجمع جو ان کے بیٹے ہیں، (۲) ابراہیم بن اسمٰعیل، جو یعقوب کے بھتیجے ہیں، (۳) عبدالعزیز بن عبید، جو ایک ثقہ راوی ہیں۔

اور یہ ایک قاعدہ ہے کہ جب کسی راوی سے دو یا تین راوی روایت کریں تو اس کی جہالت عینی ختم ہو جاتی ہے، نیز حافظ بن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یعقوب ''مقبول'' راوی ہیں، اس کے علاوہ ''الکاشف'' میں لکھا ہے: وُثِقَ بِہٖ، لہٰذا اس سے ان کا ثقہ ہونا بھی معلوم ہوگیا، اس کے باوجود ابن قطان کا ان کو مجہول کہنا ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

ویسے بھی ابن قطان کا شمار متشددین میں ہے، اور یہ ہر اس راوی کو مجہول کہہ دیتے ہیں جس کی اس کے معاصر نے توثیق نہ کی ہو، اس لیے ان کی بات کا یہاں پر کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ (الرفع والتکمیل، ص:۱۲)

تیسرے اعتراض کا جواب

امام شافعیؒ کا بھی مجمع بن جاریہ کو مجہول کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ حافظ بن حجرؒ نے ان سے روایت کرنے والے چھ افراد کا نام ذکر کیا ہے۔(۱) یونس بن محمد (۲) یحییٰ بن حسان (۳) اسمٰعیل بن ابی اویس (۴) قعنبی (۵) قتیبہ (۶) محمد بن عیسیٰ، تو جس راوی سے اتنے آدمی روایت کریں وہ کیسے مجہول ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ''تہذیب الکمال'' میں بھی ان سے روایت کرنے والے کئی حضرات بیان کیے ہیں، مثلاً: (۱) یحییٰ ابو حاظی، (۲) اسمٰعیل بن ابی اویس (۳) یونس المؤدب، (۴) قعنبی (۵) ابو عامر عقدی، معلوم ہوا کہ مجمع بن جاریہ مجہول نہیں بلکہ معروف ہیں۔

علاوہ ازیں ابن سعد نے ان کو ثقہ کہا ہے، یحییٰ بن سعید قطان نے ثقہ کہا ہے حاکم مستدرک میں ان کی حدیث کو "حَدِیثٌ کبیر" کہا گیا ہے، یحییٰ بن معین نے "لیس بہ بأس" کہا ہے، اور بھی کئی حضرات نے ان کی توثیق کی ہے لہٰذا یہ ثقہ بھی ہیں، اب ان کے معروف وثقہ ہونے کے بعد مجہول کہنا درست نہیں ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب

امام بیہقیؒ کا بھی اس حدیث کو شاذ کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اہل حدیبیہ کی تعداد کے سلسلے میں چار مشہور قول ہیں: (۱) ۱۳۰۰، (۲) ۱۴۰۰، (۳) ۱۵۰۰، (۴) ۱۶۰۰، ان اقوال میں تطبیق اس طرح دی جاتی ہے کہ جب شروع میں روانہ ہوئے تو ان کی تعداد تیرہ سو (۱۳۰۰) تھی اس کے بعد چلتے رہے اور لوگ پیچھے سے آتے رہے اور تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) ہوگئی۔ پھر نکلنے والے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور لوگ مستقل آتے رہے حتیٰ کہ تعداد پندرہ سو ہوگئی یا

اس سے بھی کچھ زائد ہوگئی، اب جن لوگوں نے شروع کا اعتبار کیا انھوں نے تیرہ سو (۱۳۰۰) بیان کردیا اور جن لوگوں نے اس کے بعد کا اعتبار کیا انھوں نے چودہ سو (۱۴۰۰) اور پندرہ سو (۱۵۰۰) بیان کردیا۔ اور بعض حضرات نے سولہ سو (۱۶۰۰) ذکر کردیا، لیکن چونکہ ۱۶۰۰ سے کم تھے اور پندرہ سو سے زائد تھے اس لیے جنھوں نے کسر کو جوڑا تو ۱۶۰۰ ذکر کردیا اور جنھوں نے کسر کا اعتبار نہیں کیا انھوں نے ۱۵۰۰ ذکر کردیا۔

حافظ بن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد پندرہ سو پچیس (۱۵۲۵) تھی، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصل تعداد تو پندرہ سو تھی لیکن ۲۵ غلام تھے جن کا بعض حضرات نے شمار کیا اور بعض نے نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے کہ حافظ بن حجرؒ کی بتلائی ہوئی تعداد ہی زیادہ صحیح ہے، اس سے تمام روایات میں تعارض بھی باقی نہیں رہتا۔

(مسئلہ مذکورہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: بذل المجہود: ۴/۴۶، اوجز المسالک: ۴/۷۸، مرقاۃ: ۸/۳۰، ہدایہ: ۲/۵۷۰، فتاویٰ شامی: ۶/۲۳۸، تکملہ فتح الملہم: ۳/۱۱۴، اعلاء السنن: ۱۲/۱۵۸، بحر الرائق: ۵/۱۴۸، ان میں بھی سب سے شاندار اور مفصل بحث اعلاء السنن میں ہے)

﴿بَاب ما جاء في النفل﴾

نفل دینے کا بیان

۸۷ ﴿حَدَّثَنا وهبُ بنُ بَقِيَّةَ قالَ أنا خالدٌ عَنْ داوُدَ عَن عِكْرمةَ عَنْ ابنِ عبّاسٍ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يَوْمَ بدرٍ: مَنْ فَعَلَ كذا و كذا فَلَهُ مِنَ النَفَلِ كَذَا وَكَذَا، قال: فتَقَدَّمَ الفِتْيَانُ ولزِمَ المَشْيَخَةُ الرايَاتِ، فَلَمْ يَبْرَحُوْهَا، فلمّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قالتِ المشيخةُ: كُنَّا رِدْءً لكُمْ، لَوْ انْهَزَمْتُمْ فِئْتُمْ إلَيْنَا، فلاَ تَذْهَبُوْنَ بالمَغْنَم وَنَبْقِيْ، فأبى الفِتْيَانُ، فقالوا: جَعَلَهُ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم لَنَا، فأنْزَلَ الله تعالى: "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الأَنْفَالِ قُلِ الأنْفَالُ لِلّٰه وَالرَّسُوْلِ (إلى قوله) كما أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بالحَقِّ وَ إنَّ فَرِيْقًا مِنَ المُؤمِنِيْنَ لكَارِهُوْنَ" يقولُ: فكان ذلك خيرًا لَهُمْ، فكذلك أيضًا فأطيعُوْنِيْ فإنّي أعْلَمُ بعاقبةِ هذا مِنْكُمْ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا: جو یہ کام کرے اس کے لیے یہ یہ انعام ہے، اس پر نوجوان حضرات آگے بڑھے اور بوڑھے لوگ جھنڈوں کے پاس رہے اور وہاں سے نہیں ہٹے، جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح سے سرفراز فرمایا تو ان بوڑھے لوگوں نے (نوجوانوں سے) کہا کہ ہم تمہارے مددگار اور پشت پناہ تھے، اگر تم کو شکست ہوتی تو تم ہماری طرف ہی لوٹتے اس لیے ہمیں

محروم کر کے سارا مال غنیمت نہ لے جاؤ، نوجوانوں نے مال دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ مال ہمارے لیے ہی متعین کر دیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "یسئلونك عن الأنفالِ الخ" یعنی اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ نفل اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے... جیسا کہ پروردگار نے تم کو حق کے ساتھ گھر سے نکالا جب کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس کو برا سمجھ رہی تھی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے یہ ہی بہتر ہوا، اسی طرح تم میری اطاعت کرو اس لیے کہ میں اس کے انجام کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔

تشریح مع تحقیق: فِتیَان فتی کی جمع ہے بمعنی نوجوان۔

المَشِیخَةُ شیخ کی جمع ہے بمعنی عمر رسیدہ۔

الرایات رأیة کی جمع ہے بمعنی جھنڈا، وہ علامت جو پہچان کے لیے لگائی جاتی ہے، "الرأیہ" کی کنیت "ام الحرب" آتی ہے۔

رِدْءٌ ج ارداء: مددگار۔

فِتَنُم (ض) بمعنی لوٹنا۔

اَنفَالُ نفل کی جمع ہے بمعنی زیادتی، ہبہ، غنیمت کو بھی نفل کہتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے عطیہ اور ہبہ ہے۔

نفل کی اقسام

اس باب سے پہلے بھی نفل کی ایک خاص قسم یعنی سلب کا بیان گزرا ہے، لیکن نفل سے مراد یہاں سلب نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ امام کسی کی اچھی کارکردگی کی وجہ سے اس کو کچھ اس کے اصل حصے سے زائد دے دے، دراصل نفل کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) امام اعلان کر دے: مَنْ قَتَلَ قَتِیلاً فَلَهٗ سَلَبُهٗ، اس نفل کو سلب سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا حکم ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

(۲) امام کوئی لشکر روانہ کرے پھر اس لشکر میں سے چند آدمیوں کو دوسری جگہ لڑنے کے لیے بھیج دے--- جس کو اصطلاح میں سریہ کہتے ہیں--- اب ان چند آدمیوں کو مال غنیمت حاصل ہوا تو یہ سارا مال اصل لشکر کا ہی ہے لیکن جو لوگ اس لشکر سے نکل کر دوسری جگہ امام کے حکم سے چلے گئے تھے ان کی محنت زیادہ ہے اس لیے امیر لشکر کو چاہیے کہ ان لوگوں کو ان کے اصل حصہ سے زائد دیدے، اس قسم کا بیان آئندہ صفحات پر بالتفصیل آئے گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے جنگ میں بہت زیادہ بہادری دکھلائی تو امام کو چاہیے کہ اس کی اس حسن کارکردگی پر اس کو اس کے اصل حصہ سے کچھ زائد دیدے، اس باب کے تحت یہ ہی بیان کرنا مقصود ہے، اگرچہ ضمناً سلب کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

حدیث باب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جنگ بدر میں یہ اعلان فرمایا کہ: من قتل قتيلاً فلهٗ سَلَبُهٗ یعنی جو شخص کسی کافر کو قتل کردے تو اس مقتول کافر کا سامان قاتل کو دیا جائے گا، اس اعلان کو سن کر نوجوان صحابہؓ اٹھے اور کفار سے قتال شروع کر دیا، اور جو لوگ بوڑھے تھے انھوں نے جھنڈے کو سنبھالا اور حضور ﷺ کی خدمت میں ہی رہے تاکہ آپ ﷺ پر کوئی حملہ نہ کردے، ایک جماعت مالِ غنیمت کو اکھٹا کرنے میں مشغول ہوگئی، اب یہ کل تین جماعتیں ہوگئیں، جب جنگ ختم ہوگئی تو ان تینوں جماعتوں میں اختلاف ہوگیا، جو قتال کرنے والے تھے انھوں نے کہا کہ ہم نے قتال کیا ہے لہٰذا ہم ہی اس مال کو لیں گے، دوسری جماعت جو جھنڈا پکڑے ہوئے تھی اس نے کہا کہ اس غنیمت کے ہم زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی ہے اور ہم ہی نے اسلام کا جھنڈا اٹھایا ہے، تیسری جماعت نے کہا کہ ہم نے مال غنیمت کو اکٹھا کیا ہے لہٰذا اس مال کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس اختلاف کی وجہ سے بڑی پریشانی سامنے آئی، حضور ﷺ وحی کا انتظار فرما ہی رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوگئی: يسئلونك عن الأنفال کہ صحابہ آپ سے مال غنیمت مانگ رہے ہیں "قل الأنفال لله والرسول" یہ اعلان فرمادیجئے کہ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے یعنی اللہ کے حکم سے اس کے رسول کو اختیار ہے کہ جس کو جتنا چاہیں دیں، تم میں سے کسی کو اختیار نہیں ہے۔ "فاتقوا الله واصلحوا ذات بينكم" اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرلو یعنی غنیمت کے بارے میں اختلاف نہ کرو، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی پانچ صفات ذکر فرمائیں، پھر ارشاد فرمایا: كما أخرجك ربك من بيتك الخ" یعنی بعض صحابہ اس حکم کو ایسے ہی ناگوار سمجھ رہے ہیں جیسا کہ آپ کے جنگ کے لیے نکلتے وقت جنگ کرنے کو ناگوار سمجھ رہے تھے، لیکن ان صحابہؓ نے اپنے ناچاہنے پر عمل نہیں کیا بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نکلنے کو قبول فرمالیا اور فتح نصیب فرمائی، ایسے ہی اگر اب یہ صحابہ آپ ﷺ کی تقسیم پر راضی ہوجائیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب آپ ﷺ مدینے سے روانہ ہوئے تاکہ ابوسفیان کے قافلہ سے مال غنیمت حاصل کرلیں، لیکن جب آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ وادی ذفران میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابوسفیان تو ساحلی کنارے سے ہو کر نکل گیا ہے اور کفار لڑنے کے لیے آرہے ہیں تو اس وقت آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ کیا کریں، اس وقت کچھ صحابہ نے جواب دیا کہ ہم تو ابوسفیان کے قافلے کے لیے آئے تھے اس لیے یارسول اللہ آپ دشمن کو چھوڑ دیجئے، اور اب مدینے واپس چلئے، ان صحابہ کی رائے پر آپ ﷺ کبیدہ خاطر ہوئے، جب حضرت ابوبکرؓ کو آپ ﷺ کی اس حالت کا علم ہوا تو فوراً لڑنے کے لیے تیار ہوگئے، اس کے بعد انصاری صحابہؓ کھڑے ہوئے اور لڑنے کے لیے تیار ہوگئے، حاصل یہ ہے کہ شروع میں یہ لوگ لڑنے کو اچھا نہیں سمجھ رہے تھے، لیکن انھوں نے پھر بھی حضور ﷺ کی اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے نتیجے میں غنیمت عطا فرمائی، ایسے ہی اب تقسیم غنائم میں حضور ﷺ کی اتباع

اور آپ کی اطاعت ہوگی تو اس میں بھی خیر ہی خیر ہوگی فاطیعوني فإني أعلم بعاقبة هذا سے حضور ﷺ یہ ہی ارشاد فرمارہے ہیں۔ واللہ اعلم

۸۸ ﴿حَدَّثَنا زِيادُ بنُ أَيُّوبَ نَا هُشَيْمٌ قال نا داوٗد بنُ أبي هِنْدٍ عن عِكرمةَ عن ابنِ عبّاسٍ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال يومَ بدرٍ: مَنْ قَتَلَ قتيلاً فلَهُ كذا و كذا، ومن أَسَرَ أسِيرًا فلَهُ كذا و كذا، ثم سَاقَ نحوَهُ، وحديثُ خالدٍ أَتَمّ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے اس کو یہ انعام ہے، اور جو شخص کسی کافر کو قید کرے اسکو یہ انعام ہے پھر پہلی حدیث کی طرح ہی حدیث بیان کی، مگر خالد کی (پہلی والی) حدیث اس (دوسری) حدیث سے مکمل ہے۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث کا مطلب بھی یہ ہی ہے کہ حضور ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا من قتل قتيلاً فلهٗ سلبه، ومن أسر أسيراً فله كذا و كذا یعنی جو کسی کو قتل کرے اس کو اتنا اتنا مال اور جو کسی کافر کو قید کر کے لائے اس کو اتنا اتنا مال دیا جائے گا۔

اس پر یہ ہی اشکال ہوتا ہے کہ غنیمت تو بدر کے موقع تک حلال نہیں ہوئی تھی، پھر آپ ﷺ نے یہ اعلان کیسے فرمایا؟ اس کا جواب گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے غنیمت کو ضرور حلال فرمائے گا، اور حلال ہونے کے قرائن بھی موجود تھے۔ یعنی "حرّض المؤمنين على القتال" اور تحریض تو کسی چیز ہی پر ہوتی ہے اس لیے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری امید تھی، اور ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی جنگ میں غنیمت کو امت محمدیہ کے لیے حلال بھی فرمادیا۔

۸۹ ﴿حَدَّثَنا هَارُوْنُ بنُ محمدِ بنِ بكّارِ بنِ بلالٍ قال نا يَزِيْدُ بنُ خالِد بنِ مَوْهَبٍ الهَمْدَانيُّ، قال نا يحيىٰ ابنُ أبِيْ زائِدَةَ قال نَا دواوٗدُ بهذا الحديثَ بإسنادِهٖ، قال: قَسَّمهَا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بالسَّوَاءِ وحَديثُ خَالِدٍ أَتَمُّ﴾

ترجمہ: یحیٰ بن ابی زائدہ کہتے ہیں کہ ہم سے داوٗد نے اسی سند سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے بدر کی غنیمت کو برابر برابر تقسیم کیا، اور خالد کی (پہلی) حدیث پوری ہے۔

تشریح مع تحقیق: یہ حدیث شریف بھی مختصر ذکر کردی گئی ہے جب کہ یہی حدیث حضرت خالد سے مفصلاً ذکر کی جاچکی ہے، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب آیت "قل الأنفال لله والرسول" نازل ہوئی اور صحابہ میں اس سے پہلے اختلاف ہو چکا تھا، تو اس آیت کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے مال غنیمت سب برابر برابر تقسیم فرمادیا۔ (بذل:۴/۴۷)

۹۰ ﴿حَدَّثنا هنادُ بنُ السريُّ عَنْ أبي بكرٍ عَنْ عاصِمٍ عن مُصْعَبِ بنِ سَعْدٍ عَنْ أبيه قال: جئتُ إلى النبي صلى الله عليه وسلم يَوْمَ بدرٍ بسَيفٍ، فقلتُ: يا رسول الله إنّ اللّٰهَ قد شَفٰى صَدْرِيْ اليومَ مِنَ العَدُوِّ، فهَبْ لي هَذا السَّيفَ، قال: إنّ هذا السيفَ لَيسَ لِي وَلاَ لَكَ، فذهبتُ وأنا أقول : يُعْطَاهُ اليومَ مَنْ لَمْ يَبْلِ بَلاَئِيْ، فَبَيْنَا أنَا إذ جَاءَ نِي الرسولُ فقال : أجِبْ، فظننتُ أنّه نَزَلَ فيَّ شيءٌ بِكلامِيْ، فجئتُ، فقال لي النبيُّ صلى الله عليه وسلم : إنَّكَ سَألتَنِيْ هذا السيفَ وليس هو ليْ ولاَ لكَ، وإنَّ اللّٰه قَدْ جَعَلَهُ لِيْ فهو لَكَ، ثم قَرَأَ "يَسْئَلُونَكَ عَنِ الأَنْفَالِ قُلِ الأَنفَالُ للّٰهِ والرّسُولِ . إلى آخر الآية" قال أبو داؤد: قراءةُ بنِ مسعودٍ "يَسْئَلُوْنَكَ النفْلَ"﴾

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں بدر کے دن حضور ﷺ کے پاس ایک تلوار لے کر آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آج اللہ تعالیٰ نے دشمن سے میرے سینہ کو ٹھنڈا کر دیا، آپ یہ تلوار مجھے ہدیہ فرما دیجئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تلوار نہ تمہاری ہے اور نہ میری ہے، یہ سن کر میں چلا گیا، اور (دل ہی دل میں) کہنے لگا کہ آج یہ تلوار اس شخص کو ملے گی جو میری طرح نہیں آزمایا گیا، اچانک آپ ﷺ کی طرف سے ایک قاصد مجھے بلانے کے لیے آیا اور کہا کہ چلئے! میں نے خیال کیا کہ شاید میرے اس کہنے کی وجہ سے میرے بارے میں کچھ نازل ہوا ہے، جب میں حضور ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ سے یہ تلوار مانگی تھی جب کہ یہ نہ تو تمہاری ہی تھی اور نہ میری۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ تلوار مجھے دیدی، پس یہ تمہارے لیے ہے؛ اس کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "يَسْئَلُونَكَ عَنِ الأَنفَالِ قُلِ الأَنفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ الخ" امام ابوداؤد نے کہا کہ عبداللہ بن مسعود کی قرأت "يَسْئَلُونَكَ النفْلَ" ہے۔

تشریح مع تحقیق :اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ سعد بن ابی وقاصؓ نے جنگ بدر میں پوری طاقت کا مظاہرہ کیا، کفار کی جماعت میں گھس کر ان کو قتل کیا، لڑائی ختم ہونے کے بعد کافروں سے چھینی ہوئی ایک تلوار لے کر آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تلوار تو آپ مجھے ہدیہ کر دیجئے، چونکہ ابھی تک غنیمت کے بارے میں کوئی حکم شرعی نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو یہ تلوار ابھی کسی کی نہیں ہے میں بھی اس کا مالک نہیں، تم کو کیسے دیدوں؟ حضرت سعد بن وقاص واپس چلے گئے، اور یا تو زبان سے ہی آہستہ آہستہ کہہ رہے ہوں یا دل دل میں کہہ رہے ہونگے کہ یہ تلوار آج کسی ایسے شخص کو دی جائے گی جس نے میری طرح بہادری نہ کی ہو۔

ابھی حضرت سعد بن ابی وقاص سوچ ہی رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کا ایک قاصد حاضر ہوا اور حضرت سعد کو بلا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے گیا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب اس تلوار کے بارے میں حکم خداوندی نازل

ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا مالک مجھے بنا دیا ہے لہٰذا میں یہ تلوار تمہیں دیتا ہوں، اور پھر حضور اکرم ﷺ نے نازل شدہ آیات کو تلاوت فرمایا۔

حاصل یہ ہے کہ بدر سے پہلے غنیمت حلال نہیں تھی بلکہ بدر میں ہی غنیمت کو حلال کیا گیا، روایت مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل دینے کا اختیار اب امام کو ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ان کی حسن کارکردگی پر تلوار بطور نفل دی۔

قال أبو داؤد : یہاں سے امام ابوداؤدؒ دو قراءتوں کا اختلاف بیان فرمارہے ہیں، کہ جمہور کی قرأت لفظ "عن" کے ساتھ ہے یعنی "يسئلونك عن الأنفال" اور اس صورت میں معنی یہ ہونگے کہ صحابہ آپ سے نفل کا حکم پوچھتے ہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرارت بغیر لفظ "عن" کے ہے یعنی "يسئلونك الأنفالَ" اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ آپ سے نفل مانگ رہے ہیں، امام ابوداؤدؒ کا مقصد یہ بتلانا نہیں ہے کہ ابن مسعودؓ "انفال" کی جگہ "نفل" واحد کا صیغہ پڑھتے ہیں کیونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قرارت بھی جمع کے صیغہ کے ساتھ ہی ہے جیسا کہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کان أصحاب عبدالله يقرأونها "يسئلونك الأنفال" معلوم ہوا کہ یہ اختلاف جمع اور واحد کا نہیں ہے بلکہ لفظ "عن" کا اختلاف ہے۔ (بذل: ۴/۴۸)

ترجمة الباب : إنَّ اللّٰه قَدْ جَعَلَهُ لِي فهو لَكَ سے ترجمۃ الباب ثابت ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو یہ تلوار بطور نفل ہی دی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

﴿بَاب في النفل للسرية تُخْرَجُ من العسكر﴾

لشکر سے نکلے ہوئے دستے کو نفل دینے کا بیان

٩١ ﴿حَدَّثَنا عبدُ الوهابِ بنُ نجدةَ نا ابنُ مُسْلِمٍ ح و نا موسىٰ بنُ عبدِ الرحمن الأنْطاكيُّ قال نا مُبَشِّرٌ ح و نا محمدُ بنُ عوفٍ الطَّائِي أنَّ الحكَمَ بنَ نافعٍ حَدَّثَهم المعنىٰ كلّهم عن شعيبِ بنِ أبي حَمْزَةَ عن نافعٍ عن ابنِ عُمَرَ قال : بَعَثَنا رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم في جيشٍ قِبَلَ نجدٍ، وانْبَعَثَ سريةٌ مِن الجيشِ فكانَ سُهْمَانُ الجَيْشِ اثْنَيْ عَشَرَ بعيرًا، اثني عشر بعيرًا، و نَفَّلَ أهلَ السَّرِيَّةِ بَعِيْرًا بَعِيْرًا؛ فكانَتْ سُهْمانُهم ثلثةَ عَشَرَ ثلثةَ عَشَرَ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم کو حضور ﷺ نے نجدہ کی طرف ایک لشکر میں بھیجا، اور ایک ٹکڑے کو اسی لشکر میں سے (دشمن سے لڑنے کے لیے) بھیجا پھر لشکر کے لوگوں کو بارہ بارہ اونٹ ملے اور ٹکڑے کے لوگوں کو ایک ایک زیادہ ملا، جس سے ان کے حصہ میں تیرہ اونٹ ہو گئے۔

تشریح مع تحقیق: سَرِيَّةٌ جمع سرایا آتی ہے۔ وہ دستہ جو بڑے لشکر سے نکال کر دشمن کی طرف بھیج دیا جائے، اور پھر اس دشمن سے لڑنے کے بعد لشکر میں آ کر ہی مل جائے۔

امام ابوداؤدؒ اس باب کو قائم کر کے یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ دارالاسلام سے کوئی فوج نکلی، اس میں سے کوئی سریہ دوسری طرف بھیج دیا، اب یہ سریہ وہاں سے کچھ غنیمت لے کر آیا تو اس مال غنیمت میں سریہ اور دوسری فوج شامل ہوگی، البتہ امیر جیش کو چاہیے کہ اس سریہ کو بطور نفل کچھ مال دیدے۔

باب کی اس حدیث میں اسی طرح کے ایک سریہ کے بھیجنے کا ذکر ہے کہ شعبان ۸ ہجری میں فتح مکہ سے پہلے حضور ﷺ نے ایک سریہ قبیلۂ غطفان کی طرف بھیجا تھا جو پندرہ (۱۵) افراد پر مشتمل تھا، اس کے امیر حضرت ابوقتادہؓ تھے، حضور ﷺ نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ جاؤ اور بنوغطفان پر اچانک حملہ کر دینا، چنانچہ اس سریہ والوں نے جا کر اس قبیلہ والوں کا احاطہ کر لیا، ان میں سے بڑے بڑے سرداروں کو تو قتل کر دیا، اور دوسو اونٹ اور دو ہزار بکریاں غنیمت میں حاصل ہوئیں جب یہ لوگ وہاں سے لوٹے تو آپ ﷺ نے اس مال کو سریہ والوں اور لشکر والوں سب کو تقسیم کر دیا، ہر ایک کو بارہ بارہ اونٹ حصے میں ملے، پھر نبی اکرم ﷺ نے سریہ والوں کو ایک ایک اونٹ اور دیا جس کی وجہ سے ان کے پاس تیرہ تیرہ اونٹ ہو گئے۔

دو اشکال اور ان کے جواب

پہلا اشکال: تمام اہل سیر کہتے ہیں کہ اس سریہ کو غنیمت میں دوسو اونٹ اور دو ہزار بکریاں ملی تھیں — جیسا کہ روایت کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے — لیکن علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ لشکر کی تعداد چار ہزار تھی اور اہل سریہ کی تعداد پندرہ تھی کل چار ہزار پندرہ افراد ہوئے، اور اونٹوں کی تعداد دوسو (۲۰۰) ہو تو اتنے افراد پر یہ ۲۰۰ اونٹ بارہ بارہ کیسے تقسیم ہو سکتے ہیں؟

جواب: دوسو اونٹ اور دو ہزار بکریاں تو صرف سریہ والے لائے تھے اس کے علاوہ اہل لشکر نے بھی بہت سی غنیمت حاصل کی تھی سب کو ایک جگہ ملا کر ہی تو تقسیم کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے بارہ بارہ اونٹ ہر ایک شخص کو ملے تھے، لیکن یہ تاویل اسی وقت صحیح ہوگی جب کہ یہ مان لیا جائے کہ یہ روایت محفوظ ہے ورنہ تو صحیح روایات سے یہ ہی ثابت ہے کہ یہ تقسیم صرف اہل سریہ پر ہوئی تھی، لشکر کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جیسا کہ امام مالکؒ کی روایت سے بھی

معلوم ہوتا ہے۔ (بذل:۴/۴۹)

دوسرا اشکال : اس روایت سے معلوم ہوا کہ سریہ والوں کو خود حضور ﷺ نے ایک ایک اونٹ بطور نفل دیا تھا، اور آگے ابن اسحاق کی روایت ہے کہ یہ نفل حضور ﷺ نے نہیں دیا بلکہ خود امیر لشکر نے یہ نفل دیا تھا، حضور کی طرف نسبت کرنا صحیح نہیں ہے۔

جواب : اصل میں نفل تو امیر لشکر نے ہی دیا تھا، لیکن حضور ﷺ نے اس کو باقی رکھا اور امیر کی اس تنفیل کو باطل نہیں کیا؛ تو جس روایت میں حضور ﷺ کی طرف نسبت ہے وہ باقی رکھنے کی حیثیت سے ہے کیونکہ کسی چیز کو باقی رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کو کرنے والا، فقہی قاعدہ ہے: يُستدام الاستدامةُ كالإنشاء.

اور جس روایت میں امیر کی طرف نسبت ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے ہے، اس جواب کی تائید حضرت ابن عمرؓ کی راویت سے ہوتی ہے وہ کہتے ہیں: لم يغيره رسول الله صلى الله عليه و سلم (بذل:۴/۴۹)۔

ترجمة الباب : نفل أهل السرية بعيرًا بعيرًا سے ثابت ہو رہا ہے۔

۹۲ ﴿حَدَّثَنَا الوليدُ بنُ عُتْبَةَ الدمشقيُّ قال قال الوليدُ يعني ابنَ مسلمٍ حدثتُ ابنَ المباركِ بهذا الحديثِ، قُلْتُ و كذا حدثنا ابنُ أبي فَرْوَةَ عن نافعٍ قال : لا يَعْدِلُ مَنْ سَمَّيْتَ بمالكٍ هكذا أو نحوهُ يعني مالكِ ابنِ أنسٍ.﴾

ترجمہ: امام ابوداوٗدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ولید بن عتبہ دمشقی نے بیان کیا کہ ولید بن مسلم نے کہا کہ میں نے اس حدیث کو ابن مبارک کے سامنے بیان کیا تو ابن مبارک نے کہا کہ جن کا نام تم نے لیا ہے وہ مالک بن انس کے برابر نہیں، یا اس طرح کا اور کوئی جملہ کہا۔

تشریح مع تحقیق :امام ابوداوٗدؒ اس سند کو ذکر کر کے ایک بہت اہم بات بیان فرما رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نافع سے روایت کرنے والے کئی آدمی ہیں اور ان سب کی روایت میں تعارض ہوتا ہے، اب کس کی روایت کو ترجیح دی جائے، اس لیے یہاں امام ابوداوٗد نے تین سندیں ذکر کی ہیں۔

(۱) وليد بن مسلم عن شعيب بن أبي حمزة عن نافع عن ابن عمر ...

(۲) وليد بن مسلم عن ابن أبي فروة عن نافع عن ابن عمر ...

شعیب بن ابی حمزہ اور ابن ابی فروہ دونوں حضرات نافع سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جیش کو روانہ کیا، اور اس جیش میں سے ایک سریہ بھیجا یہ سریہ غنیمت لے کر آیا، اس غنیمت کو جیش اور سریہ دونوں پر تقسیم کر دیا گیا، اہل جیش کو ۱۲/۱۲ حصے ملے اور اہل سریہ کو ۱۳/۱۳ حصے ملے۔

(۳) تیسری سند یہ ہے: قال مالك عن نافع عن ابن عمر ... یہ امام مالک کی سند ہے، اب نافع سے

روایت کرنے والے تین حضرات ہو گئے۔

(۱) شعیب بن ابی حمزہ، (۲) ابن ابی فروہ، (۳) امام مالک۔ امام مالکؒ کی روایت اول الذکر دونوں راویوں کے خلاف ہے کیونکہ امام مالکؒ کی روایت میں نہ جیش کا ذکر ہے اور نہ ہی جیش میں سے سریہ کو بھیجنے کا ذکر ہے بلکہ امام مالکؒ کی روایت میں صرف سریہ کو بھیجنے اور اس کو ہی حصہ دینے کا ذکر ہے۔

اب اصل عبارت سمجھئے کہ ولید بن مسلم نے یہ کہا کہ مجھ سے میرے استاذوں یعنی شعیب اور ابن ابی فروہ نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک جیش بھیجا پھر اس میں سے ایک سریہ بھیجا، اس کے بعد سریہ غنیمت لایا، اور جیش کو ۱۲/۱۲ اونٹ ملے، سریہ والوں کو ۱۳/۱۳ اونٹ ملے، اس پر ابن مبارک نے یہ کہا کہ شعیب اور ابن ابی فروہ امام مالک کے درجہ کے نہیں ہیں، کیونکہ امام مالک ان دونوں سے احفظ اور اتقن ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالک کے موافق لیث، عبید اللہ اور برد بن سنان وغیرہ کی روایت بھی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابن ابی فروہ ضعیف بھی ہیں لہٰذا متابع بننے کے لائق ہی نہیں، لہٰذا یہ ثقہ اور اوثق کی مخالفت ہوگئی، اس لیے ابن مبارک نے امام مالکؒ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ (بذل: ۴/۴۹)

۹۳ ﴿حَدَّثَنا هَنَّادٌ نَا عَبْدَةُ عَنْ محمد يعني ابنَ إسحٰق عَنْ نافعٍ عن ابنِ عمرَ قال: بَعَثَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم سَرِيَّةً إلى نجدة، فخرجتُ معها، فأصبْنا نعمًا كثيرًا، فنَفَّلَنا أميرُنا بَعِيرًا بَعِيرًا لكلّ إنسانٍ، ثم قدِمْنا علىٰ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فقَسَّم بَيْنَنا غنيمتَنا، فأصابَ كلَّ رجلٍ منّا اثنى عَشَرَ بعيرًا بَعْد الخُمسِ، وما حَاسَبَنَا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بالذي أعطَانَا صاحِبُنا، ولا عَابَ عليه ما صَنَعَ، فكان لكلٍّ منّا ثلثة عشر بعيرًا بنفْلِه﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے نجد کی طرف ایک سریہ بھیجا، میں بھی اس سریہ کے ساتھ گیا، ہم نے بہت سے اونٹ پائے، ہمارے سردار نے ہم کو ایک ایک اونٹ بطور نفل دیا، پھر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غنیمت کو ہمارے درمیان تقسیم فرمادیا، ہم میں سے ہر شخص کو خمس نکالنے کے بعد بارہ بارہ اونٹ ملے، اور حضور ﷺ نے اس اونٹ کو شمار نہیں کیا جس کو ہمارے امیر نے ہمیں دے دیا تھا، اور نہ ہی ہمارے امیر کے اس فعل پر کوئی طعن کیا، پس ہم میں سے ہر شخص کو مع نفل کے تیرہ تیرہ اونٹ ملے۔

تشریح مع تحقیق: حَاسَبَهٗ بکذا: بمعنی حساب لینا، شمار کرنا۔
نُعُمًا بمعنی تیز رفتار اونٹنی۔

اس روایت سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اس روایت میں جیش کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس لیے یہ روایت امام مالکؒ کی روایت کی طرح ہے۔ دوسری بات اس روایت سے یہ معلوم ہوئی کہ خمس نکالنے سے پہلے ہی نفل دیا گیا، حالانکہ خمس نکالنے کے بعد نفل دیا جاتا ہے جس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ حاجت شدیدہ میں خمس سے پہلے بھی نفل دینا جائز ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سریہ والوں کے پاس سواری نہ ہو اس لیے خمس سے پہلے ہی نفل دے دیا گیا۔

اس کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن اسحٰق راوی ہیں، جو مدلس ہیں اگرچہ ہمارے اساتذہ کرام فرماتے ہیں کہ حسن درجہ کے راوی ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب یہ لفظ عن سے روایت کرتے ہیں تو ان کی روایت غیر محفوظ ہوتی ہے۔

ترجمة الباب: نفلنا أميرنا بعيراً بعيراً الخ سے واضح ہے۔

۹۴ ﴿حَدَّثَنا عبدُ الله بنُ مَسْلَمَةَ القعنبيُّ عن مالكٍ ح و نا عبدُ الله بنُ مَسْلَمةَ ويَزِيدُ بنُ خالد بنِ موهبٍ قالا نا اللَّيثُ المعنٰى عَنْ نافعٍ عَن عبدِ اللّٰه بنِ عُمر أنّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم بَعَثَ سَرِيَّةً، فِيها عبدُ الله بنُ عَمَرَ قِبَلَ نجدٍ، فَغَنَمُوا إبلاً كثيرةً، فكانَتْ سِهامُهم اثنى عشر بعيرًا، و نُفِّلوا بعيرًا بعيرًا؛ زادَ ابنُ موهبٍ: فلم يغيّرهُ رسولُ الله صلى الله عليه و سلم.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے "نجد" کی طرف ایک سریہ بھیجا، جس میں حضرت ابن عمرؓ بھی شریک تھے، ان کو غنیمت میں بہت سے اونٹ ملے، سریہ والوں کا حصہ بارہ بارہ اونٹ تھے اور پھر ایک ایک اونٹ بطور نفل دیا گیا، ابن موہب نے یہ بات زیادہ لکھی ہے کہ حضور ﷺ نے اس تقسیم کو بدلا نہیں۔

تشریح مع تحقیق: بَعَثَ (ف) روانہ کرنا، بھیجنا۔

اس حدیث کو امام مالکؒ نے شک کے ساتھ نقل کیا ہے کہ بارہ بارہ اونٹ ملے یا گیارہ گیارہ اونٹ، اور صحیح یہ ہی ہے کہ امام مالک اس روایت کو اپنی کتاب میں شک ہی سے روایت کرتے ہیں، ابن مبارک نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، البتہ دوسری روایات کی روشنی میں یہ ہی بات زیادہ صحیح ہے کہ ان حضرات کو بارہ بارہ اونٹ حصے میں ملے تھے۔

ترجمة الباب: ونفلوا بعيرًا بعيرًا الخ سے واضح ہے۔

۹۵ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ نا يحيٰ عن عُبيدِ اللّٰهِ ، حدثني نافعٌ عن عَبْدِ اللّٰهِ قال : بَعَثَنا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم في سَرِيَّةٍ، فبلغَتْ سهمانُنَا اثْنَيْ عَشَرَ بعيرًا، ونفّلنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بعيرًا بعيرًا، قال أبوداؤد : رواه بُردُ بنُ سِنانٍ مثلَهُ عن نافعٍ مثلَ حديثِ عُبيدِ اللّٰه، ورواهُ أيوبُ عن نافعٍ مثلَهُ إلاّ أنَّهُ قال : ونُفِّلنَا بعيرًا بعيرًا، لَم

يَذْكرِ النبيَّ صلى الله عليه وسلم.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم کو حضور ﷺ نے ایک سریہ میں بھیجا، ہم کو بارہ بارہ اونٹ حصہ میں ملے اور حضور ﷺ نے ایک ایک اونٹ نفل کے طور پر بھی دیا۔ امام ابوداؤد نے کہا کہ اس حدیث کو بردبن سنان نے نافع سے عبیداللہ کے مثل ہی نقل کیا ہے اور ایوب نے بھی نافع سے عبیداللہ کے مثل ہی نقل کیا ہے مگر اس میں یہ بھی ہے کہ ایک ایک اونٹ ہم کو زائد ملا، اور حضور ﷺ کا تذکرہ نہیں ہے۔ (یعنی فاعل مذکور نہیں ہے)

تشریح مع تحقیق : قال أبو داؤد : یہاں سے امام ابوداؤدؒ وہ ہی اختلاف بیان فرمانا چاہتے ہیں کہ نفل کس نے دیا اور غنیمت کس نے تقسیم کی. کیونکہ امام مالکؒ کی روایت اور ایوب کی روایت میں فاعل کی صراحت نہیں ہے کہ کس نے نفل دیا؟ اور عبیداللہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے اہل سریہ کو نفل دیا تھا، اس کے برخلاف لیث کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سہام اور نفل حضور نے نہیں دیا بلکہ امیر لشکر نے تقسیم کی اور اس نے ہی سہام دیئے۔ البتہ حضور ﷺ نے اس تقسیم کو برقرار رکھا۔

ہم ماقبل میں ایک جواب لکھ چکے ہیں کہ حضور ﷺ نے امیر کی تقسیم کو ختم نہیں فرمایا بلکہ اس کو باقی رکھا، تو مجازاً آپ ﷺ کی طرف نسبت کردی گئی ہے، یہی ابن اسحاق کی روایت کا حاصل ہے۔

ابن سعد نے کہا ہے کہ امیر نے تو نفل دیا اور حضور ﷺ نے سہام کی تقسیم کی ہے۔ (وهذا تطبيق حسن بين الروايتين)

ترجمة الباب : نُفِلْنَا بعيرًا بعيرًا الخ سے واضح ہے۔

٩٦ ﴿حَدَّثَنا عبدُ الملِك بنِ شُعَيْبِ بنِ اللَّيْثِ قال حَدَّثني أبي عن جَدِّيْ ح و حدَّثنا حجاجُ بنُ أبي يعقوبَ قال حدثني حُجينٌ نا اللَّيْثُ عَنْ عَقيلٍ عَنْ ابنِ شِهَابٍ عَنْ سالمٍ عَنْ عبدِ اللّه بنِ عمرَ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قد كانَ يُنَفِّلُ بعضَ مَنْ يبعث مِن السَّرايا لأنفسِهِمْ خاصةَ النَّفلِ سِوىٰ قِسْم عامةِ الجيش، والخُمُسُ واجبٌ في ذلك كُلِّهِ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ عام لشکر کی تقسیم کے علاوہ خاص طور سے بعض سریہ والوں کو زائد حصہ دیا کرتے تھے، لیکن خمس اس سارے مال سے لیا جاتا تھا۔

تشریح مع تحقیق : حنفیہ کے نزدیک چونکہ اگر امام اعلان نہ کرے کہ خمس کے بعد نفل ہے، تو اصل غنیمت میں سے نفل ہے خمس۔ کر نکالے بغیر، اور اگر اعلان کردیا ہے تو خمس نکالنے کے بعد نفل دیا جائے گا، اس لیے حدیث مذکور بظاہر حنفیہ کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

ہم حنفی مقلد اس کا جواب یہ دیں گے کہ یہ صورت امام کے اعلان کرنے پر محمول ہے کہ مثلاً امام کوئی سریہ بھیجے اور اعلان کردے کہ جو غنیمت تم لیکر آؤ گے اس میں سے خمس کے بعد تم کو ثلث یا ربع دیا جائے گا، لہٰذا اب یہ حدیث ہمارے خلاف نہیں ہوگی۔

ترجمة الباب: قد كان ينفل بعض من يبعث من السرايا سے ثابت ہے۔

۹۷ ﴿حَدَّثَنا أحمد بنُ صالحٍ قال نا عبدُ الله بنُ وَهْبٍ نا حيٌ عَن أبي عبد الرحمن الحبليُ عن عبدِ اللّه بنِ عمرَ انَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم خَرَجَ يومَ بدرٍ في ثلث مائةٍ وخمسةَ عَشَرَ، فقالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: اَللّهم إنَّهُم حُفاةٌ فَاحمِلهُم، اَللّٰهمَّ إنهُم عُراةٌ فاكسِهِم، اَللّٰهُمَّ إنهُم جِيَاعٌ فاشبِعْهُم، ففتَحَ اللّٰهُ لَهٗ يومَ بدرٍ، فانقَلَبُوا حِينَ انقلَبُوا وما مِنهُم رجلٌ إلَّا وقَدْ رَجَعَ بِجَمَلٍ أو جَملين، و اكتَسَوا و شَبِعُوا.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ تین سو پندرہ آدمیوں کے ساتھ روانہ ہوئے، آپ ﷺ نے دعاء فرمائی کہ یا اللہ! یہ لوگ پیدل ہیں ان کو سواری عطا فرما، یا اللہ! یہ لوگ ننگے بدن ہیں ان کو کپڑے دے، یا اللہ! یہ لوگ بھوکے ہیں ان کو کھانا دے۔ (ان کو سیر کردے) پھر اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، اور جب وہ لوگ لوٹے تو ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو ایک یا دو اونٹ نہ لایا ہو، اور ان کے پاس کپڑے بھی ہوگئے اور سیراب بھی ہوگئے۔

تشریح مع تحقیق: حُفَاةٌ (س) ننگے پاؤں چلنا اور حفاة حَافٍ کی جمع ہے بمعنی ننگے پیر۔

عُرَاةٌ ج عارِي بمعنی بدن پر کپڑوں کا نہ ہونا، ننگا ہونا۔

جِيَاعٌ (ن) بھوکا ہونا، یہ جائع کی جمع ہے۔

اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان بدر کی طرف نکلے ہیں تو اسباب کی بڑی قلت تھی کل دو گھوڑے اور ستر (۷۰) اونٹ تھے تلواروں اور زرہوں کی تعداد بھی بڑی کم تھی۔ اکثر لوگ پیدل ہی تھے، اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے دعاء مانگی، یہ دعاء رائیگاں کیسے جاسکتی تھی، خداوند قدوس نے دعاء کو قبول فرمایا اور بے مثال کامیابی اور فتح نصیب فرمائی، حال یہ تھا کہ جب صحابہ کرام کی یہ جماعت واپس آئی تو ہر ایک کے پاس سواری، کپڑے اور دیگر سامان موجود تھا۔

اصحاب بدر کی تعداد: اصحاب بدر کی تعداد میں بہت اختلاف ہے۔

(۱) ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ اصحاب بدر کی تعداد تین سو چودہ (۳۱۴) تھی۔

(۲) مسلم شریف میں حضرت عمر بن الخطابؓ کی روایت ہے کہ ان کی تعداد ۳۱۹ تھی۔
(۳) ابن سعد کی روایت میں تین سو پانچ (۳۰۵) کا ذکر ہے۔
(۴) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ان کی تعداد تین سو پندرہ (۳۱۵) تھی۔
(۵) بزار کی روایت میں تین سو سترہ (۳۱۷) کا ذکر ہے۔

تطبیق : حافظ بن حجر فرماتے ہیں کہ اصل تعداد تین سو پانچ یا چھ تھی، باقی آٹھ اشخاص کو حضور ﷺ نے غنیمت سے حصہ دیا، اس اعتبار سے اصحاب بدر کی تعداد تین سو تیرہ یا چودہ ہو جاتی ہے۔

پھر بدر میں چند ایسے چھوٹے بچے بھی شریک ہوئے جن کو حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی تھی۔ جیسے حضرت برار، ابن عمر اور حضرت انس وغیرہ۔ تو بعض حضرات نے ان کو بھی شمار کر لیا اور تعداد زیادہ بیان کر دی، اس لحاظ سے ساری روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ (بذل:۴/۵۱)

﴿بَاب في من قال الخمس قبل النفل﴾

خمس قبل النفل کے قائلین کا بیان

۹۸ ﴿حَدَّثنا محمد بنُ كثيرٍ حَدَّثنا سفيانُ عَنْ يَزيدِ بْنِ يزيدِ بْنِ جَابِرٍ الشَّامِيِّ عَنْ مَكْحولٍ عن زِيادِ بنِ جارية التَمِيمِيِّ عن حبيبِ بنِ مَسْلَمَةَ الفَهْرِيِّ أَنَّهُ قالَ: كَانَ رسولُ الله صلّى الله عليه وسلم يُنَفِّلُ الثُلُثَ بَعْدَ الخُمُسِ.﴾

ترجمہ: حضرت حبیب بن مسلمہ فہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تہائی غنیمت کو خمس نکالنے کے بعد بطور نفل دیتے تھے۔

تشریح مع تحقیق : اولاً ایک ضابطہ یاد رکھئے کہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک سلب بھی نفل ہی ہے اور امام شافعی و احمد کے نزدیک سلب الگ ایک حق لازم ہے، اور نفل الگ ہے لہٰذا یہاں جس نفل کا ذکر ہے وہ سلب سے الگ ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھئے کہ وہ نفل جو امام کسی شخص کی اچھی کارکردگی کو دیکھ کر دے اس کو خمس نکالنے سے پہلے دیا جائے گا یا بعد میں؟ پھر اربعۃ اخماس میں سے دیا جائے گا یا خمس سے؟ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:
(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک خمس الخمس جو امام کا حصہ ہے اس سے نفل دیا جائے گا۔
(۲) امام مالکؒ کے نزدیک خمس سے نفل دیا جائے گا۔

(۳) امام احمدؒ کے نزدیک اربعۃ اخماس سے نفل دیا جائے گا۔

(۴) امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اگر اعلان کردیا کہ خمس کے بعد نفل دیا جائے گا تو خمس کے بعد ہی دیا جائے گا، ورنہ اصل غنیمت سے دے کر باقی مال کو سب پر برابر برابر تقسیم کردیا جائے گا، اور جس کو نفل دیا ہے اس کو اصل غنیمت سے بھی حصہ دیا جائے گا۔

امام مالک اور امام شافعی کی دلیل

ان دونوں ائمہ کرام نے مؤطا کی ایک روایت کے عموم سے استدلال کیا ہے حدیث یہ ہے: عن أبي الزناد عن سعيد بن المسيب أنه قال: "كان الناس يعطون النفل من الخمس" قال الإمام مالك: وذلك أحسن ما سمعتُ إليّ في ذلك.

امام احمدؒ کی دلیل

ابوداؤد کی ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں: أبو داؤد عن معن بن يزيد السلمي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا نفل إلّا بعد الخمس، (وأيضًا) عن حبيب بن مسلمة أن النبي صلى الله عليه وسلم "نفل الربع بعد الخمس في بدأته ونفل الثلث بعد الخمس في رجعته" یہ دونوں حدیثیں اس بات پر صریح ہیں کہ نفل اربعہ اخماس سے دیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل

عن نافع عن ابن عمر أن النبي صلى الله عليه وسلم بعث سرية قِبَل "نجدٍ" فأصبنا نعمًا كثيرًا فنفلنا أميرنا بعيرًا بعيرًا لكل إنسان، ثم قدمنا على رسول الله صلى الله عليه وسلم فقسم رسول الله صلى الله عليه وسلم غنيمتنا، فأصاب كل رجل منا اثنى عشر بعيرًا بعد الخمس، وما حاسبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بالذى أعطانا صاحبنا ولا عاب عليه ما صنع فكان لكل رجل منا ثلثة عشر بعيرًا بنفله. (ابوداؤد:۲/۳)

مخالفین کے دلائل کا جواب

دونوں فریقوں کی روایات امام کے اعلان کرنے پر محمول ہیں، اور اس جیسی تمام روایات میں یہ ہی تاویل کی جائے گی۔ (شوکانی:۷/۲۳۲، بیروت)

۹۹ ﴿حَدَّثَنا عبيدُ اللّٰهِ بنُ عُمَرَ بنِ مَيْسَرَةَ الجشميُّ قال نا عبدُ الرحمن ابنُ مَهْدِيّ عن

معاويةَ بنِ صالحٍ عَنِ العَلاءِ بنِ الحارِثِ عن مكحولٍ عَن ابنِ جاريةَ عَنْ حبيبِ ابنِ مَسْلمةَ أنّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم كانَ يُنفِّل الرُبُعَ بعد الخُمُسِ والثُلُثَ بَعْدَ الخمسِ إذَا قَفلَ.﴾

ترجمہ: حضرت حبیب بن مسلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خمس نکالنے کے بعد بطور نفل چوتھائی حصہ دیتے تھے اور تہائی حصہ دیتے تھے خمس کے بعد جب جہاد سے واپس ہوتے۔

تشریح مع تحقیق : اس روایت کو سمجھنے کے لیے ایک ضابطہ سنئے، وہ یہ ہے کہ نفل نام ہے امام کا کسی جماعت کو اس کی مشقت اور کوشش کی وجہ سے اس کے حصہ سے زیادہ مال دینا، پھر بعض اوقات میں لڑنا بہت ہی محنت کا کام ہوتا ہے اس میں زیادہ سعی اور زیادہ کوشش کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات میں محنت کم کرنی پڑتی ہے اس لیے امام محنت اور مشقت کو دیکھ کر ہی نفل دیتا ہے۔

حدیث بالا اور دیگر روایات کی روشنی میں حضور ﷺ کا ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لشکر کفار کی طرف روانہ ہوا اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ضرورت پڑی کہ فلاں جگہ جاکر بھی قتال کرنا ہے تو آپ ﷺ ایسے وقت میں لشکر میں سے جن لوگوں کو اس کے لیے مناسب سمجھتے تھے بھیج دیا کرتے تھے،۔ جس کو سریہ کہا جاتا ہے۔ جب یہ سریہ واپس آتا تھا اور کچھ مال غنیمت بھی لاتا تو آپ ﷺ اس مال کے چار حصے فرماتے تھے، ایک حصہ تو اس سریہ کو ہی بطور نفل کے دے دیتے تھے، اور باقی تین حصے سارے لشکر والوں پر برابر برابر تقسیم فرمادیتے تھے، اور اس تقسیم میں سریہ کو بھی برابر کا حصہ ملتا تھا۔

اس کی دوسری صورت یہ تھی کہ لشکر جہاد کرکے واپس آرہا ہے لیکن راستہ میں ہی کہیں دشمن سے لڑنے کی ضرورت پیش آگئی، تو ایسے موقع پر آپ ﷺ جن لوگوں کو مناسب سمجھتے ان کی جماعت بنا کر دشمن سے لڑنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے، جب یہ لوگ وہاں سے غنیمت لاتے تو آپ ﷺ اس مال کے تین حصے فرماتے، ایک حصہ اس جماعت کو دے دیتے تھے اور باقی دو حصوں کو پورے لشکر پر تقسیم فرمادیتے تھے اس تقسیم میں اس جماعت کو بھی برابر کا حصہ دیا جاتا تھا۔

اب دیکھئے کہ جب شروع یعنی لشکر کے جاتے وقت کسی سریہ کو کہیں پر لڑنے کے لیے بھیجتے تو اس کو لوٹنے کے بعد ربع دیا کرتے تھے، کیونکہ شروع میں مشقت کم ہوتی ہے، اور جہاد سے واپسی کے وقت کسی سریہ کو روانہ کرتے تو اس کو ثلث دیا کرتے تھے، کیونکہ اس وقت پریشانی اور مشقت زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہ ابھی جہاد کرکے آرہے ہیں، بہت سے حضرات کے بدنوں پر زخم بھی ہوتے ہیں، گھر پہنچنے کا بھی اشتیاق ہوتا ہے، ان تمام پریشانیوں کی وجہ سے ان کو ثلث دیا کرتے تھے۔ (حاشیہ ابی داوٗد، بذل: ۵۲/۴)

ترجمة الباب : ينفل الربع بعد الخمس الخ سے ثابت ہو رہا ہے۔

۱۰۰ ﴿حَدَّثَنا عبدُ الله بنُ أحمد بنِ بَشِيرِ بنِ ذَكْوانَ و مَحمودُ بنُ خالدٍ الدِمِشْقِيّانِ المعنىٰ قالا نا مَرْوانُ بنُ محمدٍ قالَ نا يحيىٰ بنُ حَمْزَةَ قال سمعتُ أبا وَهْبٍ يقول سمعتُ مكحولاً يقول : كنتُ عَبْدًا لِمصْرَ لإمرأةٍ مِنْ بَني هُذَيْلٍ فأعتَقَتْني، فما خرجتُ مِنْ مِصْرَ وبها عِلْمٌ إلّا حَوَيْتُ عَلَيْهِ ، فما أرىٰ، ثم أتيتُ الحجازَ فما خرجتُ مِنْها وبها عِلْمٌ إلّا حويتُ عَلَيْهِ فيما أرىٰ، ثم أتيتُ العِراقَ فما خرجتُ مِنْها وبها عِلْمٌ إلّا حَوَيْتُ علَيْهِ فيما أرىٰ، ثم أتيتُ الشّامَ فَغَرْبَلْتُها كلَّ ذلك أسْأَلُ عنِ النَفْلِ، فَلَمْ أجدْ أحدًا يُخبِرُني فيه بشيءٍ حَتّٰى لَقِيْتُ شَيْخًا يقالُ له زيادُ بنُ جارِيَةَ التميميُّ، فقلتُ لَهُ: هَلْ سمعتَ في النفلِ شيئًا ؟ قال : نعم سمعتُ حبيبَ بنَ مَسْلَمةَ الفهريَّ يقول : شهدتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم، نَفَّلَ الربعَ في البَدْأةِ والثُلُثَ في الرَجْعَةِ.﴾

ترجمہ: حضرت مکحول سے روایت ہے کہ میں مصر میں قبیلہ بنی ہذیل کی ایک عورت کا غلام تھا اس نے مجھے آزاد کردیا، میں مصر سے نہیں نکلا یہاں تک کہ (قران وحدیث کا) جتنا علم وہاں تھا میں نے حاصل کرلیا، اپنی دانست کے مطابق، پھر میں حجاز میں آیا اور وہاں سے نہیں نکلا یہاں تک کہ میری دانست کے مطابق وہاں جتنا علم تھا میں نے سب حاصل کرلیا، پھر عراق آیا اور وہاں سے نہیں نکلا حتیٰ کہ اپنی دانست کے مطابق وہاں کا سارا علم حاصل کرلیا، پھر "شام" آیا۔ اس کو میں نے چھانا اور ہر شخص سے میں نفل کا حال پوچھتا تھا تو میں نے کسی ایسے شخص کو نہ پایا جو اس بارے میں مجھ سے حدیث بیان کرتا، یہاں تک کہ زیاد بن جاریہ نام کا ایک شخص مجھے ملا، میں نے اس سے پوچھا کہ نفل کے بارے میں آپ کو کچھ معلوم ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں! میں نے حبیب بن مسلمہ فہری کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھا تو حضور ﷺ نے جہاد شروع ہوتے وقت ربع دیا اور جہاد سے لوٹتے وقت ثلث دیا۔

تشریح مع تحقیق : مَکْحُول ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ عمرو بن سعید بن العاص کے غلام تھے انھوں نے قبیلہ ہذیل کے کسی شخص کو ہبہ کردیا تھا، اس نے ان کو آزاد کردیا۔ ابن زبرؒ کہتے ہیں کہ مکحول نے مجھ سے کہا کہ سعید بن العاص کا غلام تھا انھوں نے مجھے مصر کی ایک عورت کے ہاتھ ہبہ کردیا تھا پھر اس عورت نے مجھے آزاد کردیا۔

حویتُ (ض) بمعنی حاصل کرنا، جمع کرنا۔

فَغَرْبَلْتُها (بعثر يبعش) چھاننا تلاش کرنا، جستجو کرنا، ڈھونڈنا۔

اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ مکحول نے کسی سے یہ حدیث سنی کہ رسول اللہ ﷺ مجاہدین کو ربع اور ثلث دیا کرتے تھے، لیکن وہ اس کے محمل کو نہیں سمجھ سکے کہ کب ربع دیتے تھے اور کب ثلث دیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ بڑے پریشان تھے، اسی مسئلہ کی تلاش میں کئی ممالک کا سفر کیا اور بڑے بڑے محدثین سے علم حاصل کیا، لیکن اصل مقصود حاصل نہ ہوسکا۔ آخر میں یہ ملک شام پہنچے اور وہاں زیاد بن جاریہ سے ملاقات ہوئی، زیاد بن جاریہ سے بھی یہ ہی مسئلہ دریافت کیا کہ اگر آپ کو نفل کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو مجھے بھی بتلا دیجئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں معلوم ہے کہ آپ ﷺ جہاد کے شروع میں ربع دیا کرتے تھے اور لوٹتے وقت ثلث دیا کرتے تھے۔ مزید تفصیل اس سے پہلی روایت میں گزر چکی ہے ملاحظہ ہو۔

ترجمة الباب: اس روایت سے مطلقاً نفل دینا تو ثابت ہوا، بظاہر بعد الخمس دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ زیاد بن جاریہ نے پوری تفصیل مکحول کے سامنے نہ بیان کی ہو۔

﴿بَاب في السرية تَرِدُ على أهل العسكر﴾

اس دستے کا بیان جو لشکر میں آکر مل جائے

۱۰۱ ﴿حَدَّثَنا قتيبةُ بنُ سعيدٍ نا ابنُ أبي عَدِيٍّ عَنْ ابنِ اسحٰقَ بِبَعْضِ هذا ح و نا عبيدُ الله بنُ عُمَرَ قال ثني هُشَيْمٌ عَنْ يحىٰ بنِ سَعِيْدٍ جَمِيْعًا عن عَمرو بنِ شعيبٍ عَنْ أبيهِ عَنْ جدِّهٖ قال قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: المسلمونَ تتكَافأُ دِمَاءُهُم يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ أدْنَاهُمْ، ويُجِيْرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلىٰ مَنْ سِواهُمْ يَرُدُّ مُشِدُّهُمْ علىٰ مُضْعِفِهِمْ و مُتَسَرِّيْهِم على قاعِدِهم لَا يُقْتَلُ مُؤمِنٌ بِكَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ في عَهْدِهٖ، وَلَمْ يَذْكُرْ ابنُ اسحٰقَ القَودَ والتكافيَ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے خون برابر ہیں، ادنی مسلمان امن دے سکتا ہے (اور ان کے امن کو پورا کرنا ضروری ہے) دور کا رہنے والا پناہ دے سکتا ہے (اگرچہ اس سے نزدیک والا موجود ہو) ہر ایک مسلمان دوسرے کی مدد کرے اپنے مخالفین کے خلاف، زور آور سواریوں والے کمزور سواریوں والوں کے ساتھ رہیں، اور جب لشکر میں سے ٹکڑے نکالے جائیں اور وہ مال لائیں تو لشکر والوں کو بھی اس میں شریک کرے، مسلمان کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا

جائے، اور نہ ہی ذمی کو اس کے عہد کے وقت قتل کیا جائے۔

تشریح مع تحقیق : تتکافأ (تفاعل) ایک دوسرے کے برابر ہونا۔

يَسْعٰی (ف) کوشش کرنا عمل کرنا۔

يُجِيْرُ (افعال) پناہ دینا، امان دینا۔

مُشِدّ (افعال) طاقت ور ہونا۔

متسرّيهم (تفعل) دستے میں جانے والا، سریہ۔

امام ابوداوُدؒ اس حدیث کو اس باب میں صرف یہ ثابت کرنے کے لیے لائے ہیں کہ سریہ میں گئے ہوئے لوگ جو مال غنیمت حاصل کر کے لائیں اس مال میں تمام لشکر والوں کو شریک کیا جائے گا۔ اپنے اس دعوے اور ترجمہ کو ثابت کرنے کے لیے امام ابوداوُد نے اس حدیث کے صرف ایک جزء و مُتَسَرِّيهِمْ عَلٰى قاعِدِهِمْ سے استدلال کیا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ ہم امام ابوداوُد کے اس ترجمہ کو ثابت کرنے والے اس جملے کی تشریح کریں، حدیث میں وارد تمام اہم اجزاء کی تشریح امرنا گزیر ہے۔

المسلمون تتكافأ دماؤُهم : یعنی تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں، قصاص میں ہو یا دیت میں، شریف اور وضیع کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ اگر شریف انسان یا اونچے خاندان کا کوئی شخص جرم کرتا تو اس کو سزا ہی نہ دی جاتی تھی اور اگر کوئی وضیع جرم کرتا تو اس کو سزا دی جاتی تھی، اسلام نے اس تفریق کو ختم کر دیا۔

يسعٰى بذمتهم أدناهم : ادنی مسلمان امن دے سکتا ہے، یہاں پر ادنی سے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں ایک تو عدد کے اعتبار سے ادنی یعنی کم، اور دوسرے حیثیت کے اعتبار سے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص بھی امان دیدے تو اس کے امان کو پورا کیا جائے گا، اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر کم حیثیت کا آدمی مثلاً غلام یا عورت کسی کو پناہ دے تو اس کو تمام مسلمان پورا کریں گے۔

وَيُجِيْرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ : دور کا رہنے والا مسلمان پناہ دے سکتا ہے اگر چہ نزدیک والا موجود ہو، مثلاً زید کے برابر میں ایک کافر کا گھر ہے اور عمر کا گھر زید سے دس مکانوں کے فاصلے پر ہے تو عمر کو حق ہے کہ اس کافر کو پناہ دے دے جو زید کی برابر میں رہتا ہے، اگر چہ عمر اس سے دور ہے۔

وهم يد على من سواهم : ہر ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان کی مدد کرے اگر کافروں کے خلاف مسلمانوں سے لڑائی کی اپیل کی جائے تو سب مسلمانوں کو جانا ضروری ہے اور جب مدد مانگی جائے تو ایک دوسرے کو مدد دینا ضروری ہے۔

يَرُدُّ مشدهم علی مضعفهم : اس جملے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ جنگ میں کچھ لوگ طاقت ور ہوتے ہیں اور کچھ کمزور اور ضعیف، تو طاقتوروں کو جو غنیمت ملے اس میں کمزور بھی شامل ہوں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مُشِدّ سے مراد وہ شخص ہے جس کی اونٹنی اور سواری اچھی ہو اور مضعف سے مراد وہ شخص ہے جس کی سواری کمزور ہو۔ اب معنی یہ ہونگے کہ جن کی سواریاں اچھی اور تیز چلنے والی ہوں ان کو کمزور سواریوں والوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔

و متسرّیهم علی قاعدهم : "متسریهم" سے مراد سریہ میں جانے والے ہیں، اور "قاعدهم" سے مراد جیش والے ہیں جو دار الحرب میں ٹھہرے ہوئے ہوں، اور مطلب یہ ہے کہ "سریہ" میں جانے والے حضرات جو غنیمت لے کر آئیں اس میں سے دار الحرب میں مقیم لشکر کو بھی اس کا حصہ دیا جائے گا۔

لا یقتل مؤمن بکافر ولا ذو عهد في عهده : مؤمن کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے، اور نہ ہی ذمی کو اس کے عہد کے وقت میں۔

اس عبارت میں دو جز ہیں ایک "لا یقتل مؤمن بکافر" اور دوسرا جز ہے "ولا ذو عهد في عهده" اب فقہاء کرام کے درمیان اس عبارت کو سمجھنے میں اختلاف ہو گیا کہ اس عبارت کے یہ دونوں جز الگ الگ ہیں کہ دوسرے جملے کا پہلے جملے سے کوئی تعلق نہیں، یا دونوں جز الگ الگ نہیں ہیں۔

ائمہ ثلثہ فرماتے ہیں کہ یہ دو جملے ہیں اور پہلے جملے یعنی "لا یقتل مؤمن بکافر" کا دوسرے جملے "ولا ذو عهد في عهده" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ دونوں جملوں میں باہم ربط ہے جو حکم پہلے جملے "لا یقتل مؤمن بکافر" کا ہے وہ ہی حکم "ولا ذو عهد في عهده" کا ہے۔

ثمرۂ اختلاف یہ ہوگا کہ اگر کسی مسلمان نے حربی کافر کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے میں مسلمان قاتل کو بالاتفاق قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کر دے تو مسلمان قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے یا نہیں؟

اب جو حضرات دونوں جملوں کو الگ مانتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل کو ذمی کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور جو حضرات دونوں جملوں کو باہم مربوط مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل کو ذمی کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

فریق اول کی دلیل

"لا یقتل مؤمنٌ بکافرٍ" میں کافر سے مراد عام کافر ہے، خواہ وہ حربی ہو یا ذمی ہو یا معاہد اور مستامن ہو کسی

کے بدلے میں بھی مسلمانوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور ولا ذو عهد في عهده یہ جملہ مستانفہ ہے اس میں ایک مستقل حکم بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر ایک حدیث بھی ہے: لا تقبل صلوة بغير طهور ولا صدقة من غلول یہاں ہر دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایسے ہی اس حدیث میں ہے کہ پہلے ایک مسئلہ بیان کر دیا کہ مسلمانوں کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے، پھر ساتھ ہی ایک دوسرا مسئلہ بھی بیان کر دیا کہ جب تک ذمی عہد میں رہے اس کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

فریق ثانی یعنی حنفیہ کے دلائل

(۱) حضرت عبدالرحمٰنؓ کی حدیث ہے: قال قتل النبي صلى الله عليه وسلم مسلماً بمعاهدٍ، وقال عليه والسلام أنا أحق من وفى بذمته.

(۲) قتل النبي صلى الله عليه وسلم يوم خيبر وفي رواية يوم حنين مسلماً بكافر قَتَلَهٗ غيلةً.

(۳) عن عمر بن ميمون قال : شهدت كتاب عمر بن عبدالعزيز إلى أمير الحير، في رجل مسلم قتل رجلاً من أهل الذمة أن ادفعه إلى وليه، فقال فدفعه إليه، فضرب عنقه وأنا أنظر.

(نصب الرایۃ:۴/۳۲۷)

(۴) عہد اور ذمہ کی وجہ سے وہ "لهم مالنا وعليهم ما علينا" اور بقول حضرت علیؓ "حتى تكون دمائهم كدمائنا" کا مصداق بن گئے، اور ایک مسلمان کی طرح محفوظ الدم اور محفوظ القتل ہو گئے۔

فریق اول کی دلیل کا جواب

ائمہ ثلاثہؒ کی دلیل کا جواب اس طرح دیا جاتا ہے کہ "لا يقتل مؤمن بكافرٍ" اور "ولا ذو عهدٍ في عهده" دونوں جملے الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں، اور دونوں کا ایک ہی حکم ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا جملہ معطوف علیہ ہے اور دوسرا جملہ معطوف ہے، اب ولا ذو عهد کا عطف بكافر پر تو ہو نہیں سکتا ہے کیونکہ اگر "بکافر" پر مانیں تو اس کو منصوب یعنی "ذی عہد" ہونا چاہیے تھا، تو لامحالہ مؤمن پر عطف مانیں گے اور عبارت یوں ہوگی: لا يقتل مؤمن بكافر ولا ذو عهد فی عهده بكافر، اور کافر سے مراد حربی ہوگا کیونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے لہٰذا اب عبارت کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان کو کافر حربی کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے اور "ذو عہد" کو بھی کافر حربی کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ (حاشیہ ابی داؤد:۲/۶۲۳)

ولم يذكر ابن اسحق الخ مطلب یہ ہے کہ اس روایت کو عمرو بن شعیب سے ابن اسحٰق اور یحییٰ بن سعید نقل کرتے ہیں، لیکن یہ الفاظ یحییٰ بن سعید کے ہیں ابن اسحٰق کی روایت اس روایت سے کم ہے اور اُس میں دو جملے

نہیں ہیں ایک تو "قوز" یعنی لا یقتل مؤمن بکافر الخ اورایک المسلمون تتکافأ دماء هم"

ترجمة الباب: ومتسریهم علی قاعدهم سے ثابت ہورہا ہے۔

۱۰۲ ﴿حَدَّثَنا هارونُ بنُ عبدِ الله قالَ أنا هاشم بنُ القاسمِ نا عِكرمةُ حدثني إياسُ بنُ سَلَمةَ عَنْ أبِيه قال أغارَ عبدُ الرحمن بنُ عُيَيْنَةَ علىٰ إبلِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فقَتَلَ راعِيَهَا وخَرَجَ يَطْرُدُهَا هُوَ وأناسٌ معهُ في خَيْلٍ فجعلتُ وجهي قِبَلَ المدينةِ ثم ناديتُ ثلثَ مرّاتٍ يا صَباحَا ! ثم اتبعتُ القومَ فجعلتُ أرمِيْ وَاعْقِرُهُمْ فإذا رَجَعَ إليَّ فارسٌ جلستُ في أصْلِ شجرةٍ؛ حتّٰى ما خَلَقَ اللّٰهُ شيئًا مِن ظَهْرِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم إلاّ جعلتُه وَرَاء ظهري، وحتى ألقَوْا أكثرَ مِنْ ثلاثين رُمْحًا وثلاثين بُرْدَةً، يَسْتَخِفُّونَ مِنهَا ثم أتاهُم عُيَيْنَةُ مَدَدًا فقال: لِيَقُمْ إليه نَفَرٌ مِنكم فقام إليَّ أربعةٌ مِنهُم فصَعِدُوا الجبلَ، فلمّا اسمعتُهم قلت: أتَعرِفُوْنِيْ؟ قالوا ومَنْ أنتَ؟ قلتُ أنا ابنُ الأكْوعِ، والذي كَرَّمَ وجهَ محمدٍ لا يَطْلُبُنِيْ رجلٌ مِنكُم فيُدْرِكُنِيْ، وَلاَ أطْلُبُهُ فيَفُوْتَنِيْ، فَما برِحْتُ حتى نظرتُ إلى فوارسَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم يَتَخلَّلُونَ الشَجَرَ، أوّلُهُم الأخرمُ الأسَدِيُّ، فيَلْحَق بعبدِ الرحمن بنِ عيينةَ و يَعْطِفُ عليهِ عبدُ الرحمن فاختلفَا طَعْنَتَيْنِ فعَقَرَ الأخرمُ عبدَ الرحمن وطَعَنَهُ عبدُ الرحمن فقتَلَهُ، فتَحوَّلَ عبدُ الرحمن على فرس الأخرمِ فيَلْحَقُ أبوقتادةَ بعبدِ الرحمنِ فاختلفَا طعْنتَيْنِ فَعَقَرَ بأبِيْ قتادةَ وقَتَلَهُ أبو قتادةَ، فتحوَّلَ أبوقتادةَ على فرسِ الأخرمِ، ثم جئتُ إلى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم وهو على الماءِ الذي حَلَّيْتُهُم عنهُ ذو قَرَدٍ، فإذا نبيُّ الله صلى الله عليه وسلم في خَمْسِ مائة، فأعْطَاني سهمَ الفَارِسِ والرَّاجِلِ .﴾

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عیینہ فزاری نے رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں کولوٹ لیا اور چرواہے کو مارڈالا، اس کے ساتھی جو گھوڑوں پر سوار تھے اونٹوں کو ہنکاتے ہوئے لے گئے، میں مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوا اور تین بار آواز دی یا صباحا! اوران لوگوں کے پیچھے دوڑنا شروع کردیا، میں ان کو تیر مارتا تھا، زخمی کرتا تھا، جب میری طرف کوئی سوار لوٹتا تھا تو میں کسی درخت کی جڑ میں بیٹھ جاتا تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے تمام اونٹوں کو میں نے اپنے پیچھے کردیا، ان لوگوں نے تیس بھالوں اور تیس چادروں سے زیادہ اپنے پیچھے پھینک دیں، تاکہ وہ لوگ بوجھ سے ہلکے ہوجائیں، پھر ان کے پاس عیینہ مدد لے کر آیا اور کہا کہ تم میں

سے چند آدمی اس شخص (سلمہ بن اکوع) کی طرف جائیں، سلمہ کہتے ہیں کہ ان میں سے چار آدمی میری طرف آئے اور ایک پہاڑ پر چڑھ گئے، جب وہ اتنی دور تھے کہ میری آواز ان تک پہنچ سکے تو میں نے ان سے کہا کہ کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ تم کون ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں سلمہ بن اکوع ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس نے رسول اللہ ﷺ کو بزرگی عطا فرمائی اگر تم میں سے کوئی شخص مجھ کو پکڑنا چاہے تو پکڑ نہ پائے گا، اور میں جس کو پکڑنا چاہوں تو وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا، اس کے تھوڑی دیر بعد میں نے حضور ﷺ کے سواروں کو دیکھا جو درختوں کے بیچ سے آرہے تھے، ان میں سب سے آگے اخرم اسدی تھے، وہ عبدالرحمٰن بن عیینہ سے جا ملے، عبدالرحمٰن ان کی طرف متوجہ ہوا اور دونوں میں خوب چوٹیں چلیں، اخرم اسدیؓ نے عبدالرحمٰن بن عیینہ کے گھوڑے کو مار ڈالا جس کے نتیجے میں عبدالرحمٰن نے اخرم اسدیؓ کو شہید کر دیا۔ پھر یہ عبدالرحمٰن بن عیینہ حضرت اخرم اسدیؓ کے گھوڑے پر سوار ہوا اور حضرت ابوقتادہ اور عبدالرحمٰن میں حملے شروع ہوئے، دونوں نے خوب چوٹیں کیں، عبدالرحمٰن بن عیینہ نے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کو مار ڈالا، پھر ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن کو قتل کر دیا، اور عبدالرحمٰن کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اس کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ 'ذوقرد' نام کے پانی (چشمے) پر تھے جہاں سے میں نے ان لٹیروں کو بھگا دیا تھا، اور آپ ﷺ کے ساتھ پانچ سو آدمی تھے، آپ ﷺ نے مجھے فارس اور راجل کا حصہ دیا (دو حصے دیئے)

تشریح مع تحقیق : أغار عليه : (افعال) حملہ کرنا، لوٹنا۔

يَطْرُدُ (ن) دور کرنا، بھگا دینا، کہا جاتا ہے: طَرَدَ الإبلَ وہ اونٹوں کو بھگا کر لے گیا۔

صباحاه : یہ ایک کلمہ ہے جس کو اہل عرب فریاد طلب کرنے کے لیے بولتے تھے، چونکہ اکثر و بیشتر لوٹ صبح کے وقت ہوا کرتی تھی اس لیے اہل عرب اسی لفظ کو ایسے موقع پر بولتے تھے۔

أعقر : (ض) زخمی کرنا، کاٹ دینا، عَقَرَ الإبلَ : اونٹ کی کونچیں کاٹنا۔

رمحا ج رِمَاحٌ بمعنی نیزہ۔

اسمع : (افعال) آواز سنانا، پہچانا۔

يَعْطِفُ (ض) مائل ہونا۔

تَحَوَّلَ (تفعل) پھر جانا، تَحَوَّلَ عَلَيه : سوار ہو جانا۔

حَلَّيْتُهُم (تفعیل) حلاّ عن الماء : پانی سے دھتکارنا، پانی سے بھگانا۔

ذو قرد پانی کے چشمے کا نام ہے جو خیبر اور مدینے کے درمیان ہے۔

امام ابوداؤدؒ اس روایت کو اس باب میں لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دستہ (سریہ) جو غنیمت حاصل کرے اس

میں پورے لشکر کو شامل کیا جائے گا۔اب دیکھیے کہ حدیث شریف میں لڑنے والے تین حضرات کا نام ہے ابوقتادہ، اخرم اسدی اور سلمہ بن اکوع اور غنیمت میں سارے لشکر کو شامل کیا گیا، یہاں ایک بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ کسی کی اچھی کارکردگی پر اس کو مزید انعام بھی دیا جاسکتا ہے جیسا کہ سلمہ بن اکوع کو دو حصے دیئے گئے۔اب ہم حدیث میں مذکور واقعہ کی تھوڑی سی تشریح کیا چاہتے ہیں۔

حدیث شریف میں جس غزوہ کا ذکر ہے اس کو ''غزوہ ذی قرد'' اور ''غزوہ غابہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے اپنے ایک غلام جس کا نام رباح تھا کو مقام غابہ میں چررہی بیس اونٹنیوں کو دیکھنے کے لیے بھیجا ان کے ساتھ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بھی تھے۔حضرت سلمہ بن اکوع کے پاس حضرت طلحہ بن عبید اللہ کا گھوڑا تھا۔ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ سلمہ بن اکوع ابھی ''ثنیۃ الوداع'' میں تھے، کہ ان کو واقعہ کا علم ہوا کہ اس طرح دشمنوں نے حضور ﷺ کی اونٹنیوں کو لوٹ لیا ہے۔ان کو دشمنوں کے سوار بھی نظر آ گئے، انھوں نے رباح رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم یہ گھوڑا لے جاؤ طلحہ بن عبید اللہ کو دیدینا اور رسول اللہ ﷺ کو واقعہ کی پوری تفصیل بتادینا، میں دشمن کے تعاقب میں جاتا ہوں، چونکہ عبدالرحمٰن بن عیینہ نے حضور ﷺ کے راعی (چرواہے) کو بھی قتل کردیا تھا، اور اس کی عورت کو بھی لے کر بھاگ گئے تھے، حضرت سلمہ بن اکوع بڑے زبردست تیرانداز تھے، اور اس وقت بھی ان کے پاس تیر اور تلوار موجود تھی، انھوں نے مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہوکر آواز دی کہ یا صباحاہ! تاکہ مدینہ والوں کو خطرہ کی خبر ہوجائے، اس کے بعد دشمن کے قریب پہنچ کر تیر مارنا شروع کردیا، ہر تیر سے ایک شخص کو زخمی کردیتے تھے، اور اگر ان کی طرف کوئی متوجہ ہوتا تو درخت کی آڑ میں ہوجاتے تھے، اور تیر چلانے لگتے تھے، کبھی پہاڑیوں پر چلے جاتے اور نظروں سے غائب ہوجاتے، الغرض اس طرح دشمن کو حواس باختہ کردیا، اور دشمنوں کے ہاتھ نہ آئے، اور حضور ﷺ کے جتنے بھی اونٹ تھے سب واپس لے لیے، اور ان سب اونٹوں کو مدینہ کی طرف بھگادیا، اور دشمنوں کا تعاقب کرتے رہے حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ دشمن اپنے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اپنے تیر اور اپنی چادروں کو پھینکتے ہوئے چلے جاتے تھے۔حضرت سلمہ بن اکوع ان چادروں اور تیروں پر پتھر رکھتے ہوئے چلے جاتے تھے تاکہ واپسی میں ان کو اٹھالیں اور جگہ کو بھول نہ جائیں، حتی کہ تیس سے زائد چادریں اور تیر انھوں نے گرادیئے تھے۔

جب مدینہ منورہ میں واقعہ کی خبر پہنچی تو حضور ﷺ نے مدینہ میں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا اور ایک لشکر لے کر روانہ ہوگئے، سب سے آگے حضرت اخرم اسدی تھے چنانچہ انھوں نے ہی سب سے پہلے لڑنا شروع کیا حتی کہ شہید ہوگئے، اس کے بعد ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے دشمنوں کے سردار عبدالرحمٰن بن عیینہ کو جہنم رسید کیا، اس کے بعد حضرت سلمہ بن اکوع نے دوبارہ تعاقب کیا اور جب یہ لوگ چشمہ ذی قرد پر پانی لینا چاہتے تھے اسی وقت انھوں نے تیروں کی بوچھار شروع کردی اور ان لوگوں کو بھگادیا۔حضرت سلمہ بن اکوع نے ان

دشمنوں سے دوگھوڑے بھی چھین لیے، جب لوٹ کر دیکھا تو حضور ﷺ بھی تشریف لا چکے ہیں۔

اس غزوہ میں دو صحابی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے ہیں ایک تو حضرت اخرم اسدی اور دوسرے حضرت وقاص ؓ، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے سواروں میں سب سے بہتر ابوقتادہ ہیں اور پیادہ پاؤں میں حضرت سلمہ بن اکوع ہیں، جب حضور ﷺ واپس ہوئے تو آپ نے حضرت سلمہ بن اکوع کو اپنا ردیف بنالیا۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح قول کے اعتبار سے یہ غزوہ حدیبیہ سے پہلے ہوا ہے، البتہ صحیحین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ حدیبیہ کے بعد خیبر سے پہلے ہوا ہے۔

اور بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ دو مرتبہ ذی قرد کی طرف جہاد کے لیے جانا ہوا ہے، اس آخری قول کی وجہ سے تمام روایات واقوال میں تطبیق ہوجاتی ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۲۲۸، فتح الباری کتاب المغازی)

ترجمة الباب: چند افراد نے ہی جہاد کیا تھا، لیکن غنیمت میں سب کو شریک کیا گیا۔ اسی سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے۔

﴿باب في النفل من الذهب والفضة ومن أول مغنمٍ﴾

سونے چاندی اور مال فئے (اول غنیمت) میں سے نفل دینے کا بیان

۱۰۳ ﴿حَدَّثَنا أبو صالحٍ محبوبُ بنُ موسٰى قال أنا أبو إسحٰقَ الفزاريُّ عَن عاصمِ بنِ كُلَيبٍ عن أبي الْجُوَيْرِيَـةَ الحرميِّ قال: أصبتُ بأرض الرُّومِ جَرَّةً حمراءَ فيها دَنانِيرُ في أُمْرةِ معاوِيَةَ، وعلينا رجلٌ من أصحابِ النبي صلى الله عليه وسلم مِنْ بني سُلَيمٍ يقال لهُ مَعْنُ بنُ يزيدٍ فأتَيْتُـهُ بها فقَسَّمَها بيْنَ المسلمينَ، وأعْطَاني مِنهَا مثلَ ما أعْطىٰ رجلاً مِنهُمْ، ثم قال: لَوْلَا أنّي سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقول: لَا نَفْلَ إلَّا بَعْدَ الخُمُسِ لأعْطِيَنَّكَ ثم أخَذَ يَعْرِضُ عَلَيَّ مِن نَصِيبِهِ فَأبيْتُهُ.﴾

۱۰۴ ﴿حَدَّثَنا هنادٌ عن ابنِ المباركِ عَنْ أبي عَوانَه عن عاصمِ بنِ كُلَيبٍ باسنادِهِ ومَعْناهُ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوجویریہ سے روایت ہے کہ سرزمین روم میں مجھے ایک گھڑا ملا جس میں دینار تھے، اور یہ حضرت معاویہ ؓ کی خلافت کے زمانے کی بات ہے، اور اس وقت بنوسلیم کے ایک شخص جو صحابی بھی ہیں ہمارے اوپر

حاکم تھے ان کا نام معن بن یزید تھا، تو وہ گھڑا میں حضرت معن بن یزید کے پاس لایا، تو انھوں نے ان دیناروں کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا، اور مجھے بھی اس میں سے اتنا ہی حصہ دیا جتنا ہر شخص کو دیا، اور کہا کہ اگر میں نے حضور ﷺ سے یہ نہ سنا ہوتا کہ نفل خمس کے بعد ہے تو میں تم کو نفل ضرور دیتا، پھر وہ اپنے حصے میں سے مجھے دینے لگے، لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔

حضرت عاصم بن کلیب سے بھی اسی سند کے ساتھ اسی طرح روایت موجود ہے۔

تشریح مع تحقیق

جَرَّةٌ ج جرار بمعنی گھڑا۔

حمراء احمر کا مؤنث ہے بمعنی سرخ۔

اَوَّلُ مَغْنَمٍ : سے مراد وہ مال ہے جو دارالحرب میں عنوہ حاصل ہو، جس کو مال فئے کہا جاتا ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے باب قائم فرمایا ہے کہ سونے چاندی میں نفل ہے یا نہیں، اس مسئلے میں جمہور علماء اور اہل شام کے درمیان اختلاف ہے۔ امام ابوداؤد کا رجحان بھی اہل شام کی طرف ہے۔

جمہور علماء فرماتے ہیں کہ سونا چاندی بھی غنیمت میں شامل ہے لہٰذا اس میں سے بھی نفل دینا جائز ہے جس طرح دیگر غنائم سے نفل دینا جائز ہے۔

امام اوزاعی اور اہل شام فرماتے ہیں کہ اعیان یعنی سونا چاندی سے نفل دینا جائز نہیں ہے۔ اس کے بعد مالِ فئے کے بارے میں بھی تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔

(ا) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مالِ فئے کا وہی حکم ہے جو غنیمت کے خمس کا ہے۔ دونوں قسم کے مال کو بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا، اور امام اپنے اختیار سے مصارف میں صرف کرے گا۔

(۲) ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ مالِ فئے اور خمس غنیمت میں تھوڑا سا فرق ہے۔ خمس کا مصرف تو وہ ہے جس کو سورہ انفال میں واعلموا أنما غنمتم الخ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور مال فئے کا کوئی متعین مصرف نہیں ہے بلکہ وہ امام کی صواب دید اور مصلحت بینی پر موقوف ہے۔ امام کو اختیار ہے کہ مصالح مسلمین میں جس طرح چاہے خرچ کرے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۷۶/۳)

اب دیکھیے حضرت معن بن یزید فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ نفل خمس کے بعد ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سونا اور چاندی جو حضرت ابو جویریہ کو ملا وہ بغیر حملہ کے تھا، جو مال فئے ہے شاید معن بن یزید نے اسی لیے اس میں سے ان کو نفل نہیں دیا، کیونکہ نفل اس مال میں ہوتا ہے جس میں خمس ہو اور فئے میں خمس نہیں ہوتا۔ لہٰذا فئے سے نفل بھی نہیں دیا جائے گا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک چونکہ خمس کے بعد نفل ہوگا اس لیے انھوں نے نفل نہیں دیا، یا چونکہ احراز پایا گیا تھا اس لیے نفل نہیں دیا۔

ترجمة الباب: اس روایت سے ترجمۃ الباب اس طرح ثابت ہوگا کہ ابو جویریہ کو ایک گھڑا ملا، جس میں دنانیر یعنی سونے چاندی کے سکے تھے۔ ان کو اس میں سے نفل نہیں دیا لیکن اس ترجمہ پر اعتراض یہ ہے کہ نفل نہ دینا سونے چاندی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ مالِ فئے ہونے کی وجہ سے تھا کہ نفل اس مال سے دیا جاتا ہے جس میں خمس واجب ہو اور فئے میں خمس نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں نفل بھی نہیں ہوگا، اس لیے اس روایت سے امام ابوداؤد کا ترجمہ اور اہل شام کا مسلک ثابت نہیں ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

﴿باب في الإمام يستاثر بشئ من الفئ لنفسه﴾

مال فئ میں سے امام کا کچھ اپنے لیے رکھ لینے کا بیان

۱۰۵ ﴿حدثنا: الوليدُ بنُ عُتْبَةَ نا الوَلِيْدُ قال انا عبدُ اللّٰه بنُ العلاءِ أنه سمع أبا سلام الأسودَ قال سمعتُ عمرو بنَ عَنْبَسَة قال صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلى بَعِيْرٍ مِنَ الغَنَمِ فَلَمَّا أَسْلَمَ أخذ وبرَةً مِن جَنْبِ البعيرِ، ثم قال: وَلَا يَحِلُّ لِيْ مِنْ غَنَائِمِ مثل هذا إلا الخُمُسُ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِيْكُمْ.﴾

ترجمہ: حضرت عمرو بن عنبہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو غنیمت کے ایک اونٹ کی طرف نماز پڑھائی (اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھائی) جب سلام پھیرا تو اونٹ کے پہلو سے ایک بال لیا اور ارشاد فرمایا کہ تمہاری غنیمت میں سے میرے لیے اس بال کے برابر بھی حلال نہیں ہے۔ سوائے خمس کے، اور خمس بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔

تشریح مع تحقیق: یہاں سے امام ابوداؤدؒ ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ فرما رہے ہیں کہ اگر امیر لشکر تقسیم غنائم سے پہلے ہی غنیمت میں سے کچھ اپنے لیے منتخب کر لے تو اس کا یہ عمل درست نہیں اور تقسیم سے پہلے امیر لشکر کے لیے لینا ہرگز جائز نہیں ہوگا، جیسا کہ حدیث شریف سے معلوم ہو رہا ہے۔

مسند احمد میں اس حدیث سے بھی واضح روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے لیے خمس کے علاوہ غنیمت میں سے کچھ بھی حلال نہیں ہے اور یہ خمس بھی تمہاری یعنی مسلمانوں کی ضروریات میں ہی خرچ کر دیا جاتا ہے، اس لیے جو بھی جسکے پاس ہو وہ سب جمع کر دے، اس لیے امیر لشکر کے لیے ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی چیز اچھی لگے تو وہ اس میں سے کچھ بھی قبل التقسیم نہ لے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس حدیث سے بھی وہ ہی اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جو "باب فی فداء الاسیر" کے ذیل میں وارد حدیث

سے پیدا ہوا تھا، کہ آپ ﷺ کو تین حصے ملتے تھے (۱) ایک مجاہدین کی طرح برابر حصہ ملتا تھا (۲) صفی (۳) خمس الخمس، پھر یہاں خمس کے اندر انحصار کیوں فرمایا؟

جواب: اس اعتراض کا ایک جواب وہاں پر دیا گیا تھا کہ یہ ارشادگرامی خاص جنگ حنین کے بارے میں تھا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں صرف خمس ہی لیا تھا۔ لیکن وہ جواب یہاں چلنا مشکل ہے، کیوں کہ یہاں جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا ہے: لَا یحل لي من غنائمکم مثل هذا. یعنی کسی بھی غنیمت سے میرے لیے خمس کے علاوہ کچھ حلال نہیں ہے۔ اور وہاں الفاظ یہ تھے کہ لیس لیَ من هذا الفیٔ شیٔ لہٰذا وہ جواب وہاں ہی چل سکتا ہے یہاں نہیں چلے گا۔ اس لیے دوسرا جواب یہ ہے:

(۲) اس کا جواب خود امام ابوداؤد نے ترجمۃ الباب میں لفظ امام کی قید لگا کر دیدیا ہے کہ آپ ﷺ امام بھی ہیں اور نبی بھی ہیں اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد امام ہونے کی حیثیت سے تھا۔ باقی نبوت کی حیثیت سے جو دو حصے ملتے تھے ان کا یہاں ذکر نہیں ہے۔

ترجمة الباب: جب حضور ﷺ کے لیے ایک بال کے برابر بھی حلال نہیں تو دیگر حضرات کے لیے بدرجہ اولیٰ قبل التقسیم کچھ بھی حلال نہیں ہوگا۔

﴿باب في الوفاء بالعهد﴾

عہد کو پورا کرنے کا بیان

۱۰۶ ﴿حدثنا: عبدُ اللّٰه بن مَسْلَمَةَ القعْنِبِيُّ عن مالكٍ عَنْ عبدِ اللّٰه بنِ دينارٍ عَن ابنِ عُمَرَ أنَّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: إن الغَادِرَ يُنْصَبُ لَهٗ لواءٌ يومَ القيامة فيقالُ: هٰذِهٖ غَدْرَةُ فُلانِ بنِ فُلانٍ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عہد توڑنے والے کے لیے قیامت کے دن ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے، اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی ہے۔

تشریح مع تحقیق: يُنْصَبُ (ضَ) کھڑا کرنا، گاڑنا، بلند کرنا۔ مضارع مجہول ہے۔

غَدْرَةٌ دھوکا، بے وفائی خیانت، عہد شکنی، بے ایمانی۔

یہاں سے امام ابوداؤدؒ ایک بہت اہم بات بیان کر رہے ہیں کہ عہد شکنی بڑا سنگین جرم ہے، اگر کسی کا کسی سے کوئی عہد ہو جائے تو اس کو توڑنا نہیں چاہیے، کیوں کہ قیامت کے دن ایسے شخص کو جو عہد شکن ہو رسوا کیا جائے گا،

اور حضور اکرم ﷺ نے اس رسوائی کی ایک علامت بھی بتلادی ہے کہ ایسے عہد شکن کے لیے ایک جھنڈا کھڑا کیا جائے گا تا کہ لوگ اس کو دیکھ لیں اور یہ خوب رسوا ہو۔

اشکال: یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے رسوائی کے لیے جھنڈے کو ہی خاص کیوں فرمایا کوئی اور چیز ہی بیان کر دیتے۔

جواب: ایک جواب تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی حکمت کو حضور ہی جان سکتے ہیں۔ دوسرا جواب جو استاذ محترم نے دوران درس دیا تھا کہ اہل عرب میں عموماً ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص عہد شکنی کرتا تو اس کے مکان پر ایک سیاہ جھنڈا کھڑا کر دیا جاتا تھا جس سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ فلاں شخص عہد شکن ہے اور وفا کے لیے سفید جھنڈا بھی گاڑ دیتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہو۔ (فتح الباری ۶/ ۳۴۸، تکملہ فتح الملہم: ۲۶/۳)

ترجمة الباب: جس جرم پر سزا وارد ہو یقیناً وہ ناجائز ہی ہوگا، اور اس کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اب ترک وفا ایک جرم ہے جس پر سزا وارد ہوئی، لہٰذا دلالۃً ثابت ہوا کہ وعدہ پورا کرنا ضروری ہے۔

﴿باب في الإمام يستجن به في العهود﴾

عہد و پیماں میں امام کے ذریعہ پناہ حاصل کرنے کا بیان

۱۰۷ ﴿حدثنا: محمد بنُ الصباحِ البَزّازُ نا عبدُ الرحمن بنُ أبي الزِنَادِ عَنْ أبي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قال قال: رسول اللّٰهِ ﷺ : إنما الإمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ بِهِ﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امام ایک ڈھال ہے جس کے ذریعہ قتال کیا جاتا ہے (اس کی رائے اور حکم سے قتال کیا جاتا ہے)

تشریح مع تحقیق: یستجن: یہ جَنٌّ سے ماخوذ ہے اور جَنّ کے مادے میں چھپانے اور پوشیدگی کے معنی پائے جاتے ہیں، مثلاً جنین ہے: وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں ہو کیوں کہ یہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح جنت ہے چوں کہ جنت بھی انسان سے پوشیدہ ہے حاصل یہ ہے کہ اس کے مادے میں پوشیدگی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ جُنّة کے معنی ڈھال کے ہیں۔ کیوں کہ اس سے بھی آدمی اپنے کو دشمن سے چھپاتا ہے۔

اس حدیث کو امام بخاری نے "باب یقاتل من وراء الإمام" اور امام مسلم نے "باب الإمام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به" میں ذکر کیا ہے، اور مطلب اس کا یہ ہے کہ امام پوری رعایات اور تمام مسلمانوں کے لیے چھپاؤ اور بچاؤ کا سامان ہوتا ہے اگر مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان صلح کرلے جس کی وجہ سے مسلمان

مشرکین کی تکلیفوں اور اذیتوں سے محفوظ رہیں، تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کئے ہوئے عہد کو پورا کریں، نیز امام کی رائے اور اس کے حکم سے ہی قتال کیا جاتا ہے، حاصل یہ ہے کہ امام کی بہت بڑی حیثیت ہے۔

(بذل:۴/۵۶۔تکملہ فتح الملہم:۳/۳۲۲)

ترجمة الباب: ''إنما الإمام جنة يقاتل به'' سے ثابت ہو رہا ہے۔

۱۰۸﴿أحمدُبنُ صالحٍ نا عبدُ اللّٰه بنُ وَهْبٍ أخبرَنِي عَمْروٌ عَن بُكَيْرِ بْنِ الأشَجِّ عَنِ الحَسَنِ بنِ عَلِيِّ بنِ أبي رافعٍ أنَّ أبا رافعٍ أخبرَهُ قال: بَعَثَنِي قُرَيْشٌ إلىٰ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم؛ فَلَمَّا رَأَيتُ رسولَ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أُلْقِيَ فِي قَلْبِي الإسلامُ فقلتُ: يارسولَ اللّٰه! إنِّي وَاللّٰهِ لَا أرجعُ إليهِمْ أبدًا، فقَالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إنِّي لَا أخِيسُ بالعَهْدِ، وَلَا أحْبِسُ البردَ، ولكنْ ارْجِعْ؟ فإنْ كَانَ فِي نَفْسِكَ الذِيْ فِي نَفْسِكَ الانَ فارْجِعْ؟ قَالَ: فَذهبتُ ثُمَّ أتيتُ النَّبِيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم فأسلَمْتُ، قَالَ بكيرٌ وأخبَرَنِي أنَّ أبا رافعٍ كانَ قبطيًا، قالَ أبو داؤد:هذا كانَ في ذٰلك الزَّمانِ واليومُ لا يَصلُحُ.﴾

ترجمہ: حضرت ابورافعؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ قریش نے مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام ڈال دیا گیا (اسلام کی رغبت، خوبی اور قبولیت دل میں پیدا ہوگئی) میں نے کہا کہ یارسول اللہ! خدا کی قسم میں کفار کی طرف ہرگز لوٹ کر نہیں جاؤں گا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں عہد نہیں توڑتا ہوں، اور نہ ہی قاصد کو قید کرتا ہوں، تم قریش کی طرف لوٹ جاؤ، پس اگر تمہارے دل میں وہ چیز رہی جو اب ہے (اسلام کی رغبت) تو واپس آجانا، ابورافعؓ کہتے ہیں کہ میں کفار کی طرف چلا گیا پھر حضور ﷺ کے پاس آکر اسلام قبول کیا (اسلام کا اظہار کیا) بکیر نے کہا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ابورافع قبطی تھے امام ابوداؤدؒ نے کہا کہ یہ حکم اس زمانے کا تھا اب مناسب نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق :أخِيسُ (ض) خاس بالعهد: بدعہدی کرنا، عہد توڑنا۔

البُرُد، بَرِيْدٌ کی جمع ہے بمعنی قاصد۔

حدیث بالا میں دو باتوں کا ذکر ہے کہ ایک تو حضرت ابورافعؓ کے اسلام کا تذکرہ، دوسرے حضور ﷺ کے معاہدہ نہ توڑنے کا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار نے حضرت ابورافعؓ کو کسی کام کی وجہ سے حضور ﷺ کے پاس بھیجا، جب یہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایمان واسلام کی محبت ڈال دی، چنانچہ انہوں نے

حضور ﷺ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں کفار کے پاس اب جانا نہیں چاہتا بلکہ آپ ﷺ کے پاس ہی رہوں گا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بھائی ہم عہد شکنی نہیں کرتے، شارحین لکھتے ہیں کہ یہاں پر عہد سے مراد وہ عادت ہے جو اس زمانے میں بھی موجود ہے کہ کوئی کسی کے قاصد کو نہ قتل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کو قید کر سکتا ہے، اتنی بات سننے کے بعد ابورافعؓ واپس آگئے اور پھر دوبارہ حاضر خدمت ہوئے اور اسلام کا اظہار کیا کیوں کہ اصل میں تو وہ پہلے ہی اسلام لا چکے تھے۔

قال ابو داؤد: یہاں سے امام ابوداؤدؒ یہ فرمار ہے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اگر کفار کی طرف سے کوئی قاصد آئے اور دارالاسلام میں ہی اسلام قبول کرلے، کفار کی طرف جانے سے انکار کردے تو اس کو کفار کی طرف واپس نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ حکم تو حضور ﷺ کے دور مبارک میں تھا، اب چوں کہ اگر واپس دارالحرب میں بھیج دیا تو دوبارہ کفار اس کو آنے نہیں دیں گے۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو حضرت ابورافعؓ کا اسلام لانا بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا اور آپ کو یہ بھی یقین تھا بلکہ خدا کی طرف سے خبر دیدی گئی تھی کہ ابورافعؓ ضرور بالضرور واپس آجائیں گے، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو واپس بھیج دیا تھا اگر آپ ﷺ ابورافعؓ کو اپنے پاس ہی ٹھہرنے کی اجازت دیدیتے تو لوگوں میں یہ بات پھیل جاتی کہ محمد ﷺ تو قاصدوں کو روکتے ہیں، پھر اس کی وجہ سے بادشاہوں کے پاس خطوط بھیجنا اور دیگر خبریں پہنچانا سب چیزوں کا سدّباب ہو جاتا۔ اس وجہ سے آپ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ابورافعؓ صلح حدیبیہ کی مدت میں آئے تھے، اور صلح حدیبیہ میں یہ عہد ہو چکا تھا کہ ہمارا کوئی آدمی تمہاری طرف مسلمان ہو کر آئے تو تم مسلمان اس کو واپس کرو گے، اور اگر تمہارا کوئی آدمی ہمارے پاس آئے تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے، اس وجہ سے آپ ﷺ نے ان کو واپس بھیج دیا تھا، اور یہ وجہ اب باقی نہیں رہی ہے لہٰذا اس زمانے میں اگر کوئی مسلمان ہو کر آئے تو اس کو واپس نہیں بھیجا جائے گا۔

لیکن ابن تیمیہؒ کی اس تشریح پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ ابورافعؓ تو غزوہ بدر سے پہلے اسلام لائے ہیں اور جنگ عہد میں بھی شریک ہوئے ہیں پھر صلح حدیبیہ میں آنے کا کیا مطلب ہوگا؟

البتہ اس اشکال کا جواب ممکن ہے کیوں کہ ابورافعؓ نام کے دو شخص ہیں ایک وہ ہیں جو بدر سے پہلے اسلام لائے ہیں، اور ایک وہ ہیں جو صلح حدیبیہ میں اسلام لائے اور ان کو واپس کیا گیا تھا اس صورت میں کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ (بذل ۴/۵۶)

ترجمۃ الباب: ترجمۃ الباب اس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے کہ باب کا مقصد یہ ہے کہ امام عہد کرکے مسلمانوں کی دشمنوں سے حفاظت کرتا ہے اور اس حدیث میں بھی عہد کا ذکر موجود ہے لہٰذا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا۔

﴿باب في الإمام يكون بينه وبين العدو عهد فيسير نحوهٗ﴾

جب امام المسلمین اور دشمن کے درمیان عہد ہوتو امام المسلمین کا دشمن کی سمت جانیکا بیان

۱۰۹ ﴿حدثنا حفصُ بنُ عمرَ النَمرِيُّ ناشعبةُ عَن أبي الفَيضِ عَنْ سُلَيم بنِ عامرٍ رجلٍ مِن حِمْيرَ قال: كانَ بَيْنَ معاويةَ وبَيْنَ الرُّوْمِ عَهْدٌ، وكان يَسِيْرُ نَحْوَبلادِهِمْ حَتّى إِذَا انْقَضَ العَهْدُ غَزاهُمْ، فَجاءَ رجلٌ على فَرَسٍ اَوْ بِرْذَوْنٍ وهو يقول: اللّٰه أكبر اللّٰه أكبر وفاءَ لَا غَدْرٌ فَنظَرُوْا فإِذَا عَمروبنُ عَبْسَةَ، فارسَلَ إليهِ معاويةُ، فسأله فقال: سمعتُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: مَنْ كَانَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يُشَدُّ عَقْدَةً وَلَا يَحلُّهَا حَتّٰي يَنقَضِيَ أمدُهَا أو يَنْبذ إِلَيْهِمْ عَلٰى سواءٍ فَرَجَعَ معاويةُ﴾

ترجمه: قبیلہ حمیر کے ایک شخص سلیم بن عامر کہتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان میں عہد تھا، اسی دوران حضرت معاویہؓ ان کے شہروں کی سمت چلنے لگے، کہ جب عہد کی مدت گذر جائے گی تو ان پر حملہ کردیں گے، اتنے میں ایک شخص عربی یاتر کی گھوڑے پرسوار ہوکرآیا اور یہ کہا کہ اللہ اکبراللہ اکبر! وفا ہوغدر نہ ہو، لوگوں نے بڑے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو عمرو بن عبسہ صحابی ہیں، حضرت معاویہؓ نے ان کوفوراً اپنی طرف بلایا اوران سے سوال کیا (کہ ہمارا یہ چلنا غدر کیوں ہے یا یہ پوچھا کہ یہ اعلان کیوں کرر ہے ہو) انہوں نے جواب دیا کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی شخص اور کسی قوم کے درمیان عہد ہوتو جب تک اس عہد کی مدت نہ گزرجائے تب تک عہد کو نہ توڑے اور نہ نیا عہد کرے، یا برابری پر عہد کو توڑے حضرت معاویہؓ یہ سن کروہاں سے واپس آ گئے۔

تشریح مع تحقیق: فرس۔عموماً عربی النسل گھوڑے کو کہتے ہیں۔

بِرذَوْنٌ، براذین ترکی گھوڑا۔

يَشُدّ (ن) باندھنا۔ عقدة : گرہ۔

يحل (ن) گرہ کھولنا۔

ينبذ (ض) پھینکنا، نبذ العهد: عہدتوڑنا۔

جب دشمن کے ساتھ معاہدہ ہوجائے کہ فلاں مدت تک نہ ہم تم سے لڑیں گے اور نہ تم ہم سے لڑو گے تم اپنے

شہر میں رہواور ہم اپنے شہر میں رہیں، تو اس مدت کے دوران امیر المسلمین کا دارالاسلام سے دارالحرب کے قریب سرحد پر آجانا کہ جب ہی معاہدے کی مدت پوری ہوگی تو فوراً حملہ کردیا جائے گا یہ بھی نقض عہد ہے، جیسا کہ حدیث بالا کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمرو بن عبسہؓ نے حضرت معاویہؓ کو رومیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو فوراً حضور ﷺ کا ارشاد گرامی سنایا کہ عہد کی مدت میں نہ عہد کی گرہ کو مضبوط کرو اور نہ ڈھیلا کرو، (یہ ایک محاورہ ہے جس سے عہد کی مضبوطی کی نفی نہیں ہے بلکہ توڑنے کی نفی ہے اور یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی سامان خریدتے وقت دوکاندار سے کہے کہ کچھ کمی بیشی کردو، حالاں کہ یہاں کمی مقصود ہوتی ہے نہ کہ زیادتی، ایسے ہی یہاں پر ہے) چنانچہ آپ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ معاہدے کو توڑا نہ جائے بلکہ اس کو پورا کیا جائے، اور اگر توڑنا ہی ہے تو پہلے دشمن کی طرف معاہدہ پھینک دو یعنی دشمن کو خبر کردو، تا کہ دونوں فریقوں کو نقض کا علم ہوجائے اور دونوں فریق کو تیاری کے ساتھ لڑنے کا موقع ملے، یہ ایک اسلام ہی کا نمایاں کردار ہے ورنہ دنیا کے تمام مذاہب اس اعلیٰ کردار سے عاری نظر آتے ہیں۔

ترجمة الباب: وکان یسیر نحو بلادھم الخ سے ثابت ہورہا ہے۔

﴿بابٌ في الوَفَاءِ للْمُعَاهِد وَحُرمَةِ ذِمَّتِه﴾

معاہدہ کو پورا کرنے کا بیان، اوراس کے خون کے حرام ہونے کا بیان

۱۱۰ ﴿حدثنا: عثمان بنُ أبي شَيْبَةَ ناوكيعٌ عَنْ عُيَيْنَةَ بنِ عبدِ الرحمن عَنْ أبيهِ عَنْ أبي بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم: مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا في غَيرِ كُنْهِهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ﴾

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے کسی معاہد کو ایسے وقت میں قتل کردیا جس میں اس کا قتل جائز نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص پر جنت کو حرام فرمادیا ہے۔

تشریح مع تحقیق: ذمّة. (ج) ذِمَمٌ بمعنی عہد، امان، ذمہ داری۔

الكُنْهُ، اصل شی، حقیقت شیٔ، غایت، وقت.

مُعَاهِدٌ. بفتح الهاء وکسرها، جب "ہ" کے کسرے کے ساتھ پڑھیں گے تو معاہد سے مراد وہ شخص ہوگا جو امام المسلمین کے پاس آکر لڑائی کے ترک پر معاہدہ کرے۔ اور جب "ہ" کے فتحہ کے ساتھ پڑھیں گے تو یہ اسم مفعول ہوگا یعنی وہ شخص جس سے امام المسلمین لڑائی کے ترک پر عہد کرلے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ فرماتے ہیں کہ معاہد عام ہے جس میں ذمی اور حربی دونوں ہی شامل ہیں چنانچہ جس سے بھی عہد ہو جائے خواہ ذمی ہو یا حربی وہ معاہد ہے اس سے قتل جائز نہیں ہے تا آں کہ معاہدے کو ختم کر دیا جائے۔ نیز امام سے عہد کر لینا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جمیع المسلمین سے عہد ہو گیا ہو۔

اب حدیث شریف کا مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کسی معاہد کو قتل کر دے خواہ وہ معاہد مؤقت ہو یا غیر مؤقت یعنی مستامن ہو یا ذمی ہو تو یہ قتل کرنا جائز نہیں، مگر یہ کہ معاہدہ ختم کر لیا جائے اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کے لیے حضور ﷺ کی وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر جنت کو حرام فرما دیں گے، بخاری شریف میں ہے کہ کسی معاہد کا قاتل جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا۔ حالاں کہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت کی دوری سے ہی آئے گی۔ اصل میں اس سے تہدید مراد ہے یا دخول اوّلین مراد ہے۔

ترجمة الباب: مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا فِي غير كُنْهِهِ. الخ. سے ثابت ہے۔

﴿بابُ فِي الرسل﴾

قاصدوں کا بیان

١١١ احد ثنا: محمد بنُ عمروٍ الرَّازِيُّ ناسَلَمَةُ يَعْنِيْ ابنَ الفَضْلِ عَنْ محمد بن اِسحٰق قَالَ: كان مُسَيْلَمَةُ كَتَبَ إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم قال وَقَدْ حَدَّثَنِيْ محمدُ بنُ اسحاقَ عَنْ شَيْخٍ مِنْ أَشْجَعَ يقالُ له سعدُ بنُ طَارِقٍ عَنْ سَلمةَ بنِ نعيمِ بنِ مَسْعُوْدٍ الْأشجعيُّ عَنْ أَبِيْه نَعِيْمٍ قَالَ سَمِعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ لَهُمَا حِيْنَ قَرَاءَ كتابَ مُسَيْلَمَةَ مَا تَقُوْلَانِ أنتمَا؟ قَالَا: نَقُوْلُ كَمَا قَالَ، قَالَ: لَوْلَا أن الرُّسُل لَا تُقْتَلَ لضَرَبْتُ أَعْنَاقَكُمَا.

ترجمہ: محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ مسیلمہ کذاب نے حضور ﷺ کے پاس ایک خط لکھا، سلمہ بن الفضل کہتے ہیں کہ مجھ سے محمد بن اسحاق نے قبیلہ اشجع کے ایک شیخ سعد بن طارق عن سلمہ عن نعیم کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نعیم نے حضور ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے مسیلمہ کا خط پڑھ کر اس کے قاصدوں سے کہا کہ تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم وہی کہتے ہیں جو مسیلمہ نے کہا ہے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصد قتل نہیں کیے جاتے تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔

تشریح مع تحقیق: حِيْنَ قَرَأَ ابوداؤد کے اکثر نسخوں میں یہ فعل معروف ہی نقل کیا ہے اور یہ ہی

راجح ہے، البتہ "العون" میں اس کو مجہول استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کے سامنے ان قاصدوں نے اس خط کو پڑھ کر سنایا، اس کے بعد ان قاصدوں سے کہا کہ تم کیا کہتے ہو؟ یعنی تمہارا ایمان کس پر ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو مسیلمہ نے خط میں لکھا ہے ہم اسی کے قائل ہیں۔

ضَرَبَ العنق: سر قلم کرنا، گردن مارنا، قتل کرنا۔

ہم اوّلاً یہ بیان کرتے ہیں کہ امام ابوداوٗدؒ نے اس حدیث شریف کی دو سندیں ذکر کی ہیں۔ پہلی سند میں محمد بن اسحاق کے بعد کسی کا واسطہ نہیں ہے بلکہ سند منقطع ہے اس لیے امام ابوداوٗد نے دوسری سند ذکر کی ہے جس میں محمد بن اسحاق کے بعد سعد بن طارق اور سلمہ بن نعیم نیز نعیم جو صحابی ہیں کا واسطہ ہے، اب یہ سند متصل ہوگئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسیلمہ ایک شخص کا نام ہے، جس نے حضور ﷺ کے مبارک دور میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا، اسی لیے اس کو مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے دو ایلچی حضور اکرم ﷺ کے پاس ایک خط لے کر بھیجے، کہا جاتا ہے کہ ان دونوں قاصدوں میں سے ایک کا نام عبداللہ بن نواحہ اور دوسرے کا نام ابن اثال تھا، مسیلمہ نے اس خط میں اپنی نبوت کا دعویٰ کیا تھا، مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ جب دونوں قاصد حضور ﷺ کے پاس آئے اور خط پڑھا تو آپ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا کہ کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول اور پیغمبر ہوں؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ نہیں، بلکہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے، حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر قاصدوں کو قتل نہ کیا جاتا تو آج میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ (مظاہر حق: ۵۹۴/۴)

ترجمة الباب: لولا أن الرسل لا تقتل لضربت أعناقكما۔ سے ثابت ہے۔

۱۱۲ ﴿حدثنا: محمد بنُ كثيرٍ أنا سفيانُ عَنْ أبي إسحاقَ عَن حارثةَ بنِ مُضَرِّبٍ أنَّه أتىٰ عبدَاللّٰه فقال: مَا بَيْنِي وَبَيْنَ أَحَدٍ مِنَ العَرَبِ حِنَةٌ، وَإِنِّي مَرَرْتُ بِمَسْجِدٍ لِبَنِي حَنِيْفَةَ فَإِذَا هُمْ يُؤْمِنُوْنَ بِمُسَيْلمَةَ، فأرسَلَ إِلَيْهِمْ عبدُ اللّٰه، فجيئ بِهِم، فاستَتَابهم، فتَابُوْا غَيرُ ابنِ النَّوَاحَةَ، قَالَ لَه سمعتُ رسولَ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: لولَا. أنَّكَ رسولٌ لضَرَبْتُ عُنُقَكَ، فأنْتَ اليومَ ليستَ بِرَسُوْلٍ فَأمرَ قُرْظَةَ ابنَ كعبٍ فضَرَبَ عنقَهُ في السُوقِ، ثم قال: مَنْ أَرَادَ أن يَنْظُرَ إِلىٰ ابنِ النَّوَاحَة قَتِيْلًا بالسُّوْقِ.﴾

ترجمہ: حضرت حارثہ بن مضرب سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا، اور عرض کیا کہ میرے اور کسی بھی عرب کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے، میں بنو حنیفہ کی ایک مسجد سے گذرا تو لوگوں کو دیکھا کہ وہ مسیلمہ پر ایمان لے آئے ہیں، (یہ سن کر) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان لوگوں کو بلا بھیجا، جب ان کو لایا گیا تو ان سے توبہ کرنے کو کہا گیا، ابن نواحہ کے علاوہ سب نے توبہ کر لی، ابن نواحہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ

میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر تو قاصد نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا، آج تو قاصد نہیں ہے، پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قرظہ بن کعبؓ کو (اس کے قتل کرنے کا) حکم دیا، انہوں نے بازار میں اس کی گردن اڑادی، اور فرمایا کہ جو شخص ابن نواحہ کو مرا ہوا دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کو بازار میں پڑا ہوا دیکھ لے۔

تشریح مع تحقیق :حِنَة. صاحب بذل نے اس کے معنی لکھے ہیں: عداوت، دشمنی، حسد اور بغض کے، اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ کلام اس لیے پیش کیا تا کہ میری مندرجہ ذیل بات قابل اعتماد ٹھہرائی جائے، اور اس کو سن کر اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

فَاسْتَتَابَهُمْ (استفعال) توبہ طلب کرنا، کسی سے توبہ کے لیے کہنا۔

فَتَابُوْا (ن) توبہ کرنا، ابوداوٗد کے اکثر نسخوں میں یہ لفظ نہیں ہے بعض نسخوں میں یہ لفظ موجود ہے۔ جن نسخوں میں فتابوا کی زیادتی نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابن نواحہ سے توبہ طلب ہی نہیں کی گئی تھی، اور جن نسخوں میں فتابوا کی زیادتی ہے اس صوت میں مطلب یہ ہوگا کہ توبہ سب سے طلب کی گئی اور سب نے توبہ کرلی لیکن ابن نواحہ نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے اس کو قتل کیا گیا، لیکن راجح بات یہ ہے کہ ابن نواحہ سے توبہ طلب ہی نہیں کی گئی تھی۔

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مسیلمہ نے حضور ﷺ کے زمانے میں ہی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا، لیکن حضور ﷺ کے زمانے میں اس کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں اس کو قتل کیا گیا تھا، کتب تاریخ کے حوالے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کو حضرت وحشیؓ نے قتل کیا تھا۔

مسیلمہ کذاب نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس کے بہت سے متبعین ہو گئے تھے جن کی تعداد ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی تھی، ان ہی مرتدین میں قبیلہ بنو حنیفہ بھی تھا، ایک دن حضرت حارثہ بن مضرب بنو حنیفہ کی ایک مسجد سے گزرے تو دیکھا کہ یہ لوگ مسیلمہ پر ایمان لا چکے ہیں اور دین محمدی سے مرتد ہو گئے ہیں، یہ فوراً ہی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس پہنچے اور پورا واقعہ ذکر کیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت ''کوفہ'' کے گورنر تھے انہوں نے سب قبیلہ والوں کو بلایا اور فرمایا کہ توبہ کرو، بذل کے نسخے میں ہے کہ سب نے توبہ کرلی لیکن ابن نواحہ نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا، چوں کہ یہ ہی ابن نواحہ ہے جو حضور ﷺ کے پاس مسیلمہ کا خط لے کر گیا تھا، اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر تو قاصد نہ ہوتا تو میں تجھ کو قتل کر دیتا، اب جب اس کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بلایا تو یہ قاصد نہیں تھا، اس وجہ سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا کہ آج تو قاصد نہیں ہے اس لیے تجھ کو قتل کیا جاتا ہے، یہ فرما کر قرظہ بن کعبؓ کو حکم دیا کہ اس کو قتل کر دو، انہوں نے بازار میں لے جا کر سب لوگوں کے سامنے قتل کر ڈالا، تا کہ لوگوں کو عبرت ہو

ان مذکورہ دونوں روایتوں سے مشترکہ طور پر یہ بات معلوم ہوئی کہ ایلچی (قاصد) کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، اوراس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اگر قاصدوں کو قتل کیا جانے لگا تو مراسلات اور مخاطبات کا راستہ بند ہو جائے گا، جس سے دین کی اشاعت اور تبلیغ میں بھی حرج واقع ہوگا۔

مرتد کا حکم شرعی

مرتد اگر مرد ہے خواہ آزاد ہو یا غلام، تو اس کا قتل کرنا جائز ہے، کیوں کہ ارتداد سے اس کی عصمت ختم ہو جاتی ہے، خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" کہ اگر کوئی شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اس کو قتل کردو، اس کے علاوہ تمام صحابہ کرامؓ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے گا۔

البتہ مرتد سے توبہ طلب کرنا، اور اسلام پیش کرنا مستحب ہے، کیوں کہ اس کے اسلام لانے کا احتمال بہر حال باقی ہے، لیکن واجب نہیں ہے، کیوں کہ اس کو اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہوتی ہے، لہٰذا اگر مرتد توبہ کرلے اور دوبارہ اسلام قبول کرلے تو فبہا، ورنہ تو امام کو اختیار ہے کہ قتل کردے، ہاں اگر پھر بھی امید ہو کہ یہ اسلام قبول کرسکتا ہے تو تین دن کی مہلت دی جاسکتی ہے۔

اور اگر عورت مرتد ہو جائے تو ہمارے نزدیک اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو اسلام لانے پر مجبور کیا جائے گا، جس کی شکل یہ ہوگی کہ اس مرتدہ عورت کو قید کیا جائے اور روزانہ قید سے نکال کر اسلام پیش کیا جائے، اگر اسلام لے آئے تو بہت اچھا ورنہ پھر دوبارہ قید کردیا جائے گا، اور اس کے ساتھ یہ صورت جاری ہی رہے گی یہاں تک کہ اسلام لے آئے، یا مرجائے، اس سلسلے میں ہماری دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لاتقتلوا امرأةً ولا وليداً.

البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مرتدہ عورت کو بھی قتل کیا جائے گا، اور استدلال میں حضور ﷺ کے فرمان کو لیا ہے، مَن بدّل دينه فاقتلوهٗ کیوں کہ یہ ارشاد عام ہے عورت اور مرد دونوں کو شامل ہے اور اس لیے کہ اباحت دم کی علت ارتداد ہے جو عورت کے اندر بھی موجود ہے۔ لہٰذا اس کو بھی قتل ہی کیا جائے گا۔

حنفیہ امام شافعی کی پیش کردہ حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ حدیث دوسری احادیث کی وجہ سے مردوں کے ساتھ خاص ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (بدائع: ۶/۱۱۸)

باب في أمان المرأة

عورت کے امان دینے کا بیان

۱۱۳ حدثنا: أحمدُ بنُ صالحٍ ثَنَا ابنُ وَهْبٍ أَخْبَرَنِي عِيَاضُ بنُ عبدِ اللّٰهِ عَنْ مِخْرَمَةَ بنِ

سُلَيْمَانَ عَنْ كُرَيْبٍ عَنِ ابنِ عباسٍ قَال حَدَّثني أُمُّ هَانِي بنتُ أبي طالبٍ أَجَارَتْ رَجُلاً مِنَ المُشرِكين يومَ الفتحِ، فأتَتِ النبيَّ صلى الله عليه وسلم فذكَرَتْ ذلك لهُ، قال: قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ وأَمَنَّا مَنْ أَمَنْتِ.

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے دن ایک مشرک کو پناہ دی اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر واقعہ کی اطلاع دی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو تم نے پناہ دیدی اس کو ہم نے بھی پناہ دیدی، اور جس کو تم نے امن دیدیا ہم نے بھی اس کو امان دیدی۔

تشریح مع تحقیق :أجارَتْ (افعال) پناہ دینا، مدد کرنا۔

اٰمَنْتِ: (افعال) امن دینا۔ بےخوف کرنا۔

فتح مکہ کے موقع پر ام ہانیؓ نے حارث بن ہشام کو پناہ دی تھی، ایک قول یہ بھی ہے کہ ہبیرہ بن وہب کو پناہ دی تھی، تیسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن ہشام کو پناہ دی تھی، بہرحال انہوں نے کسی شخص کو پناہ دی اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے اس کا ذکر بھی کیا تو حضور ﷺ نے اس کو جائز ٹھہرایا، اسی طرح حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص کو بھی پناہ دی تھی۔

اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور تمام فقہاء عراق وحجاز کے نزدیک عورت کے امان کا اعتبار کیا جائے گا، اور اگر عورت کسی کافر کو امن دیدے تو اس مستامن کافر کو قتل کرنا جائز نہیں ہوگا بعض لوگ مثلاً عبدالملک بن ماجشون اور سحنون عورت کے امان کو امام کی رائے پر چھوڑتے ہیں، کہ اگر امام المسلمین جائز رکھے تو جائز ہے، اور اگر جائز نہ رکھے تو عورت کے امان کا اعتبار نہیں ہوگا، لیکن علامہ عینی نے اس قول کی تردید کی ہے اس لیے کہ حضور ﷺ کا ارشاد یَسْعٰی بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ عورت کے امان کو بھی شامل ہے، جیسا کہ ہم حدیث کے ذیل میں مفصل بیان کرچکے ہیں، کہ کسی کے امان کو نہیں توڑا جائے گا خواہ امان دینے والا شریف ہو یا رضیع اسی طرح عورت ہو یا مرد، آزاد ہو یا غلام، قریب کا رہنے والا ہو یا دور کا رہنے والا، سب کے امان کو پورا کیا جائے گا۔ (فتح الباری: ۶/۳۳۶)

ایک مختلف فیہ مسئلہ

اگر عبد ماذون فی القتال کسی کافر کو امن دیدے تو بالاتفاق اس کے امان کا اعتبار ہوگا، اور اگر عبد غیر ماذون فی القتال ہے تو اس کے امان کے معتبر ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے جمہور علماء فرماتے ہیں کہ عبد غیر ماذون فی القتال کا امان دینا معتبر ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ عبد غیر ماذون فی القتال کا امان دینا غیر معتبر ہے، یہی قول امام ابویوسف کا ہے۔

فریق اوّل کی دلیل

یسعی بذمتهم أدناهم ہے اس لیے کہ یہاں ذمہ سے مراد عہد وامان ہے اور غلام ادنی مسلمین میں سے ہے لہذا حدیث شریف کے عموم میں عبد غیر ماذون لہ فی القتال بھی شامل ہوگا۔

فریق ثانی کی دلیل

دلیل تو امام ابوحنیفہؒ کی بھی ''یسعی بذمتهم أدناهم'' ہی ہے لیکن حنفیہ اس کو عام نہیں کہتے، بلکہ عبد ماذون لہ فی القتال کے ساتھ خاص مانتے ہیں، وجہ استدلال یہ ہے کہ ''ادنی'' یا تو ''دناءة'' سے ماخوذ ہے یا ''دُنُوّ'' سے ماخوذ ہے، دناء ۃ کے معنی تو ہیں خساست اور رذالت کے، اور دُنُوّ کے معنی ہیں قریب کے، اب یہاں دناء ۃ سے ماخوذ تو مان نہیں سکتے کیوں کہ حدیث کا مصداق مسلمان ہیں اور مسلمان کے ساتھ رذالت اور خساست نہیں ہوسکتی۔

اب دوسری صورت باقی رہی کہ اس کو دُنُوّ سے ماخوذ مانیں، اور یہ ہی متعین بھی ہیں دُنُوّ کے معنی قریب کے آتے ہیں اور عبد مجور یعنی عبد غیر ماذون لہ فی القتال قتال کی صف سے قریب نہیں ہوتا بلکہ دور ہوتا ہے اور ماذون لہ فی القتال خود صفوں میں ہی ہوتا ہے اسلئے اس پر ادنی کا اطلاق ہوگا نہ کہ مجور پر، اسلئے حدیث شریف عبد ماذون لہ فی القتال کو شامل ہوگی، حاصل یہ ہے کہ یہ اختلاف نص فہمی کا اختلاف ہے۔ (ماخوذ از بذل: ۵۳/۴۔ فتح الباری: ۳۳۶/۶، حاشیہ ابی داؤد: ۳۸۰/۲)

ترجمة الباب: حضرت ام ہانیؓ نے امان دیا اور حضور اکرم ﷺ نے اس کو جائز رکھا، اور باب کا مقصد بھی عورت کے امان کے جواز کو بتلانا ہے۔

۱۱۴ ﴿حدثنا: عثمان ابنُ أبي شَيْبَةَ قال نَا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ عَنْ منصورٍ عَنْ إبراهيمَ عن الأسودِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: إنْ كَانَتِ الْمَرْأَةُ لِتُجِيرُ عَلى المؤمِنِيْنَ فَيَجُوْزُ﴾

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر کوئی عورت کسی کافر کو پناہ دیتی تھی تو وہ جائز ہوتا تھا۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث میں حضرت عائشہؓ عورت کے امان دینے کے جواز کو بتلا رہی ہیں کہ اگر کوئی عورت کسی کافر کو پناہ دے دیتی تو اس کے امان کو جائز رکھا جاتا تھا اور اس کو کوئی نہیں توڑتا تھا۔

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب سے مناسبت بالکل واضح ہے۔

﴿باب في صلح العدوّ﴾

دشمن سے صلح کا بیان

۱۱۵ ﴿حدثنا محمد بنُ عُبَيدٍ أنّ محمدَ بنَ ثَوْرٍ حَدَّثهم عن مَعْمَرٍ عَن الزهريّ عنَ عُرْوَةَ

بنِ الزبيرِ عن المِسْوَرِ بنِ مِخْرمَةِ قَالَ: خَرَجَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم زَمَنَ الحديبيةِ في بِضْعِ عَشَرَ مائةٍ من أصحابهٖ، حتّٰى إِذَا كَانُوْا بِذِيْ الحُلَيفَةِ قَلَّدَ الهَدْيَ، وَأَشْعَرَ، وَأَحْرَمَ بالعُمْرَةِ، وَسَاقَ الحديث، قالَ وَسَارَ النَّبِيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم ، حتّٰى إذا كانَ بالثَّنِيَّةِ التي يُهْبَطُ عَلَيْهِمْ مِنْهَا بَرَكَتْ بهٖ رَاحِلتُهٗ ، فقالَ الناسُ: حَلْ حَلْ خَلَأَتِ القَصْوٰى مرّتَيْنِ. فقالَ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم : ما خَلَأَتْ وما ذٰلك لَهَا، ولكِنْ حَبَسَهَا حابسُ الفِيْلِ، ثم قال: والذِي نَفْسي بِيَدِهٖ لا يَسْأَلُوْنِيْ اليومَ خُطَّةً يعْظَمُوْنَ بِهَا حُرُمَاتِ اللّٰهِ إِلّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا ثم زَجَرَهَا فوثَبَتْ فَعَدَلَ عَنْهُمْ، حَتّٰى نَزَلَ بأقصٰى الحُدَيْبِيَّةِ على ثَمدٍ قَلِيلِ الْمَاءِ، فجاءَ ہ بُدَيْلُ بنُ وَرْقَاءَ الخُزَاعِيُّ ثم أتاهٗ يَعْنِي عروةَ بنَ مسعُوْدٍ، فَجَعَلَ يُكَلِّمُ النَّبِيَّ صلى اللّٰه عليه وسلم ، فَكُلَّمَا كَلَّمَهٗ أَخذَ بِلِحْيَتِهٖ، وَالْمُغِيرَةُ بنُ شَعْبَةَ قَائِمٌ عَلى النبيِّ صلى اللّٰه عليه وسلم ، وَمَعَهٗ السَيفُ وَعَلَيْهِ المِغْفَرُ، فَضَرَبَ يَدَهٗ بِنَعْلِ السَّيفِ وقال: أَخِّرْ يَدَكَ عَنْ لحيتِهٖ؟ فَرَفَعَ عروةُ رأسه فقال: مَنْ هٰذَا؟ قالوا: المغيرةُ بنُ شعبةَ، قال اى غُدَرُ أو لَسْتُ أسعٰى في غَدْرَتِكَ، وكانَ المُغِيْرَةُ صَحِبَ قوماً فِي الجَاهِلِيَّةِ فقتلَهُمْ وأخذَ أموالهُم، ثم جَاءَ فَأسلَمَ، فقال النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم : أما الإسلامُ فقد قَبِلْنَا، وأمَّا الْمالُ فَإِنَّهٗ مالُ غَدْرٍ، لاحاجةَ لَنَافِيهِ، فذكر الحديث. فقال النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم : أُكْتُبْ هٰذا ما قاضى عليه محمدُ رسول اللّٰه ، وقَصَّ الخَبَرَ؛ فقال سُهَيْلٌ: وَعَلٰى أنه لا يأتِيْكَ مِنَّا رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ على دِيْنِكَ إِلَّا رَدَدْتَهٗ إِلَيْنا، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ قَضِيَّةِ الكِتَابِ، قَالَ النَّبِيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم لأصحابهٖ: قُوْمُوْا فانحرُوْا ثم احلقُوا؟ ثم جَاءَ نِسوةٌ مُؤمناتٌ مهاجراتٌ الأية، فَنَهاهُم اللّٰهُ أن يَرُدُّوْهُنَّ، وَأَمَرَهُم أن يَرُدُّوْا الصداقَ، ثم رَجَعَ إلى المدينةِ فجاءَ ہٗ أَبُوْا بصِيرٍ رجلٌ مِنْ قُرَيشٍ يَعْنِي فأرسلُوْا في طلَبِهٖ فَدَفَعَهٗ إلى الرجُلَيْنِ، فَخَرَجَابِهٖ حتّٰى إِذَا بَلَغَا ذَا الحليفةِ نَزَلُوْا يَاكُلُوْنَ مِنْ تَمرٍ لَهُم، فَقالَ أَبُوْ بصيرٍ لأحدِ الرَجُلَيْنِ: وَاللّٰهِ إِني لَأَرىٰ سَيْفَكَ هٰذَا يافلانُ جَيِّدًا، فَاستَلَّهٗ الاٰخرُ فقَال: أَجَلْ قَدْ جَرَّبْتُ بِهٖ، فقال أبوبصير: أَرِنِي أَنْظُرْ إليهِ، فأمْكَنَهٗ مِنْه، فَضَرَبَهٗ حتّٰى بَرَدَ وَفَرَّ الاٰخِرُ حتّٰى أتى المدينة فدخل المسجدَ يَعْدُوْا ، فقَال النَّبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم : لَقَدْ رأى هٰذا ذُعْرًا، فقال: قُتِلَ وَاللّٰهِ

صَاحِبِي وَاِنِّي لمقتولٌ، فَجَاءَ أبوبصير، فقال: قَدْ أوفى الله ذِمَّتكَ ، فَقَدْ رَدَدْتَنِي إِلَيْهِمْ ثم نَجَّانِيَ اللهُ مِنْهُمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم : وَيْلُ أُمِّهِ، مِسْعَر حَرْبٍ، لَوْ كَانَ له أَحَدٌ ، فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ عَرَفَ أَنَّهُ سَيَرُدُّهُ إِلَيْهِمْ فَخَرَجَ حَتّٰى أتى سِيْفَ الْبَحْرِ، وَيَنْفَلِتُ أَبُوْ جَنْدَلٍ فَلَحِقَ بِأَبِي بَصِيرٍ حَتّٰى اجتمَعَتْ مِنْهُمْ عِصَابَةٌ﴾

ترجمہ: حضرت مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ حدیبیہ کے زمانے میں ایک ہزار سے زائد صحابہؓ کو لے کر نکلے، جب ذوالحلیفہ میں پہنچے تو ہدی کو قلادہ پہنایا، اشعار کیا اور عمرے کا احرام باندھا، اور پوری حدیث بیان کی، راوی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ وہاں سے چلے اور ''ثنیہ'' میں پہنچ گئے، جہاں سے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، وہاں جاکر آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی، لوگوں نے حل حل کہا، (یہ جملہ اونٹ کو اٹھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے) قصویٰ اڑ گئی قصویٰ اڑ گئی، دو مرتبہ یہ کہا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قصوی اڑی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی یہ عادت ہے لیکن حابس الفیل نے اس کو روک لیا ہے، پھر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے قریش مجھ سے آج ایسی چیز کا مطالبہ کریں گے، جس میں اللہ کے حرم کی تعظیم ہوگی، اور میں ان کو وہ ہی دوں گا، (اس کے بعد) اس (اونٹنی) کو ڈانٹا تو وہ تیزی سے اٹھی پھر آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی راہ سے ہٹ گئے، (اور حدیبیہ کی طرف چلنے لگے) یہاں تک کہ منتہائے حدیبیہ پر تھوڑے پانی کے گڑھے پر اترے، اس وقت بدیل بن ورقار خزاعی حضور ﷺ کے پاس آیا، اس کے بعد عروہ بن مسعود آئے اور نبی کریم ﷺ سے گفتگو کرنے لگے، جب یہ آپ ﷺ سے گفتگو کرتا تو آپ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کو پکڑتا، حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ حضور کے پاس تلوار لیے ہوئے خود پہنے ہوئے کھڑے تھے، انہوں نے عروہ کے ہاتھ پر تلوار کی نعل ماری اور کہا کہ حضور کی داڑھی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر، یہ سن کر عروہ نے سر اٹھایا اور کہا یہ کون؟ لوگوں نے بتلایا کہ مغیرہ ابن شعبہ ہیں تو عروہ نے کہا غدار کیا میں نے تیرے غدر کی اصلاح میں کوشش نہیں کی تھی (اور واقعہ کی تفصیل یوں ہے) کہ مغیرہ جاہلیت میں چند لوگوں کے ساتھ گئے تھے پس ان کو قتل کیا اور ان کا مال لوٹ لیا پھر آکر مسلمان ہو گئے تھے تو نبی ﷺ نے فرمایا بہر حال اسلام تو اس کو ہم نے قبول کیا اور رہا مال تو وہ غدر کا مال ہے ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پھر مسور نے حدیث بیان کی، اور نبی ﷺ نے فرمایا کہ لکھو یہ وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ نے فیصلہ کیا ہے پھر سارا واقعہ بیان کیا، پس سہیل نے کہا اور اس شرط پر کہ ہم میں سے جو آدمی آپ کی طرف آئے گا اگر چہ آپ کے دین پر ہو تو آپ کو واپس کرنا ہوگا، پس جب صلح نامہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور نحر کرو پھر حلق کرو، پھر کچھ مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو واپس کرنے سے منع فرمادیا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ کفار کو ان کا دیا ہوا مہر واپس کردیں، پھر آپ ﷺ مدینہ واپس آئے تو ابو بصیر جو قریشی تھے آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، قریش نے ان کو

بلانے کے لیے دو آدمیوں کو بھیجا تو آپ ﷺ نے ابوبصیر کو ان دو آدمیوں کے حوالے کر دیا پس وہ دونوں ابوبصیر کو لے کر نکلے یہاں تک کہ جب ذوالحلیفہ میں پہنچے تو وہ اپنی کھجور کھانے کے لیے اترے، ابوبصیر نے ان میں سے ایک سے کہا اے فلاں! تمہاری یہ تلوار مجھے بڑی عمدہ معلوم ہوتی ہے تو دوسرے نے اس کو میان سے نکال کر کہا ہاں میں اس کو آزما چکا ہوں تو ابوبصیر نے کہا مجھے دکھلایئے میں اسے دیکھوں گا تو اس نے ابوبصیر کو اس پر قابو دیدیا تو اس کو مارا حتی کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا، دوسرا وہاں سے بھاگا یہاں تک مدینہ پہنچا اور مسجد میں دوڑتا ہوا داخل ہوا تو اسے دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس نے کوئی گھبراہٹ کی چیز دیکھی ہے، اس نے کہا واللہ میرا ساتھی قتل کر دیا گیا، میں بھی یقینی طور پر مارا گیا ہوتا اتنے میں ابوبصیر آگئے اور عرض کیا کہ اللہ نے آپ کے ذمہ کو پورا کر دیا اس لیے کہ آپ نے مجھے ان کو واپس کر دیا تھا اور اللہ نے مجھے ان سے نجات دی، تو آپ ﷺ نے فرمایا تعجب ہے یہ لڑائی کو بھڑکانے والا ہے اگر اس کا کوئی ساتھی ہوتا، اس کو سنا تو سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ مجھے پھر کافروں کے حوالے کر دیں گے، تو وہ وہاں سے نکلے اور ساحل سمندر پر مقیم ہو گئے، اور ابوجندلؓ رہا ہو کر آئے پس ابوبصیر سے لاحق ہو گئے حتی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جمع ہو گئی۔

تشریح مع تحقیق :يُهْبَطُ (ض) اترنا، اوپر سے نیچے آنا۔

حَلْ حَلْ اونٹ کو ہنکانے کے لیے ایک لفظ ہے جس کو اہل عرب اس وقت بولتے ہیں جبکہ اونٹ بیٹھ جائے اور کھڑا نہ ہو۔

خَلَأَتْ (ف) اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، خَلَأَتْ النَّاقَة. اونٹنی کا اَڑ جانا۔

اَلْقَصْوَیٰ وہ اونٹنی جس کے کان کا ذرا سا کنارہ کٹا ہوا ہو، یہ حضور ﷺ کی اونٹنی تھی۔

خُلُقٌ عادت۔

خَطَّةٌ (ج) خُطَطٌ بمعنی منصوبہ، کام، شان،

ثَمَدٌ تھوڑا پانی کہ سردی کے موسم میں جمع رہے اور گرمی میں خشک ہو جائے۔

مِغْفَرٌ لوہے کی ٹوپی، خود۔

صَدَاقٌ (ج) صُدُقٌ بمعنی مہر، وہ عوض جو نکاح کے بعد عورت کو دیا جائے۔

فَاسْتَلَّهُ (استفعال) تلوار کو میان سے نکالنا۔

جَرَّبْتُ (تفعیل) آزمانا، تجربہ کرنا۔

مُسْعِرٌ (افعال) آگ بھڑکانے والا۔

امام ابوداؤدؒ نے اس باب میں صلح حدیبیہ سے متعلق ایک مفصل حدیث ذکر کی ہے، اس حدیث کو اچھی طرح سمجھنے

کے لیے ہم اس کے اہم اہم جملوں کی وضاحت کیا چاہتے ہیں تا کہ حدیث میں ذکر کردہ صورت حال واضح ہوجائے۔

صلح کی تعریف

اصل میں صلاح وصلوح کا اسم ہے، جوفساد وتباہی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ نظریہ توحید کے مطابق عالمگیر امن کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے تکمیل اسلام کے مطمح نظر کی تکمیل کی خاطر انسانی سلامتی اور آزادی کی حفاظت اور سیاسی وجنگی مصالح کے پیش نظر دشمن اقوام سے معاہدۂ امن کرلے، چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے سب سے بڑے دشمن کفار مکہ سے صلح کی، جوصلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس صلح کی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی، صلح حدیبیہ نے نہ صرف اسلام کی تبلیغ واشاعت کی راہ میں بڑی آسانیاں پیدا کیں بلکہ دنیا کو معلوم ہوگیا کہ اسلام انسانیت کے قیام کا حقیقی علم بردار ہے۔ مسلمانوں نے اس معاہدے کی پوری پوری پابندی کی، لیکن اس کی مدت پر تین سال گذرے تھے کہ کفار قریش نے حضور ﷺ کے حلیف بنوخزاعہ کے مقابلہ میں جنگ کرنے والے بنوبکر کی مدد کر کے اس معاہدے کو توڑ ڈالا، اور پھر یہ ہی فتح مکہ کا سبب بنا۔

قوله: زمن الحديبية: "حدیبیہ" مکہ مکرمہ سے مغربی جانب تقریباً ۱۶/۱۵ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے، اسی جگہ "جبل الشُّمَيسی" نام کا ایک پہاڑ ہے، حدود حرم یہاں سے بھی گزرتے ہیں، بلکہ اس جگہ کا اکثر حصہ حرم میں داخل ہے۔

قوله: بضع عشرة مائة: بِضعٌ کا اطلاق ۳ سے ۹ تک کی تعداد پر ہوتا ہے یہاں تعداد کو متعین کرنے کے بجائے مبہم اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس موقع پر صحابہ کی جو تعداد حضور ﷺ کے ساتھ تھی اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، بعض میں ۱۴۰۰/ ہے اور بعض میں ۱۵۰۰/ کا ذکر ہے اور بعض میں ۱۴۰۰/ سو سے کچھ زائد ہے۔ علماء کرام نے ان روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ابتدار میں حضور ﷺ ۱۴۰۰/ صحابہؓ کے ساتھ نکلے لیکن بعد میں مختلف مراحل پر اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ جس راوی نے سب سے پہلے شمار کیا اس نے ۱۴۰۰/ کی تعداد بیان کی، اور جس نے بعد میں آنے والے لوگوں کو بھی دیکھا اس نے ۱۵۰۰/ کی تعداد پائی، اور جس نے تعیین اور تحقیق نہیں کی اس نے اپنی روایت میں بضع عشرہ مائۃ کو ذکر کردیا۔

قوله: حَبَسَهُ حابس الفيل: اس میں اصحاب فیل کے قصے کی طرف اشارہ ہے، اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حبشہ کے بادشاہ کی طرف سے یمن میں ایک حاکم "ابرہہ" نام کا تھا، اس نے صنعاء (جو یمن کا ایک شہر ہے) میں اپنا کعبہ بنایا، قریش کو جب اس کی خبر ملی تو انہوں نے اس میں پاخانہ پیشاب کردیا ابرہہ کو غصہ آیا اور اس نے بہت بڑا لشکر ہاتھیوں کے ساتھ لاکر کعبہ شریف پر فوج کشی کردی، تا کہ کعبہ کو منہدم کردیا جائے، جب وادی "محسّر"

میں پہنچا جو مکہ کے قریب ہے تو سمندر کی طرف سے سبز اور زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے پرندے نظر آئے، ہر ایک کی چونچ اور پنجوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں، ان عجیب غریب پرندوں کے غول کے غول لشکر پر کنکریاں برسانے لگے، خدا کی قدرت سے وہ بندوق کی گولیوں سے زیادہ کام کرتی تھیں، جس سے بہت سے لوگ بھاگ گئے اور اکثر وہیں پر ہلاک ہوگئے، یہ واقعہ حضور ﷺ کی ولادت سے پچاس دن پہلے کا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ خاص ولادت کے دن کا ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی حفاظت کی۔ اب حضور ﷺ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح اللہ نے ''ابرہہ'' کے ہاتھیوں کو روکا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو یہاں روک دیا ہے، یہ خود نہیں بگڑی ہے۔

قوله : قوموا فانحروا الخ: احصار یعنی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لینے کے بعد اس حج یا عمرے کی ادائیگی سے روک دیئے جانے کی صورت میں یہی حکم ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ اپنی ہدی کو اسی جگہ ذبح کر ڈالے جہاں روک دیا گیا۔ اگر چہ وہ جگہ حدود حرم میں واقع نہ ہو اور وہ اپنے اس قول پر دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس موقع پر حدیبیہ میں ہی ہدی کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، جبکہ حدیبیہ حدود حرم میں نہیں ہے۔

لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک ہدی کا حدود حرم میں ذبح چونکہ شرط ہے اس لیے ان کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ حدیبیہ کا سارا علاقہ حدود حرم سے باہر نہیں ہے، بلکہ اس کا بعض حصہ حدود حرم میں ہے اور بعض حصہ حدود حرم سے باہر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہدی اس موقع پر حدود حرم والے حصہ میں ذبح کی گئی ہوگی۔ (ہدایہ:۲/۲۷۳)

قوله:أکتب هذا ماقاضى رسول الله: جب آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے تو حضور ﷺ نے صحابہؓ کو لے کر درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے بیعت لینی شروع کی، جس کو بیعت رضوانؓ کہتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ: ''لقد رضی الله عن المؤمنین. الخ''

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی، جب قریش کو اس بیعت جہاد کی خبر ہوئی تو صلح کے لیے پیغام بھیجنا شروع کیا، قبیلہ خزاعہ جو مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس کے سردار بدیل بن ورقاء نے آکر قریش کے اجتماع کی خبر دی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہم لڑائی کے لیے نہیں آئے بلکہ صرف عمرے کے لیے آئے ہیں، ہاں اگر قریش چاہیں تو عدم تعارض کے لیے صلح کرلوں گا، بدیل نے جا کر یہ خبر قریش کو دی، پھر عروہ بن مسعود آئے ان سے بھی یہ ہی گفتگو ہوئی، اخیر میں سہیل بن عمرو آئے اور صلح شروع کر دی، لیکن قدیم دستور کے مطابق بسم اللہ لکھنے کے لیے راضی نہیں ہوئے، بلکہ باسمك لکھوایا پھر حضور ﷺ نے فرمایا:هذا ما قاضى عليه رسول الله. سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو بیت اللہ سے نہ روکتے، اس لیے محمد بن عبد اللہ لکھیے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی سے فرمایا کہ رسول اللہ کو مٹا دو اور محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے فرط عقیدت کی وجہ سے مٹانے سے انکار کر دیا تو حضور ﷺ نے اس کو اپنے دست مبارک سے مٹا کر محمد بن عبد اللہ لکھا، پھر چند شرائط طے ہوئیں۔

(۱) دس سال تک لڑائی نہیں کریں گے۔

(۲) قریش کا جو آدمی بغیر اپنے ولی کی اجازت کے مدینہ آئے گا اس کو واپس کرنا ہوگا، اور مدینہ سے جو مسلمان مرتد ہوکر آئے اس کو ہم (کفار قریش) واپس نہیں کریں گے۔

(۳) اس سال بغیر عمرے کے واپس جانا ہوگا، اور آئندہ سال عمرہ کرنا ہوگا۔

(۴) عمرے کے دوران تین دن سے زائد رکنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) آئندہ سال جب عمرہ کروگے تو بغیر ہتھیاروں کے خالی ہاتھ مکہ میں آنا ہوگا۔

(۶) دوسرے قبائل کو اختیار ہوگا کہ مسلمانوں کے حلیف بن جائیں۔ (مسلم شریف باب صلح حدیبیہ)

قوله: ثم جاء نسوة مؤمنات. الخ: بخاری شریف میں ہے: ثم جاء نسوة مؤمنات فأنزل الله یایها الذین آمنوا إذا جاء کم المؤمنات. الخ اس لیے صحیح یہ ہے کہ ابوداؤد شریف میں مؤمنات کے بعد الآیہ سے پہلے یا یها الذین آمنوا الخ چھوٹ گیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے چند عورتیں مسلمان ہوکر آئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں آیت کریمہ یایها الذین آمنوا اذا جاء کم المؤمنات الخ نازل فرمائی کہ جو عورتیں تمہارے پاس مسلمان ہوکر آئیں ان کا خوب امتحان لے لو اور ان کے شوہروں کو ان کا مہر واپس کردو، حافظ بن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورتیں حدیبیہ کے وقت پر مسلمان ہوکر آئی تھیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ حدیبیہ کے بعد مدت صلح میں آئی تھیں۔

قوله: فنهاهم الله أن یردوهن الخ: یعنی جو عورتیں صلح کی مدت میں حضور ﷺ کے پاس مسلمان ہوکر آئیں اللہ تعالیٰ نے ان کو کفار کی طرف واپس کرنے سے منع فرمادیا، کیوں کہ صلح میں مردوں کی واپسی کرنے کی شرط تھی عورتوں کو بھی واپس کرنے کی شرط نہیں تھی۔

لیکن ایک روایت میں لفظ اَحدٌ ہے جو عورتوں اور مردوں کو شامل ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو بھی واپس کیا جائے گا، لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ لفظ احد والی روایت آیت قرآنی فلاترجعوهن إلی الکفار اور حدیث فنهاهم الله أن یردوهن الخ سے منسوخ ہے۔ (بذل ۴/۵۹۔ مرقاۃ: ۸/۷۹)

قوله: أن یردوا الصداق الخ. جو مہر ان کافروں نے ان مسلمان عورتوں کو دیا تھا اس کو واپس کردیا جائے، اور اگر کوئی مسلمان ان مہاجرات سے نکاح کرنا چاہے تو وہ ہی شخص کفار کو مہر واپس کرے، ورنہ بیت المال سے ان مہاجرات کا مہر واپس کردیا جائے، بعض تفاسیر کی کتب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حکم باقی نہیں ہے اور یہ اس وقت کی خصوصیت تھی، تفصیل کے لیے آیت مذکورہ کی تفسیر دیکھئے۔

قوله: وَیلُ أُمِّهِ الخ: اس کی ماں پر افسوس ہے، یہ کلمۂ ذم ہے، لیکن اہل عرب اس کو مدح میں بھی استعمال

کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ابوبصیر تو جنگ کی آگ بھڑکانے والا ہے کاش!اس کا کوئی مددگار ہوتا، یعنی کوئی خیر خواہ ہوتا جو اس کو یہ بتلادیتا کہ اب وہ میرے پاس لوٹ کر نہ آئے تا کہ میں اس کو دوبارہ واپس نہ کروں۔

قوله:فَلَمَّا سَمِعَ الخ: جب ابوبصیرؓ نے حضور اکرم ﷺ کی یہ بات سنی کہ آپ ﷺ ان کو واپس کرنا چاہتے ہیں تو وہ سمجھ گئے کہ اب یہاں پناہ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اس لیے کہیں دوسری جگہ چلے جانا چاہیے، کیوں کہ حضور ﷺ یقینی طور پر معاہدے کی پابندی کریں گے، چنانچہ حضرت ابوبصیرؓ وہاں سے ''سیف البحر'' کی طرف روانہ ہوگئے، اور وہاں جا کر پڑاؤ ڈال لیا، پھر جو بھی مسلمان ہوتا وہ ابوبصیرؓ سے جا کر مل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی ایک بہت بڑی جماعت بن گئی تھی۔

قوله:وينفلت أبو جندل الخ: ابوجندل بن سہیل کو حدیبیہ کے موقع پر ان کے والد مقام حدیبیہ سے واپس لے آئے تھے اور حضور ﷺ نے بڑی تسلی سے سمجھا کر بھیجا تھا۔ لیکن ایمانی جذبہ کہ پھر دوبارہ جا کر حضرت ابوبصیر سے جا ملے، دن بہ دن ان حضرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا حتی کہ تین سو کے قریب ان کی تعداد ہوگئی تھی، ان کا کام یہ ہوگیا تھا کہ جب بھی دشمنان اسلام قریش کا کوئی قافلہ ان کے پاس سے گزرتا تھا تو یہ لوگ ان سے سامان چھین لیا کرتے تھے، قریش ان کے اس عمل سے مجبور ہوگئے تو حضور ﷺ کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا کہ آپ ﷺ اللہ اور قرابت کے واسطہ سے ان لوگوں کو وہاں سے واپس بلالیں، اور ہم نے جو لوٹانے کی شرط لگائی تھی وہ ختم کرتے ہیں، حضور ﷺ نے ایک خط لکھا کہ ابوبصیر فوراً مدینہ آجائیں، لیکن جب حضور ﷺ کا خط پہنچا تو حضرت ابوبصیر کا آخری وقت تھا۔ حضور ﷺ کے والا نامے کو ہاتھ میں لیا اور دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب سے حدیث بالا کی مناسبت بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ پوری مفصل حدیث ہی صلح سے متعلق ہے۔

۱۱۶ ﴿حدثنا: محمدبنُ العَلَاءِ نا ابنُ إدريسَ قالَ سمِعْتُ ابنَ إسحاقَ عن الزهريِّ عَن عُروَةَ بنِ الزُّبَيْرِ عَن المِسْوَرِ بنِ مِخْرَمَة ومروانَ بنِ الحَكَمِ أنَّهم اصْطَلَحُوْا على وَضْعِ الحَرْبِ عَشَرَ سِنِيْنَ يَأمَنُ فِيهِنَّ النَّاسُ، وَ على أنَّ بَيْنَنَا عَيْبَةً مَكْفُوْفَةً وَأنَّهُ لَا إسْلَالَ وَلَا إغْلَالَ.﴾

ترجمه: حضرت مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت ہے کہ قریش مکہ نے جن باتوں پر صلح کی تھی ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ دس سال تک (فریقین میں) جنگ نہیں ہوگی، تا کہ لوگ ان دنوں میں امن وامان سے رہیں؛ اور یہ بات بھی صلح میں شامل تھی کہ بند صندوق ہوگا اور نہ اسلال ہوگا نہ اغلال ہوگا۔

تشریح مع تحقیق: عَيْبَةٌ (ج) عِيَبٌ آتی ہے۔ بمعنی کپڑوں کو محفوظ رکھنے کا صندوق، اس دور

میں اس کو سوٹ کیس وغیرہ کہا جاتا ہے، یہاں پر قلب کو صندوق سے تشبیہ دی گئی ہے کیوں کہ دل میں بھی بہت سی باتیں محفوظ رہتی ہیں۔

مکفوفة (ن) لپیٹنا، بند کرنا، مکفوف بمعنی بند شدہ، اور مطلب یہ ہے کہ ان ایام میں ہمارے دل دھوکہ بازی سے بالکل خالی رہیں گے کسی قسم کا کینہ نہیں ہوگا، جس طرح صندوق میں رکھے ہوئے کپڑے وغیرہ بالکل صاف رہتے ہیں۔

إسلال (افعال) چپکے سے کوئی چیز چرانا۔

إغلال (افعال) خیانت کرنا، ذرہ وغیرہ پہننا، مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل ہر قسم کی برائی سے پاک وصاف رہیں گے۔

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی لگائی گئی تھی کہ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ نہیں ہوگی، تاکہ ان دس سالوں میں لوگ امن وامان کے ساتھ زندگی گزاریں، حضور ﷺ نے بھی اس کو اسی وجہ سے منظور کیا تھا کہ اس میں بہت سا فائدہ ہے مثلاً کفار قریش سے صلح ہو جائیگی تو دوسرے دشمن یعنی یہودیوں سے نمٹ لیں گے، کیوں کہ دونوں دشمنوں سے ایک ساتھ لڑنا مشکل بھی ہے، اسی حکمت کی بنیاد پر آپ ﷺ نے صلح فرمائی، اور ایسا ہی ہوا کہ جب کفار قریش سے مامون ہو گئے تو یہودیوں سے جنگ ہوئی اور مسلمانوں کو غلبہ ہوا۔

حدیث شریف میں عيبة مكفوفة کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے لیے اپنے سینوں کو مکروفریب، کینہ وعداوت، شروفساد اور ہر قسم کی برائی سے پاک صاف رکھیں گے، نیز صلح ووفا کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا، اور جس طرح ایک صندوق میں کپڑے محفوظ اور پاک صاف رکھے رہتے ہیں اسی طرح ہمارے دل مکروفریب جیسی برائیوں سے محفوظ رہیں گے، اور ہر فریق اس بات کا خیال رکھے گا کہ اس کا کوئی فرد دوسرے فریق کے کسی فرد کا مال اور اس کی کوئی چیز نہ چھپ کر چرائے گا اور نہ کھلم کھلا غصب کرے گا۔

ترجمه الباب: اس حدیث میں بھی صلح کی شرائط کا ذکر ہے اسی مناسبت سے اس باب میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

١١٧ ﴿حدثنا: عبدُ الله بنُ محمدٍ النُفَيْلِيُّ نا عيسٰى بنُ يُوْنسَ نا الأوزاعيُّ عَن حسّانَ بنِ عَطِيَّةَ قَال: مَالَ مكحولٌ وابنُ أبي زكريّا إلى خالدِ بنِ مَعْدَانَ، وملتُ معهم فحدثنا عَنْ جُبَيرِ بنِ نُفَيرٍ قال: قَال جُبَيرٌ انطَلِقْ بِنَا إلى ذي مِخْمَرٍ رجلٍ مِنْ أصحابِ النبِيِّ صلى الله عليه وسلم فأتَيناهُ، فسألَهُ جُبَيرٌ عن الهُدْنَةِ؟ فقالَ سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ ستصالحُونَ الرومَ صُلْحًا امِنًا، وتَغزُوْنَ

أَنْتُمْ وَهُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِكُمْ.﴾

ترجمہ: حضرت حسان بن عطیہ کہتے ہیں کہ مکحول اور ابن ابی زکریا دونوں خالد بن معدان کی طرف چلے، میں بھی ان کے ساتھ گیا، ہم نے جبیر بن نفیر سے حدیث نقل کی، جبیر نے کہا کہ ذی مخمر کے پاس چلئے جو ایک صحابی ہیں، پھر ہم ذی مخمر کے پاس آئے تو جبیر نے ذی مخمر سے صلح کے بارے میں پوچھا، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تم رومیوں سے پُر امن صلح کرو گے پھر وہ اور تم مل کر ایک اور دشمن سے لڑو گے۔

تشریح مع تحقیق: ذو مخمَرٌ بعض لوگوں نے اس کو ذو مخمر پڑھا ہے، یہ نجاشی بادشاہ کے بھتیجے تھے اور حضور ﷺ کی خدمت کیا کرتے تھے، کچھ دنوں کے بعد آپ ملک شام چلے گئے اور وہیں پر انتقال بھی ہوا۔

الهُدْنَةُ (ج) هُدَنٌ: مصالحت۔

اس روایت کا محل تو کتاب الملاحم ہے، اور وہیں پر تفصیل کے ساتھ یہ روایت آئے گی، یہاں تو صرف صلح کے جواز کو بتلانا ہے۔

جب آخری زمانہ ہوگا تو رومیوں یعنی نصاریٰ اور مسلمانوں کے درمیان بہت اچھی صلح ہوگی، اور دونوں فریق ایک دوسرے سے خوب مطمئن ہوں گے، اور دونوں فریق مل کر کسی تیسرے دشمن سے لڑیں گے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور نصاریٰ کو غلبہ عطا فرمائیں گے، اور بہت مال غنیمت حاصل ہوگا، جب لڑنے کے بعد دونوں فریق واپس آئیں گے تو ایک بڑے میدان سے گذریں گے، جس میں بڑی اچھی گھاس ہوگی، ریت کے ٹیلے بھی ہوں گے، اسی دوران ایک نصرانی صلیب کو اٹھائے گا اور اعلان کرے گا کہ آج یہ صلیب غالب آیا ہے یعنی نصرانی مذہب کو غلبہ ملا ہے، یہ سن کر ایک مسلمان کھڑا ہوگا اور اس صلیب کو توڑ دیگا، پھر رومی لوگ غدر کریں گے، جس کی وجہ سے قتال شروع ہو جائیگا، اور مسلمان و رومی خوب لڑیں گے، یہ قیامت کی ایک علامت ہوگی۔ (دیکھئے ابوداؤد: ٢/٥٩٠)

ترجمة الباب: حدیث شریف سے دشمن کے ساتھ صلح کا جواز ثابت ہو رہا ہے جو ترجمۃ الباب کا مقصد ہے۔

﴿باب في العدو يؤتىٰ على غرّةٍ ويتشبه بهم﴾

دشمن پر غفلت میں حملہ کرنے اور ان کے ساتھ تشبہ کا بیان

١١٨﴿حدثنا أحمدُ بنُ صالحٍ نا سفيانُ عَنْ عَمروبنِ دِينارٍ عن جابرٍ. قالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ لكَعْبِ بنِ الأشرفِ؟ فإنَّهُ قد اذىٰ اللّٰهَ ورسولَهُ، فقَامَ محمدبنُ مسلمَةَ.

فقال أنا يارسول اللّٰه أتحبُّ أنْ أقتلَهُ ؟ قَالَ: نعم ، قالَ: فاذِنْ لي أن أقُولَ شيئًا؟ قَالَ:نعم، فأتاهُ فقال: إنَّ هذا الرجُلَ قَدْ سَألَنا الصدَقَةَ، وقدْ عنَّانا، قالَ:وأيضا لتُملنَّهُ، قَالَ: اتَّبعْنَاهُ فنَحْنُ نكْرَهُ أنْ نَدعَهُ حتّٰى نَنظُرَ إلى شيئٍ يَصِيرُ أمرُهُ، وقدأرَدْنا أن تُسْلِفَنَا وَسَقًا أووَسقَيْنِ، قَالَ ايُّ شيئٍ تَرْهَنُوْنِيْ ، قَالَ: وَمَاتُرِيْدُ مِنَّا؟ فَقَالَ: نِسَاءَ كُمْ قَالُوْا: سبحانَ اللّٰه! أنتَ أجْمَلُ العَرَبِ نَرْهَنُكَ نِسائَنَا فيكونُ ذٰلك عارًا علَيْنا، قَالَ : فترْهَنُوْنِي أولادَكُمْ؟ قَالُوْا: سُبْحَانَ اللّٰهِ! يُسَبُّ ابنُ أحدِنَا فيُقَالُ: رُهِنْتَ بِوَسَقٍ أو وَسَقَيْنِ، قَالُوْا: نَرْهَنُكَ اللَّامَةَ يريدُ السلاحَ، قَالَ: نعم، فلمَّا أتاهُ نَادَاهُ فَخَرَجَ إليْهِ وهو مُتَطيِّبٌ، يَنْضَحُ رَاسَه، فلمَّا أنْ جَلَسَ إليه وقَدْ كَانَ جَاءَ معهُ بِنفَرٍ ثلثةٍ أو أربعةٍ فَذكرُوْا له ، قالَ: عِنْدِيْ فُلَانَةٌ، وَهِيَ أعطرُنساء النَّاسِ، قَالَ: تأْذَنُ لي، فأشَمَّ قَالَ: نعم ، فَأَدْخلَ يَدَهُ في رَأسِهِ فشَمَّهُ، قَالَ: أعُودُ؟ قَالَ نعم، فأدْخلَ يدهُ في رأسِهِ ، فَلَمَّا استَمْكَنَ مِنْهُ قَالَ: دُوْنَكُمْ فضرَبُوْهُ حتّٰى قَتَلُوْهُ.﴾

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا؟ اس لیے کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تکلیف دی ہے، یہ سن کر محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں کروں گا، کیا آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ میں ہی اس کو قتل کروں، آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ہاں، محمد بن مسلمہؓ نے عرض کیا آپ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ میں کچھ کہوں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ہاں کہو! پھر محمد بن مسلمہؓ کعب بن اشرف کے پاس آئے اور کہاں کہ اس شخص (حضور ﷺ) نے ہم سے صدقہ مانگا ہے اور ہم کو مصیبت میں ڈال دیا ہے، کعب بن اشرف نے کہا کہ ابھی کیا ہے اور مصیبت میں پڑوگے، محمد بن مسلمہ نے کہا کہ ہم ان کی پیروی کرچکے ہیں اب یہ بھی برا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں، جب تک کہ ہم ان کا انجام نہ دیکھ لیں، اور ہم نے اس وقت یہ سوچا ہے کہ آپ ہم کو ایک یا دووسق اناج قرض دیدو، کعب نے کہا کہ کیا چیز رہن رکھوگے، محمد بن مسلمہ نے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں کعب نے کہا کہ اپنی عورتیں رہن میں رکھ دو، انہوں نے کہا کہ سبحان اللہ تم اجمل العرب ہو ہم اپنی عورتیں تمہارے پاس رکھ دیں؟ وہ ہمارے لیے عار اور شرم کی بات ہے، کعب بن اشرف نے کہا کہ اپنی اولاد کو رہن رکھ دو، انہوں نے کہا سبحان اللہ! جب ہماری اولاد بڑی ہوگی تو لوگ اس کو طعن کریں گے کہ تم کو تو ایک یا دووسق میں رہن رکھا ہوا تھا، البتہ ہم اپنے ہتھیار تمہارے پاس رہن رکھ دیتے ہیں، کعب نے کہا اچھا (ٹھیک ہے) پھر محمد بن مسلمہ ان کے پاس گئے اور آواز دی تو کعب بن اشرف ان کی طرف نکل کر آیا، اس وقت وہ خوشبو لگائے ہوئے تھا جو اس کے سر سے پھوٹ رہی تھی، جب محمد بن مسلمہ بیٹھے، ان کے

ساتھ تین یا چار آدمی اور تھے سب نے کعب کی خوشبو کا تذکرہ کیا، کعب بن اشرف نے کہا کہ میرے پاس فلاں عورت ہے وہ سب عورتوں سے زیادہ معطر رہتی ہے، محمد بن مسلمہ نے کہا کہ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں تمہارے بال سونگھوں، اس نے کہا کہ ہاں اجازت ہے، محمد بن مسلمہ نے اپنا ہاتھ اس کے بالوں میں ڈال کر سونگھا، پھر دوبارہ اجازت مانگی، کعب نے اجازت دیدی، محمد بن مسلمہ نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، اور جب اس پر قابو پالیا تو اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا کہ پکڑو چنانچہ انہوں نے اس کو مارا اور قتل کر دیا۔

تشریح مع تحقیق :عَنَّانَا (س) تھکنا، تکلیف اٹھانا، پریشان ہوجانا، اور عَنَّاهُ: پریشان کرنا، تھکانا، یہ لفظ بھی بطور تعریض تھا۔

تُسْلِفَنَا (افعال) قرض دینا۔

اللَّامَةَ (ج) لَأْمٌ بمعنی زرہ، کبھی کبھی مطلق ہتھیار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

لَتُمِلَّنَّهُ (افعال) ملال اور رنج میں ڈالنا۔

متطیب. (تفعل) اسم فاعل ہے بمعنی خوشبو لگانا۔

استمکن مِن الشيء: (استفعال) کسی چیز پر قادر ہونا، قابو پانا۔

دُوْنَکُمْ اسم فعل ہے بمعنی خُذْ، کہا جاتا ہے، دُوْنَكَ زيدًا. زید کو پکڑلو،

وَسَق. ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔

اس حدیث میں کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ ذکر کیا ہے، امام بخاری نے کتاب المغازی اور امام مسلم نے کتاب الجہاد میں اس واقعہ کو مفصلاً ذکر کیا ہے، امام ابوداؤد اس واقعہ کو ذکر کر کے ایک مسئلہ بیان فرمانا چاہتے ہیں، کہ وہ دشمن جس سے مصالحت نہ ہوئی ہو یا مصالحت تھی لیکن ختم ہوگئی، اور اس کو اسلام کی دعوت بھی پہنچ چکی ہو تو اس کو دھوکے سے قتل کرنا جائز ہے، نیز کسی امر ضروری کی وجہ سے تعریض کے طور کچھ الفاظ کہنا اور اس دشمن جیسا لباس وغیرہ پہننا بھی جائز ہے۔

کعب بن اشرف یہودی تھا حضور ﷺ کی ہجو میں اشعار کہتا تھا، نیز آپ ﷺ کو تکلیف دیتا تھا، صحابہؓ کی عورتوں کو برا بھلا کہتا تھا، غزوہ بدر کے بعد مکہ مکرمہ میں جا کر قریش کے سامنے ایسے اشعار پڑھے۔ جس میں مشرکین کو خوب بھڑکایا، ان تمام جرائم کی وجہ سے حضور ﷺ نے اس کے قتل کا فیصلہ فرمایا تھا اور آپ ﷺ کی مرضی کے مطابق محمد بن مسلمہ، عباد بن بشیر، حارث بن اوس، ابوعبس بن جبیر اور سلکان بن سلامہ اس کے قتل کے لیے مستعد ہوئے، حضور ﷺ نے ان لوگوں کو اجازت دی کہ مخادعت کی گفتگو کر سکتے ہو، چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابونائلہؓ جو کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے کعب کے مکان پر پہنچے اور آواز دی، کعب بن اشرف باہر نکل کر آیا تو

محمد بن مسلمہؓ نے گفتگو کرنی شروع کر دی اور ایسے الفاظ استعمال کیے جن کے ظاہر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے دین سے پھر گئے ہیں، کعب بن اشرف ظاہری الفاظ سن کر بہت خوش ہوا، نیز صحابہ نے تعریضاً اسلام کی وجہ سے پریشانی کا اظہار کیا اور اس سے کچھ قرض مانگا، آپسی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ قرض کے بدلے ہتھیاروں کو رہن رکھنا ہوگا، جب یہ چند صحابہؓ رہن رکھنے کے لیے اپنے ہتھیاروں کو لے گئے اور کعب بن اشرف کو آواز دی تو اس کی بیوی نے آنے سے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانا اور نیچے اتر آیا، اس کے بعد وہ پورا واقعہ پیش آیا جو حدیث شریف میں مذکور ہے۔

کعب بن اشرف کے قتل پر اشکال

کعب بن اشرف کے قتل پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح قتل کرنا تو غدر ہے اور اسلام میں غدر جائز نہیں ہے؟
اس اشکال کے چند جواب ہیں: (۱) کعب بن اشرف نے حضور ﷺ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیا تھا اس لیے اس کا قتل کرنا درست تھا۔
(۲) اس نے ایسے اشعار کہے تھے جن میں حضور ﷺ کی ہجو بیان کی گئی تھی، نیز آپ ﷺ کو خوب سب شتم کیا تھا، جس کی وجہ سے اس کا دم مباح ہو گیا تھا۔
(۳) آپ ﷺ کے خلاف لڑنے والوں کی مدد کرتا تھا، جس کی وجہ سے مباح الدم ہو چکا تھا علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ ۳ ہجری میں پیش آیا تھا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/۲۱۲۔ انعام الباری: ۹۸)

ترجمة الباب: کعب بن اشرف کو غفلت میں ہی قتل کیا گیا ہے، جس سے غفلت میں قتل کا جواز ثابت ہوتا ہے اور یہی باب کا مقصد ہے۔

۱۱۹﴿حدثنا محمد بنُ حُزابَةَ نا إسحاقُ يَعْنِي ابنَ منصورٍ نا أسباطُ الهَمْدَانِيُّ عَن السُدِيّ عَنْ أبيهِ عَنْ أبي هُرَيْرَةَ عَنِ النبي صلى الله عليه وسلم قال: الإيمانُ قَيَّدَ الفَتْكَ لَا يَفْتِكُ مُؤْمِنٌ.﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان نے فتک کو روک دیا کوئی مؤمن فتک نہ کرے۔

تشریح مع تحقیق: قَيَّدَ (تفعیل) روکنا۔
فَتْكٌ (ن، ض) غفلت میں پکڑنا، غفلت میں قتل کرنا، جو چاہے بے دھڑک کرنا۔
مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو غفلت اور بے خبری کی حالت میں قتل کرے، کیوں کہ

اسلام نے بے خبری اور دھوکے سے قتل کرنے سے روک دیا ہے، جہاں تک کعب بن اشرف کے قتل کا تعلق ہے تو اس کو اس کے محارب ہونے اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔

﴿باب في التكبير على كل شرف في المسير﴾

حالت سفر میں بلندی پر چڑھتے وقت تکبیر کہنے کا بیان

۱۲۰ ﴿حدثنا القعنبيُّ عَنْ مالكٍ عن نافعٍ عن عبدِ الله بنِ عُمَرَ أنَّ رسولَ اللّٰه صلى الله عليه وسلم كَانَ إِذَا قَفَلَ مِنْ غَزْوٍ أو حَجٍّ أو عُمرةٍ يُكَبِّرُ عَلى كُلِّ شَرَفٍ مِنَ الأرْضِ ثَلٰثَ تكْبِيراتٍ ويقول: لَا إلٰه إِلَّا اللّٰهُ وَحدهٗ لاشَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيرٍ، اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا، حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعدَهٗ وَنصرَ عَبدهٗ، وَهَزَمَ الأحْزَابَ وَحْدَهٗ﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ جہاد سے، یا حج سے، یا عمرے سے واپس آتے تھے تو ہر بلندی پر تین تکبیریں کہتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو اکیلا ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں، اسی کی سلطنت ہے، اسی کے لیے تعریف ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، ہم لوٹنے والے ہیں، توبہ کرتے ہیں، عبادت کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، اور اللہ کی حمد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اور اپنے بندے کی مدد کی، اسی نے فوجوں کو شکست دی۔

تشریح مع تحقیق: اٰئِبُوْنَ (ض) اسم فاعل بمعنی لوٹنا، مطلب یہ ہے کہ ہم اب سفر سے اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔

تَائِبُوْنَ (ن) توبہ کرنا، ہوسکتا ہے کہ حالت سفر میں کوئی غلطی ہم سے ہوگئی ہو اس لیے ہم توبہ کرتے ہیں۔

حَامِدُوْنَ (س) تعریف کرنا، حمد بیان کرنا، اللہ کی نعمتوں پر ہم شکر گزار ہیں اور اللہ کی تعریف کرتے ہیں۔

صَدَقَ اللّٰه وعده. اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو بلند کرنے کا اپنا وعدہ پورا فرما دیا، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نصر المؤمنين، اس جملہ سے قرآن میں ذکر کردہ وعدوں کی طرف ہی اشارہ ہے۔

عَبْدَهٗ: سے مراد آپ ﷺ کی پاک ذات ہی مراد ہے۔

هَزَمَ الأحزاب: اس سے مراد وہ تمام قبائل ہیں، جو حضور ﷺ سے لڑنے کے لیے جمع کئے گئے تھے، پھر ان سے بچاؤ کے لیے خندقیں کھودی گئیں تھیں، یہ لوگ تقریباً ۱۲/ ہزار تھے، اور ایک مہینے تک ٹھہرے رہے تھے، لیکن

لڑائی نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی تھی جس نے ان کے خیموں کو اکھاڑ پھینکا تھا، اور ساز و سامان کو منتشر کر دیا تھا، اور کفار خائب اور خاسر ہو کر واپس چلے گئے۔

حدیث شریف میں ذکر ہے کہ آپ ﷺ ہر بلند جگہ پر تکبیر پڑھتے تھے، مقصد اسلام کی شان کو ظاہر کرنا ہے اور یہ امر مستحب ہے، لیکن جہاد کے وقت بلند آواز سے تکبیر کہنا مضر ہو تو تکبیر نہ کہی جائے، چوں کہ بسا اوقات آہستہ جانے میں ہی مصلحت ہوتی ہے تا کہ دشمنوں کو پتہ نہ چلے، اس لیے مصلحت اور مفاد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

ترجمة الباب: حدیث شریف کی ترجمۃ الباب سے مناسبت بالکل واضح ہے، مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔

﴿باب في الإذن في القفول بعد النهي﴾

ممانعت کے بعد جہاد سے لوٹنے کی اجازت کا بیان

۱۲۱﴿ حدثنا أحمدُ بن محمَّدِ بنِ ثَابِتٍ المَرْوزِيُّ حَدَّثنى عَلِيُّ بنُ الحُسَينِ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ يَزِيْدِ النَّحوِيِّ عَنْ عِكْرِمَةَ عن ابنِ عباسٍ قالَ:"لَا يَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ"نَسَخَتْهَا التى فى النُورِ"إِنَّمَا المُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰه وَرَسُوْلِهٖ" إلى غَفُوْرِ الرَّحِيْمِ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "لَايَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰه الخ" آیت کو "إنما المؤمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰه وَ رَسُوْلِهٖ" آیت نے منسوخ کر دیا۔

تشریح مع تحقیق: یہاں سے امام ابو داؤدؒ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو جہاد سے واپس آنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کے لیے جائز ہے کہ امام (امیر) سے اجازت لیکر واپس آجائے، البتہ شروع زمانہ اسلام میں جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی تو جہاد سے لوٹ کر آنا جائز نہیں تھا، لیکن اب وہ حکم منسوخ ہو گیا۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدار اسلام میں منافقین کا طریقہ تھا کہ وہ جہاد کے لیے حضور کے ساتھ نہیں نکلتے تھے، اور اگر نکلتے بھی تو طرح طرح کے جھوٹے بہانے بنا کر واپس آجاتے تھے، حضور ﷺ کے سامنے طرح طرح کی ضرورتیں رکھتے تھے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: لَایستاذنك الذین یؤمنون باللہ والیوم الآخر الخ یعنی مؤمنین آپ سے رخصت نہیں مانگتے بلکہ منافقین رخصت مانگتے ہیں، اب اس آیت کے نزول کے بعد جہاد سے لوٹ کر آنا منع ہو گیا، لیکن بعد میں جب مجاہدین کی کثرت ہو گئی اور منافقین قتل کر دیے گئے تو سورۂ نور

کی دوسری آیت:انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ و إذا کانوا معہ علی أمر جامعٍ لم یذھبوا الخ نازل ہوئی۔

اس آیت میں یہ حکم دیا گیا کہ مؤمنین اگر کسی عذر کی وجہ سے واپس جانا چاہیں اور آپ سے اجازت مانگیں تو اجازت دید یجیے، معلوم ہوا کہ پہلی آیت یعنی سورہ توبہ کی آیت منسوخ ہوگئی اور سورہ نور کی آیت ناسخ ہوگئی یہ تو امام ابوداؤد کا مقصد اور اس باب کا خلاصہ ہے۔ لیکن بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ سورہ توبہ کی آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں تو مؤمنین کی صفات کو منافقین کی صفات کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جس طرح منافقین جھوٹے عذر پیش کرکے اجازت مانگ کر جہاد سے واپس آجاتے ہیں مؤمنوں کی یہ صفت نہیں، بلکہ وہ تو جہاد میں پوری پوری محنت اور مشقت برداشت کرتے ہیں، اور جھوٹ بول کر واپس جانے کی اجازت نہیں مانگتے، تو اس آیت سے یہ ممانعت کہاں ثابت ہوئی کہ اگر کوئی عذر کی وجہ سے اجازت مانگے تو اس کو بھی اجازت نہ دی جائے، اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ سورہ توبہ نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورت ہے اور سورہ نور اس سے مقدم ہے جب کہ ناسخ کا مؤخر ہونا ضروری ہے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ سورہ توبہ کی آیت منسوخ نہیں ہے۔

ترجمة الباب: حدیث سے واضح ہے کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے جہاد سے لوٹنے کی اجازت نہیں تھی اور بعد میں اجازت ہوگئی اور یہی ترجمۃ الباب کا مقصد ہے۔ واللہ اعلم۔

﴿باب فی بعثة البشراء﴾

خوش خبری دینے کے لیے کسی کو بھیجے جانے کا بیان

۱۲۲﴿حدثنا ابو تَوْبَةَ الربیع بنِ نافعٍ نا عیسٰی عَن إسمعیلَ عَنْ قیسٍ عن جَریرٍ قال: قال لی رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ألَا تُرِیحُنیْ مِنْ ذِیْ الخَلَصَةِ ؟فأتَا ھَا، فَحرقَھَا ثم بَعَثَ رجُلًا مِنْ أحْمَسَ إلیٰ النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یُبَشِّرُہُ یُکْنٰی أبَا أرْطاۃٍ.﴾

ترجمہ: حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تم مجھے ذی الخلصہ سے بے فکر نہیں کروگے؟ یہ سن کر جریر وہاں سے گئے، اور اس کو جلا دیا، پھر قبیلہ احمس کا ایک آدمی بھیجا تا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش خبری سنائے، اس شخص کی کنیت ابوارطاۃ تھی،

تشریح مع تحقیق: تُرِیْحِنِیْ: (افعال) راحت پہنچانا، آرام دینا، بے فکر کرنا۔

ذی الخَلَصه بفتح الخاء و اللام، بعض حضرات نے اس کو "لام" کے سکون اور بعض نے لام کے ضمہ کے

ساتھ بھی پڑھا ہے، لیکن لام کے فتح کے ساتھ ہی زیادہ مشہور ہے۔

اصل میں خلصہ ایک گھاس ہوتی ہے، جس کے سرخ رنگ کے بیج ہوتے ہیں، بخاری شریف کی کتاب المغازی میں ہے کہ ذوالخلصہ یمن میں قبیلہ خثعم اور جیلہ کا ایک صنم خانہ تھا جس میں بہت سے بت رکھے ہوئے تھے، اس کو کعبہ بھی کہا جاتا تھا۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس صنم خانے کا نام ہی خلصہ تھا، اور اس میں رکھے ہوئے بت کا نام ذوالخلصہ تھا، مبرد نے نقل کیا ہے کہ اس وقت ذوالخلصہ کی جگہ عبلات شہر کی جامع مسجد بنادی گئی ہے۔

حافظ بن حجرؒ اپنی کتاب فتح الباری میں رقم طراز ہیں: کہ عرب میں ذوالخلصہ نام کے دو بت تھے، ایک تو وہ ہے جس کا ذکر حدیث باب میں ہے یہ یمن میں تھا اور دوسرا بت وہ تھا جس کو عمرو لحی نے اسفل مکہ میں نصب کیا تھا۔ اس دوسرے بت کا ذکر کتاب الفتن میں آئے گا، (فتح الباری ۷۱/۸)

أبا أرطاة: یہ ان کی کنیت ہے ان کا نام حصین بن ربیعہ تھا، یہ صحابی ہیں اور صرف اسی حدیث میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ جب مکہ فتح ہو گیا، اور آپ ﷺ کے پاس جگہ جگہ سے وفود کی آمد شروع ہوئی تو اسی دوران حضرت جریرؓ بھی آپ ﷺ کی خدمت میں مسلمان ہو کر حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ جریر! زمانہ جاہلیت کے تمام بت ختم ہو چکے ہیں، صرف ذوالخلصہ باقی ہے، کیا تم ذی الخلصہ کے لیے کافی نہیں ہو؟ حضرت جریرؓ نے جواب دیا کہ کیوں نہیں یارسول اللہ! اسی دوران حضرت جریرؓ نے حضور ﷺ سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ میں گھوڑے پر ثابت قدم نہیں رہ پاتا ہوں، اس پر آپ ﷺ نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک مارا اور فرمایا: اَللّٰھم ثبته و اجعله هادياً مهدياً۔

اس کے بعد حضرت جریرؓ پانچ سو یا سات سو لوگوں کو لیکر ذوالخلصہ کی طرف روانہ ہوئے، قبیلہ خثعم سے قتال ہوا صحابہ کی یہ جماعت غالب آئی، پھر انہوں نے ذوالخلصہ کی تعمیر کو توڑ ڈالا اور اس کے سامان کو جلا دیا، اس کے بعد حضرت حصین بن ربیعہ کو خوش خبری لیکر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا انہوں نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ: ماجئتك حتى تركناها كأنّها جمل أجرب، یعنی ہم نے ذی الخلصہ کو جلا کر خاکستر کر دیا، اور اب وہ ایسا ہو گیا ہے جیسا کہ خارش زدہ اونٹ جس پر تارکول پھیر دیا گیا ہو، یعنی بالکل سیاہ ہو گیا ہے اور اب اس کا نام ونشان ہی ختم ہو گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مسلم شریف باب فضائل جریرؓ)

ترجمة الباب: ثم بعث رجلاً من أحمس إلى النبي صلى الله عليه و سلم يبشرهٗ يكنى أبا أرطاة سے ثابت ہو رہا ہے۔

باب فی اعطاء البشیر

خوش خبری لانے والے کو کچھ دینے کا بیان

۱۲۳ ﴿حدثنا ابنُ السّرحِ أنا ابنُ وَهْبٍ اخبرنی یُونسُ عَنْ ابنِ شِهَابٍ قال: أخبَرنِی عبدُالرحمٰنِ بنُ عبدِالله بنِ کَعْبِ بنِ مالكٍ أنَّ عبدَالله بنَ کعبٍ قال: سمعتُ کعبَ بنَ مالكٍ قال: کانَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم إذا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَأ بالْمَسجدِ، فرَکَعَ فِیْهِ رکعتَیْنِ، ثم جَلَسَ للنّاسِ، وَقَصَّ ابنُ السَّرحِ الحدیثَ قال: ونهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم المسلمین عن کلامنا أیّها الثلاثة حتی إذا طَالَ عَلَيَّ تَسَوَّرْتُ جِدَارَ حائطِ أبی قتادةَ و هو ابنُ عمِی، فسَلَّمْتُ علَیْهِ، فواللهِ ما رَدَّ عليَّ السلامَ، ثم صلَّیْتُ الصُبحَ صَباحَ خمسین لَیْلة علیٰ ظَهْرِ بیتٍ من بیوتِنا، فَسَمِعْتُ صَارِخاً یا کَعْبَ بنَ مالكٍ أبْشِرْ فلمّا جَاءَ نی الذیْ سمعتُ صوتَه یُبَشِّرُنیْ، نَزَعْتُ لَهٗ ثَوْبیّ فکَسَوْتُهما إیّاهُ، فانْطَلَقْتُ حتّی دخلتُ المسجدَ، فإذَا رسولُ الله صلی الله علیه وسلم جالِسٌ، فقامَ إلَی طلحةُ بنُ عبیدِالله یُهَرْوِلُ حتّی صَافَحَنیْ و هَنَّأنِیْ﴾

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ سفر سے تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز پڑھتے، پھر لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتے تھے، (تاکہ احوال معلوم کریں) اس کے بعد ابن السرح نے پوری حدیث بیان کی؛ کعب بن مالکؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم تینوں سے مسلمانوں کو گفتگو کرنے سے منع فرمادیا۔ بہت دن گزر گئے تو میں اپنے چچازاد بھائی ابوقتادہ کے باغ میں دیوار پھاند کر گیا اور اس کو سلام کیا، لیکن خدا کی قسم اس نے جواب نہیں دیا، جب میں نے پچاس ویں دن اپنے گھر کی چھت پر صبح کی نماز پڑھی تو ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو یہ آواز لگا رہا تھا کہ اے کعب بن مالک! خوش ہوجاؤ، جب یہ منادی میرے پاس آیا تو میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر اس کو دے دیے، اور میں مسجد نبویؐ میں چلا گیا تو دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف فرما ہیں، طلحہ بن عبیداللہ مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور دوڑ کر مجھ سے مصافحہ کیا، اور مبارک باد دی۔

تشریح مع تحقیق: تَسَوَّرْتُ (تفعل) دیوار کو کودنا، پھاندنا، دیوار پر چڑھنا۔

یُهَرْوِلُ (فعل مجرد رباعی وزن فَعْلَلَ معتل اللام) بمعنی تیز چلنا، دوڑ کر آنا۔

اس حدیث شریف میں آپ ﷺ کی ایک عادت شریفہ بیان کی گئی ہے کہ جب آپ ﷺ سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو اولاً آپ ﷺ مسجد میں جاتے اور دو رکعت نماز پڑھ کر صحابہؓ سے ملاقات فرماتے، کیونکہ جو لوگ سفر میں نہ گئے ہوتے تو وہ آپ کے دیدار کے مشتاق ہوتے تھے، نیز آپ ﷺ بھی صحابہؓ سے حالات دریافت فرماتے، لوگوں سے خیریت معلوم کرتے تھے۔

اسی معمول کے مطابق جب آپ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے، تو تمام لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ منافقین بھی آئے جو اس غزوہ میں نہیں گئے تھے، ان منافقین نے جھوٹے جھوٹے عذر پیش کردیے، اسی دوران کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع بھی ملاقات کیلئے آئے، حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ جہاد میں کیوں نہیں گئے؟ ان تینوں حضرات نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کو کوئی عذر نہیں تھا یوں ہی رہ گئے اور نہ جاسکے، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے بارے میں اللہ ہی فیصلہ فرمائے گا، پھر آپ ﷺ نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمادیا کہ ان سے کوئی بات چیت نہ کرے۔

جب پچاس دن گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا اور ان کے بارے میں آیت نازل ہوئی: وعلى الثلثة الذين خلفوا الخ جس میں یہ بیان کیا گیا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی ہے، اب حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی نے حضرت کعب بن مالک کو خوش خبری دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کرلی ہے اور تمہارے بارے میں آیت بھی نازل فرمائی ہے، اسی طرح ہلال بن امیہ کو سعید بن زید نے اور مرارہ بن ربیع کو سلمہ بن قیس یا سلکان بن سلامہ نے خوش خبری دی، جب حضرت کعب بن مالک کو خوش خبری ملی تو انہوں نے خوشی میں اپنے کپڑے اتارے اور حضرت حمزہ بن عمرؓ کو دے دیے، اس سے معلوم ہوا کہ خوش خبری لانے والے کو کچھ دیدینا چاہئے۔

اس کے بعد حضرت کعب بن مالکؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت طلحہؓ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کعب تم کو ایسے دن کی بشارت ہے جو ان تمام دنوں میں بہتر ہے جو تم نے پیدائش سے آج تک گزارے ہیں، حضرت کعبؓ نے اسی خوشی میں اپنا سارا مال خرچ کرنا چاہا لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ کچھ مال اپنے لیے رہنے دو، یہ حضرت کعبؓ، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع کی بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی کتاب میں ان کا ذکر فرمادیا۔

مسئلہ: حدیث مذکورہ سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلاف شرع کام کرنے والوں سے سلام، کلام ترک کرنا اور ان کا بائیکاٹ کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ ان تینوں صحابہؓ سے کیا گیا تھا۔

مسئلہ: یہاں ایک مسئلہ اور مستنبط ہوتا ہے کہ جو شخص خوش خبری لائے مثلاً کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور دوسرا شخص اس کے والد کو خوش خبر دے تو اس خوش خبری سنانے والے کو کچھ دے دینا مستحب ہے۔

ترجمة الباب: نَزَعْتُ لَهٗ ثوبیٌ فکسوتهما الخ سے ثابت ہے۔

﴿باب فی سجود الشکر﴾

سجدۂ شکر کا بیان

۱۲۴ ﴿حدثنا مخلد بنُ خالدٍ نا أبو عاصمٍ عَن بَكْرةَ بكّار بنِ عَبدِالعزيزِ قال أخبَرنِي أبيْ عبدُالعزيزِ عَن أبِي بَكْرةَ عن النبيَّ صلى الله عليه و سلم أنَّهٗ كانَ إذَا جاءَهٗ أمرُ سُرُوْرٍ أو بُشِّرَبِهٖ خرَّ ساجداً شاكراً لِلّٰه﴾

ترجمہ: حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ کے پاس کوئی خوشی کی بات آتی، یا آپ ﷺ کو کوئی خوش خبری دیتا تو آپ ﷺ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

تشریح مع تحقیق بُشِّرَ بِهٖ (تفعیل) کسی کو خوش خبری دینا، یہاں مجہول کا صیغہ ہے، خَرَّ (ن، ض) گرنا، خَرَّ ساجداً: سجدہ کرنا،

جب کسی آدمی کو کوئی نئی نعمت حاصل ہو، یا اللہ تعالی مال عطا فرمائے، یا اولاد عطا فرمائے یا کسی مصیبت کو انسان سے دور کرے، تو ایسے شخص کے لیے مستحب ہے کہ وہ قبلہ رخ ہو کر اللہ تبارک وتعالی کے سامنے اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو جائے، جس طرح انسان سجدۂ تلاوت کرتا ہے اسی طرح سجدہ شکر بھی ادا کرے۔

درمختار کتاب الحظر والاباحہ میں اسی کے اوپر احناف کا فتوی نقل کیا ہے، اس کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے بارے میں جو روایت ہے کہ یہ دونوں ائمہ کراہت کے قائل ہیں یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کا اصل جملہ یہ ہے: لا أراها واجبةً، نیز امام محمدؒ سے منقول ہے: لا أراها شيئاً، اس جملہ سے استحباب کی نفی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سجدۂ شکر واجب نہیں ہے کیونکہ اگر واجب قرار دیا جائے تو اللہ تعالی کی بے شمار نعمتیں ہیں جن کے لیے سجدے کرنا تکلیف مالا یطاق ہے، تو اس قول سے وجوب کی نفی ہے استحباب کی نہیں، اور امام محمدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعت نماز کے مقابلہ میں صرف سجدہ کرنا کچھ نہیں یعنی کوئی حیثیت نہیں ہے، یا یہ کامل شکر نہیں ہے لہذا جو لوگ مشروعیت کی نفی کرتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ (شامی)

کیونکہ سجدۂ شکر حضور ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علیؓ وغیرہ حضرات سے بھی ثابت ہے اس لیے یاد رہے کہ احناف کا مفتی بہ قول بھی استحباب کا ہی ہے، (بذل ص:۶۳ ملخصا)

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت بالکل واضح ہے۔

﴿باب فِی رفع الیدین فی الدعاء﴾

دعاء میں ہاتھ اٹھانے کا بیان

۱۲۵ ﴿حدثنا أحمدُ بنُ صالحٍ نا ابنُ أبی فُدَیْكٍ حدّثنی موسٰی بنُ یَعْقُوبَ عَنْ ابنِ عُثْمانَ قال أبو داوٗد: و هو یحیٰ بنُ الحسنِ بنِ عثمانَ عن اشعثِ بن إسحٰق بنِ سَعْدٍ عَنْ عامرِ بنِ سَعْدٍ عن أبیہٖ قال: خَرَجْنَا مَعَ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم مِن مکّةَ نُرِیْدُ المدینةَ، فلما کُنّا قَرِیْباً مِن عَزْوَراءَ؛ نَزَلَ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْهِ فدَعَا اللّٰهَ ساعةً، ثم خَرَّ ساجداً فمکثَ طَوِیْلاً، ثم قامَ فرفع یَدَیْهِ ساعةً، ثم خَرَّساجداً، ذَکَرَہٗ أحمدُ ثَلٰثاً قال: إنّي سألتُ ربیّ و شَفَعْتُ لِأُمّتیْ فاَعْطَانیْ ثلثَ اُمّتیْ، فخَرَرْتُ ساجداً شکراً لِرَبیّ، ثم رفَعْتُ رَأسیْ فسألتُ رِبيّ لأمّتی فخَرَرْتُ ساجداً لربیّ شکراً ثم رَفَعْتُ راسی فسَألتُ ربی لأمّتي فاَعْطَانی الثلثَ الآخرَ، فَخَرَرْتُ ساجداً لِرَبّي. قالَ أبو داوٗدَ: أَشْعَثُ بنُ إسحٰقَ أسْقَطَهٗ أحمدُ بنُ صالحٍ حِیْن حدَّثَنَا بِهٖ، فحدَّثنی بِهٖ عَنْهُ موسٰی بنُ سَهْلٍ الرملیُّ﴾

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے، جب مقام "عزورار" میں پہنچے تو آپ ﷺ اترے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر تھوڑی دیر اللہ سے دعار کی، پھر سجدے میں گر گئے، اور بہت دیر تک سجدے میں ہی رہے، پھر کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعار کی، پھر سجدے میں گر گئے اور بہت دیر ٹھہرے رہے، پھر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کو اٹھایا، پھر سجدے میں گر گئے، احمد بن صالح نے اس کو تین مرتبہ ذکر کیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے مانگا اور اپنی امت کی سفارش کی تو اللہ تعالی نے ایک تہائی امت مجھے دیدی، تو میں نے سجدۂ شکر کیا، پھر سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے دعار کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تہائی امت اور دیدی، پھر سر اٹھا کر اپنی امت کیلئے دعار کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تہائی امت جو باقی تھی وہ بھی دیدی تو میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

امام ابوداؤدفرماتے ہیں کہ احمد بن صالح نے ہم سے جب یہ حدیث بیان کی تو اشعث بن اسحٰق کو ساقط کر دیا، پھر موسیٰ بن سہل نے جن کے واسطے سے یہ حدیث بیان کی۔

تشریح مع تحقیق: یحیٰ بن الحسن بن عثمان: حافظ حجر فرماتے ہیں کہ یہ مجہول ہیں، اسی طرح یحیٰ

زہری نے بھی کہا ہے کہ ''لا یعرف حالہ'' البتہ ابن حبان نے ان کو اپنی ثقات میں ذکر کیا ہے۔ (تحریر تقریب التہذیب ص:۴/۸۱ بیروت)

عَزْوَرَاء: یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے۔ امام ابوداؤد یہاں سے رفع الیدین فی الدعاء کے جواز کو بتلاتے ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا جائز ہے، اور کسی مصیبت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے۔

بعض غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ دعاء میں ہاتھ اٹھانا بدعت ہے، اور دلیل میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو پیش کرتے ہیں: إن رفعکم أیدکم بدعة، لیکن حضرت ابن عمرؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ فوق الصدر ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا بدعت ہے، نہ کہ کبھی کبھی ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا مکروہ ہے، یا حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول ان دعاؤں کے بارے میں ہے جو بطور ذکر پڑھی جاتی ہیں، مطلقاً ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنا مکروہ نہیں ہے صاحب التعلیق نے دعاء میں ہاتھ اٹھانے کو احادیث متواترہ سے ثابت کیا ہے۔ (تعلیق: ص:۳/۳۵۳)

ترجمة الباب: رفع یدیه فدعا الله سے ثابت ہے۔

﴿باب فی الطروق﴾

رات میں سفر سے گھر آنے کا بیان

۱۲۶ ﴿حدثنا حَفْصُ بنُ عُمرَ و مُسلِم بنُ إبراهيمَ قالا ناشعبةُ محارِبُ بنُ دِثارٍ عَنْ جابرِ بنِ عبدِاللّٰه قال: كانَ رسولُ الله ﷺ يَكْرَهُ أَنْ يأتِيَ الرجلُ أهْلَهُ طروقاً﴾

ترجمه: حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کو برا جانتے تھے کہ کوئی شخص رات کے وقت گھر آئے۔

تشریح مع تحقیق: الطُروق (ن) کھٹکھٹانا، بجانا، طَرَقَ البَابَ: دروازہ کھٹکھٹانا، چونکہ رات میں آنے والا عموماً دروازہ بجاتا ہے اس لیے اس کو طارق کہتے ہیں۔ والطُروق (بضم الطاء) المجیئی باللیل۔ رات کے وقت آنا۔ و یقال لکلّ آتٍ باللیل: طارق، وَلَا یُقَالُ بالنهار إلّا مجازاً۔ (فتح الباری: ص:۳۴۰)

کیونکہ مجاہدین بھی کئی دن کے بعد گھروں کو واپس آتے ہیں اس مناسبت سے امام ابوداؤدؒ نے کتاب الجهاد میں اس باب کو بھی قائم کر دیا اور اس کے تحت کئی حدیثوں کو ذکر کیا ہے،

حضور ﷺ نے رات میں سفر سے گھر آنے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ کے اس فرمان کی بہت سی وجوہات

اور علل ہوسکتی ہیں، چند یہاں پر ذکر کی جاتی ہیں۔

(۱) گھر والے رات کو سو جاتے ہیں، دروازے پر آواز دینی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے گھر والوں اور پڑوسیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

(۲) جب رات کو گھر پہنچتا ہے تو بسا اوقات پہچان نہیں ہو پاتی، اور محلہ والے چور سمجھ کر حملہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں علتوں کی تائید حدیث سے نہیں ہوتی۔

(۳) عورت جب گھر میں رہتی ہے تو اس کے کپڑے اور بدن وغیرہ صاف نہیں رہ پاتے، جس سے شوہر کے دل میں کراہت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اور ازدواجی زندگی بیکار ہو جاتی ہے۔ اس تیسری وجہ کی تائید احادیث شریفہ سے ہوتی ہے، مثلاً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی رات میں گھر نہ آئے یہاں تک کہ اس کی بیوی اپنے بدن اور کپڑوں کی صفائی کرلے۔

ترجمة الباب: کان رسول الله صلی الله علیه و سلم یکره أن یاتی الرجل أهله طروقاً سے ثابت ہے۔

۱۲۷ ﴿حدثنا عثمانُ بنُ أبی شَیْبَةَ نَا جَرِیرٌ عَنْ مُغِیْرةَ عَنِ الشَّعْبِیِّ عن جابرٍ عَنِ النبیِّ ﷺ قال: إن أَحْسَنَ ما دَخَلَ الرجلُ علی أهلِهِ إذا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ أَوَّلَ اللَّیلِ﴾

ترجمه: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کے گھر آنے کا سب سے بہتر وقت جب سفر سے واپس آئے تو شام کا وقت ہے۔

تشریح مع تحقیق: یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے مخالف ہے، کیوں کہ پہلی یعنی محارب بن دثار کی حدیث میں رات میں آنے سے منع کیا گیا ہے، اور اس حدیث میں اول لیل میں آنے کو بہتر قرار دیا گیا ہے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس حدیث میں اول لیل میں آنے سے مراد جماع ہے، کہ جب انسان لمبے سفر سے آئے تو رات کے اول حصے میں بیوی سے جماع کرلے، تاکہ پوری رات اطمنان وسکون سے گزر جائے۔

دوسرا جواب یہ کہ اس حدیث میں بھی اتیان باللیل ہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب پہلے سے آنے کی اطلاع کردے تو اب رات کے وقت آنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً موجودہ زمانے میں ٹیلی فون سے آنے کی اطلاع کردی ہو تو اب رات میں کسی وقت بھی آسکتا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث بیان جواز پر محمول ہے، اور پہلی حدیث کراہت تنزیہی پر محمول ہے۔

(بذل ص:۶۴/۴)

۱۲۸ ﴿حدثنا أحمدُ بنُ حَنبلٍ نا هُشَیْمٌ أنَا سَیّارٌ عَنِ الشَعْبِیِّ عَنْ جابرِبن عَبْدِاللّٰه قال :

كُنَّا مَعَ رسولِ الله صلى الله عليه و سلم فى سَفَرٍ،فلمَّا ذَهَبْنَا لنَدْخُلَ قال: امْهِلُوْا حتّٰى نَدْخُلَ لَيْلاً كَىْ تَمْتَشِطَ الشَعِثَةُ، و تَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ،قال أبوداؤد: قال الزهريُّ الطُرُقُ بَعْدَ العشاءِ قال أبو داؤد و بَعْدَ المَغربِ لَا بأسَ﴾

ترجمه: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے جب سفر سے واپس آئے تو ہم شہر میں جانے لگے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ، ہم رات کو جائیں گے تا کہ جس عورت کے بال پراگندہ ہوں وہ کنگھی کرلے اور جس عورت کا شوہر غائب ہو وہ موئے زیرناف صاف کرلے، امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ زہری نے کہا نہی عشار کے بعد آنے میں ہے، امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ مغرب کے بعد آنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق :تَمْتَشِطُ (افتعال)اِمْتَشَطَتِ المرأةُ: عورت کا اپنے بالوں میں کنگھا کرنا۔شَعِثَةٌ(س) بالوں کا غبار آلود ہونا، بالوں کا بکھر کر چکٹ جانا۔

المُغِيْبَةُ (بضم المیم وکسر الغین ض) المرأة التی غاب عنها زوجها، وہ عورت جس کا شوہر گھر نہ ہو بلکہ سفر میں ہو۔

الاستِحْدَادُ (استفعال) استرے کا استعمال کرنا، یہاں اس سے مراد موئے زیرناف صاف کرنا ہے۔

عورتوں کے لیے موئے زیرناف کا اکھاڑنا مستحب لکھا ہے۔(فتاوی شامی:۹/۵۸۳)

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ جب حضور ﷺ سفر سے تشریف لاتے تھے تو مدینہ سے باہر ٹھہر جایا کرتے تھے، اور مدینہ میں اطلاع بھیج دیا کرتے تھے، جب عورتیں پوری طرح صفائی ستھرائی کرلیا کرتی تھیں تو پھر مدینے میں داخل ہوا کرتے تھے، اس حدیث میں بھی اسی معمول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قال أبو داؤد: امام ابوداؤدؒ یہاں سے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ رات میں آنے کی ممانعت عشار کے بعد ہے، مغرب کے بعد آنا ممنوع نہیں ہے، اور یہ ہی اس سے پہلی حدیث میں ذکر کیا ہے، کہ آپ ﷺ نے اول لیل میں آنے کو اچھا فرمایا۔ اور اس حدیث میں بھی حتی ندخل لیلاً سے مراد عشار سے پہلے کا ہی وقت ہے۔

فائده(۱): اس حدیث سے ایک مسئلہ معلوم ہوا کہ جب شوہر سفر سے آئے تو عورت کے لیے مناسب اور بہتر ہے کہ وہ بن سنور جائے، اور زینت کو اختیار کرلے۔ شوہر کو تکلیف دینے والی ہر چیز سے پاک وصاف ہو جائے۔

فائده(۲): ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں بن سنور کر اور زیب وزینت کے ساتھ نہ رہے، بلکہ معمولی لباس پہن کر ہی گھر میں رہے۔

فائده(۳): باب کی تینوں روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ رات میں آنے کی ممانعت کی علت عورت کو اپنے شوہر کے آنے کی خبر نہ ہونا ہے، اب اگر علت پائی جائیگی تو ممانعت برقرار رہے گی،

اور اگر علت نہ پائی جائے تو ممانعت بھی نہیں رہے گی، مثلاً بیوی کو بذریعہ فون شوہر کے آنے کی خبر مل گئی تو اب رات میں آنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح شوہر کسی بڑے لشکر میں گیا ہے یا چالیس دن کی جماعت میں گیا ہے، اور آمد کا دن، تاریخ متعین ہے تو اس صورت میں بھی ممانعت باقی نہیں رہے گی۔ (تکملہ فتح الملہم ص:۳/۲۷۷، بذل ص:۴/۶۳، فتح الباری ص:۳/۷۹۰)

ترجمة الباب: اس حدیث میں بھی چونکہ رات کو آنے کا ذکر ہے اگر چہ اس آنے میں ممانعت نہیں ہے مگر رات میں آنے کی مناسبت سے حدیث کو اس باب میں ذکر کر دیا ہے۔

﴿باب فی التلقّی﴾

مسافر کا شہر سے باہر نکل کر استقبال کرنے کا بیان

۱۲۹ ﴿حدثنا ابنُ السَّرحِ نا سفيانُ عنِ الزُّهْرِیِّ عن السَّائِبِ بنِ يزيد قال : لمَّا قدِمَ النبیُّ ﷺ المدينةَ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوْكٍ تَلَقَّاهُ الناسُ فلقيتُه مَعَ الصِبْيَانِ عَلٰى ثَنِيَّةِ الوَدَاعِ﴾

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے مدینہ واپس آئے تو ثنیۃ الوداع میں لوگوں نے حضور ﷺ کا استقبال کیا، حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے بھی بچوں کے ساتھ ملکر حضور ﷺ سے ملاقات کی۔

تشریح مع تحقیق :ثنية الوداع: مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک وادی کا نام ہے اس کی وجہ تسمیہ میں کئی قول ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہاں سے مکہ کی طرف مسافرین وداع کئے جاتے تھے، اس لیے اس کو ثنیۃ الوداع کہتے ہیں، جب کہ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ اس جگہ سے فوجی دستوں کو روانہ فرمایا کرتے تھے، اس وجہ سے اس کو ثنیۃ الوداع کہا جاتا ہے، صاحب بذل رقم طراز ہیں کہ اس کا یہ نام زمانہ جاہلیت میں ہی رکھ دیا گیا تھا۔

اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر سفر سے آئے اور لوگوں کو اس کے آنے کی خوشی ہو تو استقبال کے لیے شہر سے باہر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ مستحب ہے کہ باہر جا کر اس آنے والے سے ملاقات کرے۔ (تکملہ فتح الملہم:۳/۱۲۷)

ترجمة الباب: تلقاه الناس فلقيته مع الصبيان على ثنية الوداع سے ثابت ہو رہا ہے، مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿بَابٌ فِيْمَا يَسْتَحِبُّ مِنْ أَنْفَادِ الزَّادِ في الغَزْوِ إِذَا قَفَلَ﴾

سامان جہاد تیار کرے اور نہ جاسکے تو کسی دوسرے مجاہد کو دینا مستحب ہے

۱۳۰ ﴿حدثنا:موسی بنُ إسمعيلَ نا حَمّادٌ أنا ثابتُ البِنانِيُّ عَنْ أنسِ بنِ مالكٍ أنَّ فتًى مِن أسلَمَ قَالَ: يَارسولَ اللّٰه! إنِي أُرِيدُ الجهادَ وَلَيسَ لِي مالٌ ، أتجَهَّزُ بِهٖ، قَالَ: إذهَبْ إلى فُلانٍ الأنصاري فإنَّهٗ قَد تَجَهَّزَ فَمرِضَ فقُلْ لَهٗ : إنّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يُقرِئُكَ السَّلام، وقُلْ لَهٗ ادفَعْ إلَيَّ ما تَجَهَّزتَ به؟ فأتاهُ فقال له ذٰلك، فقال لا مرأتِهٖ: يا فلانةُ ادفِعِي إلَيْهِ ما جَهَّزتِنِىْ بِهٖ ولا تَحْبَسِي مِنْهُ شَيْئًا، فَوَ اللّٰهِ لاتَحْبَسِينَ مِنهُ شَيئًا فيُبَارَكُ لكِ فِيْهِ.﴾

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کے ایک نوجوان نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میرا جہاد کا ارادہ ہے، لیکن میرے پاس مال نہیں جس سے جہاد میں جانے کی تیاری کرسکوں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فلاں انصاریؓ کے پاس جاؤ، انہوں نے جہاد کا سامان تیار کیا ہے لیکن وہ بیمار ہوگئے ہیں، ان سے میرا اسلام کہنا، اور کہہ دینا کہ تم نے جو جہاد کا سامان تیار کیا ہے وہ مجھے دیدو، اس نوجوان نے انصاری صحابیؓ سے جاکر ایسا ہی کہا، انصاری صحابی نے اپنی بیوی سے کہا کہ اے فلانہ! جو سامان تو نے میرے لیے تیار کیا تھا وہ اس نوجوان کو دیدو اور اس میں سے کچھ روکنا مت، خدا کی قسم اگر تو نے اس میں کچھ روک لیا تو برکت نہیں ہوگی۔

تشریح مع تحقیق :أتجَهَّزُ (تفعل) تیاری کرنا۔

يُقْرِئُكَ السلام. سلام کہنا، سلام کرنا۔

تَحبسي: (س) روکنا۔

امام ابوداؤدؒ اس حدیث شریف سے یہ ثابت فرمارہے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی نیک کام میں کچھ خرچ کرنے کا ارادہ کرے، اور تیاری کرے، تو اس کے لیے مستحب ہے کہ اسی کام میں اس مال کو خرچ کرے، ہاں اگر اس کام میں خرچ کرنا متعذر ہو جائے، تو دوسرے نیک کام میں خرچ کردے، البتہ اگر نذر مان لی تھی تو اسی کام میں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ترجمة الباب: حدیث کی باب سے مناسبت یہ ہے کہ جب مسلمان جہاد کے لیے سامان تیار کرلے تو

اس سامان کو جہاد میں خرچ کرنا ہی مستحب ہے اور اگر کچھ باقی بچ جائے تو دوسرے راستہ میں خرچ کرسکتا ہے، باب کا مقصد بھی یہی تھا کہ سامان جہاد تیار کرے اور نہ جاسکے تو کسی دوسرے مجاہد کو دیدے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

﴿بابٌ في الصَّلَاةِ عِنْدَ القُدُوْمِ مِنَ السَّفَرِ﴾

سفر سے واپسی کے وقت نماز پڑھنے کا بیان

۱۳۱ ﴿حدثنا محمد بنُ المُتَوَكِّلِ العَسْقَلانِي والحسنُ بنُ عليٍّ قَالَا نا عبدُ الرزاق أخبرَنِي ابنُ جُرَيْجٍ قَالَ أَخبَرَنِي ابنُ شِهاب قَالَ أخبرني عبدُ الرحمنِ بنُ عبدالله بنِ كعبِ بن مالكٍ عن أبيه عبد الله بنِ كعبٍ وعَمِّهٖ عبيد الله بنِ كعبٍ عن أبيهما كعبِ بنِ مالكٍ أنّ النبيّ صلى الله عليه وسلم كَانَ لَا يَقْدَمُ مِنَ السَفَرِ إلَّا نَهَارًا، قَالَ الحسنُ في الضحىٰ؛ فإذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ أَتَى المسجِد فَرَكَعَ فِيْهِ ركعتينِ ثم جَلَسَ فيهِ.﴾

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ دن میں ہی سفر سے تشریف لاتے تھے، حسن بن علی نے کہا کہ چاشت کے وقت آتے تھے، پس جب سفر سے واپس آتے تو مسجد میں تشریف لے جاتے اور دو رکعت نماز پڑھتے، پھر مسجد میں (لوگوں سے ملاقات کے لیے) بیٹھ جاتے۔

تشریح مع تحقیق: صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ سفر کو جاتے وقت اور سفر سے آتے وقت دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے، حدیث باب سے بھی سفر سے واپسی کے وقت دو رکعت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے علاوہ طبرانی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی سفر کو جاتا ہے تو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے افضل چیز دو رکعت نماز ہی چھوڑ کر جاتا ہے جس نماز کو اس نے گھر کے اندر ہی پڑھا ہو نیز حضرت کعب بن مالکؓ سے مسلم شریف میں روایت ہے کہ حضور ﷺ سفر سے دن میں آتے تھے اور مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھتے تھے، پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے مسجد میں ہی بیٹھ جاتے تھے۔

طبرانی اور مسلم کی ان دونوں روایتوں سے یہ امر واضح ہوا کہ سفر میں جاتے وقت گھر کے اندر نماز پڑھنا اولیٰ ہے، اور سفر سے آتے وقت مسجد میں نماز پڑھنا اولیٰ ہے، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے بلکہ تجربہ بھی ہے کہ اسی میں آسانی اور سہولت زیادہ ہے۔

ترجمة الباب: إذَا قَدِمَ من سفر أتى المسجد فركع فيه ركعتين۔ سے ثابت ہے۔

۱۳۲ ﴿حدثنا: محمدُ بنُ منصورٍ الطوسِيُّ نا يعقوبُ نا أبي عَنْ ابنِ إسحاقَ قَالَ حدَّثني نافعٌ عن ابنِ عُمَرَ: أن رسولَ الله صلى الله عليه وسلم حِيْنَ أَقْبَلَ مِنْ حَجَّتِهِ دَخلَ المدينةَ فَأَنَاخَ علىٰ بابِ مسْجِدِهِ ثُمّ دَخَلَهُ، فرَكَعَ فِيهِ ركعتينِ؛ ثُم انصَرَفَ إلى بَيْتِهِ، قَال نافعٌ: فَكَانَ ابنُ عُمَرَ كذٰلكَ يَصْنَعُ.﴾

ترجمه: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حج کر کے واپس تشریف لائے اور مدینے میں داخل ہوئے تو مسجد نبوی ﷺ کے سامنے اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور مسجد میں ہی دو رکعت نماز پڑھی، پھر گھر تشریف لے گئے، نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث سے بھی سفر سے آتے وقت دو رکعت نماز پڑھنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے، حضرت ابن عمرؓ بھی جب سفر سے آتے تھے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر گھر تشریف لے جاتے تھے؛ حضرت ابن عمرؓ کو اس معنی کر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے کہ اگر حضور ﷺ نے کہیں نماز پڑھ لی تو اسی جگہ ضرور نماز پڑھتے تھے، اور یہ ان کی حضور ﷺ سے انتہائی محبت کی علامت تھی۔

ترجمة الباب: حدیث کی باب سے کلی طور پر مناسبت ثابت ہے۔

﴿باب في كراء المقاسم﴾

تقسیم کرنے والے کی اجرت کا بیان

۱۳۳ ﴿حدثنا: جعفرُ بنُ مسافرٍ التينسِيُّ نا ابنُ أبي فُدَيْكٍ نا الزَمْعِيُّ عَنْ الزُّبَيرِ بنِ عُثْمَانَ بنِ عبدِ الله بنِ سُرَاقَة أنَّ محمدبنَ عبدِ الرحمن بنِ ثَوبانَ أخبرهُ أنَّ أبا سَعِيْدٍ الخدريَّ أخبرَهُ أن رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: إيَّاكُم والقُسَامَةَ، قالَ: فقُلْنَا: وَمَا القُسَامَةُ؟ قالَ: الشّئُ يكونُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْتَقِصُ مِنْهُ.﴾

ترجمه: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بچو تم تقسیم کی اجرت دینے سے، راوی کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا کہ قسامہ کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک چیز ہے جو کئی آدمیوں کے درمیان مشترک ہوتی ہے، پھر وہ کم ہو جاتی ہے۔

تشریح مع تحقیق: قُسامة: (بضم القاف) مقسِّم یعنی تقسیم کرنے والے کا حصہ، وہ مال جو راُس المال سے اپنے عملِ تقسیم کی اجرت کے طور پر الگ کر لے۔

المقاسِم: (بضم الميم) تقسیم کرنے والا۔
ينتقص: (افتعال) انتقَصَ الشيئُ: کم ہونا۔ اِنْتَقَصَ الشيئَ: گھٹانا، کم کرنا۔
امام ابوداودؒ یہاں پر ایک مسئلہ بیان فرمارہے ہیں کہ اگر کوئی شخص لوگوں کے درمیان مال تقسیم کرے اور اس مال میں سے کچھ مال اپنے لیے بچا کر رکھ لے، تو چوں کہ یہ مال مالکوں کی رضامندی کے بغیر ہوتا ہے اس لیے جائز نہیں، جہاں تک تقسیم کرنے والے کی اجرت کا تعلق ہے تو قسام کے لیے اجرت لینا شرعاً جائز ہے کیوں کہ یہ اپنے کام کی اجرت لے رہا ہے، لیکن یہ اجرت لینا بھی اسی قسام کے لیے جائز ہے جو حکومت کی طرف سے متعین نہ ہو، اور حکومت کی طرف سے اس کو وظیفہ نہ ملتا ہو۔
علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق قسام کی اجرت کی تحریم کو بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مصداق یہ ہے کہ کوئی حاکم مقرر ہو اور لوگوں کے درمیان مشترکہ مال کو تقسیم کرے پھر مالکوں کی رضامندی کے بغیر جبراً اپنے لیے بھی حصہ لے لے، یہ ناجائز اور حرام ہے۔
ترجمة الباب: إنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إيّاكم والقسامة. سے ثابت ہو رہا ہے۔
۱۳۴ ﴿حدثنا: عبدُ الله القَعْنَبِيُّ نا عبدُ العزيز يعني ابنَ محمدٍ عَنْ شريكٍ يعني ابنَ أبِي نمْرٍ عَن عطاءِ بنِ يَسارٍ عَن النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَهُ قَالَ: الرَّجُلُ يكونُ علَى الفِئَامِ مِنَ النَّاسِ فيأخُذُ مِنْ حَظِّ هذَا وَحَظِّ هذَا.﴾
ترجمہ: حضرت عطاء بن یسار سے بھی ایسے ہی (پہلی حدیث کی طرح) مروی ہے۔ (البتہ اس میں اتنا اضافہ ہے کہ) ایک آدمی لوگوں کی ایک جماعت کا امیر ہوتا ہے، اور وہ لوگوں کے درمیان تقسیم کرتا ہے، اور اس کے حصہ سے اور اس کے حصہ سے جبراً لے لیتا ہے۔
تشریح مع تحقیق :فِئَام: (ج) فِئَة بمعنی جماعت۔
حَظّ: (ج) حُظوظ بمعنی حصہ۔
اس حدیث میں پہلی حدیث کے مقابلہ میں کچھ اضافہ ہے، وہ یہ ہے کہ عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی جماعت کا امیر ہوتا ہے اور اس جماعت کے درمیان تقسیم کرتا ہے، تقسیم کرتے وقت ہر شخص کے حصہ سے کچھ لے لیتا ہے، حالاں کہ اس کے لیے اس طرح لوگوں کے حصہ سے لینا جائز نہیں ہے۔
ترجمة الباب: حدیث کا تعلق ترجمۃ الباب سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے قسامت سے منع فرمایا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگوں سے ان کا مال زبردستی لیتا ہے۔

﴿بابٌ في التِجارَةِ في الغَزْوِ﴾

سفر جہاد میں تجارت کرنے کا بیان

١٣٥ ﴿حدثنا الربيعُ بنُ نافعٍ نا معاوية يعنيَ ابنَ سلامٍ عَنْ زَيدٍ يَعْني ابنَ سَلامٍ أنَّهُ سَمِع أبا سلامٍ يقول: حدثني عبدُ الله بن سَلمانَ أنَّ رَجُلاً مِنْ أصحابِ النبي صلى الله عليه وسلم حدّثه، قَالَ: لمَّا فَتحنَا خَيْبَرَ أخرجوا غنائمهم مِنَ المتاعِ والسَّبْيِ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَتبَايَعُوْنَ غنَائِمَهم، فجاءَ رجلٌ فقال: يا رسول الله صلى الله عليه وسلم لَقَدْ رَبِحْتُ ربحًا ماربِحَ اليومَ مثلهُ أحدٌ مِنْ أهلِ هذا الوادي، قال: وَيْحكَ! وَمَارَبِحْتَ؟ قَالَ : ما زِلتُ أَبِيْعُ وابْتَاعُ حتّٰى رَبِحْتُ ثلثَ مائةِ أوقية، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أنا انبئكَ بخير رجلٍ ربِحَ، قَالَ: وَمَا هُوَ يَارَسُوْلُ الله صلى الله عليه وسلم؟ قَالَ: رَكعتَيْنِ بَعْدَ الصَّلَاةِ.﴾

ترجمہ: عبداللہ بن سلمان کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک صحابیؓ نے بیان کیا کہ جب ہم نے خیبر کو فتح کیا تو لوگوں نے اپنی اپنی غنیمتوں کو اور قیدیوں کو نکالا اور آپس میں خرید وفروخت کرنے لگے، اتنے میں ایک صاحب آئے اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے آج اتنا نفع حاصل کیا کہ اتنا کسی کو حاصل نہ ہوا ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہائے کیا نفع کمایا؟ جواب دیا کہ میں مسلسل خرید وفروخت کرتا رہا یہاں تک کہ تین سو اوقیہ چاندی مجھے نفع میں ملی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو ایسے شخص کے بارے میں خبر دیتا ہوں جس نے تجھ سے بہتر نفع کمایا، اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ وہ کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے فرض نماز کے بعد دو رکعت پڑھیں۔

تشریح مع تحقیق :امام ابوداؤدؒ نے اس باب کو قائم کیا ہے، لیکن باب سے یہ کوئی صراحت نہیں ہوتی کہ ابوداؤدؒ غزوہ میں تقسیم غنائم سے پہلے بیع وفروخت کے بارے میں بتلانا چاہتے ہیں، یا غزوہ میں ہی تقسیم غنائم کے بعد تجارت کے جواز کو بتلانا چاہتے ہیں، اگر مصنف علیہ الرحمہ کی غرض تقسیم غنائم کے بعد تجارت کے جواز کو بتلانا ہے تو اس کے جواز میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ بالاتفاق تجارت کرنا جائز ہے، کیوں کہ ہر شخص اپنی اپنی چیز کا مالک ہے۔

اور اگر تقسیم غنائم سے پہلے ہی تجارت کے جواز کو بتلانا مقصود ہے تو اس سلسلہ میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہے۔

(۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تقسیم غنائم سے پہلے بھی دارالحرب میں تجارت کرنا جائز ہے۔
(۲) امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تقسیم غنائم سے پہلے دارالحرب میں تجارت جائز نہیں ہے۔
(۳) امام احمدؒ کی اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں ایک شوافع کے مطابق اور دوسری امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کے مطابق، امام ابوداؤدؒ کا رجحان اس مسئلہ میں شوافع کی طرف ہے۔

اصل میں یہ مسئلہ ایک دوسرے مسئلہ پر متفرع ہے، وہ یہ ہے کہ شوافع کے نزدیک محض استیلاء سے ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، اور جب استیلاء سے ملکیت ثابت ہوگئی تو اس میں تجارت کرنا بھی جائز ہوگیا۔

جب کہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک محض استیلاء سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے بلکہ ملکیت کے ثبوت کے لیے ید نافذہ یعنی احراز کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ قواعد الفقہ میں صراحت ہے: الأصل عندنا أن الحق بالغنيمة يتعلق بالأخذ، ويستقر بالإحراز بالدار، ويقع الملك بنفس القسمة ، وعندالشافعي يقع الملك بنفس الأخذ. (قواعد الفقہ: ص: ۴۳)

لیکن امام ابوداؤدؒ کا اس مسئلہ کو حدیث مذکور سے ثابت کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے کیوں کہ روایت میں قبل التقسیم تجارت کی کوئی وضاحت نہیں ہے، بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خیبر کے بعض قلعے تو غلبہ سے فتح ہوئے ہیں، اور بعض صلح سے فتح ہوئے ہیں، اور جب بعض قلعے فتح ہو چکے تھے تب ہی خیبر دارالاسلام بن چکا تھا، اور جب دارالاسلام بن گیا تھا تو احراز پایا گیا اور احراز کے بعد ہم بھی بیع وفروخت کے جواز کے قائل ہیں۔

دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ حنفیہ اس حدیث کو بعد التقسیم پر محمول کرتے ہیں، جس کی وضاحت یہ ہے کہ صحابہؓ کو سخت ضرورت ہوگی جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے دارالحرب میں ہی غنیمت کو تقسیم فرمادیا ہوگا، اور صحابہؓ نے وہیں پر تجارت کی ہوگی۔

ترجمة الباب: جعل الناسُ يتبايعون غنائمهم سے ثابت ہے۔

﴿باب في حَمْلِ السِّلاحِ إلىٰ أرضِ العَدُوِّ﴾

دارالحرب میں ہتھیار لے جانے کا بیان

۱۳۶ ﴿حدثنا مسدّدٌ نا عيسى بنُ يونسَ نا أبي عن أبي إسحاقَ عَنْ ذِي الجوشنِ رجل منَ الضِبَابِ قَال: أتَيْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ أنْ فَرَغَ مِنْ أهلِ بَدْرٍ بابنِ فرسٍ لي يقالُ لَها القَرْحَاءُ، فقلتُ يا محمدا إنِّي قَدْ جئتُكَ بابنِ القَرحاءِ لِتَتَّخِذَهُ،

قَالَ: لَا حَاجَةَ لِي فِيْهِ ، فَإِنْ شِئْتَ أَنْ أَقِيضُكَ بِهِ الْمُخْتَارَةَ مِنْ دُرُوْعِ بَدْرٍ فَعَلْتُ،
قُلْتُ مَا كُنتُ أُقِيضُهُ اليومَ بِغُرَّةٍ ، قَالَ: فلاحاجة لي فيه.﴾

ترجمه:قبیلۂ ضباب کے ایک شخص ذی الجوشن سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بدر کے دن کافروں سے فارغ ہوئے،تو میں آپ ﷺ کے پاس گھوڑے کا ایک بچھڑا لایا،جس کا نام قرحا رتھا،اور عرض کیا کہ یا محمد ﷺ!میں آپ ﷺ کے پاس قرحار کا بچہ لایا ہوں تاکہ آپ ﷺ اس کو اپنے استعمال میں لے لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں،البتہ اگر تو اس کے بدلے میں بدر کی ایک عمدہ ذرہ لینا چاہے تو میں اس کو لے لوں گا،میں نے کہا کہ آج تو میں اس کے بدلے میں گھوڑا ابھی نہ لوں گا،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق :ذي الجوشن:ان کے نام کے بارے میں کئی قول ہیں بعض نے کہا ہے کہ ان کا نام اوس تھا،اور بعض نے عثمان،اور بعض نے شرحبیل لکھا ہے جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت ذی الجوشن کافر تھے،بعد میں اسلام لائے ہیں۔

قرحاء:یہ گھوڑے کا نام ہے۔

أَقِيضُكَ:(ض) بکسر القاف وسکون الیاء صیغہ متکلم)قَاضَ فلانٌ فلاناً بالشيء:کسی کو کسی چیز کا بدل دینا۔

اس باب کو قائم کر کے امام ابوداوٗدؒ ایک اہم مسئلہ بیان فرمار ہے ہیں،کہ دارالاسلام سے دارالحرب میں ہتھیاروں کو منتقل کرنا اور کافروں کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام ابوداوٗدؒ کا رجحان جواز کی طرف ہے،اور حدیث باب سے بھی اسی جواز کی طرف اشارہ ملتا ہے،اس لیے کہ ذی الجوشن اس وقت مسلمان نہیں تھے اور انہوں نے ہدیہ میں حضور ﷺ کو گھوڑا پیش کیا تو آپ ﷺ اس ابن القرحار کے بدلے میں بدر کی ایک شاندار،عمدہ ذرہ کے دینے پر راضی ہوگئے،آپ ﷺ کی یہ رضامندی اس بات کی دلیل ہے کہ کافروں کو ہتھیار دینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

جبکہ احناف فرماتے ہیں کہ چار چیزوں کا دشمنوں کے ساتھ دارالحرب میں لے جا کر فروخت کرنا جائز نہیں ہے (۱) سواری (۲) غلام (۳) ہتھیار (۴) ہتھیار تیار کرنے کا مادہ جیسے:لوہا وغیرہ۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سواریوں اور ہتھیاروں سے دشمنوں کو قوت ملتی ہے،اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے مضبوطی پیدا ہوتی ہے،اسی طرح غلاموں سے بھی دشمنوں کو تقویت ملتی ہے کیوں کہ غلام یا تو خود لڑے گا یا ان کی مدد کرے گا،اور لوہے سے چوں کہ ہتھیار بنائے جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَأنزلنا الحديد فيه بأس شديد.لہٰذا لوہا بھی ہتھیاروں کے حکم میں ہوگا،البتہ کھانا،کپڑے وغیرہ کفار کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں۔

حنفیہ کے پاس اصل دلیل تو قرآن کی آیت ہے: وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين لله. وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں قتال کی غایت فتنہ وفساد کا ختم ہونا بتلایا ہے، اور فتنہ کے ختم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار مغلوب ہو جائیں ان کی شان وشوکت جاتی رہے، جزیہ دینے پر مجبور ہو جائیں، یا اسلام قبول کرلیں، کیوں کہ اگر یہ چیز پیدا نہ ہوئی تو فتنہ کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اب اگر ان کو ہتھیار فروخت کیے جائیں تو ان کی شان وشوکت اور قوت میں اضافہ ہوگا جو آیت قرآنی کے منشار کے خلاف ہے۔

دوسری دلیل اس سلسلہ میں خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے، حدیث ہے: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع السلاح في الفتنة. اس حدیث سے بھی یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے ہاتھوں ہتھیاروں کا بیچنا جائز نہیں ہے۔

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے تو حدیث منقطع ہے جو قابل استدلال نہیں ہے کیوں کہ ابواسحاق کا ذی الجوشن سے سماع نہیں ہے، بلکہ انہوں نے ذی الجوشن کے بیٹے سے سنا ہے جس کا نام شمر ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

ترجمة الباب: باب سے حدیث کی مناسبت ظاہر ہے کیوں کہ ذی الجوشن اس معاملہ کے وقت مسلمان نہیں تھے، اس کے باوجود حضور ﷺ زرہ دینے کے لیے راضی ہو گئے تھے، جو دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنے کی دلیل ہے، جیسا کہ امام ابوداؤدؒ کا مسلک ہے۔

﴿باب في الإقامة في أرض المشرك﴾

جہاں مشرک ہو وہاں رہنے کا بیان

۱۳۷ ﴿حدثنا: محمد بن داؤد بن سفيان حدثني يحيىٰ بن حسان قال أنا سليمان بن موسىٰ أبوداؤد قال نا جعفربن سعد بن سمرة بن جندب قال حدثني خبيب بن سليمان عن أبيه سليمان بن سمرة عن سمرة بن جندب أما بعد: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله.﴾

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مشرک کے ساتھ بیٹھے اٹھے اور اس کے ساتھ سکونت اختیار کرلے وہ اسی کے مثل ہے۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث شریف کا آسان مطلب یہ ہے کہ جو شخص مشرکین کے ساتھ رسوم وعادات، شکل وصورت، رہن سہن اور دیگر چیزوں میں موافقت کرے تو قریب ہے کہ وہ بھی مشرک ہو جائے،

کیوں کہ صحبت کا ایک غیر معمولی اثر ہوتا ہے، اچھے لوگوں کی صحبت انسان کو اچھا بنا دیتی ہے اور برے لوگوں کی صحبت انسان کو برا بنا دیتی ہے۔

یا یہ حدیث تغلیظ وتشدید پر محمول ہے، اور سخت حکم ہے کہ مشرکین جو اللہ سے بغاوت کرنے والے ہیں کے ساتھ ہرگز نہ رہا جائے، بلکہ مسلمان ان خبیثوں سے بالکل الگ تھلگ رہیں، اس حدیث شریف سے یہ اصول مترشح ہوتا ہے کہ دار الحرب سے ہجرت کر کے دار الاسلام چلے جانا چاہیے، جہاں شرائع اسلام کو آزادی کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔

ترجمة الباب: حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ باب کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کی سرزمین میں نہ رہا جائے اور حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے کہ مشرکین کے ساتھ نہ رہا جائے، لہٰذا مناسبت ثابت ہوگئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

وبه تمّ بعون الله الملك الوهاب ولفضله وكرمه وإحسانه، وحسن توفيقه شرحُ كتاب الجهاد من سنن أبي داؤد، وذلك في ۲۵/ من ربيع الآخر سنة ۱٤۲۱هـ ليل الجمعة في الساعة الواحدة إلا الربع، فللّٰه الحمد والشكر على هٰذا الأمر الجُلل، ونسأله تعالىٰ بغاية الخشوع أن يوفق لإكمال باقي الشرح حسب مايحبه ويرضاه، إنه على كل شيئ قدير.

☆ ☆ ☆

﴿أوّل كتاب الضحايا﴾

مناسبت

امام ابوداوُدؒ نے کتاب الجہاد کے بعد کتاب الضحایا کا عنوان قائم کیا ہے، دونوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ قربانی دوقسم کی ہوتی ہے (۱) جان کی قربانی (۲) مال کی قربانی، اور یہ بات معلوم ہے کہ جانی قربانی، مالی قربانی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے، اس لیے امام ابوداوُد نے اولاً جانی قربانی (جہاد) کی فضیلت اور اس کے احکام کو بیان کردیا۔ اس کے بعد مالی قربانی سے متعلق فضائل واحکام بیان فرمارہے ہیں، یہ ہی دونوں کتابوں کے درمیان مناسبت ہے۔

ضحایا کی تحقیق

بعض لوگوں نے اس میں چار اور بعض نے آٹھ تحقیق بیان کی ہیں، لیکن قول اوّل یعنی چار لغات ہی زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) أُضْحِيَّة: بضم الهمزه و سكون الضاد۔

(۲) إِضحِيَّة: بكسر الهمزه وسكون الضاد۔ ان دونوں کی جمع "أضاحي" بتشديد الياء وتخفيفها آتی ہے۔

(۳) ضَحِيَّةٌ : بفتح الضاد و كسر الحاءِ، اس کی جمع "ضحايا" آتی ہے، جیسے "عطية" کی جمع "عطایا" آتی ہے۔

(۴) أَضْحَاة: بفتح الهمزه وسكون الضاد، اس کی جمع "اضحیٰ" آتی ہے، مزید تحقیق کے لیے دیکھئے۔ (فتاویٰ شامی:۹/۴۵۲، تکملہ فتح الملہم:۳/۵۴۴)

لغوی تعریف

درمختار میں ہے: هِيَ لغة: إسم لما يُذْبح أيام الأضحى، یعنی وہ جانور جو ایام نحر میں ذبح کیا جائے۔

شرعی تعریف

صاحب تنویر الابصار تحریر فرماتے ہیں کہ: هي ذبح حيوان مخصوصٍ بنية القربة في وقت مخصوص. یعنی مخصوص وقت میں مخصوص جانور کو تقرب الی اللہ کی نیت سے ذبح کرنا اضحیہ ہے۔

قربانی کی مشروعیت

امت محمدیہ کے لیے اس کی مشروعیت ۲ھ میں ہوئی ہے، اگرچہ پہلے سے بھی تمام مذاہب میں کسی نہ کسی حیثیت میں قربانی کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمان صاحب مدظلہ اپنی مشہور کتاب "تکملہ فتح الملھم" میں قربانی کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ ہمارے (امت محمدیہ کے) لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر قربانی واجب کی گئی ہے اور پہلی امتوں میں قربانی کا طریقہ مختلف رہا ہے، ان مذاہب میں قربانی کی قبولیت اس طرح ہوتی تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی تھی۔ اور اس مذبوحہ جانور کو آ کر کھا جاتی تھی لیکن ہمارے لیے یہ طریقہ نہیں بیان کیا گیا ہے، بلکہ ہمارے لیے تو اللہ تعالیٰ نے قربانی کے بارے میں صراحۃً ارشاد فرمایا ہے "لن تنال الله لحومها ولا دماء ها ولكن يناله التقوىٰ منكم ذلك سخرهالكم لتكبر الله على ماهداكم.

یعنی اضحیہ کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنا تقرب حاصل کرنے کے لیے بندوں کے لیے مشروع کیا ہے، تاکہ بندہ اس عبادت کو بجالا کر اللہ رب العزت کا تقرب اور اسکی خوشنودی حاصل کر لے، خواہ بندوں کی عقل میں آئے یا نہ آئے، اور اللہ کو قربانی کے گوشت پوست کی چنداں حاجت نہیں ہے۔

﴿باب في إيجاب الضحايا﴾

قربانی کے وجوب کا بیان

۱۳۸ ﴿حدثنا: مسدد نايزيد ح وحدثنا حميد بن مسعدة قال ثنا بشر عن عبدالله بن عون عن عامر بن أبي رملة قال أنبأنا مخنف بن سليم قال ونحن وقوف مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بعرفات، قال قال: يأيها الناس! إن على أهل كل بيت في كل عام اضحيةوعتيرة، أتدرون ما العتيرة؟ هذه هي التي يقول الناس الرجبية.﴾

ترجمہ: حضرت مخنف بن سلیم سے روایت ہے کہ ہم وقوف عرفات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! ہر سال ہر گھر والے پر قربانی اور عتیرہ واجب ہے، اور کیا تم عتیرہ کو جانتے ہو؟ وہ وہی ہے جس کو لوگ رجبیہ کہتے ہیں۔

تشریح مع تحقیق :عَتِيْرَةٌ: وہ جانور جس کو لوگ ماہ "رجب" کے عشرۂ اول میں ذبح کیا کرتے تھے، اسی کا دوسرا نام رجبیہ بھی ہے، اب عتیرہ جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں روایات مختلف ہیں، امام ابوداؤدؒ نے

مستقل ایک باب عتیرہ کے سلسلے میں قائم کیا ہے ان شاء اللہ وہیں پر اس کی بحث کی جائے گی، اس باب کے تحت اصل مسئلہ یہ بیان کرنا ہے کہ قربانی کی شرعی حیثیت کیا ہے، کیا قربانی کرنا واجب ہے؟ یا سنت؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان زبردست اختلاف پیدا ہوگیا ہے، اور اصل میں یہ اختلاف نص فہمی کی طرف جاتا ہے، تاہم وضاحت کے لیے اس اختلاف کو مع دلائل بیان کیا جاتا ہے۔

ایک اختلافی مسئلہ

(۱) امام ابوحنیفہؒ اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ مقیم مالدار مسلمان پر قربانی کرنا واجب ہے۔

(۲) امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ قربانی کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

حنفیہ کے دلائل

(۱) آیت قرانی "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ: عید کی نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، تو یہ صیغہ امر ہے جس کی حقیقت وجوب کو بتلاتی ہے تا آں کہ ایسا قرینہ پایا جائے جس سے وجوب کی نفی ہو، یہاں پر ایسا کوئی قرینہ نہیں جو وجوب کی نفی کو بتلائے، لہٰذا مطلق امر ہونے کی وجہ سے وجوب ہی مراد لیا جائے گا۔

(۲) رُوِيَ عن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم أنه قال: "ضَحُّوا فإنّها سنة أبيكم إبراهيم عليه الصلاة والسلام" اس حدیث میں بھی قربانی کا مطلق امر ہے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ کتاب الاضاحی، حدیث نمبر: ۳۱۲۷)

(۳) روی عنه علیه السلام أنه قال: "على كل أهلِ بيتٍ في كل عام أضحاة وعتيرة" (ابوداؤد: ۳۸۵/۲۔ بیہقی: ۳۱۳/۹)

(۴) وروي عنه علیه السلام أنه قال: "من لم يضحِ فلا يقربنّ مصلّانا" اس حدیث میں ترک اضحیہ پر سخت وعید سنائی گئی ہے جو کہ غیر واجب پر سنائی نہیں جاتی، اس لیے قربانی کا وجوب ثابت ہوا۔ (المستدرک للحاکم: ۳۸۹/۴)

(۵) وقال علیه السلام: "مَنْ ذَبَحَ قبل الصلاة فليعد أضحيتهٗ، وَمَنْ لَم يَذْبَحْ فليذبح بسم اللّٰه" (بیہقی: ۲۷۷/۹)

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا کہ اگر نماز سے پہلے قربانی کردی تو اس کا اعادہ کیا جائے گا، اس سے بھی وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔

(٦)عَن ابن عمرقال: أقام رسول الله صلى الله عليه وسلم بالمدينة عَشرَ سنين يضحي، آپ ﷺ کا مواظبت کے ساتھ قربانی کرنا اور کبھی ترک نہ کرنا بھی وجوب کی دلیل ہے۔(ترمذی شریف کتاب الاضحیہ)

امام شافعی اور امام احمدؒ کے دلائل

(۱)رُوي عن رسول الله صلى الله عليه و سلم أنه قال: "ثَلٰثٌ كُتِبَتْ عَلَيَّ، وَلَمْ تكْتَبْ عَلَيْكُمْ الوِتْرُ، والضحى، والأضحى"(مسند احمد:۱/۲۳۱)

(۲) روِيَ أن سيدنا أبا بكر وسيدنا عمرؓ كانَا لَا يُضحيَانِ السنةَ والسنتين ،ان دونوں حضرات کا ایک ایک دو دو سال قربانی ترک کرنا عدم وجوب کی دلیل ہے۔

(۳) حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ:قَدْ يَرُوْحُ عليَّ ألف شاةٍ ولا أضحى بواحدة مخافة أن يعتقد جاري أنها واجبة.

(۴) حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے:اِنَّهٗ عليه السلام قال: إذا دخل العشر وأراد بعضكم أن يضحى فلا يمسّ من شعره وأظفاره شيئًا. (مسلم)اس حدیث میں قربانی کو ارادے پر معلق کیا گیا ہے،اور جو چیز ارادے پر معلق ہو وہ واجب نہیں ہوتی بلکہ سنت ہوتی ہے۔

(۵) اگر قربانی واجب ہوتی تو مقیم اور مسافر کے درمیان فرق نہ کیا جاتا، کیوں کہ مال سے متعلق حقوق میں مسافر اور مقیم برابر ہیں جیسا کہ زکاۃ مقیم پر بھی فرض ہے اور مسافر پر بھی فرض ہے، ایسے ہی قربانی بھی اگر واجب ہوتی تو مقیم اور مسافر میں فرق نہ کیا جاتا۔

امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے دلائل کے جوابات

پہلی دلیل کا جواب

ولم تُكْتَبْ عَلَيْكُمْ میں فرضیت کی نفی ہے، وجوب کی نفی نہیں ہے کیوں کہ ''كُتِبَ'' فرضیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ، نیز یہ حدیث ضعیف ہے، اس لیے قابلِ استدلال نہیں۔

دوسری دلیل کا جواب

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس اتنا مال ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہر سال قربانی کریں، کیوں کہ یہ دونوں حضرات بقدرِ ضرورت ہی بیت المال سے وظیفہ لیا کرتے تھے، لہٰذا اغنا نہیں ہے جو وجوب کی ایک شرط ہے۔

تیسری دلیل کا جواب

حضرت ابومسعود انصاریؓ کا قول کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کے معارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا اس قول کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، نیز اُن کے قول کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اصل میں ان پر دوسرے کا قرضہ تھا اب اگر یہ قربانی کرتے تو پڑوسی یہ خیال کرتے کہ قربانی کرنا تنگ دستی اور مقروض ہونے کی صورت میں بھی واجب ہے۔

اسی طرح ان کے قول میں یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے وجوب سے مراد فرض لیا ہو کیوں کہ واجب مطلق ہی کا نام تو فرض ہے، اور مطلب یہ ہو کہ پڑوسی اس کی فرضیت کا اعتقاد نہ رکھ لیں۔

چوتھی دلیل کا جواب

لفظ "اراد" سے عدم وجوب ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ "مَنْ أرادالحجّ فليعمل" حالاں کہ حج کے وجوب کی نفی کوئی نہیں کرتا، نیز لفظ "اراد" کو اس لیے بھی لائے ہیں تا کہ اضحیہ واجبہ اور نافلہ دونوں کو شامل ہو جائے۔

پانچویں دلیل کا جواب

جہاں مسافر اور مقیم کے درمیان فرق کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قربانی نام ہے مخصوص حیوان کو مخصوص وقت میں ذبح کرنا، اب اگر مسافر پر بھی قربانی واجب کردی جائے تو حرج عظیم لازم آئے گا، کیوں کہ پھر تو مسافر پر ضروری ہوگا کہ وہ قربانی کا جانور اپنے ساتھ ساتھ لے کر سفر کرے، یا ان ایام میں سفر ہی نہ کرے، اور ان دونوں باتوں میں حرج عظیم لازم آئے گا، بخلاف زکاۃ کے کیوں کہ زکاۃ وقت مخصوص کے ساتھ متعین نہیں ہے، بلکہ پوری عمر زکاۃ کی ادائیگی کا وقت ہے، سفر سے آنے کے بعد بھی زکاۃ ادا کی جاسکتی ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے، بذل المجہود: ۴/ ۶۸۔ اعلاء السنن: ۱۷/ ۲۱۵۔ بدائع: ۴/ ۱۹۵۔ فتاویٰ شامی: ۹/ ۴۵۳۔ فتح الباری: ۱۰/ ۴)

۱۳۹ ﴿حدثنا هارونُ بنُ عبدِ الله قالَ نا عبدُ الله بنُ يزيدٍ قَالَ حَدَّثني سعيدُ بنُ أبي أيوبَ قال حدثني عياشُ بنُ عباسٍ القِتْبَانِيُّ عَنْ عيسى بنِ هلالٍ الصَدفيّ عَنْ عَبْدِ الله بنِ عَمرو بنِ العاصِ أن النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: أُمِرْتُ بِيَوْمِ الْأَضحى عِيْدًا ، جَعَلَه اللّٰهُ لهذهِ الأمَّةِ، قَالَ الرجلُ: أرأيتَ إنْ لم أجِدْ إلَّا مَنِيحَةً أُنْثى أفاضحي بِهَا؟ قال: لَا، ولكن تأخُذُ مِنْ شَعْرِكَ وأظْفَارِكَ وَتَقَصّ شَارِبَكَ وتُحلِقُ عَانَتَكَ ، فَتِلْكَ تَمامُ أضحِيَّتِكَ عِندَاللهِ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے

قربانی کے دن عید منانے کا حکم دیا گیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے بھی عید بنایا ہے، اس پر ایک صحابی نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر میرے پاس صرف پرائی اونٹنی ہی ہو تو بھی میں اس کی قربانی کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں، لیکن تم اپنے بال، ناخن، مونچھیں اور موئے زیر ناف صاف کرلو، اللہ کے نزدیک تمہاری قربانی یہ ہی ہے۔

تشریح مع تحقیق :مَنِيحَة: وہ بکری یا اونٹنی جس کو ایک آدمی دوسرے آدمی کو دودھ یا اون وغیرہ سے انتفاع کے لیے دے، اور پھر اس کو واپس لے لے، عربوں کے یہاں یہ دستور تھا کہ مالدار لوگ فقراء اور غرباء کو اس طرح جانور دیدیا کرتے تھے، لیکن ذات کا مالک نہیں بناتے تھے۔

أُنثى: دراصل منیحہ کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہوتا ہے، اس لیے یہاں پر انثی کی قید لگا کر مذکر کو خارج کردیا، ورنہ تو "منیحۃ" میں بھی تاء تانیث موجود تھی۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایک روز آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو عید منانے کا حکم فرمایا ہے، نیز اس امت کے لیے بھی اس دن کو عید کا دن بنادیا گیا ہے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد سنا تو چونکہ عید کے دن قربانی بھی ہوتی ہے اس لیے انہوں نے فوراً ہی یہ سوال کرلیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے پاس ایک منیحہ (عطیہ کی اونٹنی) ہے تو کیا میں اس کی قربانی کروں؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کی قربانی مت کرو، کیونکہ یہ تمہاری ملک نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی ملک ہے، اور قربانی کرنا اپنی ملک میں ہوتا ہے، اور اگر "ما یمنع بھا" سے مراد سائل کی ملک ہے تو حضور ﷺ کے فرمانے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے پاس اس اونٹنی کے سوا کوئی دوسرا جانور نہیں ہے، اور گھر والوں کو اس کی ضرورت ہے، لہٰذا شفقت کے طور آپ ﷺ نے ان سے منع فرمادیا، اور ارشاد فرمایا کہ اپنے ناخن، بال وغیرہ قربانی کی نیت سے کاٹ لو اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اخلاص کی بنیاد پر قربانی کا ثواب عطاء فرمائے گا۔

اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوگئی کہ غریب پر قربانی واجب نہیں ہے، کیونکہ اگر غریب پر بھی قربانی واجب ہوتی تو حضور ﷺ ان صحابی کو قربانی کرنے کا حکم فرمادیتے، اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تشبہ بفاعل الخیر پر بھی ثواب دیا جاتا ہے، مثلاً فاقد الطھورین نماز نہیں پڑھے گا بلکہ تشبہ بالمصلین کرے گا اور اس کو اسی پر ثواب بھی ملے گا۔

ترجمة الباب: باب کی دونوں حدیثوں کا باب سے ربط یہ ہے کہ پہلی حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر گھر والے پر قربانی کرنا واجب ہے اور ضروری ہے، جس سے وجوب ثابت ہوا، اور دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دسویں تاریخ کو مجھے عید منانے کا حکم دیا گیا ہے، اور اس دن کے احکام میں سے

ایک اہم حکم قربانی کرنا ہے، ثابت ہوا کہ قربانی کا حکم بھی دیا گیا ہوگا، اس سے بھی وجوب ثابت ہوگا۔

باب الأضحية عن الميت

میت کی طرف سے قربانی کرنے کا بیان

۱۴۰ حدثنا عثمانُ بنُ أبي شَيْبةَ قالَ نا شَرِيْكٌ عَنْ أبي الحَسَناءِ عن الحَكَمِ عَنْ حَنَشٍ قال: رأيْتُ عليًّا يُضَحِّيْ بِكَبْشَيْنِ، فَقُلْتُ لَهُ:ما هذا؟ فقال: إنَّ رسول الله صلى الله عليه و سلم أوْصَانِيْ أنْ أضَحِّيَ عَنْهُ، فأنَا أضَحِّيْ عَنْهُ

ترجمہ: حضرت حنشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو دو دنبوں کی قربانی کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ (دو کی قربانی کیوں کر رہے ہو) تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ حکم فرمایا تھا کہ میں آپ ﷺ کی طرف سے قربانی کروں، اس لیے میں آپ ﷺ کی طرف سے بھی قربانی کر رہا ہوں۔

تشریح مع تحقیق :أبو الحسناء: یہ راوی متکلم فیہ ہیں، ان کا اصل نام ”حسن“ ہے، اگرچہ بعض لوگ ”حُسین“ بھی کہتے ہیں، تقریب التہذیب میں حافظ بن حجرؒ نے ان کو مجہول کہا ہے، میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ شریک کا ان سے روایت کرنا غیر معروف ہے۔

حنش بن معتمر: یہ راوی بھی متکلم فیہ ہیں، اکثر محدثین نے ان پر جرح کی ہے، چنانچہ ابن مدینی کہتے ہیں: لَاأعْرِفُهُ، ابوحاتم نے کہا ہے:و هو عندِيْ صالحٌ ليس أراهم يختجون بحديثه، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ يتكلمون في حديثه ،امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ليس بالقوی، اور بھی دیگر اصحاب جرح وتعدیل نے ان پر کلام کیا ہے، لیکن سنداً ضعیف ہونے کے باوجود یہ حدیث متناً بالکل صحیح ہے، اور قابل استدلال ہے، دوسری احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے، یہ ہی ائمہ اربعہ کا مسلک ہے، لیکن میت کی طرف سے قربانی کرنے کی دو صورتیں ہیں، یا تو میت نے وصیت کی ہوگی یا نہیں، اگر میت نے قربانی کی وصیت کی تھی تو اس کے ثلث مال سے قربانی کرنا واجب ہے، قربانی کے گوشت کو صدقہ کیا جائے گا، اس کا کھانا جائز نہیں۔

اور اگر میت نے قربانی کرنے کی وصیت نہیں تھی تو میت کی طرف سے قربانی کرنا ثواب کا کام ہے، اور اس قربانی کے گوشت کو خود بھی استعمال کر سکتا ہے، دوسروں کو بھی کھلا سکتا ہے اس کا تصدق واجب نہیں ہے۔

(فتاوی شامی:۹/۴۸۴زکریا)

ترجمة الباب: حدیث شریف میں ہے کہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کی، جب کہ آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ان کا فعل نیز حضور ﷺ کا ان کو وصیت کرنا جواز کی دلیل ہے۔ یہ ہی باب کا مقصد ہے۔

﴿باب الرجل يأخذ من شعره في العشر و هو يريد أن يضحى﴾

جس شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو اس کے لیے ذی الحجہ کے اول عشرہ میں بال وغیرہ کتروانے کا بیان

۱۴۱ ﴿حدثنا: عُبيدُ اللّٰهِ بنُ معَاذٍ قَالَ نا أبِيْ قَالَ نَا محمدُ بنُ عَمرٍو قالَ نَا عَمرو بنُ مُسْلِمٍ اللَّيْثِيُّ قالَ: سمعتُ سَعِيْدَ بنَ المسَيَّبِ، يَقُوْلُ سَمِعْتُ أُمَّ سَلَمَةَ تَقُوْلُ: قَالَ رَسولُ اللّٰهِ صلّى اللّٰه علَيْهِ وسلَّم: مَنْ كَانَ لَهُ ذِبْحٌ يَذْبَحُهُ، فإذَا أَهَلَّ هِلَا لُ ذِي الحَجَّةِ، فَلَا يَأْخُذَنَّ مِنْ شعْرِهِ، وَلَا مِنْ أَظْفَارِهِ شَيئًا، حتّى يضَحِّي﴾

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس قربانی کا جانور ہو اور وہ اس کو ذبح کرنا چاہتا ہے، تو جب سے ذی الحجہ کا چاند ہو جائے وہ شخص قربانی کرنے تک اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔

تشریح مع تحقیق: ذِبْحٌ بکسر الذال وسکون الباء بمعنی المذبوح، وہ جانور جس کو ذبح کیا جائے، جیسا کہ قرآن میں ہے: "و فَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ"

أَظْفَار: ظِفْرٌ کی جمع ہے، بمعنی ناخون، حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں ناخون، بال وغیرہ نہ کاٹے جائیں، تاکہ تشبہ بالحُجّاج ہو جائے، لیکن در حقیقت یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو قربانی کرنے کا عزم رکھتا ہو، اور جس پر قربانی واجب نہیں اور نہ ہی اس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہے تو اس کیلئے یہ حکم نہیں ہے۔

لیکن ذی الحجہ کے شروع ہونے کے بعد قربانی کرنے سے پہلے ناخون و، غیرہ کاٹنے کی یہ نہی تنزیہی ہے یا تحریمی؟ اس بارے میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہو گیا۔

اختلافی مسئلہ

(۱) امام احمد، امام اسحٰق، داؤد ظاہری اور بعض شوافع کے نزدیک ذی الحجہ شروع ہونے کے بعد قربانی کرنے تک ناخن اور بال وغیرہ کا کاٹنا حرام ہے۔

(۲) امام مالک، امام شافعی اور صحیح قول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ ذی الحجہ شروع ہونے

کے بعد قربانی کرنے سے پہلے۔ بال، ناخن وغیرہ کا کاٹنا مکروہ تنزیہی ہے۔ بعض لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ کا یہ مسلک بھی نقل کیا ہے کہ نہ مکروہ ہے نہ واجب بلکہ نہ کاٹنا صرف مستحب ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اور امام صاحب کی طرف اس کی نسبت کرنا کسی مضبوط دلیل سے ثابت نہیں ہے۔

فریق اول کے دلائل

(۱) حضرت ام سلمہؓ کی حدیث: تقول : قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : من كان له ذبح فلا يأخذنّ من شعره ولا من أظفاره شيئًا حتى يضحّى. (ابوداؤد)

(۲) حضرت ام سلمہ کی دوسری حدیث: عَن أم سلمة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا رأيتم هلال ذى الحجة وأراد أحدكم أن يضحى فليمسك عن شعره وأظفاره (مسلم)

فریق ثانی کے دلائل

(۱) حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حدیث: أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث بالهدي من المدينة فلا يجتنب شيئًا مما يجتنب منه المحرم.

(۲) حضرت عائشہؓ کی دوسری حدیث :إن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث بهديه ولا يحرم عليه شيئ أحله الله له حتى ينحر هديه.

ان دونوں حدیثوں کا مفاد یہ ہے کہ جو چیزیں حضور ﷺ پر ہدی کے روانہ کرنے سے پہلے حلال تھیں وہ بعد میں بھی حلال رہیں، اور ان حلال چیزوں میں سے ناخن وغیرہ کاٹنا بھی تھا، معلوم ہوا وہ بھی حلال رہا۔

فریق اوّل کے دلائل کا جواب

حضرت ام سلمہؓ سے جتنی بھی احادیث منع عن اخذ الشعر کے بارے میں منقول ہیں وہ سب کراہت تنزیہی پر محمول ہیں، ورنہ احادیث میں تعارض لازم آئے گا، اور کراہت تنزیہی کے ہم بھی قائل ہیں۔

ترجمة الباب: من كان له ذبح يذبحهٗ فإذا أهل هلال ذى الحجة فلا يأخذن من شعره الخ. سے ثابت ہے۔

باب مايستحب من الضحايا

مستحب قربانی کا بیان

۱۴۲ حدثنا: أحمد بنُ صالحٍ قال حدثنا عبدُالله بنُ وهْبٍ قال أخبرني حيوة قال

حدثني أو صخرٍ عن ابن قُسَيْط عن عروةَ بنِ الزُبير عن عائشةَ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بكبش أقرَنَ، يطأ في سَوادٍ وينْظُرُ فِي سَوادٍ، ويَبْرُكُ فِي سَوادٍ، فأتِيَ بِهِ، فَضَحىّٰ بهِ فقال: ياعائشةُ: هَلمي المُدْيَةَ، ثم قالَ: اشحَذِيْهَا بحجَرٍ، ففعَلْتُ، فأخذَهَا وأخذَ الكبشَ، فأضْجعَهُ، فَذَبَحهُ، وقالَ: بسم الله اللّٰهُمَّ تقَبَّل مِنْ محمدٍ وآل محمدٍ ومِنْ أمّةِ محمدٍ. ثم ضحى به.

ترجمه: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سینگ والا مینڈھا لانے کا حکم فرمایا جو سیاہی میں چلتا ہو، سیاہی میں دیکھتا ہو، سیاہی میں بیٹھتا ہو، چنانچہ مینڈھا لایا گیا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! چھری لاؤ اور اس کو پتھر پر تیز کرو؟ حضرت عائشہؓ نے حکم کی تعمیل کی، آپ ﷺ نے مینڈھے کو پکڑا اور چھری کو پکڑا، پھر مینڈھے کو لٹایا اور یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ تقبل من محمد الخ کہ اللہ کے نام سے ذبح کرتا ہوں اے اللہ! میری طرف سے، میری اولاد کی طرف سے اور میری امت کی طرف سے اس کو قبول فرما۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی قربانی کی۔

تشریح مع تحقیق: كَبْشٌ (ج) أكباش. دو یا چار سال کا مینڈھا۔

اَقْرَنَ: وہ مینڈھا جس کے سینگ لمبے ہوں۔

يَطَأُ (س) چلنا، روندنا۔

يَبْرُكُ: (ن) بیٹھنا۔

اَلْمُدْيَة: بمعنی چھری۔

اَشحَذِيهَا. (ف) دھار لگانا، چھری وغیرہ کو تیز کرنا۔

آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ خوبصورت جانور کی قربانی کیا کرتے تھے، مثلاً ایسے مینڈھے کو منگایا کرتے تھے جس کے قدم بھی کالے ہوں، اس کی آنکھوں کے چاروں طرف کا گھیرا بھی کالا ہو، نیز اس کے پیٹ پر بھی سیاہی ہو، کیوں کہ ان تمام اوصاف سے متصف جانور خوبصورت سمجھا جاتا ہے، آپ ﷺ نے جب مینڈھے کو قربانی کے لیے منگایا تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ چھری کو تیز کرلو تا کہ روح جلدی نکل جائے، جانور کو پریشانی اور تکلیف کم ہو، اسی وجہ سے تو حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اچھی طرح اور جلدی ذبح کرو اگرچہ قصاص ہی میں کسی کی گردن اڑائی جائے، نیز حضور ﷺ نے جانور کو زمین پر لٹا کر قربانی کی تا کہ ذبح کرنے والے کو آسانی ہو، کہ ایک ہاتھ میں چھری لے لے اور دوسرے ہاتھ سے قربانی کے جانور کے سر کو پکڑے، پھر ذبح کرے، آپ ﷺ کا یہی طریقہ تھا۔

یادر ہے کہ اس حدیث سے امام مالک اور امام احمدؒ یہ استدلال کریں گے کہ ایک بکری میں چند آدمی شریک ہوسکتے ہیں کیوں کہ حضور ﷺ نے پوری امت کی طرف سے ایک مینڈھے کی قربانی کی ہے، لیکن ان کا یہ استدلال تام نہیں ہوگا کیوں کہ یہاں پر شرکت فی الثواب مراد ہے، شرکت فی الملک مراد نہیں ہے۔ یہ مسئلہ مستقلاً الگ ذکر کیا جائے گا۔ ہم وہاں پر مکمل بحث کریں گے، اس باب میں تو صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ کس جانور کی قربانی مستحب ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ قربانی کے جانور تین قسم کے ہیں (۱) ابل (۲) بقر (۳) غنم۔ صرف ان ہی تینوں کی قربانی کی جائے گی، ان کے علاوہ کی قربانی کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ جاموس (بھینس وغیرہ) بقر کی جنس میں داخل ہیں، اور ضان ومعز، غنم کی جنس میں داخل ہیں، ابن حزم کے علاوہ کوئی بھی ان مذکورہ اجناس کے ماسوا کی قربانی کو جائز نہیں کہتا، کیوں کہ ابن حزم کی رائے اس مسئلہ میں جمہور امت کے خلاف ہے، ابن حزم کا کہنا ہے کہ مرغی کی قربانی بھی جائز ہے اور اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں جمعہ کی نماز کے لیے اخیر میں آنے کی فضیلت یہ بتائی ہے کہ اس کو ایک مرغی کے قربانی کرنے کا ثواب ملے گا، لیکن جمہور امت کے مقابلہ میں فرد واحد کی کیا حیثیت ہے؟

رہا مسئلہ یہ کہ قربانی میں کونسا جانور افضل ہے، تو اس بارے میں فقہاء کے مابین کچھ اختلاف ہے ہم ہر فریق کا مذہب مع اس کے دلائل کے آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔

مختلف فیہ مسئلہ

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک بھیڑ کی قربانی کرنا افضل ہے، یہ ہی رائے امام ابوداؤدؒ کی بھی ہے۔

(۲) امام ابوحنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اولاً اونٹ کی قربانی افضل ہے پھر گائے کی، اور پھر بکرے کی قربانی کرنا افضل ہے۔

فریق اوّل کے دلائل

(۱) آیت قرآنی ہے: وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ: اس آیت میں مینڈھے کی قربانی کو ذبح عظیم یعنی بڑی اور افضل قربانی بتایا گیا ہے۔

(۲) حدیث باب بھی امام مالکؒ کی مستدل ہے کیوں کہ حضور ﷺ کبش کی قربانی ہی فرمایا کرتے تھے، اور آپ ﷺ کو کبش ہی پسند تھا۔

فریق ثانی کے دلائل

(۱) حدیث جمعہ ہماری دلیل ہے: مَنْ رَاحَ أَوَّلَ السَاعَةِ فقرّب بَدْنَةً. الخ (بخاری: ۱/۱۲۱، مسلم: ۱/۲۸۰) وجہ

استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سب سے پہلے مسجد میں جائے تو اس کا ثواب ایسا ہے جیسا کہ اس نے اللہ کی راہ میں ایک اونٹ کی قربانی کی، اور جو شخص اس کے بعد جائے تو اس کا ثواب ایسا ہے کہ جیسا کہ گائے کی قربانی کی، اور جو اس کے بعد جائے تو اس کو بکرے کے قربانی کرنے کا ثواب ملے گا، اب دیکھئے سب سے پہلے آنے والا زیادہ ثواب کا مستحق ہے، اور زیادہ ثواب اونٹ کے قربانی کرنے میں ہے، معلوم ہوا کہ افضل قربانی اونٹ کی ہی ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ ہر عمل میں ثواب مشقت کے اعتبار سے ملتا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ اونٹ کی قربانی کرنے میں زیادہ مشقت ہے لہٰذا اس کی قربانی ہی افضل ہوگی۔

فریق اوّل کے دلائل کا جواب

قرآن شریف میں مینڈھے کو عظیم قربانی کہا گیا ہے، لیکن عظمت کی یہ صفت تمام مینڈھوں میں نہیں ہے بلکہ وہ اسی مینڈھے کے ساتھ خاص تھی، کیوں کہ وہ جنت سے لایا گیا تھا، جہاں تک حضور ﷺ کے عمل کا تعلق ہے تو اس سے افضلیت تو ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس طرح تو حضور ﷺ نے اونٹ کی قربانی بھی کی ہے۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی رائے گرامی

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم نے ترمذی شریف میں کتاب الاضحیہ پڑھاتے وقت فرمایا تھا کہ دراصل قربانی کے افضل اور غیر افضل ہونے میں جگہ کا فرق ہے، جہاں جانور کا گوشت اچھا اور قیمتی سمجھا جاتا ہو وہاں اسی کی قربانی افضل ہوگی، چنانچہ ہمارے یہاں ہندوستان میں بکرے کے گوشت کو عمدہ سمجھا جاتا ہے اس لیے اسی کی قربانی کرنا افضل ہے، اور عربوں کے یہاں اونٹ کا گوشت اچھا سمجھا جاتا ہے، اس لیے وہاں اونٹ کی قربانی کرنا ہی افضل ہے۔

ترجمة الباب: باب کا مقصد ان جانوروں کو بیان کرنا ہے جن کی قربانی کرنا افضل ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ایسے ہی جانوروں کا ذکر ہے، جن کی قربانی کرنا افضل ہے، کیوں کہ امام ابوداؤدؒ نے ترجمۃ الباب میں ان ہی احادیث کو ذکر کیا ہے جس سے ان کے مسلک کی بھی تائید ہوتی ہو۔

۱۴۳ ﴿حدثنا: موسىٰ بنُ إسمٰعيلَ قال نا وُهَيْبٌ عن أبي قِلابَةَ عَنْ أنسٍ أنَّ النبيّ ﷺ نَحَرَ سَبْعَ بَدَنَاتٍ بِيَدِهٖ قِيامًا وَضَحّٰى بالمدينةِ بكَبْشَيْنِ أقْرَنَيْنِ أمْلَحَيْنِ﴾

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے سات اونٹوں کو کھڑا کرکے نحر کیا، اور مدینہ منورہ میں دو چتکبرے مینڈھوں کی قربانی کی۔

تشریح مع تحقیق: بَدَنَاتٌ: بَدَنَة کی جمع ہے وہ گائے یا اونٹ جس کی حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں قربانی کی جاتی ہے۔

کَبْشَیْن "کَبْشٌ" کا تثنیہ ہے اس کی جمع "اَکْبَاش" آتی ہے، بمعنی دو یا چار سال کا بکرا، مینڈھا وغیرہ۔

اَمْلَحَیْنِ "اَمْلَح" کا تثنیہ ہے بمعنی چتکبرا جانور۔

اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے حج کے موقع پر اپنے دست مبارک سے سات اونٹوں کو ذبح فرمایا، حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم نے سبق کے دوران یہ ارشاد فرمایا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر سات اونٹ تو حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح کیے، اور ۵۶/اونٹ حضرت علیؓ اور آپ ﷺ دونوں نے مل کر ذبح کیے، اور کچھ اونٹ حضرت علیؓ کے سپرد بھی کیے تھے تا کہ وہ ان کو ذبح کردیں (غالبًا حضرت علی کو سپرد کیے گئے اونٹوں کی تعداد ۳۷/تھی) اس طرح کل ملا کر حضور نے ۱۰۰/اونٹ کی قربانی کی۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں بھی دو مینڈھوں کی قربانی کی، مختلف سندوں کے ذریعہ ان دو مینڈھوں کا تذکرہ آئے گا، اگر تفصیل مطلوب ہو تو مسلم شریف کی کتاب الاضاحی کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۴۴ ﴿حدثنا: مُسلم بنُ إبراهيمَ ناهشامٌ عَنْ قتادةَ عَنْ أنسٍ أنَّ النَّبِيَّ ﷺ ضَحىٰ بكَبْشَيْنِ أقْرَنَيْنِ أملَحَينِ، يَذْبَحُ وَيُكَبِّرُ ويسَمِّي ويضَعُ رِجْلَهُ على صَفْحَتِهِما﴾

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو لمبے سینگ والے چتکبرے مینڈھوں کی قربانی کی، جب آپ ﷺ ذبح کرتے تو تکبیر کہتے تھے، بسم اللہ پڑھتے تھے، اور اپنا بایاں پاؤں ان کی گردن پر رکھتے تھے۔

تشریح مع تحقیق: صَفْحَةٌ جانب، کنارہ، مراد جانور کا سینہ (ہنسلی) ہے، عموماً بولا جاتا ہے صفحة الرجل: آدمی کا سینہ۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت اپنے قدم مبارک کو جانور کے سینے پر رکھ لیا کرتے تھے، اور بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑ لیتے تھے، دائیں ہاتھ سے چھری پکڑتے پھر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرتے تھے۔

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے دو مینڈھوں کی قربانی کی، اور ان دونوں کی صفت بھی حدیث میں بیان فرمادی، دوسری بات اس حدیث سے قربانی کرنے کا مسنون طریقہ معلوم ہوا کہ کس طرح جانور کو لٹایا جائے اور کس طرح ذبح کیا جائے۔ (مزید تفصیل دیکھئے، فتح الباری: ۱۰/۱۲)

۱۴۵ ﴿حدثنا: إبراهيمُ بنُ موسٰى الرازيُّ قالَ نا عيسٰى قال نا محمدُ بنُ إسحاقَ عن يزيد بنِ أبي حَبِيْبٍ عَنْ أبي عيَّاشٍ عَن جابرِبنِ عبدِ اللهِ قَال: ذَبَحَ النَّبِيُّ صلى الله عليه

وسلم يَوْمَ الذِبْحِ كَبْشَيْنِ أَقْرَنَيْنِ أَمْلَحَيْنِ مَوْجُوئَيْنِ، فَلَمَّا وَجَّهَهُمَا قَالَ: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ عَلٰى مِلَّةِ إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا، وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، "إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وأُمَّتِهٖ، بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ ذَبَحَ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے دن "سینگ والے چتکبرے، خصی مینڈھے ذبح کیے تو ان کو پہلے قبلہ رو کیا اور پڑھا "إِنِّي وَجَّهْتُ الخ" کہ میں اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں، موحد ہوں، مشرکین میں سے نہیں ہوں، بے شک میری نماز، میری قربانی، اور میرا مرنا جینا سب کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور اسی کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور میں مسلمان ہوں، اے اللہ! یہ قربانی تیری ہی عطا ہے، اور خاص تیری ہی رضا کے لیے ہے، میری (محمد ﷺ) کی طرف سے، اور میری امت کی طرف سے اسے قبول فرما اللہ تعالیٰ جو بہت بڑا ہے کے نام کے ساتھ ذبح کرتا ہوں، پھر آپ ﷺ نے اس کو ذبح کیا۔

تشریح مع تحقیق: مَوْجُوئَيْنِ: یہ "مَوْجُوْءٌ" اسم مفعول کا تثنیہ ہے (س) جانور کو خصی کرنا اس حدیث میں ایک نئی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس جانور کی قربانی کی تھی وہ خصی تھا اس سے پہلی حدیث میں اس صفت کی وضاحت نہیں تھی، تمام اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خصی کی قربانی کرنا فحل کے مقابلہ میں افضل ہے، بعض لوگ مثلاً ابن حزم کہتے ہیں کہ خصی چوں کہ ناقص الاعضاء ہوتا ہے، اس لیے اس کی قربانی کرنا مکروہ ہے۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو حضور ﷺ ہرگز خصی مینڈھے کی قربانی نہ کرتے، نیز خصی جانور کا گوشت عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے، اسی طرح گراں بھی ہوتا ہے، اس کے بالمقابل غیر خصی کے گوشت میں بدبو بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کھانے میں لذت ختم ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ترمذی شریف کی اس حدیث کا تعلق ہے جس میں ہے کہ حضور ﷺ نے جس مینڈھے کی قربانی کی تھی وہ خصی نہیں تھا، تو یہ روایت ہمارے خلاف نہیں، کیوں کہ حضور ﷺ نے کوئی ایک مرتبہ تو قربانی کی نہیں، بلکہ متعدد بار قربانی فرماتے رہے ہیں، تو کبھی آپ نے خصی کی قربانی کی اور کبھی بیان جواز کے لیے غیر خصی کی قربانی کی۔

حدیث بالا میں جو دعا ذکر کی گئی ہے، قربانی کرتے وقت اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے، نیز جس طرح حضور ﷺ نے اپنی قربانی خود اپنے ہاتھ سے کی تھی اسی طرح ہم کو بھی اپنی قربانی اپنے ہاتھ سے ہی کرنی چاہیے، ہاں اگر

کوئی مجبوری ہو تو دوسرے سے کراسکتا ہے۔ (بذل المجہود:۴/۷۱)

۱۴۶ ﴿حدثنا: يحيىٰ بنُ مَعينٍ قال نا حَفصٌ عَنْ جعفرٍ عَنْ أبِيْهِ عَنْ أبي سَعِيْدٍ قالَ: كَانَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يُضَحّى. بِكَبْشٍ أقْرَنَ، فَحِيْلٍ، يَنْظُرُ فِي سَوادٍ ويأكلُ في سوادٍ ويَمْشِي في سوادٍ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوسعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سینگ والے فربہ دنبے کی قربانی کیا کرتے تھے، جو سیاہی میں دیکھتا تھا، (اس کی آنکھوں کے اردگرد سیاہی تھی) سیاہی میں کھاتا تھا (منھ بھی سیاہ تھا) سیاہی میں چلتا تھا۔ (اس کے پیر بھی کالے تھے)

تشریح مع تحقیق: فَحِيْلٌ جمع فحول آتی ہے بمعنی سانڈ، ہر حیوان کا نر، فتح الباری میں ابن العربیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فحل کی قربانی کی جیسا کہ ترمذی شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، نیز ابوداؤد کی اس حدیث باب سے بھی معلوم ہوتا ہے، تو دراصل حضور ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے جانوروں کی قربانی کی ہے، کسی سال خصی کی قربانی کردی تو کسی سال غیر خصی کی قربانی کی، اس قسم کی روایات ان روایات کے منافی اور معارض نہیں جن میں خصی کا ذکر ہے۔ (فتح الباری:۱۰/۱۲۔ بذل:۴/۷۱)

ترجمة الباب: اس باب کی تمام روایات کی ترجمہ سے مطابقت بالکل واضح ہے اس لیے طول وتکرار سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

﴿باب مايجوز في الضحايا من السِّنِ﴾

قربانی میں کس عمر کا جانور ہونا چاہیے

۱۴۷ ﴿حدثنا: أحمدُ بنُ أبي شُعَيب الحرّانيُّ قَالَ أخبرنازُهيرُ بنُ مُعاوِيَةَ قَالَ نا أبوالزُبَير عَنْ جابرٍ قَالَ: قَالَ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لَا تَذْبَحُوْا إلَّا مُسِنَّةً، إلَّا أن يُعْسَرَ عَلَيْكُمْ، فتَذْبَحُوْا جَزَعَةً مِنَ الضَّانِ.﴾

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''سنہ'' کو ہی ذبح کرو، مگر یہ کہ تم پر تنگی ہو جائے، (سنہ کو نہ پاسکو) تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کردو۔

تشریح مع تحقیق: مُسِنَّة: یہ ''سِنّ'' سے ماخوذ ہے، مراد عمر دراز جانور ہے، عام طور پر اس کو لفظ ''ثنی'' سے تعبیر کرتے ہیں، ہر جنس کا مسنہ الگ الگ ہوتا ہے۔

مَعْز: اسم جنس ہے اس کا واحد ''ماعِز'' اور جمع ''مَعِیْز'' آتی ہے، بکری پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔
ضَان: بھیڑ، دنبہ۔
غَنَم: (ج) أغْنام: بمعنی بکری، لیکن غنم کا اطلاق ضان اور معز دونوں پر ہوتا ہے۔
بقر کا مسنہ: وہ گائے یا بھینس جو دو سال کی ہو کر تیسرے سال میں لگ جائے۔
اونٹ کا مسنہ: وہ اونٹ جو پانچ سال کا ہو کر چھٹے سال میں لگ جائے۔
بقر کا جذعہ: جس کی عمر دو سال سے کم ہو وہ گائے، بھینس کا جذعہ ہے۔
اونٹ کا جذعہ: جو اونٹ پانچ سال سے کم کا ہو اس کو جذعہ من الابل کہتے ہیں۔
ان چاروں کی تفسیر کے سلسلے میں تو ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، البتہ بھیڑ اور بکری کے جذعہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے، اسی طرح بھیڑ اور بکری کے مسنہ میں بھی اختلاف ہے۔

بھیڑ اور بکری کا مسنہ: امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جو ایک سال کا ہو کر دوسرے سال میں لگ جائے اس کو مسنة من الغنم کہتے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جو دو سال کا ہو جائے اس کو مسنة من الغنم والضأن کہتے ہیں۔

بھیڑ اور بکری کا جذعہ: امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جو چھ مہینے کا ہو جائے اس کو جذعہ من الغنم والضأن کہتے ہیں امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جو ایک سال کا ہو کر دوسرے سال میں لگ گیا ہو، اگر ایک سال سے پہلے بھی دانت ٹوٹ جائیں تو بھی جذعہ من الغنم ہوگا۔ اختلاف مذکور کی اصل وجہ لغت کا اختلاف ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۵۵۸، فتح الباری: ۱۰/ ۱۹)

مسئلۂ خلافیہ

(۱) ائمہ اربعہ اور تمام دیگر فقہائے کرام کا مسلک یہ ہے کہ جذعہ من الضأن کی قربانی کرنا جائز ہے، البتہ مسنہ کی قربانی افضل ہے، اور جذعہ من البقر والابل والمعز کی قربانی کرنا جائز نہیں۔

(۲) حضرت ابن عمرؓ اور امام زہری کی طرف یہ نسبت کی جاتی ہے کہ ان کے نزدیک جذعہ من الضأن کی قربانی بھی جائز نہیں ہے، البتہ اگر مسنہ کی قربانی سے عاجز ہو جائے تو جائز ہے۔

فریق اوّل کے دلائل

(۱) حضرت مجاشعؓ کی حدیث: إن النبيّ صلى الله عليه وسلم قال: إنّ الجذعَ يوفي مايوفي منه الثني. (ابن ماجہ، ابوداوٗد، نسائی)

(۲) حضرت معاذ بن عبداللہ حضرت عقبہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں: "ضحينا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم بجزع من الضأن" (نسائی)

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے: "نعمة الأضحية الجذعة من الضأن" (ترمذی)

(۴) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يجوز الجذع من الضأن، اخرجهٔ ابن ماجة عن ام هلال بن هلال عن أبيها، ورجاله ثقات أو مقبولون (كما في نيل الأوطار ۳۴۶/۴)

فریق ثانی کی دلیل

حدیث باب ہے کیوں کہ حدیث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ صرف مسنہ کی ہی قربانی کرو، مگر مسنہ نہ ملے تو مجبوری کی وجہ سے جذع بھی کافی ہو جائے گا۔

جواب: حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ علامہ نوویؒ نے جمہور سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث جس سے حضرت ابن عمر اور امام زہریؒ نے استدلال کیا ہے ندب اور استحباب پر محمول ہے۔ اور حدیث میں جذعه من الضأن کی ممانعت صریح نہیں ہے، بلکہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: والتقديرُ يستحبُّ لكم أن لا تذبحوا إلاّ مسنة، فإنْ عَجَزْتُمْ فاذبحوا جذعة من الضأن. (فتح الباری: ۱۰/۱۸، تکملہ فتح الملہم: ۳/۵۵۸۔ بذل المجہود: ۴/۷۱۔ حاشیہ ابی داؤد)

ترجمة الباب: لا تذبحوا إلا مُسِنَّةً الخ. سے ثابت ہے۔

۱۴۸ ﴿حدثنا: محمدبنُ صدرانَ قال نا عبدُ الأعلى بنُ عبدِ الأعلى قَالَ أنا محمد بنُ إسحاقِ قَالَ نا عمارةُ بنُ عبدِ اللهِ بنِ طُعْمَة عن سعيد بن المسيَّبِ عن زيد بن خالدٍ الجُهْنِيِّ قَالَ: قَسَّم رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم ضحايًا في أصحابِه، فأعطَانِيْ عَتُودًا جذَعًا، قَالَ فَرَجَعْتُ بِهِ إِلَيْهِ، فقلتُ: إِنَّهُ جَذَعٌ فقَالَ: ضَحِّ بِهِ فَضَحَّيْتُ.﴾

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کے درمیان قربانی کے جانور تقسیم کئے، تو مجھے ایک سال کا بکری کا بچہ دیا، جو جذعہ تھا، میں اس کو دوبارہ حضور ﷺ کے پاس لایا اور عرض کیا کہ یہ تو جذعہ ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسی کی قربانی کردو، میں نے اس کی قربانی کردی۔

تشریح مع تحقیق: عَتُود: (ج) أَعْتِدَةٌ. وعِتْدَانٌ. بکری کا وہ بچہ جو خود بخود چرنے لگے، اور اس پر ایک سال گزر جائے، لیکن ابن بطال نے کہا کہ "العتود الجذع من المعز" پانچ ماہ کے بچے کو کہتے ہیں، اور بعض نے کہا کہ چار ماہ کا بچہ۔ (قواعد اللغۃ ص: ۳۷۲، بذل: ۴/۷۱)

جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ جذعہ من المعز کی قربانی جائز نہیں، لیکن بخاری شریف، مسلم شریف، اور ابوداؤد شریف کی حدیث الباب اس کے علاوہ اور بہت سی سندوں سے اس قسم کی روایات موجود ہیں، جن سے جذعہ من المعز کی قربانی کا جواز معلوم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے فقہاء کے سامنے بڑا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے کہ ان روایات کے باہم تعارض کو کس طرح دور کیا جائے؟

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے ایسی بہت سی احادیث لاکر جن میں حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے خاص طور سے جذعہ من المعز کی قربانی کا ثبوت ہے، علامہ بیہقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ان تمام روایات کو محفوظ مان لیا جائے جن میں اس بات کی صراحت ہے کہ اے ابو ہریرہ! جذعہ من المعز صرف تمہارے لیے جائز ہے تمہارے بعد کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔(وَلن تجزي عن أحد بعدذلك؛ لا تجزي عن أحد بعدك وغيره) تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے صرف حضرت ابو ہریرہؓ کو رخصت دیدی تھی اس کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ روایت بالا میں تو حضرت زید بن خالدؓ کو جذعہ من المعز کی قربانی کی اجازت دی، اور ہم دیگر احادیث کی بنیاد پر یہ مان چکے ہیں کہ ان کو اجازت دیکر یہ فرمایا کہ تمہارے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کو اجازت دی ہوگی اور فرمایا ہوگا کہ تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے، اسی طرح عقبہؓ کے بارے میں بھی ہے کہ تمہارے لیے جائز ہے اور کسی کے لیے جائز نہیں، اسی طرح کل پانچ آدمیوں کو رخصت دینا ثابت ہے، حالاں کہ جس شخص سے اولاً کہا ہوگا کہ تمہارے لیے جائز ہے اور اس کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں ہے تو بعد والوں کے لیے اجازت دینا کس طرح ثابت ہوگا، اس لیے ان زیادتیوں کا اضافہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اور جب زیادتی ثابت نہ مانیں گے تو خصوصیت پر کیسے محمول کیا جائے گا؟

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس اشکال کا جواب دیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان پانچوں افراد کو ایک ہی وقت میں رخصت دی ہو، اور پھر بعد میں سب کو منع کر دیا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کو رخصت دی ہو پھر دوسرے شخص کو رخصت دی ہو جس سے پہلے شخص کی رخصت منسوخ ہوگئی، اور جہاں پانچوں کا ذکر ہے تو ان میں دو تو یہ ہیں (۱) ابو ہریرہؓ (۲) عقبہ اور تین ان کے علاوہ ہیں لیکن جب ان تین کو رخصت دی تو کسی بھی زیادتی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ نے ان کو اجازت دیکر یہ فرمایا ہو کہ تمہارے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں، جیسا کہ حضرت زید بن خالد کی حدیث باب ہے کہ حضور ﷺ نے صرف اجازت دیدی یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں، اس لیے یہ کہا جائے کہ ان تینوں حضرات کو جن میں حضرت زید بن خالد بھی شامل ہیں شروع زمانے میں رخصت دی پھر ان کی رخصت منسوخ کردی گئی، اور خصوصیت صرف ابو ہریرہؓ اور اور حضرت عقبہؓ کی رہی، علامہ حافظ بن حجرؒ نے اس مسئلہ پر بڑا مفصل

کلام کیا ہے، اس لیے مطالعہ کرنا مناسب ہے۔(فتح الباری: ۱۰/ ۱۷، بذل: ۴/ ۷۳)

ترجمة الباب: امام ابوداوٗد نے ترجمۃ الباب اس لیے قائم کیا تھا کہ ان جانوروں کو بیان کیا جائے جن کی قربانی کرنا جائز ہے، اور ان کی عمر کے بارے میں بیان کیا جائے کہ کتنی عمر کے جانور کی قربانی جائز ہے، اور کتنی عمر کے جانور کی قربانی ناجائز ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے حضرت زید بن خالدؓ کی حدیث کو ذکر کیا، چوں کہ جب حضرت زید بن خالد کو جذعہ من المعز ملا تو انہوں نے سوچا کہ اس کی تو قربانی جائز نہیں ہے پھر کیا کروں چنانچہ حضور ﷺ کی خدمت میں دوبارہ پہنچ گئے تو حضور ﷺ نے صرف ان کو رخصت دیدی، اب ترجمہ اس طرح ثابت ہوگا کہ حضرت زید بن خالد کا جذعہ من المعز کو لوٹا کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جذعہ من المعز کی قربانی جائز نہیں ہے۔

۱۴۹﴿حدثنا:الحسنُ بنُ عليّ قال أنا عبدُ الرزاق أنا الثوريُّ عن عاصمِ بنِ كُلَيبٍ عن أبيه قال: كُنَّا مَعَ رجلٍ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم يقال لهُ مُجاشع من بني سُلَيمٍ فَعَزَّتِ الغنمُ، فأمرَ مُنَادِيًا؟ فنادىٰ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: إن الجَذَعَ يُوفِي مِمَّا يُوْفِيْ مِنْهُ الثَنِيُ، قَالَ أبوداوٗد:وهو مُجاشع ابنُ مسعُودٍ﴾

ترجمہ: حضرت کلیب کہتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے ایک صحابی جن کا نام مجاشع تھا کے ساتھ تھے، اس وقت بکریوں کی قلت ہوگئی، تو حضرت مجاشع بن مسعود نے منادی کو حکم دیا کہ وہ اعلان کرے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس چیز سے ثنی کفایت کرتا ہے جذعہ بھی اس سے کافی ہوجاتا ہے۔

تشریح مع تحقیق :عَزّت الغنم:ای قَلَّتْ (ض) عَزَّ الشیئ یَعِزُّ: کم ہونا اور غنم سے مسنہ بکریاں مراد ہیں۔

يُوْفِي: (افعال) کافی ہوجانا، پورا کرنا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ مسنہ بکریوں کی بڑی قلت پڑگئی تو حضرت مجاشع بن مسعودؓ نے یہ اعلان کرادیا کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جذعہ بھی اس چیز کی کفایت کرتا ہے جس کی مسنہ کفایت کرتا ہے۔(جذعہ سے مراد جذعہ من الضان ہے نہ کہ تمام جانوروں کا جذعہ) لہٰذا جذعہ کی قربانی کرلو، کافی ہوجائے گی، بعض لوگوں نے حدیث کے ظاہر کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ ہر قسم کے جذعہ کی قربانی جائز ہے حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہاں جذعہ سے مراد جذعہ من الضان ہی ہے۔

قال ابو داؤد: چوں کہ متن میں حضرت مجاشعؓ کا پورا نام ذکر نہیں کیا تھا، اس لیے امام ابوداوٗد نے مناسب

سمجھا کہ والد کے نام کوذکر کر کے وضاحت کردی جائے، عین ممکن ہے کہ امام ابوداؤد کے سامنے کوئی اور مجاشع بھی ہوں جس کی وجہ سے وضاحت کرنی پڑی۔

ترجمۃ الباب: واضح رہے کہ حدیث سے جذعہ من الضان کی قربانی کے جواز کو بیان کیا گیا ہے۔اور باب کا مقصد بھی یہ ہی بیان کرنا ہے کہ کتنی عمر والے جانوروں کی قربانی جائز ہے۔

۱۵۰ ﴿حدثنا:مسدّدٌ قال نا أبوالأحوصِ قال نا منصورٌ عن الشعبي عنِ البراءِ قال: خَطَبَنَا رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يومَ النحر بَعْدَ الصَّلاةِ، فقال: مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا، وَنَسَكَ نُسُكَنَا، فقَدْ أصَابَ النُسكَ، ومَنْ نَسكَ قبلَ الصلاةِ فتِلْكَ شاةُ لَحْمٍ، فقامَ ابوبُرْدَةَ بنُ نيارٍ فقال: يا رسول اللّٰه! واللّٰهِ لَقَدْ نَسَكْتُ قبل أن أخرجَ إلى الصلاة، وعرفتُ أن اليومَ يوم أكلٍ وشُربٍ فتعجَّلْتُ، فَأكَلْتُ وأطعَمْتُ أهلي وجيراني، فقالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم تِلْكَ شاةُ لحمٍ، فقال: إن عندِي عَنَاقًا جَذْعَةً، وَهِيَ خَيْرٌ مِنْ شَاتَيْ لَحْمٍ فَهَلْ تُجْزِئُ عَنِّي؟ قَالَ: نَعَمْ: وَلَنْ تَجْزِئَ عَنْ أحدٍ بَعدَكَ﴾

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عید کے دن نماز کے بعد خطبہ دیا، اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہماری جیسی نماز پڑھے اور ہماری طرح قربانی کرے، تو اس نے قربانی کو پالیا (اس کو ثواب ملے گا) اور جو شخص عید کی نماز سے پہلے قربانی کرلے تو وہ بکری (قربانی کی نہیں ہوگی بلکہ) گوشت (کھانے) کی ہوگی، یہ سن کر حضرت ابو بردہؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے نماز سے پہلے ہی قربانی کردی ہے اور میں تو یہ سمجھا کہ آج کا دن کھانے پینے کا ہے، اسی لیے میں نے جلدی کی اور خود بھی کھایا گھر والوں اور پڑوسیوں کو بھی کھلایا، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تو گوشت کی بکری ہوگئی۔

حضرت ابو بردہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے وہ گوشت کی دو بکریوں سے بہتر ہے تو کیا وہ میری طرف سے کافی ہوجائے گا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ ہاں کافی ہوجائے گا لیکن تمہارے بعد کسی کے لیے کافی نہ ہوگا۔

تشریح مع تحقیق :نَسَكَ (ن) عبادت کرنا، اللہ کے نام پر قربانی کرنا،

عَنَاقًا: بفتح العین بکری کا ایک سال سے کم کا بچہ۔اس کی جمع ''أعنق'' آتی ہے۔

اس حدیث شریف میں صرف دو باتیں سمجھنے کی ہیں (ا) آپ ﷺ کا ارشاد کہ تم اس جذعہ کی قربانی کردو، تمہارے لیے کافی ہوجائے گا، تمہارے بعد کسی کو بھی اس کی اجازت نہیں ہوگی، اس سلسلہ میں تو ہم ماقبل میں

مفصل کلام کر چکے ہیں کہ یہ ان صحابیؓ کی خصوصیت تھی۔ (۲) ''مَن صلّٰی صلاتنا'' سے متعلق ہے، کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے اور ہماری طرح قربانی کرے تو اس کی قربانی ہوگی اور جو نماز کے بعد قربانی نہ کرے بلکہ پہلے ہی قربانی کرے تو اس کی قربانی نہیں ہوگی، اس ارشاد سے قربانی کے وقت کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر نماز سے پہلے ہی قربانی کی گئی تو قربانی ادا نہیں ہوگی، اس میں تو کسی کو بھی کلام نہیں کہ اگر نماز کے بعد جب امام بھی اپنی قربانی کر چکے تو اس وقت قربانی کرنا افضل اور اولیٰ ہے، لیکن اس کے وقت کی ابتداء کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے۔

مسئلہ خلافیہ

(۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قربانی کا وقت امام کی نماز کے بعد ہے، نیز امام کے ذبح کرنے کے بعد ہی قربانی کرنا جائز ہے اگر امام کے ذبح کرنے سے پہلے ذبح کر دیا تو کافی نہیں ہوگا، بلکہ اعادہ ضروری ہوگا۔

(۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ قربانی کا وقت امام کی نماز کے بعد ہے خواہ ذبح کرے یا نہ کرے۔

(۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب سورج طلوع ہو جائے اور عید کی نماز اور دو خطبوں کا وقت گذر جائے تب قربانی کا وقت ہے خواہ امام نے نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو اور شہر و دیہات کا کوئی فرق نہیں ہے۔

(۴) امام ابوحنیفہؒ امام اوزاعی اور امام اسحٰق فرماتے ہیں کہ شہر میں جب امام نماز پڑھ لے تو قربانی کا وقت ہے، اور دیہات میں فجر صادق کے طلوع کے بعد ہی قربانی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

فریق اوّل کی دلیل

(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: مَن ذبح قبل أن یصلی فلیعد مکانها أخری.

وجہ استدلال یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور ﷺ کے ذبح کرنے سے پہلے ہی ذبح کر دیا تھا اس لیے اعادے کا حکم دیا گیا۔

فریق ثانی کی دلیل

(۱) حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث ہے: من نسك قبل الصلاۃ فتلك شاۃ لحم. اس حدیث میں صرف نماز کا ذکر ہے کہ اگر نماز سے پہلے قربانی کر دی تو قربانی نہیں ہوئی بلکہ وہ گوشت کی بکری ہو گئی۔ اس میں یہ کوئی ذکر نہیں ہے کہ امام کے ذبح کرنے کے بعد ہی قربانی ہوگی اور اس سے پہلے کر دی تو اعادہ واجب ہوگا۔

فریق ثالث کی دلیل

امام شافعیؒ نے بخاری شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے: عن البراء قال "صلی

رسول اللہ ﷺ ذات یوم فقال: من صلی صلاتنا، واستقبل قبلتنا، فلا یذبح حتی ینصرف الخ"
وجہ استدلال یہ ہے کہ قربانی کا اوّل وقت نماز اور خطبوں کی بقدر وقت کے گذرنے کے بعد ہے، کیوں کہ اس عبادت میں نماز کے ساتھ دو خطبے ہی مقصود ہیں، جب اصل نماز اور دو خطبے ہوئے تو ان کی ادائیگی کے بقدر وقت کے گذرنے کو ان کا قائم مقام بنالیا جائے گا۔ اور کہا جائیگا کہ اتنا وقت گذرنے کے بعد قربانی کرنا درست ہے، خواہ نماز پڑھی گئی ہو یا نہیں، اسی طرح امام نے ذبح کیا ہو یا نہیں، نیز شہر اور دیہات والوں کے مابین امتیاز کی کوئی وجہ نہیں بلکہ سب برابر ہیں۔

فریق رابع کے دلائل

(۱) بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے: مَنْ ذَبَح قبل الصلاة فَلْيعِدْ.
(۲) مسلم شریف کی روایت ہے: عَنْ جابر بلفظ "أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى يوم النحر بالمدينة، فتقدم رجال، فنحروا وظنوا أن النبيّ صلى الله عليه وسلم قد نحر فأمرهم أن يعيدوا"
(۳) حضرت برار بن عازبؓ کی حدیث: "إن أوّل مانصنع أن نبداء بالصلاة ثم يرجع فننحر"
رہا شہر اور دیہات والوں کے درمیان فرق کرنا تو یہ اس لیے ہے کہ دیہات والوں پر نماز نہیں ہے۔ حالاں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ عید کے دن پہلی قربانی نماز ہے اور دوسری قربانی اللہ کی راہ میں جانور کو ذبح کرنا ہے، لہٰذا جب دیہات والوں پر نماز ہی نہ ہوگی تو ظاہر سی بات ہے کہ ان پر امام کی نماز کا انتظار کرنا بھی ضروری نہیں ہوگا، اور شہر والوں پر نماز ضروری ہے اس لیے نماز کے بعد ہی قربانی کرے گا، ورنہ حضور ﷺ کی بیان کی ہوئی ترتیب فوت ہوجائے گی۔

جواب: فریق اوّل کی دلیل کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بردہؓ نے حضور ﷺ کے نماز پڑھنے سے پہلے ہی قربانی کی تھی اس وجہ سے اعادہ کا حکم فرمایا، اور قبل الصلاۃ کی صورت میں ہم بھی اعادے کے قائل ہیں، فریق ثانی امام احمدؒ کی دلیل ہمارے بالکل خلاف ہی نہیں ہے، رہا مسئلہ فریق ثالث امام شافعیؒ کی دلیل کا تو جس طرح کھینچ تان کرکے انہوں نے اپنا مسلک ثابت کیا ہے اس کی کمزوری کسی سے مخفی نہیں، اسی طرح صریح احادیث کے خلاف تاویل معلوم ہوتی ہے۔ (مستفاد: فتح الباری: ۱۰/ ۲۷۔ تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۵۵۰۔ بذل: ۴/ ۷۲، کاپی ابوداؤد شریف)

مسئلۂ خلافیہ

(۱) امام شافعیؒ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ایام تشریق کے اخیر تک قربانی کا وقت ہے یعنی چار دن تک

قربانی کرنا جائز ہے۔

(۲) امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ تین دن تک قربانی کا وقت رہتا ہے۔

فریق اوّل کے دلائل

(۱) عن أبي سعيد الخدري أنه عليه السلام قال: أيام التشريق كلها ذبح۔

(۲) حضرت جبیر بن مطعم کی حدیث: إنه عليه السلام قال: كل فجاج اى طريق مِنىٰ منحرٌ وفي كل أيام التشريق ذِبح. (ابن حبان)

فریق ثانی کے دلائل

(۱) عن علي أنه كان يقول: أيام النحر ثلثة أيام، أولهن أفضل۔

(۲) عن عبدالله بن عمر قال: الأضحى يومان بعد يوم الأضحى۔

یہ عبادت کے اوقات ہیں قیاس سے ثابت نہیں ہوتے، اس لیے یہ کہنا ہوگا کہ ان دونوں جلیل القدر صحابہؓ نے حضور ﷺ سے سنکر ہی بیان کیا ہوگا۔ حضرت تھانویؒ نے حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ وغیرہ کبار صحابہ کے آثار بھی نقل کئے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے تین دن سے زیادہ گوشت کو رکھنے سے منع فرمایا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے تین ہی دن تھے۔

جواب: امام شافعیؒ نے جو پہلی روایت پیش کی ہے اس کی سند میں معاویہؒ بن یحییٰ ہیں ان کو نسائی، ابن مدینی وغیرہ ائمہ جرح وتعدیل نے ضعیف قرار دیا ہے، ابن ابی حاتم نے اس کو موضوع بھی کہا ہے۔ (عینی:۶۳/۴)

دوسری روایت کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند کے بارے میں بھی بزار نے اپنی مسند میں کہا ہے عبدالرحمٰن بن حسین کی ملاقات جبیر سے نہیں ہوئی، لہٰذا سند منقطع ہے۔ (عینی:۶۳/۴)

۱۵۱ ﴿حدثنا: مسدّدٌ نا خالدٌ عن مُطَرِّفٍ عن عامرٍ عنِ البراءِ بنِ عازبٍ قَالَ ضَحّٰى خالٌ لِي يقال له أبوبردةَ قبلَ الصلاةِ، فقال له رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: شَاتُكَ شاةُ لَحْمٍ، فقالَ يارسول الله صلى الله عليه وسلم! إنَّ عِنْدِي دَاجنَ جَذَعَةٍ مِنَ المَعْزِ؟ فقال: اذْبَحْهَا وَلا تَصْلُحُ لِغَيْرِكَ.﴾

ترجمہ: حضرت ابن عازب کہتے ہیں کہ میرے ایک ماموں ابوبردہؓ نے نماز سے پہلے ہی قربانی کرلی، تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہاری یہ بکری گوشت کی بکری ہوگئی، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ!

میرے پاس ایک پلی ہوئی بکری (پالتو بکری) ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو ذبح کردو اور تمہارے علاوہ کسی کے لیے درست نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق: دَاجِنْ (ج) دَوَاجِنْ بمعنی پالتو بکری، ابوداؤد شریف کے اکثر نہیں بلکہ تمام ہی نسخوں میں یہ لفظ ''داجن'' ہی لکھا ہوا ہے، حالاں کہ عربی کے قواعد کالحاظ کرتے ہوئے اس کو منصوب ''داجنا'' ہونا چاہیے، جیسا کہ بخاری شریف میں منصوب ہی ہے۔

اس حدیث سے بھی یہ ہی بات معلوم ہوئی کہ امام کے نماز پڑھنے سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح جذعہ من المعز کی قربانی بھی جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ نے خود صراحت فرمادی کہ تمہارے علاوہ کسی کے لیے بھی جائز نہیں۔

ترجمة الباب: آپ ﷺ نے جذعہ من المعز کی قربانی سے منع فرمایا ہے کیوں کہ اس کی عمر کم ہوتی ہے اور باب کا مقصد بھی ان ہی جانوروں کی قربانی کو بتلانا ہے جن کی عمر پوری ہوگئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

﴿باب مايكره من الضحايا﴾

ان جانوروں کا بیان جن کی قربانی کرنا مکروہ ہے

۱۵۲ ﴿حدثنا: حفصُ بنُ عمرَ النمريُّ قالَ حدثنا شعبةُ عَنْ سليمانَ بنِ عبدِ الرحمن عَنْ عُبَيدِ بنِ فَيْرُوْزَ قَالَ: سألتُ البراءَ بنَ عازبٍ مالاَ يجوزُ في الأضاحي؟ فقالَ: قامَ فينا رسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: وأصَابِعِيْ أقْصَرُ مِنْ أصَابِعِهِ، وأنامِلِيْ أقصرُ مِنْ أنَامِلِهِ. فقَالَ: أَرْبَعٌ لاتجوزَ في الأضَاحِي، العَوْرَاءُ بَيِّنٌ عَوَرُهَا، والْمَرِيْضَةُ بَيِّنٌ مَرَضُهَا، والعَرْجَاء بَيِّنٌ ظَلَعُهَا، والكبرَةُ التيْ لا تنْقِيْ، قَالَ: قلتُ فإِنِّيْ أكْرَهُ أن يكونَ في السِّنِّ نقصٌ، فقَالَ: ما كرِهتَ فدَعْهُ، وَلَا تحرِمْهُ على أحدٍ.﴾

ترجمه: حضرت عبید بن فیروز سے روایت ہے کہ انہوں نے برار بن عازب سے پوچھا کہ قربانی میں کون سا جانور درست ہے؟ تو حضرت برار بن عازب نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ اور میری انگلیاں آپ ﷺ کی انگلیوں سے چھوٹی اور حقیر ہیں، میری پوریں حضور ﷺ کی پوروں سے چھوٹی اور حقیر ہیں۔ اور ارشاد فرمایا کہ چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں۔

(۱) وہ کانا جانور جس کا کاناپن ظاہر ہو۔

(۲) وہ بیمار جس کی بیماری بالکل ظاہر ہو۔
(۳) ایسا لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔
(۴) ایسا دبلا جانور جس کی ہڈی میں مغز نہ ہو، حضرت عبید ابن فیروز کہتے ہیں کہ پھر میں نے حضرت براء بن عازب سے کہا کہ مجھے وہ جانور بھی برا معلوم ہوا ہے جس کی عمر کم ہو، تو حضرت براء بن عازب نے جواب دیا کہ جو تم کو برا لگے اس کو چھوڑ دو، لیکن اس کو کسی پر حرام مت کرو، (یعنی دوسروں کو اس سے منع مت کرو، کیوں کہ شرعاً اس کی قربانی کرنا جائز ہے)

تشریح مع تحقیق: أنامِلُ. أَنْمُلَةٌ. کی جمع بمعنی انگلی، انگلی کا پور۔
عوِرَ. (س) کانا ہونا
اَلْعَرْجَاءُ: الاعرج. کا مؤنث ہے بمعنی لنگڑا۔
ظَلَعَ: یقال: ظَلَعَ البعیرُ ظلعًا. اونٹ کا چلنے میں لنگڑانا۔ لنگڑا پن۔
تَنْقِي: (افعال) ہڈی سے گودا نکالنا، وہ ہڈی جس میں مینگ نہ ہو۔
امام ابوداوٗدؒ نے اس باب میں پانچ روایتیں ذکر کی ہیں، اور مقصد ان جانوروں کو بیان کرنا ہے جن کی قربانی کرنا درست نہیں ہے۔
وأصَابِعِي أقصر من أصابعه: یہ جملہ معترضہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک کو اٹھایا اور چار انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا کہ چار چیزوں کی قربانی جائز نہیں ایسے ہی میں بھی اپنی انگلیوں سے اشارہ کرتا ہوں لیکن میری اور حضور ﷺ کی انگلیوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے، حضور ﷺ کی انگلیوں کے مقابلہ میں میری انگلیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت براءؓ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے ان چار چیزوں کو بیان کیا جن کے بارے میں حضور نے فرمایا تھا کہ ان کی قربانی جائز نہیں ہے۔
اَلعَورَاء بین عَورَهَا: ای التي ذهبت احدیٰ عینها، کلها، أو أکثرها۔ یعنی ایسا جانور جس کی ایک آنکھ مکمل یا اکثر جاتی رہے۔
العرجاء بین ظلعها: ای التي لا تستطیع أن تمشي إلی المنسك، ایسا لنگڑا جانور جو مذبح تک بھی نہ جا سکے۔
والمریضة بین مرضها: ای التي لا تقدر علی الاعتلاف. یعنی ایسا کمزور جانور جو خود چر بھی نہ سکتا ہو۔
والکبیرة التي لا تنقي: وهي المهزولة التي لا نقی لعظامها یعنی لا مخ لعظامها من العجف. ایسا کمزور جانور جس میں کمزوری کی وجہ سے گودا اور مغز باقی نہ رہے اس حدیث شریف میں ان چاروں طرح کے

جانوروں کی قربانی کی ممانعت ہے،اس کے بعد حدیث آرہی ہے اس میں بھی کئی طرح کے جانوروں کی ممانعت ہے۔(مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: فتاویٰ شامی:۹/ ۴۶۸۔البدائع:۴/۲۱۴؛ہندیۃ:۵/ ۲۹۷)

۱۵۳ ﴿حدثنا: إبراهيمُ بنُ موسىٰ الرازيُّ قالَ أخبرنا ح وحدثنا عليّ بنُ بحرٍ نا عيسى المغنى عَنْ ثورٍ قالَ حدثني أبو حُميدٍ الرُّعَيْنِيُّ قالَ أخبرَني يزيدُ ذو مصر قال أتيتُ عتبة ابنِ عبدِالسَّلَمِيِّ فقلتُ: يا أبا الوليد إنّي خرجتُ أَلْتَمِسُ الضَحايَا، فلم أجدْ شَيئًا يُعْجِبُني، غيرَ ثَرْمَاء فكرهتُها، فما تقول؟ فقال: أفلا جِئتَنِي بها، قلتُ سبحَان اللّٰه! تجوز عَنكَ وَلَا تجوزعني، قَالَ: نعم، أنَّكَ تشكُّ ولا أَشُكُّ، إنمانهٰى رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن المُصْفَرَةِ، وَالمُسْتَاصِلَةِ، والبخْقَاءِ، والمشَيَّعَةِ، والكسْراءِ . فالمصفَرةُ: الّتي تَستَاصِلُ أذنُهَا، حتى يَبْدُوْ سِمَاخُهَا، والمستاصلةُ، قَرنُهَا من أصْلِهٖ، والبخقاءُ: التي تُبْخَقُ عَيْنُهَا، والمشيَّعة: التِي لا تَبْعَ الغنمَ عَجفًا أوضعفاً، والكَسْرَاءُ: الكَسِيْرَة﴾

ترجمہ:حضرت یزید ذوی مصر سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں عتبہ بن عبد سلمی کے پاس آیا،اورعرض کیا کہ اے ابوالولید! میں قربانی کے لیے جانور تلاش کرنے گیا تھا،تو مجھے کوئی ایسا جانور نہیں ملا جو مجھے پسند ہو سوائے ایک ایسی بکری کے جس کے دانت گر گئے تھے،میں نے اسے اچھا نہیں سمجھا،اب آپ کی کیا رائے ہے؟انہوں نے کہا کہ تم اس کو میرے پاس کیوں نہ لے آئے، میں نے کہا کہ سبحان اللہ،تمہارے لیے درست ہو جائے اور میرے لیے درست نہ ہو،انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں، چوں کہ تم کو شک ہے،اور مجھے اس میں شک نہیں ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف مصفرہ، مستاصلہ، بخقاء، مشیعہ اور کسراء کی قربانی کرنے سے منع کیا ہے(اور ثرماء کی قربانی سے منع نہیں کیا) مستاصلہ وہ ہے جس کا سینگ جڑ سے اکھڑ گیا ہو،بخقاء وہ ہے جس کی آنکھ کی بینائی جاتی رہی ہو۔مصفرہ وہ ہے جس کا کان جڑ سے کاٹ دیا گیا ہو،مشیعہ وہ ہے جو لاغری اور کمزوری کی وجہ سے بکریوں کے ساتھ نہ چل سکے،کسراء وہ ہے جس کا ہاتھ یا پیر ٹوٹ گیا ہو۔(ان قسموں کے سوا سب کی قربانی درست ہے)

تشریح مع تحقیق :المُصْفَرَة:بضم المیم وسکون الصاد والفاء المفتوحہ،ویجوز بضم المیم وفتح الصاد والفاء المشدد ہ یعنی المُصَفَّرَۃ ''اصفار'' سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بمعنی خالی کرنا۔

مطلب یہ ہے کہ کان بالکل جڑ سے کاٹ دیئے جائیں کہ کان کا سوراخ بالکل ظاہر نظر آنے لگے،اور چوں کہ کان کے سوراخ خالی ہوتے ہیں اس لیے مصفرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مستأصلة: (استفعال) کسی چیز کو جڑ سے ختم کردینا، یہاں پر وہ جانور مراد ہے جس کے سینگ بالکل جڑ سے

اکھاڑ دیے گئے ہوں۔

بَخقاء: (ف) آنکھ کا کانا ہونا، آنکھ کی بینائی کا سلب ہوجانا، ہر اس آنکھ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کی بینائی سلب ہوگئی ہو اور آنکھ بدستور باقی ہو۔

مشیعة: بفتح الیاء المشددة (تفعیل) مکان تک پہنچانے کے لیے ہمراہ جانا یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے مراد وہ بکری ہے جس کے ساتھ ہنکانے والا ہو یعنی وہ ضعف کی وجہ سے دوسری بکریوں کے ساتھ چلنے پر قادر نہ ہو۔

کسراء: (ض) بروزن حمراء اور یہ یہاں پر کسیرة کے معنی میں ہے یعنی وہ بکری جس کے ہاتھ یا پیر ٹوٹ گئے ہوں۔

ماقبل کی روایت میں چار قسم کے جانوروں کی قربانی کی ممانعت مذکور تھی، اور اس حدیث میں پانچ جانوروں کے بارے میں اور اضافہ کیا گیا ہے کہ ان کی قربانی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں ایک لفظ "ثرما" اور آیا تھا، جس کی وضاحت یہ ہے کہ جس جانور کے اتنے دانت ٹوٹ جائیں کہ اب وہ گھاس وغیرہ نہیں کھاسکتا تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، ہاں اگر وہ گھاس وغیرہ کھاسکتا ہے یعنی اکثر دانت موجود ہیں تو اس کی قربانی جائز ہے۔ (شامی: ۹/۴۶۹۔ بدائع: ۴/۲۱۵، ہندیہ: ۵/۲۹۸)

نوٹ: اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابوحمید رعینی ہیں، جن کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے کلام کیا ہے، چنانچہ تقریب التہذیب میں ان کو مجہول کہا ہے اور میزان الاعتدال میں لا یعرف کہا گیا ہے۔

ترجمة الباب: واضح ہے ممنوعہ جانوروں کی حدیث میں صراحت موجود ہے۔

۱۵۴ ﴿حدثنا: عبدُ اللّٰه بنُ محمدِ النُفَيْلِيُّ قَال نازهيرٌ قَال ناأبو اسحاقَ عن شريح بنِ نعمانَ وكانَ رجلَ صِدْقٍ عَنْ عليٍّ قَالَ: أمرنا رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أن نَسْتَشْرِفَ العَيْنَ وَالأذنَ، وَلا نضحِيَّ بِعَوْرَاء، وَلَا مُقَابِلةٍ، وَلَا مُدَابِرَةٍ، وَلاحَرْقَاءَ، ولا شَرْقَاءَ؛ قَالَ زهير: فقلت لأبي إسحاق أذكرَ عضباءَ؟ قَالَ: لَا، قُلتُ فَمَا المُقَابَلةُ؟ قَالَ يُقْطَعُ طرفُ الأذنِ، فقلتُ: فَما المدابرةُ؟ قَالَ: يُقْطَعُ مِنْ مُؤخرِ الأذنِ، قلتُ: فَما الشرقاءُ؟ قَالَ: تُشَقُّ الأذُنُ، قلتُ: فما الخرقاءُ؟ قَال: تُخرِقُ أذُنُها للسِّمَةِ.﴾

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم فرمایا کہ قربانی کے جانور کی آنکھ اور کان کو ہم اچھی طرح دیکھیں، (تاکہ اس میں ایسا نقص نہ ہو جس کی وجہ سے قربانی جائز نہ ہو) اور یہ بھی فرمایا کہ ہم کانے جانور کی قربانی نہ کریں، اور نہ اس کی قربانی کریں جس کا کان آگے سے یا پیچھے سے کٹا ہوا ہو، اور نہ اس جانور کی قربانی کریں جس کے کان گول پھٹے ہوں، یا لمبائی میں چرے ہوئے ہوں، حضرت زہیر کہتے ہیں کہ میں نے

ابواسحاق سے پوچھا کہ کیا شریح بن نعمان نے عضباء کا بھی ذکر کیا تھا؟ تو ابواسحاق نے جواب دیا کہ نہیں، زہیر کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا مقابلہ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو، میں نے کہا کہ مدابرہ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو، میں نے پوچھا کہ شرقاء کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جس کے کان گولائی میں پھٹے ہوئے ہوں، میں نے کہا کہ خرقاء کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ علامت کی وجہ سے جس کے کان لمبائی میں چیر دیئے جاویں۔

تشریح مع تحقیق :عضبَاءُ: (س) جانور کا سینگ ٹوٹا ہوا ہونا، حضرت سعید بن مسیب نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ جس کا آدھا کان یا سینگ ختم ہو جائے یا اس سے زیادہ حصہ ٹوٹ جائے تو اس کو عضباء کہتے ہیں۔ باقی تمام الفاظ کی تشریح حدیث میں موجود ہے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

۱۵۵ ﴿حدثنا: مسلم بنُ إبراهيمَ قَالَ نا هشامٌ عَنْ قتادةَ عن جريِّ بنِ كُلَيبٍ عن عليٍّ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نهىٰ أن يضَحِّى بعضْبَاءَ الأذنِ والقرنِ، قال أبوداؤد: جُريّ سَدُوسِيٌّ بَصرِيٌّ لم يُحدِّثُ عنهُ إلّا قتادةُ﴾

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عضباء کی قربانی کرنے سے منع فرمایا ہے، یعنی سینگ ٹوٹے یا کان کٹے ہوئے جانور کی قربانی سے، امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ جری سدوسی بصری ہیں، ان سے صرف حضرت قتادہ نے ہی روایت کی ہے۔

تشریح مع تحقیق :اَلأذن والقرن: یہ عضباء کی ہی تفسیر ہے، عضباء کی تعریف ماقبل کی روایت میں مفصل گذر چکی ہے، اس حدیث شریف میں مطلقاً عضباء کی قربانی سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت آئندہ صفحات میں بھی آئے گی۔

قال ابو داؤد: یہاں سے امام ابوداؤدؒ یہ بیان فرما رہے ہیں کہ جری سدوسی بصری مجہول راوی ہیں، کیوں کہ ان سے روایت کرنے والے صرف ابوقتادہ ہیں، اور جس سے روایت کرنے والا صرف ایک ہو تو وہ مجہول ہوتا ہے۔

لیکن امام ابوداؤدؒ کا یہ اعتراض کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ ان سے ابوقتادہ کے علاوہ روایت کرنے والے دو حضرات اور ہیں لہٰذا اب تین شخص ہو گئے (۱) ابوقتادہ (۲) عاصم (۳) یونس اور جب کسی راوی سے تین شاگرد روایت کرلیں تو اس کی جہالت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ امام عجلیؒ نے ان کی توثیق کی ہے ابن حبان نے بھی ثقات میں ذکر کیا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ ابن حبان جس کو اپنی ثقات میں ذکر کردیں وہ مجہول نہیں رہتا۔ پھر جن لوگوں نے ان پر جرح کی ہے وہ بھی عقیدہ کے اعتبار سے کی ہے کہ یہ فرقہ ازارقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور یہ معلوم ہے کہ اگر بدعتی غیر داعی ہو تو اس کی روایت

قبول کرلی جاتی ہے، لہٰذا یہ ماننا ہوگا کہ ان کی روایت حسن درجہ کی ہوگی۔ نیز حافظ ابن حجر نے بھی تقریب التہذیب میں ان کو مقبول کہا ہے۔

۱۵۶ ﴿حدثنا:مسددٌ قال نايحيىٰ قال نا هشامٌ عن قتادة قال: قلتُ لسعيد بنِ المسيِّبِ ما الأعضب؟قال : النصفُ فما فوقهٗ.﴾

ترجمہ: حضرت قتادہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن میتب سے پوچھا کہ عضباء کس جانور کو کہتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جس جانور کا آدھا یا آدھے سے زیادہ کان کٹا ہو یا سینگ ٹوٹا ہو۔

تشریح مع تحقیق :روایت بالا میں عضباء کی تعریف بیان کی گئی ہے، جیسا کہ اس سے پہلی روایت کے ذیل میں ہم اس تعریف کو نقل کر چکے ہیں، باب کی تمام روایات آپ کے سامنے آچکی ہیں، اب ہم یہاں پر ایک مختلف فیہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں، اگر چہ مناسب یہ تھا کہ شروع باب میں ہی بیان کردیا جاتا لیکن محض اس لیے مؤخر کیا کہ اوّلاً باب کی ساری روایات سامنے ہوں اور پھر مسئلہ کی تنقیح ہو۔

مسئلہ خلافیہ

حضرت امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ جس جانور کے کان کا کوئی حصہ کٹ جائے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، اس کی قربانی کرنا جائز نہیں۔

حنفیہ کا مفتی بہ مذہب یہ ہے کہ اگر اقل من النصف مقطوع ہے تو اس کی قربانی جائز ہے، اور اگر اکثر من النصف مقطوع ہے تو جائز نہیں۔

فریق اوّل کی دلیل

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ جس میں ہے:أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم أن نستشرف العين والأذن ولا نضحيّ بِعَوْرَاء، ولا مقابلةٍ ، ومدابرةٍ ولا خرقاء، ولا شرقاء الخ. (ابوداؤد:۲/۳۸۸)

وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مذکورہ جانوروں کی قربانی سے مطلقاً منع فرمایا ہے کہ جس کا کان آگے سے یا پیچھے سے، چوڑائی میں یا لمبائی میں پھٹا، کٹا ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں، قلیل اور کثیر کی حدیث میں کوئی قید نہیں ہے۔

فریق ثانی کی دلیل

عن جريّ بن كليب عن على أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى أن يضحى بعضباء الأذن والقرن، قال قتادةؓ : فقلت لسعيد بن المسيب ما الأعضب ؟ قال: النصف فما فوقه. (ابوداؤد:۲/۳۸۸)

وجہ استدلال یہ ہے کہ اس روایت میں عضباء کی تعریف بیان کردی گئی ہے کہ اگر نصف یا نصف سے زائد کان کٹا ہو تو عضباء ہے، اور عضباء کی قربانی ممنوع ہے، اور اگر نصف سے کم کٹا ہوا ہو تو عضباء نہیں ہے، اور جب نصف سے کم کان کٹا ہوا جانور عضباء نہیں تو اس کی قربانی جائز ہے کیوں کہ حضور نے عضباء کی قربانی سے منع فرمایا ہے۔

فریق اوّل کی دلیل کا جواب

(۱) امام شافعیؒ نے جو حضرت علی کی حدیث پیش کی ہے وہاں پر مقابلہ اور مدابرہ سے نصف یا اکثر ہی مراد ہے ورنہ احادیث میں تعارض لازم آئے گا۔

(۲) یا حضرت علی والی حدیث کو کراہت تنزیہی پر محمول کرلیا جائے کیوں کہ کراہت تنزیہی کے ہم بھی قائل ہیں۔ (بذل المجہود: ۴/۴۷۔ تکملہ فتح الملہم: ۳/۵۶۱)

﴿باب البقر والجزور عن كم من تجزئ﴾

اونٹ گائے، بیل کی قربانی کتنے آدمیوں کی طرف سے کافی ہے

۱۵۷ ﴿حدثنا: أحمد بن حنبلٍ قال حدثنا هُشَيمٌ قَالَ نا عبدُ الملكِ عنْ عطاء عَنْ جابرِ بنِ عبدِ اللّٰه قالَ: كُنَّا نَتَمَتَّعُ في عهدِ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم نَذْبَحُ البَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ نَشْتَرِكُ فِيهَا.﴾

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تمتع کرتے تھے تو ایک گائے سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کرتے تھے، اس میں ہم سب شریک ہوتے تھے،

تشریح مع تحقیق: اس باب میں تین روائتیں ہیں تینوں کا حاصل یہ ہے کہ ایک اونٹ اور ایک گائے میں سات آدمی شریک ہوکر قربانی کرسکتے ہیں، اس باب میں دو اختلافی مسئلے بھی آتے ہیں جن کو تینوں حدیثیں نقل کرنے کے بعد پیش کیا جائیگا۔

۱۵۸ ﴿حدثنا موسى بنُ إسمعيلَ قال أنا حمادٌ عن قَيسٍ عن عطاءٍ عَنْ جابر بنِ عبدِاللّٰهِ أنَّ النبي صلى الله عليه و سلم قال: البَقَرةُ عَن سَبْعَةٍ و الجُزُورُ عنْ سَبْعةٍ﴾

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گائے سات آدمیوں کی طرف سے کفایت کرتی ہے اور اونٹ بھی سات آدمیوں کی طرف سے کفایت کرتا ہے۔

۱۵۹ ﴿حدثنا القعنبیُّ عن مالكٍ عن أبی الزُبَیْرِالمکِیّ عَن حابرِ بنِ عَبدِاللّٰهِ أنّه قال: نَحرنَا مَعَ رسول الله ﷺ بالحدیبیَّةِ البَدَنَةَ عن سبعةٍ والبَقَرةَ عن سَبْعةٍ﴾

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نحر کیا، اونٹ کو بھی سات آدمیوں کی طرف سے اور گائے کو بھی سات آدمیوں کی طرف سے۔

تشریح مع تحقیق :بَدَنَۃٌ ج بُدُنٌ لغت میں صرف اونٹ کو بدنہ کہتے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں ہر اس اونٹ، بقر وغیرہ کو بدنہ کہتے ہیں جس کو حرم مکہ میں قربان کیا جائے، باب کی تینوں روایتوں کا مفاد یہ ہے کہ اونٹ، گائے، بیل اور بھینس وغیرہ میں صرف سات آدمی ہی شریک ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ خلافیہ

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک اونٹ کی قربانی ایک اہل بیت کی طرف سے کی جاسکتی ہے، اگرچہ وہ سات آدمیوں سے زیادہ ہوں، اور دو اہل بیت کے لیے ایک اونٹ کافی نہیں ہوگا، اگرچہ سات شریک سے کم ہوں۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ ایک اونٹ میں صرف سات آدمی ہی شریک ہو سکتے ہیں، خواہ سب ایک اہل بیت میں سے ہوں یا دو اہل بیت میں سے ہوں۔

فریق اول کی دلیل

قربانی کرنا تقرب الی اللہ ہے، اور قربت میں تقسیم نہیں ہوتی اس لیے وحدت کا اعتبار ضروری ہے، خواہ وحدت حقیقیہ ہو کہ ایک آدمی ہی قربانی کرے، یا وحدت جنسیہ ہو کہ ایک اہل بیت پورے جانور کی قربانی کردیں، دو اہل بیت کی صورت میں نہ وحدت حقیقیہ پر عمل ہوگا اور نہ ہی وحدت جنسیہ پر عمل ہوگا۔

فریق ثانی کی دلیل

حضرت جابرؓ کی حدیث ہے: إن النبی صلی الله علیه وسلم قال: البقرة عن سبعة و الجزور عن سبعة۔(ابوداؤد:۲/۳۸۸)

فریق اوّل کی دلیل کا جواب

صریح اور صحیح احادیث کے مقابلہ میں قیاس معتبر نہیں ہے، کیونکہ قیاس کا اعتبار وہاں ہوگا جہاں نص موجود نہ ہو۔(بذل:۴/۷۵)

مسئلہ خلافیہ

اسحٰق بن راہویہ اور ایک قول سعید بن المسیب کا یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ میں دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔

امام طحاویؒ نے جمہور کا اجماع نقل کیا ہے کہ اونٹ میں بھی گائے کی طرح سات آدمی ہی شریک ہوسکتے ہیں دس آدمیوں کی طرف سے ایک اونٹ کی قربانی درست نہیں ہوگی۔

فریق اول کے دلائل

(۱)عن ابن عباس قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه و سلم فحضر الأضاحي، فذبحنا البقرة عن سبعة و البعير عن عشرة (ترمذی شریف:۱/۲۷۶)

(۲) عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال: البدنة تجزئ عن عشرة. (ترمذی:۱/۱۸۰)

(۳) قیاس کا تقاضہ بھی یہ ہی ہے کہ ایک اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے کافی ہوجائے، کیونکہ اونٹ کی قیمت گائے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے لہٰذا زیادہ افراد کی طرف سے کافی ہونا چاہیے۔ (بدائع ۴/ ۲۰۷)

فریق ثانی کے دلائل

(۱) حضرت جابرؓ کی حدیث ہے: إن النبي صلى الله عليه وسلم قال: البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة (ابوداؤد:۲/۳۸۸)

(۲) عن جابر قال: نحرنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الحديبية البقرة عن سبعة والبدنة عن سبعة. (ترمذی:۱/۱۸۰)

فریق اوّل کے دلائل کا جواب

(۱) جب احادیث میں تعارض ہوجائے تو احتیاط پر عمل کرنا ضروری ہے، اور سات آدمیوں کے شریک ہونے میں احتیاط ہے، کیوں کہ سات آدمیوں کی طرف سے بالاتفاق قربانی ہو ہی جاتی ہے۔ اور دس کے بارے میں اختلاف ہے لہٰذا متفق علیہ قول کو لینا ہی احتیاط کا تقاضہ ہے۔

(۲) حضرت ابن عباسؓ کی روایت حضرت جابرؓ کی روایت سے منسوخ ہے۔ (حاشیہ ترمذی:۱/۲۷۶)

(۳) حاوی میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے، لہٰذا مرفوع حدیث کے مقابلہ میں مرجوح ہوگی۔ (حاشیہ نسائی:۱/۱۸۱)

تیسری دلیل جو قیاس میں پیش کی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قربانی کے باب میں شرکت خلاف قیاس ثابت ہے، اور جو چیز خلاف قیاس ثابت ہو اس میں قیاس کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہوتا، لہٰذا آپ کا قیاس کرنا درست نہیں۔ (بدائع:۴/۲۰۷)

﴿باب في الشاة يضحى بها عن جماعة﴾

ایک بکری کو چند آدمیوں کی طرف سے قربانی کرنے کا حکم

۱۶۰ ﴿حدثنا قتيبةُ بنُ سعيدٍ حدثنا يعقوبُ يعني الإسكندرانيّ عَنْ عمروبن المطلبِ عن جابرِ بنِ عبدالله قَال: شَهِدْتُ مع رسولِ الله صلى الله عليه وسلم الأضحىٰ في المصلّى ، فلمّا قَضٰى خُطْبَتَهٗ نَزَلَ منْ منبره، وأُتِيَ بكبشٍ فَذبحهٗ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ، وقالَ: بِسْمِ اللهِ والله اكبر هذا عَنّي وعَمَّنْ لم يضحِّ مِنْ اُمّتي﴾

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ عید الاضحیٰ کو عیدگاہ میں میں حضور ﷺ کے ساتھ تھا، جب آپ ﷺ خطبہ کے بعد ممبر سے نیچے تشریف لائے تو ایک مینڈھا لایا گیا، آپ ﷺ نے اس کو اپنے دست مبارک سے ذبح کیا، اور پڑھا، بسم الله والله اكبر هذا عنى وعمن لم يضح من أمتي.

تشریح مع تحقیق: قوله: نزل من منبره: جس جگہ پر آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے وہاں منبر موجود نہیں تھا بلکہ اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا تھا، لہٰذا یہاں پر نزول منبر سے مراد انتقال مکان ہے، یا یہ کہئے کہ ارض مرتفعہ پر خطبہ دیا اور وہاں سے خطبہ دے کر نزول فرمایا، تو راوی نے اونچی جگہ کو منبر سے تعبیر کر دیا ہے۔

اس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بکری ایک جماعت کی طرف سے قربانی میں کافی ہو جائے گی کیوں کہ حضور ﷺ نے ان لوگوں کی طرف سے قربانی کر دی جنہوں نے قربانی نہ کی تھی، لیکن اس مسئلہ میں ائمہ کرام کے مابین زبردست اختلاف ہو گیا، جس کی جامع اور مختصر وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

مسئلہ خلافیہ

(۱) امام مالکؒ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ ایک بکری کی قربانی ایک اہل بیت کی طرف سے جائز ہے، خواہ اہل بیت کی تعداد کم ہو یا زیادہ، پھر ان دونوں حضرات کے مذہب میں تفصیل یہ ہے کہ امام احمد تو مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں، اور امام مالکؒ دو شرطوں کا اضافہ کرتے ہیں، ایک شرط تو یہ ہے کہ جس کو شریک کر رہا ہے اس کے اوپر خرچ بھی کرتا ہو، دوسرے یہ کہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوں، اور یہ بھی جب ہے جبکہ ایک ہی بکری میں دوسرے کو بھی شریک کیا ہو اور خود بھی شریک ہو، اگر اپنے کو شریک نہیں کیا تو کوئی شرط ضروری نہیں۔ (تکملۃ فتح الملہم: ۳/۵۶۴)

(۲) امام ابو حنیفہ اور صحیح قول کے مطابق امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ایک بکری کی قربانی ایک ہی شخص کی طرف سے کی جا سکتی ہے، ایک سے زائد لوگوں کی طرف سے ایک بکری کی قربانی کرنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ جو قربانی

کرے گا صرف اسی کے ذمے سے وجوب ساقط ہوگا، البتہ قربانی کے ثواب میں چند آدمیوں کو شریک کرنا جائز ہے۔ (الاقناع:۲/۲۶۰ بیروت، بدائع:۴/۲۰۶ زکریا)

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے دلائل

(۱) عن عائشة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمر بكبش اقرن، يطأ في سواد، ويبرك في سواد، وينظر في سوادٍ، فأتي به ليضحيّ به، فقال لها يا عائشة! هلمّي المدية؟ ثم قال: اشحذيها بحجرٍ، ثم أخذها ، وأخذالكبش فأضجعه، ثم ذبحهٗ، ثم قال: اللّٰهم تقبل من محمدٍ وال محمدٍ، وأمة محمدٍ، ثم ضحىّ بها. (مسلم شریف:۲/۱۵۶)

(۲) حدیث باب ہے: قال: بسم الله والله أكبر،هذا عني وعمن لم يضح من أمتي (ابوداؤد:۲/۳۸۸)

(۳) عطاء بن يسار يقول: سألتُ أبا أيوب كيف كانت الضحاياعلى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ؟ فقال: كان الرجل يضحى بالشاة عنه وعن أهل بيته، فيأكلون ويطعمون، حتى تباهي الناس فصارت كما ترىٰ. (ترمذی شریف:۱/۲۷۶)

ان کے علاوہ اور بھی روایات ایسی ملتی ہیں جن سے ان دونوں حضرات کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

فریق ثانی کے دلائل

(۱) من كان له سعة ولم يضح فلا يقربن مصلّٰنا: (ابن ماجہ) اگر ایک اہل بیت کی طرف سے ایک بکری کافی ہوجاتی تو پھر ہر مالدار شخص کو وعید کیوں سنائی جارہی ہے کہ جس کے پاس وسعت ہو وہ قربانی کرے، ورنہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے؟ معلوم ہوا کہ ہر مالدار پر قربانی واجب ہے۔

(۲) قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اونٹ اور گائے میں بھی شرکت نہ ہو، کیوں کہ قربانی کرنا قربت ہے اور قربت میں تقسیم نہیں ہے، لیکن خلاف قیاس ان کی قربانی میں شرکت حدیث کی وجہ سے جائز ہے اور بکری کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، لہٰذا اس کو اصل پر برقرار رکھا جائے گا۔

فریق اوّل کے دلائل کے جوابات

پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے امت کو اور اپنی آل واولاد کو ثواب میں شریک کیا تھا نہ کہ ملکیت میں، اس لیے کہ اگر آپ ﷺ اپنی پوری امت کی طرف قربانی کرتے اور شرکت فی الملک مراد ہوتی تو پھر امت پر ہر سال قربانی واجب نہ ہوتی بلکہ کم از کم ایک سال کی تو ساقط ہو ہی جاتی، لیکن اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، اس

لیے یہ کہنا ہی مناسب ہوگا کہ یہ شرکت فی الثواب پر محمول ہے۔

پھر اگر ایک بکری ہی ایک جماعت کی طرف سے کافی ہو جائے تو لازمی طور پر ایک گائے کو سات آدمیوں سے زائد کی طرف سے کافی ہو جانا چاہیے، لیکن اگر اس کے قائل ہوں گے تو تحدید شرع جو سات کے ساتھ مقید ہے کو باطل کرنا لازم آئے گا، اس لیے کہ بکری کی قربانی ادنیٰ ہے اس سے کم کسی کی قربانی جائز ہی نہیں، تو اگر ایک بکری میں چند آدمی شریک ہوں تو ہر ایک کی طرف مثلاً نصف، ثلث، سدس اور ثمن وغیرہ بکری علی حسب الافراد ہوگی، اب اس صورت میں ادنی کی تحدید باقی نہ رہی، بلکہ یہ تحدید شرع باطل ہوگئی۔

جہاں تک دوسری روایت کا تعلق ہے تو اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ ہم پہلے ایک ہی قربانی کرتے تھے اب لوگ فخر کرنے لگے، اور ایک ایک گھر میں کئی کئی بکریوں کی قربانی ہونے لگی، یعنی لوگ اپنے گھر والوں کی طرف سے بھی قربانی کرنے لگے اور ضروری سمجھنے لگے، جس کی وجہ سے ایک گھر والے کو پریشانی ہوتی ہے کہ وہ سب کی طرف سے کس طرح قربانی کرے، اتنی بکریاں کہاں سے لائے، اور ہم بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ کسی مال دار پر اپنی اولاد، بیوی اور بھائیوں وغیرہ کی طرف سے قربانی کرنا واجب نہیں ہے۔

اب حضرت ابوایوب انصاریؓ اسی کی تردید فرما رہے ہیں کہ ہم میں سے صرف ایک آدمی قربانی کرتا تھا جو گھر کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور عموماً گھر کا ذمہ دار ایک یا دو آدمی ہی ہوتے ہیں، اور دوسرے گھر والوں پر قربانی واجب ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور یہ تو ظاہری بات ہے کہ دورِ صحابہ میں ہر ایک کے پاس اتنا مال کہاں تھا کہ اس پر قربانی واجب ہوتی۔

حاصل یہ ہے کہ عقل ونظر کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک بکری کی قربانی صرف ایک ہی شخص کی طرف سے کافی ہو، دو یا اس سے زائد پورے خاندان کی طرف سے قربانی کرنا کافی نہیں ہوگا۔ (ملخص از بدائع: ۴/۲۰۶، بذل المجہود: ۴/۵۷، تکملہ فتح الملہم: ۳/۵۶۴، طحاوی: ۲/۲۷۶)

﴿باب الإمام يذبح بالمصلّٰى﴾

امام کے عیدگاہ میں ہی قربانی کرنے کا بیان

۱۶۱ ﴿حدثنا: عثمانُ بنُ أبي شيبة أن أبا أسامة حدّثهم عن أسامةَ عن نافعٍ عن ابنِ عُمر أنّ النبيّ ﷺ كانَ يَذْبَحُ أضحِيّتَهُ بالمُصلّى، و كانَ ابنُ عُمَرَ يفعَلُهُ﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قربانی عیدگاہ میں کرتے تھے۔ (راوی کہتے ہیں کہ) حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

تشریح مع تحقیق :حضور اکرم ﷺ عیدگاہ میں ہی قربانی فرمایا کرتے تھے،اس کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ عیدگاہ میں فقراء اور مساکین سب موجود ہوتے ہیں،اور بآسانی عیدگاہ میں پہنچ بھی جاتے ہیں اس کے بالمقابل فقراء کو گھر گھر جانا دشوار ہوتا تھا،بعض مرتبہ گھروں کا پتہ نہیں ہوتا۔اور عیدگاہ تو سب کو معلوم ہی ہوتی ہے،دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے۔تیسرے یہ کہ عیدگاہ میں ذبح کرنے سے قربانی کا گوشت جلدی تیار ہوجاتا ہے،اور بھی بہت سی حکمتیں آپ ﷺ کے ارشاد میں ہوسکتی ہیں۔

﴿باب حبس لحوم الأضاحي﴾

قربانی کے گوشت کو روک کر رکھنے کا بیان

۱۶۲ ﴿حدثنا:القعنبيُّ عن مالكٍ عن عبدِ الله بن أبي بكرٍ عَنْ عمرةَ بنتِ عبدِ الرحمن قَالَ قَالَتْ سمعتُ عائشَةَ تقولُ: دَفَّ ناسٌ من أهلِ البادِيَةِ حضرَةَ الأضحٰى في زمانِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم ، فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: ادَّخِرُوْا الثلثَ، وتصدَّقُوْا بما بَقِيَ، قالت: فلمَّا كان بَعْدَ ذٰلكَ قِيْلَ لرسولِ الله صلى الله عليه وسلم : يا رسول الله صلى الله عليه وسلم! لَقَدْ كان الناسُ يَنْتَفِعُوْنَ مِنْ ضحاياهم، ويُجْمِلُوْنَ مِنْهُ الوَدَكَ، وَيَتَّخِذُوْنَ منها الأَسْقِيَةَ، فقال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: وَما ذٰلك أو كماقال، قالوا: يارسول الله! نَهَيْتَ عن إمساكِ لُحُوْمِ الضحايَا بعْدَ ثلٰث ، فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: إنَّما نَهَيْتُكُمْ منْ أَجْلِ الدافةِ، التي دَفَتْ عَلَيْكُمْ ، فَكُلُوا وَتَصَدَّقُوْا ، وادَّ خِرُوْ.﴾

ترجمہ:حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کچھ جنگل کے رہنے والے لوگ آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین روز تک گوشت رکھ لو،اور باقی کو صدقہ کردو،حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس کے بعد لوگوں نے آپ ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ!لوگ اپنی قربانیوں سے نفع اٹھاتے ہیں،چربی پگھلاتے ہیں،اور اس سے مشکیں (مشکیزے) بناتے ہیں،آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا مطلب؟ یا ایسا ہی کوئی جملہ کہا، صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے تین روز سے زائد قربانی کے گوشت کو روکنے سے منع فرمایا تھا،اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لیے منع کیا تھا کہ جنگل سے کچھ مسکین لوگ آتے تھے،لیکن اب قربانی کے گوشت کو کھاؤ،صدقہ کرو اور جمع کر کے رکھو۔

تشریح مع تحقیق:ادّخروُا (افتعال) جمع کرنا، ذخیرہ کرکے رکھنا، یہ اصل میں ''اذتخر'' تھا مجرد میں (ف) سے آتا ہے اس کے معنی بھی ذخیرہ کرنا، اسٹاک کرنا کے آتے ہیں۔

دَفَّ (ض) سبک رفتار سے چلنا، بولا جاتا ہے:دفت الجماعة دفاً و دفيفاً۔

الدافّة: خانہ بدوش لوگ، شہر کارخ کرنے والے بدّو لوگ، مراد وہ اعراب ہیں جو دیہاتوں سے مدد کے لیے آیا کرتے تھے۔

حَضْرَةَ الأضحى: الحضرة کے اصل معنی ہیں موجودگی، اور مراد قربانی کے ایام ہیں۔

يُجْمِلُوْنَ (افعال،ن،ض) بمعنی پگھلانا۔

اَسْقِيَة. یہ سقار کی جمع ہے بمعنی مشکیزہ۔

امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور خود امام داؤدؒ نے اس مضمون کی ادائیگی کے لیے بہت سی احادیث مختلف طرق سے بیان کی ہیں، حاصل سب کا یہ ہے کہ شروع زمانے میں یہ حکم تھا کہ قربانی کے گوشت کو تین دن سے زائد روک کر نہ رکھا جائے، بخاری شریف میں واضح حدیث ہے:عَن علي قال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهاكم أن تأكلوا لحوم نسككم فوق ثلث۔

جب کچھ زمانہ گزر گیا تو صحابہؓ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ قربانی کی تمام چیزوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں، گوشت کو کئی کئی دن تک استعمال کررہے ہیں، اس کے چمڑے سے مشکیزے بناتے ہیں تو ان کو بڑا تعجب ہوا کہ تین دن سے زیادہ کے گوشت سے نفع اٹھانا تو منع ہے پھر یہ حضرات ایسا کیوں کررہے ہیں، چنانچہ بعض صحابہؓ حضور ﷺ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے تو تین دن سے زیادہ قربانی کے گوشت کو روکنے سے منع فرمایا تھا، اور اب لوگ خوب استعمال کررہے ہیں؟

اس پر حضور ﷺ نے بڑے تعجب خیز انداز میں فرمایا کہ کیا ہوا؟ بھائی میں نے ان دیہات سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے کیا تھا، اب یہ لوگ نہیں آتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وسعت دیدی ہے، اس لیے اب گوشت کو تین دن سے زیادہ روکنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس حدیث کی تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ گوشت کو تین دن سے زیادہ روکنے کی ممانعت مصلحت کی وجہ سے تھی، جب وہ مصلحت ختم ہوگئی تو یہ ممانعت بھی باقی نہ رہی۔ اس کی تائید بخاری شریف کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ فإن ذلك العام كان بالناس جَهْدٌ۔

علماء کرام کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قربانی کے گوشت کو روکنے سے منع فرمانا حکم شرعی تھا یا ارشادی اور وقت کی ضرورت کی وجہ سے، تو اس سلسلے میں صحیح بات یہ ہی ہے کہ یہ ممانعت ایک مصلحت کی وجہ سے تھی کہ اس وقت مسکین کافی تھے سب کو گوشت دینا بھی ضروری تھا، اگر تین دن سے زیادہ تک

گوشت کو روک کر رکھنے کی اجازت دی جاتی تو مسکینوں کو گوشت نہ مل پاتا، اب جب یہ علت ختم ہوگئی تو ممانعت بھی برقرار نہ رہی۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/۵۷۷ ملخصاً)

فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے علامہ رافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت ادخار (جمع کرنے رکھنے) میں کسی قسم کی حرمت یا کراہت باقی نہیں ہے، اسی طرح علامہ نوویؒ نے "شرح المہذب" میں یہ لکھا ہے کہ موجودہ دور میں ادخار حرام نہیں ہے، اور یہ نسخ السنۃ بالسنۃ کی مثال ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مطلقاً نہی کا نسخ ہے، لہٰذا اب تین دن سے زیادہ تک روک کر رکھنا، اسی طرح جب تک طبیعت چاہے قربانی کے گوشت کو کھانا بغیر کسی کراہت کے درست ہے، (فتح الباری: ۱۰/۳۴ زکریا)

قوله فکُلُوا: اس صیغۂ امر سے ابن حزم اور ابوالطیب وغیرہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا واجب ہے، کیونکہ امر کا صیغہ وجوب پر دلالت کرتا ہے، لیکن جمہور کا قول اس سے مختلف ہے کیونکہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے، جیسے: "وإذا حللتم فاصطادوا" میں امر کا صیغہ وجوب کے لیے نہیں ہے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ امر ممانعت کے بعد ہے جو اباحت کے لیے آتا ہے: ولا حجة فيه لأنه أمر بعد الحظر فيكون للإباحة۔

نیز امر کا صیغہ تو ادخار میں بھی ہے مگر ادخار کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اس لئے صحیح بات یہ ہی ہے کہ اپنی قربانی کے گوشت کو کھانا مستحب ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ قربانی کے دن صبح سے روزے دار کی طرح رہے نماز کے بعد اپنی قربانی کا گوشت کھائے چنانچہ ترمذی شریف کی ایک روایت ہے کان علیه السلام لايطعم يوم الأضحى حتى يصلي (بدائع: ۱/۲۲۴، ہندیہ: ۱/۱۵۰)

قوله تصدقوا: اس سے شوافع اور حنابلہ نے استدلال کیا ہے کہ قربانی کے گوشت کو صدقہ کرنا واجب ہے، اگرچہ قلیل مقدار ہی میں صدقہ کرے، لیکن جمہور فرماتے ہیں کہ یہاں پر بھی امر کا صیغہ استحباب پر محمول ہے، کیونکہ قربانی کا اصل مقصد خون بہانا (اراقة الدم) ہے، لہٰذا گوشت کو صدقہ کرنا ضروری نہیں۔

البتہ تمام فقہاء کے نزدیک طریقہ یہ ہے کہ ایک تہائی گھر میں استعمال کرے، ایک تہائی پڑوسیوں، دوستوں اور رشتہ داروں کو تقسیم کردے، اور ایک تہائی صدقہ کردے، یہ ہی طریقہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، اگر سارے گوشت کو روک لیا تب بھی جائز ہے، (شامی: ۹/۴۷۴، بدائع: ۴/۲۲۴، ہندیہ: ۵/۳۰۰)

ترجمة الباب: "فكلوا و تصدقوا وادخروا" سے واضح ہے۔

۱۶۳ حدثنا: مسدد نا يزيدبنُ زُرَيعٍ ثنا خالد الحذاء عنْ أبي المليح عنْ نبيشة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنّا كنّا نَهَيْنَاكُمْ عَنْ لحومِها أن تأْكُلُوها فوق

ثلثٍ، لِكَيْ تَسَعَكُمْ، جَاءَ اللّٰهُ بالسَعَة، فكُلُوْا وادَّخِروا، واتَّجِرُوْا، الا وانَّ الأَيَّامَ أيَّامُ أكلٍ وشربٍ وذكرِ اللّٰه عزَّوَجلَّ.﴾

ترجمہ: حضرت نبیشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے تم کو تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا تھا، تا کہ وہ گوشت سب کو پہنچ جائے، اب اللہ تعالیٰ نے وسعت دیدی (لوگ مالدار ہوگئے) لہٰذا کھاؤ، ذخیرہ کرکے رکھو اور ثواب حاصل کرو۔ (صدقہ کرکے) یاد رکھو کہ یہ ایام کھانے، پینے اور یادِ الٰہی کے ہیں۔ (اس لیے ان ایام میں روزہ رکھنا درست نہیں)

تشریح مع تحقیق : السَعَةُ (ن، س) کشادہ ہونا، گنجائش ہونا، السَعَة: گنجائش، وسعت، کشادگی۔

اتَّجِرُوْا: (افتعال) ثواب حاصل کرنا، یہ اَجْرٌ سے ماخوذ ہے، نہ کہ تجارت سے، اور مراد یہ ہے کہ صدقہ کرکے ثواب حاصل کرو۔

اس حدیث شریف کا مطلب بھی یہ ہی ہے کہ شروع زمانے میں تین دن سے زیادہ تک گوشت روکنے کی اجازت نہیں تھی۔ (بعض حضرات نے کہا کہ یہ ممانعت ۹ھ میں ہوئی اور حلت کا حکم ۱۰ھ میں ہوا) لیکن جب لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے غنی کردیا تو یہ ممانعت ختم کردی گئی۔

ترجمة الباب: "فکلوا وادخروا واتجروا" سے ثابت ہے۔

﴿باب في الرفق بالذبيحة﴾

جانور کو ذبح کرنے میں نرمی کرنے کا بیان

۱۶۴ ﴿حدثنا: مسلم بنُ إبراهيم ناشعبةُ عن خالد الحذاء عن أبي القلابة عن أبي الأشعث عن شدادٍ بن أوس قال: خَصْلَتَانِ سمعتُها مِنْ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، إن اللّٰه كَتَبَ الإحْسَانَ على كُلِّ شَيْئٍ فَإذَا قتَلْتُم فاحسنُوْا القَتْلَةَ، وإذا ذَبَحْتُمْ فاحسنُوْا الذِبْحَ، وَالْيَحُدَّ أحدُكُم شفْرَتَهُ، والْيرِحْ ذَبِيْحَتَهُ﴾

ترجمہ: حضرت شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے دو خصلتوں کو سنا ہے، اول تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم دیا ہے، سو جب تم قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو، دوسرے یہ کہ جب کسی جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، اور تم میں سے ہر ایک کو اپنی چھری تیز کرلینی چاہیے اور اپنے ذبیحہ کو

راحت پہنچانی چاہیے۔

تشریح مع تحقیق :إحسان: ہر کام کو اچھی طرح انجام دینا۔(أن تعبد اللّٰه كانك تراهُ الخ)

شَفْرَة: (ج) شفرَات: بڑی چھری۔

وَالیُرِح: (افعال) آرام دینا، آرام پہنچانا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اگر کسی کو قتل بھی کرو تو اچھی طرح قتل کرو اس کا مثلہ نہ بناؤ، بلکہ یکبارگی ہی قتل کردو، اگر جانور کی قربانی کرو اور ذبح کرو تو چھری کو تیز کرلیا کرو تا کہ جانور کو تکلیف نہ ہو، اسی طرح ذبح کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی کھال نہ نکال لو ٹھنڈا کر کے کھال نکالو، حاصل یہ ہے کہ ہر ہر چیز میں احسان کا معاملہ کرو۔

ترجمة الباب:فاحسنوا الذبح الخ. سے ثابت ہے۔

۱۶۵ ﴿حدثنا:أبو الوليدِ الطيالسيُّ ثنا شعبة عن هشام بن زيدٍ قَالَ دخَلتُ مع أنس على الحكم بن أيوب فرأىَ فِتيَانًا او غلمَانًا قَدْ نَصبُوْا دَجَاجَةً يَرْمُوْنَهَا، فقَالَ أنسٌ: نهٰى رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. أنْ تُصْبَرَ البَهَائِمُ.﴾

ترجمہ: حضرت ہشام بن زید سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں حضرت انس بن مالکؓ کے ساتھ حکم بن ایوب کے پاس گیا وہاں چند نوجوانوں یا لڑکوں کو دیکھا، کہ انھوں نے ایک مرغی کو محبوس کر رکھا ہے، اور اس پر تیر مارتے ہیں، اس پر حضرت انس نے کہا کہ حضور ﷺ نے جانوروں کو باندھ کر مارنے سے منع فرمایا ہے۔

تشریح مع تحقیق :فِتيَان بکسر الفاء ''فتى'' کی جمع ہے، اس کی ایک جمع فِتيَة بھی آتی ہے، بمعنی نوجوان۔

غِلمَان بکسر الغین ''غلام'' کی جمع ہے بمعنی لڑکا، جوان، خادم۔

نَصبُوْ (ض) کھڑا کرنا۔

دَجَاجَة: بمعنی مرغی جمع دَجَاجِين.

يَرْمُوْنَهَا: (ض) تیر مارنا۔

اس حدیث میں بھی جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے پہلے بھی قتل بالصبر کی ممانعت گزر چکی ہے، قتل بالصبر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جانور کے ہاتھ پیر باندھ کر تیر کا نشانہ بنایا جائے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنے کے لیے پکڑ کر رکھا ہے، نہ اس کو کھانا دیتا ہے نہ پانی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ بھوکے پیاسے جانور کو ہی ذبح کرڈالتا ہے یہ بھی قتل بالصبر کی صورت ہے، لہٰذا اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔

ترجمة الباب: حضور ﷺ نے جانوروں کو قتل بالصبر سے منع فرمایا، کیوں کہ اس میں جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ نرمی کی جائے۔

﴿باب في المسافر يضحيّ﴾

مسافر کے قربانی کرنے کا بیان

١٦٦ ﴿حدثنا: عبدُ اللّٰه بنُ محمد النُفَيليّ ثنا حمادُ بنُ خالدٍ الخيَّاط ثنا معاويةُ بنُ صالحٍ عَنْ أبي الزَّاهِرِيَّةِ عَنْ جُبَيْرِبنِ نُفَيْرٍ عن ثوبَانَ قَالَ: ضَحّ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ثُمَّ قَالَ يا ثوبَانُ أَصْلِحْ لَنَا لَحْمَ هٰذِهِ الشاةِ، قَالَ: فمازلتُ أُطْعِمُهُ مِنْهَا حتّى قَدِمْنَا المدينَةَ﴾

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (سفر میں) قربانی کی، اور پھر فرمایا کہ اے ثوبانؓ! اس بکری کے گوشت کو ہمارے لیے تیار کرو، ثوبان کہتے ہیں کہ میں اس گوشت کو آپ ﷺ کو کھلاتا رہا حتیٰ کہ ہم مدینہ آگئے۔

تشریح مع تحقیق :أصلِح: (افعال) ٹھیک کرنا، تیار کرنا۔ درست کرنا۔ صاف کرنا۔ جب حضور ﷺ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے قربانی بھی کی، قربانی کرنے کے بعد اپنے غلام حضرت ثوبان سے کہا کہ بھئی اس گوشت کو ٹھیک ٹھاک کرلو، تاکہ ہم سفر میں استعمال کرتے رہیں، چنانچہ حضرت ثوبان نے گوشت کو صاف کر کے رکھ لیا، اور پورے سفر میں یہ گوشت استعمال کیا۔

اس حدیث کے پیش نظر امام مالکؒ نے مسافر کے لیے بھی قربانی کو واجب قرار دیا ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک مسافر پر قربانی کرنا واجب نہیں۔

حنفیہ نے اپنے مسلک کی تائید کے لیے حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کیا ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ليس على المسافر جمعة ولا أضحية.

صاحب بدائع رقم طراز ہیں کہ قربانی نام ہے مخصوص وقت میں مخصوص جانور کو تقرب الی اللہ کی نیت سے ذبح کرنا، اور مسافر قربانی کے مخصوص وقت میں بسا اوقات قادر نہیں ہوتا، لہٰذا اگر ہم مسافر پر قربانی واجب کردیں تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ جانور کو ساتھ لیے پھرے، حالاں کہ اس میں حرج عظیم ہے، ”لايكلف الله نفساً الا وسعها“ یا پھر ضروری ہوگا کہ ان ایام میں سفر ہی نہ کرے، حالاں کہ بعض مرتبہ سفر نہ کرنے میں بہت بڑا

نقصان ہوتا ہے، اس لیے مسافر پر قربانی کرنا واجب نہیں ہے۔ (بدائع:۴/۱۹۵)

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بطور استحباب کے قربانی کی تھی، (بذل:۴/۷۸)

تم بفضل الله عز وجل شرحنا "السمح المحمود" لكتاب الذبائح من "سنن أبي داؤد" في الساعة الثانية تماماً في الليلة المتخللة بين ١٤٢٣/٥/٢٩هـ و ١٤٢٣/٥/٣٠هـ وأسأل الله تعالىٰ أن يوفق لى فرصة ذهبية لإكمال القطعة الباقية كما يحب ويرضى إنه سميع بصير، وهو على كل شيئ قدير.

☆ ☆ ☆

﴿أوّل كتاب الذبائح﴾

اکثر نسخوں میں یہ عنوان نہیں ہے، لیکن محشی نے لکھا ہے کہ قلمی نسخہ میں یہ عنوان موجود ہے، اسی وجہ سے یہاں اس عنوان کو قائم کیا جارہا ہے، اور حقیقت میں یہ عنوان ہونا بھی چاہیے، کیوں کہ تمام کتب فقہ اور کتب احادیث میں یہ عنوان مستقلاً موجود ہے۔

﴿باب في ذبائح أهل الكتاب﴾

اہل کتاب کے ذبیحہ کا بیان

١٦٧ ﴿حدثنا: أحمد بنُ محمدبنِ ثابتٍ المروزيُّ قَالَ ثني علي بنُ حسينٍ عن أبيه عَن يزيدِ النحويِّ عن عِكرِمَة عن ابنِ عباسٍ قَالَ: "فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ" فنسخ، واستثنى من ذلك، فقال: طَعَامُ الَّذِيْنَ أوتوا الكتاب حِلٌّ لَّكُمْ، وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ.﴾

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "کہ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو ان جانوروں کو کھاؤ، اور جن پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو ان کو مت کھاؤ" یہ آیت منسوخ کردی گئی ہے، اور اس آیت سے یہ استثناء کردیا گیا ہے "کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے، اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔

تشریح مع تحقیق: یہاں پر ہم چند بحثیں پیش کرنا چاہتے ہیں، ان کا یہاں ذکر کرنا ضروری بھی ہے۔

(١) اوّل تو یہ کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ انعام کی مذکورۂ آیات میں نسخ ہوا ہے یا نہیں؟

(٢) قرآن وسنت کی اصطلاح میں اہل کتاب سے مراد کون لوگ ہیں؟

(٣) نام کے یہودی اور نصرانی جو درحقیقت دہریے ہیں، اہل کتاب میں داخل ہیں یا نہیں؟

(٤) طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

بحث اوّل: سورۂ انعام کی آیت ''فکلوا مما ذکر اسم اللّٰہ علیه، ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللّٰہ علیه'' کو اگر منسوخ مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو کھا سکتے ہیں، اور اس سے مراد اہل کتاب کا ذبیحہ ہوگا، کہ وہ بغیر اللہ کے نام کے لیے ہوئے ذبح کرتے ہیں پھر بھی اس کا کھانا حلال ہے، معلوم ہوا کہ آیت انعام منسوخ ہوگئی۔

لیکن صحیح اور تمام ائمہ تفسیر کا مذہب یہ ہے کہ سورہ انعام کی آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے، جہاں تک ان کے ذبیحہ کے حلال ہونے کا مسئلہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرتے ہیں پھر بھی حلال ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے، یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں، اس کے بغیر جانور کو ناپاک مردہ قرار دیتے ہیں، اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے ان کے مذہب میں بھی حرام ہے، حتی کہ موجودہ دور میں جو توراۃ اور انجیل کے نسخے ہیں ان میں بھی ذبیحہ اور نکاح کے تقریباً وہ ہی احکام ہیں جو قرآن میں ہیں (چنانچہ بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں ذبیحہ کے متعلق مذکور ہے: ''جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی کام میں لاؤ تو لاؤ تم اس سے کسی حال میں نہ کھانا'' (احبار:۲۴)

بایں وجہ اسلام نے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے، یہ کہنا صحیح نہیں کہ آیت میں نسخ ہوا ہے چنانچہ ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان وغیرہ تمام ائمہ تفسیر اس پر متفق ہیں کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ انعام کی آیات میں نسخ نہیں ہوا ہے، یہ ہی جمہور صحابہ وتابعین کا مذہب ہے۔ (ابن کثیر:۳/۱۹، بحر محیط:۴/۴۳۱۔ احکام ابن عربی:۱/۲۲۹)

لہٰذا آیات قرآنی میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ (معارف القرآن:۳/۵۴)

بحث ثانی: اہل کتاب کون لوگ ہیں؟

جو قومیں کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی ہوں، اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں، جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن وسنت کے یقینی ذرائع سے ثابت ہو وہ اہل کتاب میں شامل ہیں، معلوم ہوا کہ یہود ونصاری جو توراۃ اور انجیل جن کا آسمانی کتابیں ہونا یقینی طور سے ثابت ہے پر ایمان رکھتے ہیں وہ باصطلاح قرآن اہل کتاب میں شامل ہیں۔

بحث ثالث: آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے، جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی اور نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب کے بھی قائل نہیں، نہ تورات اور انجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰؑ وعیسیٰؑ کو خدا کا رسول مانتے ہیں وہ لوگ اہل کتاب میں داخل نہیں۔

اہل کتاب میں شامل ہونے کے لیے اتنی بات ضروری ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی

اتباع کے دعویدار ہوں، خواہ وہ اتباع کرنے میں گمراہی میں پڑ جائیں۔

بحث رابع: طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟

طعام کے اصل معنی کھانے کی چیز کے آتے ہیں، جس میں از روئے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں شامل ہیں۔ لیکن جمہور امت کے نزدیک آیت کریمہ میں طعام سے مراد اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے، تفسیر قرطبی میں لکھا ہے: و الطعام إسم لما تؤكل و الذبائح منه، وهو ههُنا خاص بالذبائح عند كثير من أهل العلم۔ یعنی لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی شامل ہے اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لیے استعمال کیا گیا ہے، (قرطبی:۶/۷۷)

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح کو حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف پایا جاتا ہے وہ حقیقت میں جہالت ہے مذہب نہیں، اسی لیے جمہور صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورۂ بقرہ، انعام اور سورہ مائدہ کی آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے اسی طرح نسخ اور تخصیص بھی نہیں ہے، اور جن علماء وتابعین نے جاہلوں کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل کر کے نسخ کا قول اختیار کیا ہے اس کی بنیاد بھی یہ ہی ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے: إنّ الله هو المسيح بن مريم، تو یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اس سے مراد عیسیٰ ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا عیسیٰ کا نام لینا برابر ہے، اس لیے سورہ انعام کی آیت منسوخ ہے۔

(احکام ابن عربی:۱/۲۲۹)

مگر جمہور امت نے اس قول کو قبول نہیں کیا جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر وتفسیر بحر محیط ابھی گزرا ہے، تفسیر مظہری میں اقوال مختلفہ لکھنے کے بعد لکھا ہے: و الصحيح المختار عندنا هو القول الأوّل يعني ذبائح أهل الكتاب تاركاً للتسمية عامداً لا يؤكل۔ (تفسیر مظہری:۳/۳۷۷)

۱۶۸﴿حدثنا: محمد بن كثير قال أنا إسرائيلُ ثنا سمّاكٌ عَنْ عِكرِمَةَ عَنْ ابنِ عبّاسٍ فی قولِهٖ: وَ إنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إلىٰ أوْلِيَائِهِمْ، يَقُوْلُوْنَ: مَا ذَبَحَ اللّٰهُ فَلَا يَاكُلُوْهُ، وَ مَاذَبَحْتُمْ أنْتُمْ فكلُوْهُ، فَأنْزَلَ اللّٰهُ "وَلَا تَاكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ"﴾

ترجمہ: حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "إنَّ الشَّيَاطِيْنَ ليوحون إلى أوليائهم، کے بارے میں نقل کیا ہے کہ کفار کہتے تھے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کیا ہے اس کو تو یہ لوگ کھاتے نہیں، اور جس کو خود ذبح کرتے ہیں اس کو کھاتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت: ولا تاكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه نازل فرمائی۔

تشریح مع تحقیق :مطلب یہ ہے کہ شیاطین کفار کے دلوں میں ایسی باتیں ڈالتے ہیں، جن کے ذریعہ کفار مسلمانوں پر طعن وتشنیع کرتے ہیں، ذبح کے بارے میں ہی کہنے لگتے ہیں کہ دیکھو جس جانور کو خود اللہ تعالی مارتا ہے اس کو تو کھاتے نہیں اور جس کو خود مارتے ہیں اس کو کھاتے ہیں، اس طرح کے اعتراضات مشرکین کے دلوں میں شیاطین کی طرف سے آتے ہیں، چنانچہ اسی کے پیش نظر اللہ تعالی نے آیت کریمہ نازل فرمادی اور حکم فرمایا کہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کو مت کھاؤ، اصل میں یہاں پر آیت " ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" کے شان نزول کو بتلانا مقصود ہے ہم اس شان نزول کی پوری وضاحت آنے والی حدیث کے بعد پیش کریں گے۔

۱۲۹ ﴿حدثنا: عثمانُ بنُ أبي شَيْبَةَ ثنا عِمرانُ بن عُيَيْنَة عَنْ عطاء بنِ السَّائِبِ عَن سعيدِ بنِ جبيرٍ عَن ابن عبّاسٍ قال: جَاءَ تْ اليهودُ إلى النبيِّ صلّى اللّٰه عليه وسلّم فقَالُوا: إِنَّا نَأْكُلُ مِمَّا قتلْنَا ولَا نَأْكُلُ ممَّا قتلَ اللّٰهُ فأنْزَلَ اللّٰه تعالی: "ولَا تَأْكُلُوْا ممّا لمْ يُذْكَرِ اسمُ اللّٰهِ عَلَيهِ" إلى آخر الأيه.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہود آئے، اور کہنے لگے کہ ہم اس جانور کو کھاتے ہیں جس کو ہم نے قتل کیا ہے اور اس جانور کو نہیں کھاتے جس کو اللہ نے قتل کیا ہے، تو اللہ تعالی نے "و لا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" کو نازل فرمادیا۔

تشریح مع تحقیق :اس حدیث شریف میں بھی آیت ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" کے شان نزول کو بتلایا جارہا ہے کہ یہود اور مشرکین نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا کہ جس جانور کو اللہ تبارک وتعالی ذبح کرے اس کو مسلمان نہیں کھاتے، اور خود کے مارے ہوئے جانور کو کھالیتے ہیں یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہے، جب اس طرح کے جملے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے کسے گئے تو اللہ تبارک وتعالی نے اعلان فرمادیا کہ جس جانور پر اللہ تعالی کا نام نہ لیا جائے اس کو ہرگز مت کھاؤ۔

علماء تفسیر لکھتے ہیں: کہ اصل میں تمام جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے برابر ہیں، اس لیے ایک جاندار کے لیے دوسرے جاندار کو فنا کرنا، اور ذبح کر کے کھالینا بظاہر جائز نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن اللہ تعالی نے انسانی ضرورت کی بنیاد پر جائز قرار دیا، اب جن کے لیے جائز کیا گیا ہے ان پر اللہ تعالی کا ایک بھاری انعام ہے، اس لیے جانور کو ذبح کرتے وقت اس نعمت خداوندی کا استحضار اور ادائے شکر ضروری قرار دیا گیا، جس کا اظہار اللہ تعالی کا نام لینے سے ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک تسمیہ عند الذبح واجب ہے، اگر کسی نے بالقصد تسمیہ نہیں پڑھا تو اس جانور کا

کھانا حلال نہیں ہوگا، اگر چہ مسئلہ میں دیگر ائمہ کا اختلاف بھی ہے، مگر یہاں یہ مسئلہ مقصود نہیں اس لیے مستقل طور پر باب آئے گا، وہیں پر انشاء اللہ بحث کی جائیگی۔

باب فی أكل معاقرة الأعراب

اہل عرب کے فخریہ ذبیحوں کے کھانے کا بیان

۱۷۰: حدثنا: هارونُ بنُ عبدِ الله قَالَ نا حمادُ بنُ مسعدةَ عَنْ عوفٍ عن أبي رَيْحَانَة عَن ابن عباسٍ قَالَ: نهىٰ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عَنْ مُعَاقَرَةِ الأعراب.
قال أبوداؤد: غُنْدَرٌ أو قفهُ علىٰ ابنِ عباسٍ،قَالَ أبوداؤد:إسمُ أبي رَيْحَانَة عَبْد الله بنُ مَطرٍ.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاقرۃ الاعراب (وہ جانور جن کو اہل عرب تفاخر کے طور پر کاٹتے ہیں) سے منع فرمایا امام ابوداؤد نے کہا کہ غندر نے اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ پر موقوف کیا ہے، امام ابوداؤد نے کہا کہ ابوریحانہ کا نام عبداللہ بن مطر ہے۔

تشریح مع تحقیق :معاقرۃ: (مفاعلت) اونٹ وغیرہ کو ذبح کرنے میں ایک دوسرے پر فخر کرنا، اصل میں یہ عقر سے ہے (ض) بمعنی زخم لگانا، اونٹ کے ہاتھ پیر کاٹنا۔

عربوں کے یہاں دستور تھا کہ لوگ فخر کے طور پر اونٹوں کو ذبح کرتے تھے، اگر ایک شخص نے ایک اونٹ ذبح کر دیا تو دوسرا بھی اس کی طرح فخر اور ریار کے طور پر اونٹ ذبح کرتا تھا، پھر پہلا شخص ایک اونٹ اور ذبح کر دیتا تھا، تو دوسرا بھی ایک اور ذبح کر دیتا تھا، اس طرح آپس میں ضد رہتی تھی، یہاں تک کہ ان میں سے ایک عاجز آجاتا تھا، اور یہ سب کچھ اپنی بڑائی، تکبر سخاوت کے اظہار میں ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی پہلو اس میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کی زبانی ایسے اونٹوں کے گوشت کو کھانے اسی طرح ایسے فعل سے منع فرمایا، کیوں کہ اس میں اللہ کی تعظیم تو ہوتی نہیں تھی بلکہ غیر اللہ کی تعظیم میں ہی سب کچھ ہوتا تھا، اور یہ وما اھل لغیر اللہ کا مصداق تھا، یہ ہی معاقرہ الاعراب کا مطلب ہے۔

قال ابوداؤد: امام ابوداؤد یہاں سے یہ بیان فرمارہے ہیں کہ یہ حدیث اس مذکورہ سند سے مرفوع ہے، لیکن غندر یعنی محمد بن جعفر اس حدیث کو موقوفاً نقل کرتے ہیں، تو گویا یہ حدیث دونوں طرح ثابت ہے، موقوفاً بھی اور مرفوعاً بھی، اس قال ابوداؤد کا مطلب عموماً امتحان میں پوچھ لیا جاتا ہے، تو اس کا جواب صرف یہ ہی کہ اس سے

امام ابوداؤدؒ اس حدیث کے مرفوع اور موقوف دونوں طرح ثابت ہونے کو بتلا رہے ہیں۔

اور دوسرے قال ابوداؤد سے ایک راوی ابوریحانہ ہیں جن کا ذکر سند میں آیا ہے ان کے اصل نام کی طرف توجہ دلادی کہ ابوریحانہ تو ان کی کنیت ہے اصل نام عبداللہ بن مطر ہے۔

مسئلہ: مذکورہ حدیث کی روشنی میں صاحب بذل المجہود نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ہر وہ کھانا جو مفاخرہ وریار کے طور پر تیار کیا گیا ہو اس کو کھانا درست نہیں ہے، اسی طرح جو جانور کسی امیر کی آمد کی وجہ سے اس کے تقرب کے حصول کے لیے ذبح کیا گیا ہو اس کا کھانا بھی حلال نہیں ہے۔ (بذل:۴/۷۸)

ترجمة الباب: حدیث کا باب سے ربط واضح ہے کہ حضور ﷺ نے معاقرہ الاعراب کے کھانے سے منع فرمایا ہے۔

﴿باب الذبيحة بالمَرْوَةِ﴾

پتھر سے ذبح کرنے کا بیان

۱۷۱﴿حدثنا: مسدد قال نا أبو الأحوص قال نا سعيد بنُ مسروقٍ عن عباية بن رفاعةَ عن أبيه عن جدّه رافع ابنِ خديجٍ قال: أتيتُ رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم فقلتُ: يا رسول اللّٰه! إنّا نَلقى العدوَّ غدًا، وليس معَنَا مُدًى، فقال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أرِنْ أو اِعْجَلْ ما أنهرَ الدَّمَ، وذُكِرَاسمُ اللّٰه عَلَيْهِ فكلو، مالم يكن سِنّ أو ظُفرٌ، وسَأ حدِّثكم عَنْ ذلك؛ أما السِّنُّ فعظمٌ، وأما الظفرفَمُدَى الْحَبْشَةِ، تَقَدَّمَ بِهِ سَرَعَانُ مِنَ النَّاسِ، فتعجَّلُوْا فاصابوا من الغنائِم، ورسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم في آخر الناس فنصبوا قدوراً، فمرّ رسول الله صلى الله عليه وسلم بالقُدُورِ، فأمرَ بِها، فأكْفِئَتْ، وقَسَّمَ بَيْنَهُمْ فَعَدَلَ بعيراً شيَاهٍ، ونَدّ بَعِيْرٌ مِن إبِلِ الْقَوْمِ، وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُمْ خَيْلٌ، فرماه رجل بسهم فَحَبِسَهُ اللّٰه، فقَالَ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم: إن هذهِ البَهَائِمَ أوَابِدَ كأوَابِدِ الوَحْشِ، وَمَا فَعَلَ مِنْهَا هذَا، فَافْعَلُوْا بِهِ مثْلَ هذَا﴾

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم کل کو دشمنوں سے لڑیں گے، اور ہمارے پاس چھریاں نہیں ہیں، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل کرو،

اور جلدی کروایسی چیز سے جوخون بہادے، اور اس پر اللہ کا نام لیا جائے، تو اس کو کھالو، سوائے دانت اور ناخون کے، (ان دونوں سے ذبح مت کرو) میں تم سے اس کی وجہ بیان کرتا ہوں کہ دانت تو ایک ہڈی ہے، اور ناخون حبشیوں کی چھری ہے، پس کچھ لوگ جلدی میں آگے بڑھ گئے، اور غنیمت کا مال لوٹا، حضور ﷺ لوگوں کے اخیر میں تھے، انہوں نے ہانڈیاں چڑھائیں، جب حضور ﷺ ہانڈیوں کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے ہانڈیوں کو الٹ دینے کا حکم کیا، چنانچہ ہانڈیوں کو الٹ دیا گیا، پھر ان کے درمیان مال غنیمت کو تقسیم کردیا، اور ایک اونٹ کو دس بکریوں کے مقابلہ میں رکھا، اسی دوران ایک اونٹ بھاگ گیا، اس وقت لوگوں کے پاس گھوڑے نہیں تھے، ایک شخص نے اس اونٹ کو تیر مارا، اللہ تعالیٰ نے اس اونٹ کو روک دیا، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چوپائے بھی بھاگنے والے ہوتے ہیں جیسا کہ وحشی جانور بھاگتے ہیں لہٰذا جو جانور ایسا کرے اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرو۔

تشریح مع تحقیق :المَرْوَةُ: بفتح المیم وسکون الراء: یہ سفید رنگ کا ایک پتھر ہوتا ہے۔

مُدىً: مُدْيَةٌ کی جمع ہے بمعنی چھری۔

نَلْقِيْ: (س) ملاقات کرنا، ملنا۔

أَرِنْ: اس لفظ کی تحقیق میں شارحین کی مختلف رائیں ہوگئیں ہیں، امام خطابیؒ نے تو یہ کہہ دیا کہ مجھے اس لفظ کی صحیح تحقیق نہ مل سکی، تاہم آپ کے سامنے چند اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) أَرِنْ: إِرَانَةٌ سے ماخوذ ہے اور "أَطِعْ" کے وزن پر امر کا صیغہ ہے، اسکے معنی ہیں: ہلاک ہونا، کہا جاتا ہے: أران القومُ إرانة: لوگوں کے جانور ہلاک ہوگئے، اس اعتبار سے یہاں حدیث میں اسکے معنی ہوں گے۔ أَهْلِكْهَا ذِبْحًا کہ ذبح کر کے ہلاک کردو، لیکن یہ معنی بعید ہیں، کیوں کہ إرانة غیر متعدی ہے اور یہاں فعل متعدی ہے۔

(۲) أَرِنِي: إِرَاءة. سے ماخوذ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جس چیز سے تم جانور کو ذبح کرنا چاہتے ہو وہ چیز مجھے دکھلاؤ، تا کہ میں بتلاؤں کہ اس سے ذبح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ لہٰذا یہاں پر ارِنْ سے مراد أرني ہے جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں بھی "أرني" کا ہی لفظ ہے۔ (فتح الباری: ۹/ ۷۹۷)

(۳) إِأْرَنْ بروزن إِفْهَمْ (س) أَرِنَ يَأْرَنُ، نشیط ہونا، اور مطلب یہ ہے کہ جلدی سے ذبح کرو تا کہ وہ جانور گھٹ کر نہ مرجائے، اس لیے کہ لوہے کے علاوہ چیزوں میں جلدی سے ذبح کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن یہ روایت بھی صرفی قواعد کی رو سے غلط ہے کیوں کہ قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ "إيرن" ہوتا، کیوں کہ یہ فعل مجرد ثلاثی میں صحیح مہموز الفاء کا صیغہ امر ہے۔ إيئذ کے وزن پر اور یہاں اس کے برخلاف ہے۔

(۴) ہوسکتا ہے کہ اس کلمہ میں تصحیف ہوگئی ہو اور اصل میں یہ کلمہ "أَزِرْ" تھا بمعنی ہاتھ کو تیزی سے چلاؤ، امام خطابیؒ نے اس کو اقرب المعنی قرار دیا ہے، لیکن علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اس میں اور بھی تفصیل

دیکھئے۔ (تکملہ فتح الملہم:۳/ ۵۶۷، فتح الباری:۹/ ۹۷۔ شرح نووی علی مسلم:۲/ ۱۵۶)

سُرْعَانُ: بفتح السین وضمہا، آگے آگے چلنے والے لوگ، ''یقال: جاء نی سرعان القوم'' وہ آگے آگے آیا، اُکْفِئَتْ (افعال) برتن کو الٹ دینا۔

نَدَّ: (ض) بدکنا، بچھڑنا، اوابِدُ آبدة کی جمع ہے بھاگنے والا اونٹ، أبَدَت البهيمة تأبد (من باب ضرب) أبودًا اي توحشت.

حدیث بالا میں بقول امام نوویؒ یہ واقعہ طائف کے وقت کا ہے، جب آپ ﷺ روانہ ہوئے تو صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم لوگ دشمنوں سے لڑنے کے لیے جارہے ہیں، اور خدا تعالیٰ سے امید بھی ہے کہ فتح نصیب ہوگی، مال غنیمت حاصل ہوگا، ہوسکتا ہے کہ کچھ جانور غنیمت میں ملیں گے تو ہم ان کو کس چیز سے ذبح کریں، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ ہم سفر میں جارہے ہیں ہمارے پاس کھانے کے جانور ہیں راستہ میں ذبح کرنے کی ضرورت پڑے گی تو کس چیز سے ذبح کریں گے، کیوں کہ تلواریں تو لڑنے کے لیے ہیں، اگر ان کو استعمال کیا جائے گا تو ان کی دھار ختم ہوجائے گی، لیکن دیگر روایات کی روشنی میں پہلا مطلب ہی واضح اور زیادہ مناسب ہے۔

صحابہ کے جواب میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز سے خون بہہ جائے اسی سے ذبح کردو، البتہ دانت اور ناخون سے ذبح مت کرنا، کیوں کہ دانت تو ایک ہڈی ہے اور ہڈی سے ذبیحہ حلال نہیں ہوتا، لیکن علامہ نوویؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ہڈی سے ذبح کی ممانعت اس لیے ہے کہ جب ہڈی خون سے ملے گی تو ناپاک ہوجائے گی، اور ہڈی کو ناپاک کرنے کی ممانعت ہے کیوں کہ وہ جنات کی غذا ہے۔

اور ناخون سے چوں کہ حبشی لوگ ذبح کرتے ہیں لہٰذا اس میں تشبہ بالکفار ہوگا، اور غیر قوم کے ساتھ تشبہ سے منع کیا گیا ہے، اس پر یہ اشکال نہ ہونا چاہیے کہ تشبہ تو چھری سے ذبح کرنے سے بھی لازم آئے گا کیوں کہ کفار بھی چھری سے جانور کو ذبح کرتے ہیں، اس لیے کہ چھری ایک اصل ہے، جس کا استعمال ناگزیر ہے، اس کے علاوہ دانت اور ناخون وغیرہ سے ذبح کرنے میں جانور کو تکلیف بھی ہوتی ہے، جو ضرورت سے زائد ہے لہٰذا ممنوع ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب صحابہؓ کی یہ جماعت حضور اکرم ﷺ کی قیادت میں مقام ذی الحلیفہ میں پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مال غنیمت عطا فرمایا، اسی دوران کچھ لوگوں نے جلدی کی اور تقسیم سے پہلے ہی اونٹ کو ذبح کرکے پکانا شروع کردیا حضور ﷺ نے جب یہ حالت دیکھی تو ناراض ہوئے، اور حکم فرمایا کہ جن ہانڈیوں میں گوشت پک رہا ہے ان کو الٹ دیا جائے، آپ ﷺ کے ہمراہ صحابہ نے حکم کی فرمانبرداری کی اور ہانڈیوں کو الٹ دیا، آپ ﷺ نے ہانڈیوں کو الٹنے کا یہ حکم زجراً دیا تھا، کیوں کہ انہوں نے بغیر تقسیم کے ہی مال غنیمت کو استعمال کرنا شروع کردیا تھا، حالاں کہ بغیر ضرورت شدیدہ کے تقسیم سے پہلے مال غنیمت کو استعمال کرنے

کی اجازت نہیں ہے، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ضرورت تو تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کو ضرورت تھی انہوں نے بھی اپنی ضرورت سے زیادہ مال لیا ہوگا۔

جیسا کہ کتاب الجہاد میں گذر چکا ہے کہ یہاں پر ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہانڈیوں کے اندر گوشت پک رہا تھا جب ہانڈیوں کو الٹ دیا گیا تو اس میں اضاعت مال ہوا؟ اس کا جواب ہم حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے شوربا گرانے کا حکم دیا تھا نہ کہ گوشت کو گرانے کا، البتہ اس جواب پر کتاب الجہاد کی ایک روایت سے اشکال ہوگا کہ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے گوشت کو مٹی میں ملا دیا تھا اس لیے اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ان لوگوں نے لوٹ کی تھی، جس کی سزا میں آپ ﷺ نے یہ حکم فرمایا تھا، تا کہ آئندہ کوئی اس قسم کی حرکت نہ کر سکے۔ (فتح الباری: بذل: ۴/ ۲۹)

قوله فقسم بينهم الخ: اس کے بعد آپ ﷺ نے مال غنیمت کی تقسیم کی، اور ایک اونٹ کو دس بکریوں کے مقابلہ میں رکھا، کیوں کہ اونٹ بہت عمدہ تھے جن کی قیمت دس بکریوں کے برابر تھی، اس لیے یہاں قیمت کا اعتبار کر کے تقسیم ہوئی، اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اونٹ کی قربانی دس آدمیوں کی طرف سے کرنا جائز ہے، کیوں کہ اشتراک فی الاضحیہ امر تعبدی ہے جو قیمت کے مختلف ہونے سے مختلف نہیں ہوگا، (تکملہ فتح الملہم: ۳/ ۵۷۱)

قوله ندّ بعير من إبل القوم: مطلب یہ ہے کہ جب غنیمت تقسیم کر دی گئی اور جس شخص کے حصہ میں اونٹ آیا اس کا اونٹ ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ گیا، ان کے پاس گھوڑے بھی نہیں تھے کہ اس کے ذریعہ اس کو پکڑا جائے بہت پریشانی ہوئی، لیکن اسی دوران ایک صحابی نے اس اونٹ کو تیر مارا جس کی وجہ سے وہ رک گیا، اور پھر اس اونٹ کو ذبح کر دیا گیا، اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے اونٹوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرنا چاہیے۔

اس روایت کی تشریح سے جہاں بہت سے مسئلے مستنبط ہوئے وہیں پر دو مسئلے انتہائی اہم اور ضروری ہیں۔ (۱) حدیث کی شرح سے معلوم ہوا کہ ہر دھار دار چیز سے ذبح کیا جا سکتا ہے۔ (۲) ذبح اضطراری کا ثبوت ہوا کہ اگر پالتو جانور وحشی ہو جائے تو اس میں ذبح اضطراری کافی ہے۔ (بذل: ۴/ ۹۷، شامی: ۹/ ۴۴۰)

یہاں پر ایک مسئلہ اور زیر بحث آتا ہے کہ کٹے ہوئے ناخون یا ہڈی سے کوئی ذبح کر دے تو ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں، ہم دونوں اختلافی مسئلوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

مسئلہ خلافیہ

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کٹے ہوئے ناخون یا اکھڑے ہوئے دانت سے ذبح کرنا جائز نہیں ہے، اگر کسی نے ذبح کر دیا تو حلال نہیں ہوگا۔

حنفیہ کا مسلک اس بارے یہ ہے کہ اگر دانت اور ناخون انسان کے جسم میں لگے ہوئے ہیں، اور اس حالت میں دانت اور ناخون کو ذبح کرنے میں استعمال کرے تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ فعل ذبح نہیں بلکہ خنق ہے، اس کی وجہ سے جانور منخنقہ ہو جائے گا، لیکن اگر دانت یا ناخون جسم سے الگ ہیں اور بہت تیز ہیں تو ان سے حدیث بالا کی وجہ سے ذبح کرنا تو ناجائز ہے البتہ اگر ذبح کر لیا تو جانور حلال ہو جائے گا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ پاکستان: ۷۰۲/۳)

امام شافعیؒ کی دلیل

حدیث باب ہے کہ حضور ﷺ نے کٹے ہوئے ناخون یا اکھڑے ہوئے دانت یعنی ہڈی سے ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے، اور ان دو چیزوں کا استثنار استثنار من الاباحت ہے جس سے عدم جواز ہی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل

(۱) ایک تو حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ أنہر الدم بما شئت یعنی جس چیز سے بھی خون بہہ جائے اس سے ذبح کرنا صحیح ہے، اور کٹے ہوئے ناخون وغیرہ سے خون بہہ جاتا ہے البتہ استثنار کی وجہ سے کراہت باقی رہے گی جس کے ہم بھی قائل ہیں۔

(۲) نسائی شریف کی روایت: أفر الأوداج بماشئت قاله النبي صلى الله عليه وسلم.

امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب

دونوں قسم کی روایات میں تعارض ہونے کی وجہ سے بہتر یہ ہے کہ ایک کو حلت پر محمول کر لیا جائے، اور دوسری کو کراہت پر، کیوں کہ حلت کراہت کے منافی نہیں ہے۔ (شامی کتاب الحظر والاباحۃ)

(۲) حبشی لوگ ہی غیر منزوع دانت اور ناخون ذبح کے لیے استعمال کرتے تھے جیسا کہ خود حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے لہٰذا حدیث مذکور میں غیر منزوع ناخون اور دانت مراد لے لیے جائیں۔ (بذل: ۷۹/۴، ہدایہ: ۴/ ۴۴۲، مرقاۃ: ۱۱۳/۸، بدائع: ۴۲/۵، پاکستان)

ترجمة الباب: أرن أو اعجلْ ما أنهر الدم الخ سے ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے۔

۱۷۲ ﴿حدثنا: مسدَّدٌ أن عبدَ الواحد بنَ زياد وحمادًا المعنى واحد حدثاهم عن عاصم عن الشعبي عن محمد بن صفوان أو صفوان بن محمد قال أَصَّدْتُ أرنبَيْنِ فذَبَحْتُهما بِمَرْوَةٍ، فسألتُ رسولَ الله ﷺ عنهما؟ فأمرني بأكلِهِمَا.﴾

ترجمہ: حضرت محمد بن صفوان سے روایت ہے کہ میں نے دو خرگوش کا شکار کیا، اور ان دونوں کو دھار دار

سفید پتھر سے ذبح کیا، پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان دونوں کے (حلال) ہونے کے بارے میں پوچھا، تو آپ ﷺ نے کھانے کا حکم فرمادیا؛

تشریح مع تحقیق :اصّدتُ (افتعال) بالصاد المشددة، اس کی اصل "اِصطَدتُ" تھی "ط" کا صاد میں ادغام کردیا گیا ہے۔

أَرنَبَینِ (صیغہ تثنیہ) أَرنَبٌ بمعنی خرگوش۔

مَرْوَة: سفید پتھر۔

اس روایت سے دو چیزوں کا ثبوت ہوا۔(۱) خرگوش کی حلت (۲) ذبح اضطراری کا جواز ائمہ اربعہ کا خرگوش کی حلت پر اتفاق ہے، امام نوویؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف حرمت کے قول کی نسبت کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ امام صاحب حلت کے قائل ہیں۔(انتخاب المنن:۲۶)

۱۷۳﴿حدثنا: قتيبةُ بنُ سعيدٍ قال نا يعقوبُ عن زيدِ بنِ أسلم عن عطاء بن يسارٍ عن رجلٍ مِنْ بني حارثة أَنَّهُ كانَ يَرْعَى لِقْحَةً بِشِعبٍ من شِعَابِ أُحُدٍ، فأخذَهَا الموتُ، ولم يَجِدْ شَيئًا يَنحَرُهَا بِهِ، فأخذ وتَدًا، فَوَجَأَ بِهِ في لَبَّتِهَا حَتّٰى أُهْرِيقَ دَمُهَا، ثم جَاءَ إلى النبي صلى الله عليه وسلم فأَخْبَرَهُ بذلك. فأمَرَهُ بأكلِهَا.﴾

ترجمہ: قبیلہ بنو حارثہ کے ایک شخص سے روایت ہے کہ وہ احد پہاڑ کی گھاٹی میں اپنی اونٹنی چرا رہا تھا، اچانک وہ اونٹنی مرنے لگی، اور اس نے کوئی ایسی چیز نہ پائی جس سے وہ اس کو ذبح کرے، تو اس نے ایک میخ (کیل) لے کر اونٹنی کے سینے میں گھونپ دی حتی کہ خون بہہ گیا، پھر حضور ﷺ کو اس کی خبر دی، تو حضور ﷺ نے اس اونٹنی کو کھانے کا حکم فرمادیا۔

تشریح مع تحقیق :یَرْعٰی (ف) چرانا۔

لِقْحَة. (ج) لِقَاحٌ بمعنی بہت دودھ دینے والی اونٹنی۔

وَتَد (ج) أَوْتَادٌ بمعنی کھونٹی، میخ کیل جو دیوار میں گاڑی جاتی ہے۔

وَجَأَ (تفعیل) داخل کرنا، گھونپنا۔

جب آدمی کسی بھی وجہ سے ذبح اختیاری سے عاجز ہوجائے، تو جسم کے کسی حصہ سے خون کا بہادینا ہی اس جانور کے ذبح کے لیے کافی ہے، چوں کہ خون کا بہنا ہی ذبح کی شرط ہے جب خون بہہ گیا تو ذبح صحیح ہوگیا، اسی وجہ سے حضور ﷺ نے اس اونٹنی کے کھانے کا حکم فرمادیا اسی کا نام ذبح اضطراری ہے۔(ہدایہ ۴/۴۱۸)

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب اس طرح ثابت ہوگا کہ باب کا اصل مقصد چھری کے علاوہ چیزوں مثلاً

پتھر سے ذبح کے جواز کو بتلاتا ہے، اور حدیث میں مذکورہ صورت میں بھی چھری کے علاوہ میخ سے ذبح کیا گیا ہے اور حضور ﷺ نے اس سے ذبح شدہ جانور کے کھانے کو جائز قرار دیدیا، معلوم ہوا کہ چھری کے علاوہ چیزوں سے بھی ذبح کرنا جائز ہے۔

۱۷۴ ﴿حدثنا: موسىٰ بن ُ إسمعيل قال نا حمّادٌ عن سمّاكِ بنِ حربٍ عَن مَرِيِ بنِ قَطَرِيٍّ عن عديِّ بنِ حاتمٍ قَالَ قلتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ أَرَأَيتَ انَّ أحدَنَا أَصَابَ صَيْدًا، وَلَيْسَ مَعَهٗ سِكِّيْنٌ، أَيَذْبَحُ بالمَرْوَةِ وَشقَّةِ العَصَا، فقَالَ: أَمْرِرِ الدَّمَ بِمَا شِئْتَ وَاذْكرِ اسْمَ اللّٰهِ.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم میں سے کوئی آدمی شکار کو پائے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا تیز پتھر یا لکڑی کی کنار سے اس کو ذبح کرلے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز سے چاہو ذبح کرو، اور اللہ کا نام لے لو۔

تشریح مع تحقیق: سِكِّيْنٌ (ج) سکاکین بمعنی چھری، چاقو۔

أَمْرِرْ. (افعال) صیغہ امر ہے۔ إمْرَار الدم. خون بہانا، خون نکالنا۔

مطلب یہ ہے کہ جو بھی چیز خون کو بہادے اس سے ہی ذبح کردو، خواہ وہ چھری ہو یا پتھر ہو یا لکڑی ہو، بشرطیکہ دھاردار ہو، جس سے رگیں کٹ جائیں، حدیث شریف میں عموم ہے، لیکن دوسری احادیث کی وجہ سے ظفر، سن وغیرہ کا استثنار کیا جائے گا، جیسا کہ ماقبل میں تفصیلی بحث گذر چکی ہے۔

ترجمة الباب: أمرِر الدم بما شئت الخ سے ثابت ہے۔

﴿باب ماجاء في ذبيحة المُتَرَدِّيَةِ﴾

اوپر سے نیچے گر کر مر جانے والے جانور کو ذبح کرنیکا بیان

۱۷۵ ﴿حدثنا: أحمدُ بنُ يونسَ قَالَ نا حمَّادُ بنُ سلمة عَنْ أبي العشراء عن أبيه أنه قالَ: يارسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم! أما تكونُ الذكاة إلّا منَ اللَّبَّةِ أو الحَلَقِ؟ قَالَ: فقَالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لَوْ طَعَنْتَ في فَخِذِهَا لأجزَأَ عَنْكَ، قَالَ أبوداؤد. لا يَصْلُح هٰذَا إلَّا في الْمُتَرَدِّيَة والْمُتَوَحِّشِ.﴾

ترجمہ: ابوالعشراء سے روایت ہے کہ ان کے والد نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! کیا لبہ اور حلق کے

علاوہ میں ذکاۃ نہیں ہوسکتی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو اس کی ران پر نیزہ مارے تو بھی کافی ہے، ابوداؤد نے کہا کہ یہ صرف متردیہ اور متوحش کی ذکاۃ ہے۔

تشریح مع تحقیق: حدیث شریف سے تو یہ معلوم ہوا کہ فخذ (ران) میں تیر مارنا بھی ذبح کے لیے کافی ہے، جب کہ خون بہہ جائے، خواہ جانور پالتو ہو یا متوحش ہو، کیوں کہ متردیہ پالتو ہی ہوگا، عموماً؛ لیکن یہ بات اجماع امت اور تمام صحیح روایات کے خلاف ہے حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں یہ اعلان کرادیا تھا کہ ذبح اختیاری کا محل لبہ اور حلق ہے، اور اسی پر سب کا اجماع ہوگیا تھا، اور ذبح اضطراری کا محل پورا بدن ہے، جسم کے کسی بھی حصہ پر زخم لگادیا گیا اور خون نکل آیا تو وہ جانور حلال ہوگا۔

اسی وجہ سے امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کی تاویل کی، اور اس کو متردیہ اور متوحش پر محمول کرلیا، لیکن امام ابوداؤد کی یہ تاویل جب ہی صحیح ہوسکتی ہے، جب کہ موت کا اصل سبب زخم کرنا ہی ہو، اور اگر زخم لگانے کے بعد زندہ پکڑا اور قدرت علی الذبح کے باوجود ذبح نہیں کیا، یا اس کے ساتھ کوئی دوسرا سبب پایا گیا، تو اس کا کھانا حرام ہوگا، اب ہم نے صورتِ مذکورہ میں دیکھا کہ "متردیہ" جو جانور اوپر سے گرا ہے اور اس کو تیر ماردیا، تو اب یہاں دو سبب جمع ہوگئے، ایک محرم اور ایک مبیح، یعنی اوپر سے گرنا یہ سبب محرم ہے اور تیر مارنا سبب مبیح ہے، اور یہ ضابطہ ہے کہ جب موت کے دو ایسے سبب جمع ہوجائیں کہ ایک حلت کا تقاضہ کرے اور دوسرا حرمت کا متقاضی ہو تو اس وقت سبب محرم کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ (شامی: ٦/٤٧٢ کراچی) اس لیے یہاں پر "متردیہ" جانور کے بارے میں امام ابوداؤد کی مذکورہ تاویل مفید نہیں ہوگی، کیوں کہ جو جانور اوپر سے گرا ہے اور جان باقی ہے تو اس میں ذبح اختیاری ہوگا، ران (فخذ) میں نیزہ مارنا کافی نہیں ہوگا، رہا مسئلہ متوحش کا تو امام ابوداؤدؒ کی مذکورہ تاویل اس کے بارے میں بالکل صحیح ہے۔ (بذل: ٤/٨١)

اس کے برخلاف جمہور اس روایت کو قبول ہی نہیں کرتے، اس لیے کہ یہ روایت ضعیف ہے اور وجہ یہ ہے کہ ابوالعشراء کے نام کے بارے میں ہی (٩) قول ہیں، امام حاکم نے کہا کہ ان کا نام سنان تھا، ابن حبان نے کہا عبداللہ تھا، طبرانی نے بلال لکھا ہے اور بعض حضرات نے یسار بتلایا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میمون کہتے ہیں کہ میں نے ابوداؤد سے ابوالعشراء کی حدیث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک یہ حدیث غلط ہے، اور کہا کہ ابوالعشراء سے صرف ایک یہ ہی روایت ثابت ہے لہٰذا مجہول ہوئے۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابوالعشراء نے اپنے والد سے سنا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مجھے نظر ہے، ابن سعد نے کہا کہ ابوالعشراء مجہول ہیں، امام مزنی، حافظ ابن حجر وغیرہ پایہ کے محدث حضرات نے بھی ان کو مجہول قرار

دیا ہے، لیکن ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے البتہ ضعف کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ وہ بصرہ کے راستوں میں بھٹکتے تھے یعنی راستوں میں بیٹھا کرتے تھے، البتہ امام ابوداؤد کا رجحان غالباً اس حدیث کے بارے میں حسن درجہ کا ہے اسی لیے انہوں نے توجیہ بھی کی ہے، بہر حال ان تمام خرابیوں کے باوجود جمہور علماء اس حدیث کو صحیح احادیث کے مقابلہ میں نہیں رکھتے۔ (بذل:۸۱/۴)

ترجمة الباب: امام ابوداؤد نے اس حدیث کو متوحش پر محمول کر کے ذکاۃ اضطراری کو ثابت کیا ہے امام ابوداؤد کی توجیہ کے مطابق باب سے مناسبت ثابت ہو جائے گی۔

﴿باب في المبالغة في الذبح﴾

خوب اچھی طرح ذبح کرنے کا بیان

۱۷۶ ﴿حدثنا: هنادُ بنُ السريّ والحسنُ بنُ عيسٰى مولى ابنِ المباركِ عن ابنِ المُبَارَكِ عن مَعْمَرٍ عن عمروبن عبدالله عن عكرمة عن ابنِ عباسٍ، زادَ ابنُ عيسٰى وأبي هريرةَ قَالَا: نهىٰ رسولُ الله ﷺ عَنْ شَرِيْطَةِ الشَّيْطانِ، زاد ابنُ عيسٰى في حديثِهٖ: وَهِيَ الَّتِي تُذْبَحُ فَيُقْطَعُ الجِلْدُ وَلَا تُفرىَ الْأَوْدَاجُ، ثُمَّ يُتْرَكُ حتى يموتَ.﴾

ترجمه: حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شریطہ سے منع فرمایا، ابن عیسیٰ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ شریطۃ الشیطان وہ جانور ہے جس کو ذبح کیا جائے اور اسکی کھال کاٹ دی جاوے، لیکن اس کی رگوں کو نہیں کاٹا، پھر اس کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ مرجائے۔

تشریح مع تحقیق :شريطة: (ن،ض) بمعنی نشتر لگانا، شرط حجام سے ماخوذ ہے، شیطان کی طرف اس کی نسبت اس لیے کی گئی ہے کہ اس قبیح عمل کا باعث اور محرک شیطان ہی ہوتا ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگ ایسا کرتے تھے کہ جانور کے حلق کا تھوڑا سا حصہ یعنی صرف کھال کھال کاٹ دیتے تھے، اس کی رگوں کو نہیں کاٹتے تھے، اس کے بعد اس کو چھوڑ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اس کے بعد اس کو پکا کر کھالیا کرتے تھے۔ جنوب کے علاقے میں ایسا اب بھی دیکھنے کو ملا ہے۔ اس میں جانور کو بہت تکلیف ہوتی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔ ابن عیسیٰ نے بھی اس کی تفسیر اسی طرح کی ہے کہ شریطہ سے مراد وہ جانور ہے جس کی رگیں نہ کاٹی جائیں بلکہ صرف کھال کاٹی جائے اور چھوڑ دیا جائے۔ (بذل:۸۲/۴)

مسئله: ذبح کرنے میں مبالغہ کرنا مسنون ہے، اور چاروں رگوں کا کاٹنا یہ مبالغہ فی الذبح ہے یعنی

دونوں رگوں کو جو مونڈھوں سے گردن تک پہنچتی ہیں، اور حلقوم کو، چوتھے مری کو، اگر ان چاروں کو نہ کاٹے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بغیر کسی تعیین کے تین کا کاٹنا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف حلقوم کا کاٹنا ضروری ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک ودجین اور حلقوم کا کاٹنا ضروری ہے۔ صاحب ہدایہ نے امام مالکؒ کا ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ چاروں کا کاٹنا ضروری ہے، امام ابویوسفؒ کے نزدیک ودجین میں سے ایک ضروری ہے اور حلقوم و مری بھی ضروری ہیں، امام محمد اور امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول یہ ہے کہ چاروں رگوں میں سے اکثر کا کاٹنا ضروری ہے، اگر مذکورہ تفصیل کے مطابق جانور کو ذبح نہیں کیا گیا تو وہ شریطۃ الشیطان کا مصداق ہوگا، اور اس کا کھانا حلال نہیں ہوگا۔

(ہدایہ:۴/۴۳۴، بذل:۴/۸۲)

ترجمة الباب: باب سے مناسبت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جانور کے کھانے سے منع فرمایا ہے جس کی ساری رگیں نہ کاٹی جائیں، معلوم ہوا کہ جس کی ساری رگیں کاٹی جائیں اس کا کھانا حلال ہے، اور ساری رگوں کا کاٹنا ہی مبالغہ فی الذبح ہے۔

﴿باب ماجاء في ذكوة الجنين﴾

جنین کے ذبح کرنے کا بیان

١٧٧ ﴿حدثنا: القعنبيُّ قال أخبرنا ابنُ المبارك ح وحدثنا مسدّدٌ نا هُشَيْم عن مُجالدٍ عَنْ أبي الوداكِ عَنْ أبي سعيدٍ قَال: سألتُ رَسُوْلَ الله صلى الله عليه وسلم عَنِ الجَنِيْنِ؟ فقَالَ: كُلُوْهُ إنْ شِئتُم، وَقَالَ مُسَدّدٌ: قُلْنَا يَارَسُوْلَ الله! نَنْحرُ النَّاقَةَ وَنَذْبَحُ البَقَرَةَ وَالشَّاةَ فَنَجدُ فِي بَطْنِهَا الْجَنِيْنَ أ نُلْقِيْهِ اَمْ نأكُلُ؟ قَالَ: كُلُوْهُ إنْ شِئتُم، فَإنَّ ذَكَاتَهُ ذَكَاةُ أمِّهِ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے جنین کے بارے میں پوچھا؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر چاہو تو اس کو کھالو، مسدد نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم اونٹنی کا نحر کرتے ہیں اور بکری، گائے کو ذبح کرتے ہیں تو ہمیں اس کے پیٹ میں جنین ملتا ہے، ہم اس کو پھینک دیں یا کھالیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر چاہو تو کھالو، کیوں کہ اس کی ذکاۃ اس کی ماں کی ذکاۃ ہے۔

١٧٨ ﴿حدثنا: محمد بنُ يحيى بن فارسٍ حدثني إسحقُ بنُ إبراهيمَ بن راهويه قَالَ نا

عتابُ بنُ بَشِيرٍ قَالَ نا عُبيدُ اللّٰه بنُ أبي الزِّيَادِ القدّاحِ المكيُّ عن أبي الزبير عن جابرِ بنِ عبدِ اللّٰه عَنْ رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه علی وسلم قَالَ: ذَكٰوةُ الجنينِ ذَكٰوةُ أمه.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنین کا ذبح کرنا اس کی ماں کا ذبح کرنا ہے۔

تشریح مع تحقیق :جَنِیْنَ. جَنٌّ سے ماخوذ ہے، اور جَنٌّ کے مادے میں ستر کے معنی پائے جاتے ہیں، جیسے: جُنّة بمعنی ڈھال، کیوں کہ اس سے انسان کا بدن چھپ جاتا ہے، ایسے ہی جَنَّتْ ہے اس کی تمام چیزیں بھی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں، تو بالکل اسی طرح جنین ہے یعنی ہر وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو جنین کہلاتا ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کرام کا ان کے سمجھنے میں زبردست اختلاف ہو گیا، دلائل دونوں فریقوں کے پاس ہیں، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کے دلائل زیادہ مضبوط و مستحکم ہیں، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر مفصل کلام معتبر کتب کی روشنی میں اہل علم کی خدمت میں پیش کریں۔

مسئلہ خلافیہ

(۱) اگر ماں کو ذبح کرنے کے بعد جنین زندہ نکلا اور اتنا وقت مل گیا جس میں ذبح کیا جا سکتا تھا اور پھر وہ مر گیا تو بالاتفاق حرام ہوگا۔

(۲) اسی طرح اگر ماں کو ذبح کرنے کے بعد مردہ ناقص الخلقت نکلا تو بھی بالاتفاق حرام ہے۔

(۳) اور اگر ماں کو ذبح کیا گیا پھر اس کے پیٹ سے ایسا بچہ نکلا جس میں تھوڑی سی رمق باقی تھی لیکن اتنا وقت نہیں ملا کہ اس کو مستقلاً ذبح کیا جا سکے اور وہ مر گیا۔

(۴) اسی طرح اگر ماں کو ذبح کرنے کے بعد تام الخلقت مردہ نکلا، تو ان دونوں صورتوں میں ائمہ ثلاثہ اور صاحبین جواز کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس جنین کا کھانا حلال ہے۔

اس کے برخلاف ابوحنیفہ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح پہلی دونوں صورتوں میں یہ جنین حرام ہے اسی طرح اخیر کی دونوں صورتوں میں بھی اس کا کھانا حرام ہے، شامی میں ہے:

إنّ الْجَنِيْنَ مُفْرَدٌ بِحُكْمِهِ ۞ لَمْ يَتَذَكَّ بِذَكَاةِ أُمِّهِ

حاصل یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک چاروں صورتوں کا یکساں حکم ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ وصاحبین کے نزدیک دو صورتوں میں جواز ہے اور دو میں عدم جواز، مذاہب کی تفصیل کے لیے دیکھئے۔

(المغنی لابن قدامہ: ۵۷۹/۹۔ البحر الرائق: ۳۱۲/۸، شامی: ۴۴۱/۹)

ائمہ ثلثہ اور صاحبین کے دلائل

(۱) عن أبی سعید قال: سالت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن الجنین؟ فقال: کلوہ إن شئتم. (ابوداؤد:۲/۳۹۱)

(۲) عن أبي سعید الخدري عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قالَ: ذکاۃ الجنین ذکاۃ أمہ. (ترمذی:۲/۲۷۲)

ان دونوں روایتوں سے ائمہ ثلثہ نے استدلال کیا ہے، پہلی روایت سے تو اس طور پر کہ حضور ﷺ نے صراحتاً ارشاد فرمایا کہ تم اس کو کھالو، جو حلت کی واضح دلیل ہے؛ اور دوسری روایت سے استدلال اس طرح کیا ہے کہ ”ذکاۃ الجنین ذکاۃ أمہ“ میں نیابت کے معنی ہیں، یعنی ذکاۃ الأم نائبۃ من ذکاۃ الجنین ، جیسے لسان الوزیر لسان الأمیر.

(۳) ذبح کی بنیاد طاقت اور وسعت پر ہے، جو بچہ ماں کے پیٹ میں ہے بندے کو اس کے ذبح کرنے پر صرف اتنی ہی قدرت ہے کہ وہ اس کی ماں کو ذبح کردے کیوں کہ پیٹ میں ذبح کرنا امرِ ناممکن ہے اور پیٹ سے نکلنے کے بعد یا تو زندہ رہتا ہے یا فوراً ہی مرجاتا ہے کہ اتنی دیر میں اس کو ذبح نہ کیا جاسکے۔ لہٰذا اس کو ذبح نہیں کیا جائے گا، اور اس کی حلت کے لیے اس کی ماں کا ذبح کردینا ہی کافی ہے، جیسے مثلاً اونٹ جب بدک جائے اور کسی طرح قابو میں نہ آئے، بھاگ جائے، تو اس کے نحر کی صورت صرف یہ ہے کہ جسم کے کسی حصے پر بھی زخم لگادے، کیوں کہ بندے کی وسعت میں یہ ہی ہے۔

(۴) جنین حقیقۃ وحکماً ماں کا جزء ہے، حقیقتاً تو اس لیے کہ ماں کی غذا سے وہ بھی غذا حاصل کرتا ہے اور حکماً اس لیے کہ جس طرح ماں کے فروخت کرنے کے بعد اس کے کسی جزء کا استثناء جائز نہیں اسی طرح جنین کا استثناء بھی جائز نہیں ہے، لہٰذا جب جنین حقیقۃ وحکماً ماں کا جزء ہے اور ماں کے تمام اجزاء کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تو جنین کو بھی الگ ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ وہ بھی تمام اجزاء کی طرح ایک جزء ہے۔

حنفیہ کے دلائل

(۱) قولہ تعالی: حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر، وما أھل لغیر اللّٰہ بہ والمنخنقۃ الخ

اس آیت کریمہ میں منخنقہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور جنین بھی منخنقہ ہے، کیوں کہ جب جنین کی ماں کو ذبح کیا جائے گا تو اس جنین کا سانس بند ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے اور یہ مرجاتا ہے، اور منخنقہ نام ہی

اس جانور کا ہے جو دم گھٹنے کی وجہ سے مرجائے، لہٰذا یہ قرآن کی اس آیت کی رو سے حرام ہے، اب اگر ہم اس کو حلال قرار دیں تو ایک کمزور حدیث کی وجہ سے کتاب اللہ پر زیادتی ہوگی، جو درست نہیں ہے۔

(۲) إنّ النبي صلى الله عليه وسلم قال لعدي بن حاتم: إذا وقعت رميتك في الماء فلا تأكل فإنّك لاتَدْرِيْ أن الماء قتلهُ ام سهمك . (ابوداؤد:۲/۳۹۳)

اس حدیث میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ جس کی موت کے دو سبب ہوں ایک سبب محرم ہو اور دوسرا سبب مبیح ہو، تو سبب محرم کو ہی راجح قرار دیا جاتا ہے، اور پھر اسی پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، جیسے مثلاً شکار کو تیر مارا اور وہ پانی میں گر گیا، اور پھر مر گیا تو اس کا کھانا حرام ہوگا، کیوں کہ اس میں دو سبب جمع ہو گئے، ایک تیر مارنا جو حلت کا سبب ہے، اور ایک پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے مرنا جو سبب حرمت ہے، لہٰذا اس جانور کو کھانا حلال نہیں ہوگا بعینہ یہ ہی صورت یہاں بھی ہے، اس لیے کہ معلوم ہی نہیں کہ ماں کے ذبح کرنے کی وجہ سے مرا ہے یا دم گھٹنے کی وجہ سے مرا ہے۔ (لیکن اس دلیل پر علامہ ظفر تھانوی نے اعلاء السنن میں اعتراض کیا ہے اور اس کو مسترد کر دیا، طول کی وجہ سے اس بحث کو چھوڑ جاتا ہے)

(۳) عن ابراهيم النخعي أنه قال: لا يكون ذكاة نفس ذكاة نفسين قال القاري اى لاحقيقة ولا حكماً. (کتاب الآثار: ص:۱۱۶)

اس میں صراحت ہے کہ ایک نفس کی ذکاۃ دو نفسوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی اور یہاں پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ جنین بھی ایک جاندار اور نفس ہے لہٰذا اس کی ماں کی ذکاۃ اس کے قائم مقام نہ ہوگی۔

(۴) حضور ﷺ نے مردہ جنین کو اپنے ارشاد "اَحلَّتْ لنا ميتتان ودمان" میں داخل نہیں کیا، اگر یہ حلال ہوتا تو اس کو داخل کیا جاتا۔

ائمہ ثلثہ اور صاحبینؒ کے دلائل کے جوابات

(۱) پہلی دلیل: کلوہ ان شئتم الخ کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں جنین سے مراد زندہ ہے، نہ کہ وہ جنین جو ماں کے پیٹ سے مرا ہوا نکلا ہو، اور مراد یہ ہے کہ اذبحوا و کلوہ إن شئتم، کیوں کہ بعض طبیعتوں کو ایسے بچے کے گوشت کے کھانے سے کراہت محسوس ہوتی ہے جس کی ابھی ابھی پیدائش ہو، اس لیے حضور ﷺ نے إنْ شِئْتُمْ کی قید لگا دی، رہا مسئلہ یہ کہ حضرت مسدد نے مردہ ہونے کی تصریح کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے کے قریب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّك مَيِّتٌ وإنهم ميتون.

(۲) دوسری دلیل: "ذكاة الجنين ذكاة اُمّه" کا جواب: جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے، اس کے

بارے میں حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دو طریقے سے مروی ہے، ایک یہ کہ بعض راویوں نے حدیث "ذكاة الجنين ذكاة أمه" کو نصب کے ساتھ روایت کیا ہے، اگر نصب والی روایت لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل میں یہ عبارت "ذكاة الجنين كذكاة أمه" ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ جنین کی ذکاۃ بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح ماں کی ذکاۃ فرض ہے، لہٰذا جس طرح ماں بغیر ذکوۃ کے حلال نہیں ہوتی اسی طرح جنین بھی بغیر ذکاۃ کے حلال نہیں ہوگا، نصب کی صورت میں تو یہی معنی متعین ہیں، اس کے علاوہ دوسرے معنی نہیں ہوسکتے۔

اور اگر اس روایت کو لیا جائے جس میں "ذكاة امه" مرفوع ہے، تو اس صورت میں بھی یہ توجیہ ہو جائے گی، کہ اگرچہ یہاں پر حرف تشبیہ تو مذکور نہیں لیکن یہ تشبیہ بلیغ ہے، جس میں مشبہ بہ کو مشبہ پر حمل کیا جاتا ہے اور حرف تشبیہ کو حذف کر دیتے ہیں، جیسے "زَيْدٌ أَسَدٌ" اصل میں "زَيْدٌ كَالْأَسَدِ" تھا، اس میں سے حرف تشبیہ کو حذف کر دیا گیا، اور لفظ "اسد" جو مشبہ بہ ہے، اس کو "زید" مشبہ پر حمل کر دیا گیا' اس کو تشبیہ بلیغ کہا جاتا ہے، اسی طرح ایک مثال ہے "سال ماءٌ لُجَيْنٌ" یہاں پر پانی کو پگھلی ہو چاندی سے تشبیہ دی گئی، حالاں کہ اس کو مرفوع پڑھا جاتا ہے۔ (حاشیہ البلاغۃ الواضحۃ: ۴۲)

اسی طرح ایک عربی شاعر کا شعر ہے:

فَعَيْنَاكِ عَيْنَاهَا وَجِيْدُكِ جِيْدُهَا
سِوٰى أَنَّ عَظْمَ السَّاقِ مِنْكِ دَقِيْقٌ

شاعر کو ایک ہرنی نظر آئی، تو اس نے ہرنی سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے ہرنی! تیری آنکھیں تو ایسی ہیں جیسی میری محبوبہ کی آنکھیں ہیں، اور تیری گردن ایسی ہے جیسے میری محبوبہ کی گردن ہے، سوائے اس کے کہ تیری پنڈلی کی ہڈی پتلی ہے، اور میری محبوبہ کی پنڈلی کی ہڈی موٹی ہے۔

اس شعر میں لفظ "فَعَيْنَاكِ" مشبہ ہے اور لفظ "عيناها" مشبہ بہ ہے، لیکن شاعر نے مشبہ بہ کو مشبہ پر حمل کیا، اور حرف تشبیہ کو ذکر نہیں کیا، اسی کو تشبیہ بلیغ کہتے ہیں، اسی طرح حدیث باب "ذكاة الجنين ذكاة أمه" میں تشبیہ بلیغ ہے، یعنی جنین کی بھی ذکاۃ ماں کی ذکاۃ کی طرح ہے۔ جس طرح ماں کو ذبح کیا جائے گا اسی طرح جنین کو بھی ذبح کیا جائے گا۔

حنفیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ حدیث باب کی جو تشریح کرتے ہیں وہ یہاں درست نہیں بنتی عربی زبان کے قواعد کے خلاف ہے، کیوں کہ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ ماں کی ذکاۃ جنین کی ذکاۃ کے قائم مقام ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جنین کی ذکاۃ اصل ہوئی، اور ماں کی ذکاۃ اس کے قائم مقام ہوئی، یعنی ماں کی ذکاۃ نائب ہوئی اور جنین کی ذکاۃ منوب عنہ ہوئی، اور عام طور پر محاورات میں نائب کو منوب عنہ پر حمل نہیں کیا جاتا، بلکہ منوب عنہ کو نائب پر حمل

کیا جاتا ہے، لہٰذا جملے میں نائب مبتدا واقع ہوتا ہے خبر واقع نہیں ہوتا، جیسے ایک دوسری حدیث میں حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مَنْ کان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة" کہ امام کی قرات مقتدی کی قرات کی نائب ہوتی ہے۔ اس حدیث میں امام کی قرات کو مبتدا، بنایا اور مقتدی کی قرات کو خبر بنایا، اور منوب عنہ کو نائب پر حمل کیا، نہ کہ نائب پر منوب عنہ کو۔ لہٰذا اگر حدیث باب میں آپ کی بیان کردہ تشریح کو درست مان لیں، تو اس صورت میں ذکوٰۃ أمہ جو نائب ہے کو منوب عنہ پر حمل کرنا لازم آئے گا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں قلب لازم آئے گا، اور تشبیہ بلیغ کی صورت میں معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔

اس کو آسان لفظوں میں یوں تعبیر کر لیجئے کہ اگر کہیں پر نیابت مراد ہوتی ہے تو نائب کو مقدم کیا جاتا ہے اور منوب عنہ کو مؤخر کیا جاتا ہے، اور اگر تشبیہ مراد ہو تو مشبہ کو مقدم کیا جاتا ہے اور مشبہ بہ کو مؤخر کیا جاتا ہے، اب عبارت میں دیکھئے کہ اگر ہم نیابت مراد لیں تو ''ذکوۃ أمہ'' نائب ہے اور ''ذکوۃ الجنین'' منوب عنہ ہے تو قاعدے کے اعتبار سے عبارت یوں ہونی چاہیے: "ذکاۃ أمہ ذکاۃ الجنین" اور یہ کلام نبوی میں قلب کرنا ہے تشبیہ مراد لینے میں کوئی خرابی نہیں کیوں کہ ''ذکوۃ الجنین'' مشبہ ہے، اور ''ذکاۃ امہ'' مشبہ بہ ہے اور مشبہ مشبہ بہ سے مقدم ہوتا ہے، لہٰذا عبارت اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہوگئی اور حدیث پاک پر بھی عمل ہو گیا۔

چلو! ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہاں نیابت ہی مراد ہے تو بھی قرآن کی آیت ''حرمت علیکم المیتۃ الخ'' کے مقابلہ میں خبر واحد کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، جب کہ یہ حدیث بھی گیارہ طریق سے مروی ہے لیکن ہر طریق میں ضعف پایا جاتا ہے اگر تعدد کی بنیاد پر حسن درجہ کی ہو تب بھی قرآن کی آیت کے مقابلہ میں مرجوح ہوگی۔

ائمہ ثلاثہ کی تیسری دلیل کا جواب

ائمہ ثلثہ نے بھاگے ہوئے اونٹ پر قیاس کیا ہے لیکن ان کا یہ قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اونٹ میں ذبح شرعی (اختیاری یا اضطراری) حاصل ہو گیا، کیوں کہ مقصود ہی ذبح سے دم مسفوح کا بہانا ہے، بخلاف ''ذکوۃ الجنین'' کے کہ اس میں ماں کے ذبح کرنے سے جنین سے خون نہیں بہا، جو اصل مقصود ہے لہٰذا یہ قیاس کرنا درست نہیں۔

ائمہ ثلثہ کی چوتھی دلیل کا جواب

ان حضرات نے جنین کو دوسرے اجزاء کی طرح ایک جز شمار کیا تھا، یہ شمار کرنا ہی صحیح نہیں، کیوں کہ دوسرے اجزاء میں تو انفصال کے بعد زندہ رہنے کا وہم بھی پیدا نہیں ہوتا اور جنین بسا اوقات ماں کے ذبح کرنے کے بعد

زندہ نکل آتا ہے، رہا یہ کہ وہ ماں کے پیٹ میں رہ کر ہی غذا حاصل کرتا ہے، تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بغیر غذا کے ہی رکھتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے غذا پہنچاتا ہے ہمیں اس کا صحیح علم ہی نہیں ہے۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ماں کی غذا سے ہی غذا حاصل کرتا ہے تو بھی یہ ماں کا جزء نہیں ہوگا، غذا حاصل کرنا جزء ہونے کی دلیل نہیں، کیوں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی تو وہ ماں کے دودھ سے ہی غذا حاصل کرتا ہے، حالاں کہ اس وقت بحکم جزء نہیں رہتا، اور نہ ہی اس وقت اس کی جزئیت کا کوئی قائل ہے، بلکہ بالاتفاق اس کو ذبح کرنا ضروری ہوتا ہے اگر جزئیت ہی ماننی ہے تو یہاں بھی جزئیت مان کر ماں کے ذبح کو کافی قرار دو۔

جہاں تک بیع میں استثناء کرنے کا حکم ہے کہ بیع میں استثناء کرنا جائز نہیں تو یہ ایک معنوی حکم ہے، جس پر ذبح کو قیاس کرنا باطل ہے، کیوں کہ ذبح ایک حسی حکم ہے، حسی حکم کو حسی پر تو قیاس کیا جاسکتا ہے لیکن حسی پر معنوی کو یا معنوی پر حسی کو قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

مسلک حنفی راجح ہے

علامہ شوکانیؒ اور ابن حزم وغیرہ نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ پر بڑا طعن کیا ہے یہاں تک کہہ دیا کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلہ میں اجماع امت کے خلاف قدم اٹھایا ہے، اسی وجہ سے صاحبینؒ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، لیکن یہ بے بنیاد بات ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں۔ امام ابوحنیفہ جیسی شخصیت کے بارے میں ان حضرات کا اس طرح کا کلام کرنا انتہائی "ضیق صدر" کی دلیل ہے، حق یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے جیسا اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے ایسا کسی کو سمجھنے کی توفیق ہی نہیں ملی اگر ان کا فہم وادراک وہاں تک رسائی کرتا تو ہرگز امام صاحب کے بارے میں ایسے جملے نہ کہتے، امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلہ میں درحقیقت قرآنی آیات اور احادیث شریفہ دونوں پر ہی شاندار طریقہ سے عمل کیا ہے، ہم ذرا ایسے حضرات سے جن کا سینہ امام اعظمؒ کے مقام عالی کے لیے تنگ ہے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے اس حدیث کے عموم پر عمل کیا ہے؟ ارے آپ نے تو اس حدیث کے عموم پر بھی عمل نہیں کیا اور قرآنی آیت پر بھی عمل نہیں کیا، اگر حدیث کے عموم پر عمل کرتے تو پھر جو جنین ناقص الخلقت پیدا ہوا اس کو بھی حلال قرار دو، یا جو جنین پیدا ہونے کے اتنی دیر بعد مرے جتنی دیر میں ذبح ہوسکتا تھا تو اس کو بھی حلال قرار دو، کیوں کہ حدیث تو عام ہے ہر قسم کے جنین کو شامل ہوگی۔

اس لیے حنفیہ کا مسلک ہی راجح ہے، کہ انہوں نے قرآنی آیات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا ہے، نہ حدیث کو چھوڑا اور نہ ہی قرآنی آیات کو چھوڑا۔ (اس مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھئے: بذل المجہود: ۸۲/۴، اعلاء السنن: ۷۰/۱۷، المغنی لابن قدامہ: ۵۷۹/۸، البحر الرائق: ۳۱۲/۸، فتاوی شامی: ۴۴۱/۹، بدائع الصنائع: ۱۵۹/۴، شرح المہذب: ۱۲۸/۹، محلی: ۴۲۰/۷۔ ہدایہ ۴/۴۴۴)

﴿بابُ اللّحمِ لايَدْرِیْ أذُكِرَ اسمُ اللّٰه عليه أمْ لاَ﴾

جس گوشت پر بسم اللہ پڑھنا اور نہ پڑھنا معلوم نہ ہو اس کا بیان

۱۷۹ ﴿ حدثنا موسٰی بنُ إسمعيلَ نا حَمّادٌ ح وحدثنا القعنبيُّ عَن مالكٍ ح وحدثنا يوسفُ بنُ موسٰی قال حدثنا سليمانُ بنُ حيّانَ و محَاضِرٌ الْمَعْنٰی عَنْ هشام بنِ عروةَ عَنْ أبيه عَنْ عائشةَ ولَمْ يذكرا عَنْ حمّادٍ ومالكٍ عَنْ عائشة أنَّهُمْ قَالُوا : يا رسولَ الله ! إنَّ قَوْماً حَدِيثُوا عهدٍ بجَاهِلِيَّةٍ يَأْتُوْنَ بلُحْمانٍ ، لاَنَدرِيْ أَذَكَرُوْا إسمَ اللّٰه علَيهَا أَمْ لَمْ يَذْكُرُوا أَ نأكُلُ مِنْها؟ فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : سَمُّوا اللّٰه وَكُلُوْا.﴾

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں (لوگوں) نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! چند قومیں ہیں جو تازہ ایمان لائی ہیں (جاہلیت کے زمانے سے قریب ہیں) وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ وہ ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں یا نہیں؟ تو کیا ہم اس سے کھالیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم خدا کا نام لے کر کھالیا کرو۔

تشریح مع تحقیق : أنهم قالوا: یہاں قالوا سے مراد صحابہ ہیں، جو حضور ﷺ کے پاس ہی رہتے تھے، یا آپ ﷺ کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔

قوماً: سے مراد مدینہ کے قرب وجوار کے دیہاتی لوگ ہیں۔

حديثوا عهدٍ بجاهلية: مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، معلوم نہیں سارے اسلامی احکام سے واقف ہیں یا نہیں؟۔

لُحمان: یہ "لحم" کی جمع ہے بمعنی گوشت، بخاری کی روایت میں مفرد کا لفظ ہی ہے۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گوشت لائے، جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھی ہے یا نہیں؟ لیکن وہ مسلمان ہے تو اس کے گوشت کو قبول کرلیا جائے گا، کیونکہ مؤمنوں کے ساتھ اچھا گمان رکھنا چاہئے، البتہ اگر شک پیدا ہو رہا ہے کہ اس نے پڑھا یا نہیں تو اس صورت میں اطمنان قلب کے لئے بسم اللہ پڑھ لو، علامہ ابن التین نے فرمایا ہے کہ یہاں تسمیہ سے مراد تسمية عند الأكل ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں اگر انہوں نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو تو تمہارا پڑھنا اس کے قائم مقام ہو جائے گا، کیونکہ

بسم اللہ پڑھنا تو شرط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسن ظن کی وجہ سے اس گوشت کو کھالیا جائے گا، اور یہ کہا جائے گا کہ جب مسلمان نے ذبح کیا ہے یقینی طور پر اس نے بسم اللہ پڑھی ہوگی۔ (مرقاۃ ۱۱۱/۸)

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ایک مسئلہ تحریر فرمایا ہے کہ مسلم مارکیٹ میں جو گوشت بیچا جاتا ہے وہ صحت پر ہی محمول ہوگا، اسی طرح دیہاتی مسلمانوں کا ذبیحہ بھی حلال ہوگا، کیونکہ غالب گمان یہ ہی ہے کہ انہوں نے اس پر بسم اللہ پڑھی ہوگی، علامہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ جس جانور کو مسلمان ذبح کرے اس کو کھانا حلال ہوگا، اور یہ نہیں خیال کیا جائے گا کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی ہوگی لأن المسلم لا يظن به فى كلّ شيئ إلا الخير حتى يتبين خلاف ذلك. (فتح الباری شرح بخاری: ۷۹۳/۷)

ترجمة الباب: اس طرح ثابت ہے کہ باب کا مقصد یہ تھا کہ جس ذبیحہ کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ اس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہے یا نہیں پڑھی گئی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اب اس حدیث کو لا کر اس کا حکم بیان کردیا کہ جائز ہے۔

﴿باب فى العتيرة﴾

عتیرہ (رجب کی قربانی) کا بیان

۱۸۰ ﴿حَدَّثَنَا: مسدّد ح و حدثنا نصر بنُ عليٍّ عن بشر بنِ المفضَّلِ الْمَعْنٰى قال حدثنا خالد الحذاء عن أبي قلابةَ عن أبي المليحِ قال: قال نُبَيْشَةُ: نَادىٰ رجلٌ رسولَ اللّٰه صلى الله عليه وسلم إنّا كنّا نَعْتِرُ عَتِيرَةً فى الجاهليّةِ فى رجب فَمَا تَأمُرُنَا؟ قال: اذْبَحُوا لِلّٰه في أىّ شهرٍ كانَ، وبَرُّوا الله، واطْعِمُوا، قالَ قالَ: إنّا كنّا نفرِعُ فَرَعاً في الجاهليّةِ، فما تأمُرُنَا؟ قال: فى كلّ سَائمة فَرَعٌ، تَغْذُوهُ مَاشِيَتُكَ حتى إذَا اسْتَحْمَلَ، قال نصرٌ: اسْتَحْمَلَ للحجيجِ ذَبَحْتَهُ، فتَصَدَّقْتَ بِلَحْمِهِ، قال خالد: أحْسَبُهُ، قال على ابنِ السَّبِيلِ فإنَّ ذٰلِكَ خَيرٌ، قال خَالِدٌ: قلتُ لأبى قلَابَةَ: وكَمِ السَّائِمَةُ؟ قال: مائَةٌ.﴾

ترجمہ: ابوملیح روایت کرتے ہیں کہ نبیشہ نے کہا کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کو آواز دی، اور کہا ہم زمانہ جاہلیت میں رجب میں جانور ذبح کرتے تھے، آپ ﷺ اس وقت ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نام پر ذبح کرو، خواہ کسی بھی مہینے میں ہو، اور اللہ کے لئے نیکی کرو، اور فقراء و مساکین کو کھلاؤ، نبیشہ

کہتے ہیں کہ اس آدمی نے عرض کیا کہ ہم دور جاہلیت میں فرع ذبح کیا کرتے تھے، اب آپ اس کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر سائمہ میں ایک فرع ہے، جس کو تمہارا چوپایا غذا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ بوجھ اٹھانے کے لائق ہو جائے، (دوسرے راوی) نصر نے کہا کہ یہاں تک کہ وہ جمل ہو جائے، اور حاجیوں کو سوار کرنے کے قابل ہو جائے، تو تم اس کو ذبح کرو، اور اس کا گوشت صدقہ کرو، خالد نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ابوقلابہ نے کہا کہ مسافروں پر صدقہ کردو، اس لئے کہ وہ ہی بہتر ہے، خالد نے ابوقلابہ سے پوچھا کہ کتنے جانوروں میں ایسا کرے، انہوں نے کہا کہ سو جانوروں میں۔

تشریح مع تحقیق عتیرة: (ض) ذبح کرنا، "عتیرہ" "فعیلہ" کے وزن پر ہے وہ جانور جس کو ذبح کیا جائے، زمانہ جاہلیت میں ماہ رجب میں بتوں کی تعظیم کے لئے ایک جانور ذبح کرتے تھے اس کو عتیرہ کہا جاتا تھا، اور چونکہ یہ رجب میں کرتے تھے اس لیے اس کو رجبیہ کہا جاتا تھا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۳/۵۸۴، ترمذی شریف: ۱/۱۸۲)

فَرَع: اس کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں (۱) جاہلیت کے زمانے میں یہ رواج تھا کہ جب کسی کی اونٹنی پہلا بچہ جنتی تو وہ لوگ اس پہلے بچے کو اپنے بتوں کے نام پر قربان کیا کرتے تھے لیکن جب اسلام آیا تو بتوں کے نام پر قربانی بند ہو گئی لیکن پھر اللہ کے نام پر اس پہلے بچے کو ذبح کیا کرتے تھے، اس کو ہی "فرع" کہتے تھے۔

(۲) اکثر اہل لغت کہتے ہیں کہ اونٹنی سے جو پہلا بچہ پیدا ہوتا تھا اس کو نسل میں برکت کے عقیدے کی وجہ سے ذبح کیا جاتا تھا اس کو "فرع" کہتے تھے۔

(۳) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اونٹ کی پہلی مرتبہ جفتی کرنے سے جو بچہ پیدا ہوتا تھا اس کو فرع کہتے تھے، خواہ اونٹنی کا پہلا بچہ ہو یا دوسرا۔

(۴) بعض حضرات نے یہ کہا کہ جب اونٹوں کی تعداد سو (۱۰۰) ہو جاتی تھی پھر اس کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا تھا اس کو ذبح کیا جاتا تھا اسی کا نام "فرع" ہوتا تھا، اس قول کی تائید حدیث میں ابوقلابہؓ کے قول: "مائة" سے ہوتی ہے۔

اسْتَحْمَلَ: (استفعال) جب وہ بوجھ اٹھالے، یعنی بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے، اور اس سے دور دراز کا سفر کرنا ممکن ہو جائے۔

استحمَلَ: (استفعال) أي صار جملاً یعنی اونٹ ہو جاوے، اور اس پر حاجی لوگ سفر کر سکیں، یہاں اس کی طاقت اور قوت کو بتلانا ہے کہ وہ ایسا جوان اور طاقت ور ہو جائے کہ اس سے سفر حج کیا جا سکے۔

علی ابن سبیل: ماقبل میں ذکر کیا تھا کہ اس کے گوشت کو صدقہ کر دیا جائے لیکن خالد کو یہ شک ہوا کہ میرے استاذ ابوقلابہ نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ اس گوشت کو مسافروں پر صدقہ کیا جائے، یا مطلقاً صدقہ کرنے کا قول

ذکر کیا تھا، اس کا یہی مطلب ہے۔

کم السائمة : یعنی ایسے کتنے سائمہ جانوروں کا ہونا ضروری ہے جس میں "فرع" ہوتا ہے؟ ابوقلابہ نے جواب دیا کہ سو جانور ہوں تو فرع ہوتا ہے، اس سے چوتھے قول کی تائید ہوتی ہے۔

﴿مسئلة خلافية﴾

عتیرہ اور فرع سے متعلق تین قسم کی روایات ثابت ہیں، ایک تو وہ روایات جن سے وجوب ثابت ہوتا ہے جیسے حضرت عائشہ کی روایت: أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بالفرعة من كلّ خمسين واحدة. ایسے ہی باب الاضحیہ کی پہلی حدیث جس میں ہے "على أهل كلّ بيت فى كل عامٍ أضحية و عتيرة. (ابوداؤد)

دوسرے وہ احادیث ہیں جن سے صرف اباحت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حارث بن عمرو کی روات میں ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من شاء عتر ومن شاء لم يعتر ، ومن شاء فرع ومن شاء لم يفرع.

تیسرے وہ روایات ہیں جن سے حرمت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: إن النبي صلى الله عليه وسلم قال:لافرع ولاعتيرة. (ابوداؤد)

اب ان روایات میں کیسے تطبیق دی جائے؟ اس سلسلے میں فقہاء کرام کے مابین اختلاف ہوگیا، چنانچہ امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ نے اس طرح تطبیق دی کہ جن احادیث سے حرمت ثابت ہوتی ہے، ان کو عدم وجوب پر محمول کرلیا جائے اور کہا جائے کہ "لافرع واجب ولاعتيرة واجبة" اور جن روایات سے اباحت ثابت ہوتی ہے ان میں تاویل کی ضرورت ہی نہیں۔ اس اعتبار سے امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ استحباب کے قائل ہیں۔

لیکن باقی جمہور فرماتے ہیں کہ جو روایات وجوب اور اباحت کو ثابت کرتی ہیں وہ سب منسوخ ہیں، اور جو روایات ممانعت کو ثابت کرتی ہیں وہ ناسخ ہیں، اس اعتبار سے جمہور علماء کے نزدیک فرع اور عتیرہ غیر مشروع ہے۔

فریق اول کے دلائل

(۱) عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الفرع حق.

(۲) عن مِخْنَف بن محمد قال: كنّا وقوفاً مع النبى صلى الله عليه وسلم بعرفة، فسمعته يقول : ياأيها الناس على أهل كل بيت في كل عام أضحية وعتيرة.

(۳) حديث حارث بن عمرو : أنه لقي رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع، فقال رجل : يا رسول الله! العتائر والفرائع؟ قال : من شاء عتر ومن شاء لم يعتر ومن شاء فرع ومن شاء لم يفرع.

فریق ثانی کے دلائل

(۱) عن أبی هریرۃؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : لافرع ولاعتیرۃ.
(۲) حضور ﷺ کی وفات کے بعد کسی صحابی سے بھی فرع اور عتیرہ کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

فریق اول کے دلائل کے جوابات

(۱) حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث ناسخ ہے، لہذا فرع اور عتیرہ کی مشروعیت اور استحباب منسوخ ہوگیا، اسی طرح صحابہؓ کا آپ ﷺ کی وفات کے بعد عمل نہ کرنا بھی منسوخ ہونے کی واضح دلیل ہے۔
لیکن علامہ شوکانیؒ نے اس جواب یعنی نسخ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جب احادیث کا مقدم اور مؤخر ہونا ثابت نہیں تو نسخ کا دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔
لیکن ابن منذر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اہل عرب فرع اور عتیرہ پہلے کیا کرتے تھے، بعض مسلمانوں نے بھی شروع زمانہ اسلام میں کیا، لیکن پھر منع کردیا گیا، کیونکہ نہی کا وجود کسی شئ کے فعل کے بعد ہی ہوتا ہے، ایسا آج تک نہیں ہوا کہ پہلے نہی وارد ہوا اور بعد میں فعل کی اجازت ہوئی ہو، اس لئے یہ ہی معنی متعین ہیں کہ پہلے فرع کیا جاتا تھا بعد میں منع کردیا گیا، لہذا نسخ کا دعویٰ کرنا بالکل صحیح ہے۔ (بذل ۴/۸۵، تکملہ فتح الملہم ۳/۵۸۴، فتح الباری ۷/۴۷۶)
اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے حرمت عارض ہے اور اصل مقدم ہوتی ہے عارض پر، لہذا معلوم ہوا کہ عتیرہ اصلاً مباح تھا بعد میں اس کی مشروعیت ختم کردی گئی، قواعد الفقہ میں یہ قاعدہ موجود ہے:
الأصل فی الأشیاء الإباحة. (قواعد الفقہ ص۵۹)
(۲) جب کسی چیز کی حلت اور حرمت میں تعارض ہوجائے تو اس وقت حرمت کو ہی مقدم کیا جاتا ہے: إذا اجتمع الحلال والحرام، أو المحرّم والمبیح، غُلِّبَ الحرام والمحرم. (قواعد الفقہ: ص۵۵)

۱۸۱ ﴿حَدَّثَنا أحمد بنُ عبدةَ قال أخبرنا سفیانُ عَن الزهریِّ عَن سعیدٍ عن أبی هُریرةَ أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم قال : لَا فَرَعَ وَ لَا عَتِیرَةَ .﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (اسلام میں) فرع اور عتیرہ نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق : یہ روایت جمہور کی مستدل ہے کہ اب فرع اور عتیرہ مشروع نہیں ہے جیسا کہ ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

۱۸۲ ﴿حدثنا : الحسن بنُ علیٍّ قال نا عبدُالرزاق قال أخبرنا معمرٌ عَن الزهریِّ عَن

سعيدٍ قال : الفَرَعُ أَوَّلُ النَتاجِ كانَ يَنتجُ لَهُم ، فيذْبَحُونَهُ .﴾

ترجمہ: حضرت سعید بن میتب کہتے ہیں کہ فرع پہلے بچے کو کہتے ہیں، جس کو وہ ذبح کرتے تھے۔

تشریح مع تحقیق: یہ حضرت سعید بن میتب نے فرع کی تعریف کی ہے، فرع کی تعریف سے متعلق ہم باب کے شروع میں مختلف اقوال ذکر کر چکے ہیں۔

۱۸۳ ﴿حدَّثَنا موسٰی بنُ إسمٰعِيلَ قال نا حَمَّادٌ عَنْ عَبْدِاللّٰه بنِ خَيثَم عَنْ يوسفَ بنِ مَاهَكَ عَنْ حَفْصَة بنتِ عبدِالرحمن عَنْ عائشة قالَتْ : أَمَرَنَا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم مِنْ كُلِّ خَمْسِينَ شَاةً شاةٌ ، قال أبوداؤد : قال بعضُهم : الفَرَعُ أَوَّلُ مَا تُنتجُ الإبلُ كانوا يَذْبَحُونَهُ لِطوَاغِيتِهِمْ ثُمَّ ياكُلُهُ ، ويُلْقِىُ جِلْدَهُ عَلى الشجرِ ، والعَتِيرَةُ فِي العِشرِ الأوَّلِ مِنْ رَجبٍ.﴾

ترجمہ : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے پچاس بکریوں میں سے ایک بکری کاٹنے کا حکم دیا، (غریب اور مسکینوں کے لئے) ابوداؤد کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے فرع کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اونٹ کا سب سے پہلا بچہ جب پیدا ہوتا تھا تو کفار اس کو بتوں کے نام پر ذبح کر کے کھالیتے تھے، اور اس کی کھال کو درخت پر ڈال دیتے تھے، اور عتیرہ اس کو کہتے ہیں، جس کو رجب کے پہلے عشرہ میں ذبح کرتے تھے۔

تشریح مع تحقیق : مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب عتیرہ جائز تھا اور فرع بھی جائز تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ہر پچاس بکریوں میں ایک بکری اللہ کے نام پر ذبح کرنے کا حکم فرمایا، جمہور اس حدیث کو منسوخ مانتے ہیں جیسا کہ مفصل گزر چکا ہے، امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کے ذیل میں فرع اور عتیرہ کی تعریف بھی ذکر کی ہے، ماقبل میں یہ سب تعریفیں ہم لکھ چکے ہیں۔

ترجمة الباب : اس باب میں صرف چار روایتیں پیش کی گئی ہیں، اور چاروں کا باب سے ربط بالکل واضح ہے۔

﴿ بَاب في العقيقة ﴾

عقیقہ کا بیان

۱۸۴ ﴿حَدَّثَنا مسدَّد قال نا سُفيانُ عن عَمرو بنِ دينارٍ عن عطاءٍ عن حبيبةَ بنتِ مَيْسَرةَ عَن أمِّ كُرزٍ الكَعْبِيَّةِ قالَتْ : سمعتُ رسولَ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يقولُ : عَنِ

الغُلامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ ، وعَنِ الجارِيَةِ شَاةٌ ، قال أبوداؤد : سمعتُ أحمدَ قال : مُكافِئتَانِ مُستَوِيانِ أو مُتقَارِبَتَانِ.﴾

ترجمه: حضرت ام کرز کعبیہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (عقیقہ میں) لڑکے کی طرف سے برابر کی دو بکریاں، اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (ہوتی ہے) امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ نے مکافئتان کے معنی بتلائے ہیں کہ وہ عمر میں برابر کی ہوں یا عمر میں قریب قریب ہوں۔

تشریح مع تحقیق : عقیقۃ : "عَقّ" سے ماخوذ ہے بمعنی کاٹنا، اسی سے عقوق الوالدین ہے، "عقوق المولود" بچے کے وہ بال جو ساتویں دن کاٹے جاتے ہیں، اس بارے میں اہل لغت کا اختلاف ہے کہ عقیقہ کا اطلاق کس پر ہوتا ہے؟ اصمعیؒ فرماتے ہیں کہ عقیقہ کا اطلاق بچے کے سر کے بالوں کے کاٹنے پر ہوتا ہے، اور مذبوحہ بکری کو مجازاً عقیقہ کہا جاتا ہے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جس بکری کو ذبح کیا جاتا ہے اسی کو ہی اصل میں عقیقہ کہا جاتا ہے، اور یہ معنی مراد لینا ہی زیادہ اچھا ہے۔ (تفصیل: فتح الباری: ۷/۳۲ ۷)

عقیقہ کی شرعی حیثیت

عقیقہ کی شرعی حیثیت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، جسکی مختصر وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(۱) ابن حزم کہتے ہیں کہ عقیقہ کرنا فرض ہے۔

(۲) ائمہ ثلثہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ عقیقہ کرنا سنت مؤکدہ ہے، اگرچہ امام احمدؒ کا ایک قول وجوب کا بھی ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہؒ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ عقیقہ کرنا مستحب ہے جو سنت سے ثابت ہے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف بہت سے لوگوں نے یہ نسبت کی ہے وہ عقیقہ کو بدعت کہتے ہیں، یہ امام صاحبؒ پر افتراء ہے، مشہور حنفی مجتہد حضرت امام محمدؒ نے اپنی کتاب "موطا" میں لکھا ہے "کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ عقیقہ اصل میں زمانۂ جاہلیت کی رسم تھی، جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی رائج رہی، مگر پھر قربانی نے ہر اس ذبح (کے وجوب) کو منسوخ کر دیا جو قربانی سے پہلے رائج تھا، رمضان کے روزوں نے ہر اس روزے (کے وجوب) کو منسوخ کر دیا جو پہلے سے رائج تھا، زکوۃ نے ہر اس صدقہ (کے وجوب) کو منسوخ قرار دیا جو اس سے پہلے رائج تھا" اس لئے امام صاحب کا اصل قول استحباب کا ہی ہے۔

ابن حزم کی دلیل

قوله عليه الصلاة والسلام: مع الغلام عقيقة، فاهريقوا عنه دماً واميطوا عنه الأذىٰ. (ابوداؤد ص ۲/۳۹۲) حضور علیہ السلام نے امر فرمایا ہے جس سے فرضیت ثابت ہوتی ہے۔

ائمۂ ثلاثہ کی دلیل

أنه صلى الله عليه وسلم أمر بتسمية المولود يوم سابعة ووضع الأذیٰ عنه. (ابوداؤد۲/۳۹۲؛ اوجزالمسالک:۴/۲۷۳)

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل

قوله عليه الصلاة والسلام: من أحب منكم أن ينسك عن ولده فليفعل. (اوجزالمسالک:۴/۲۷۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد استحباب پر ہی دلالت کرتا ہے، کیونکہ یہاں عقیقہ کرنے کو بندے کی مشیت پر چھوڑ دیا گیا ہے، اگر سنتِ مؤکدہ ہوتا تو پھر مشیت پر معلق نہ کیا جاتا۔

فریقین کے دلائل کا مشترکہ جواب

عقیقہ کی فرضیت، وجوبیت اور سنیت اضحیہ کو واجب کرکے منسوخ کردی گئی ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان کے روزوں نے تمام روزوں (کی وجوبیت) کو منسوخ کردیا، اور اضحیہ نے ہر ذبح کو منسوخ کردیا، اور غسل جنابت نے ان تمام غسلوں کو منسوخ کردیا جو پہلے کئے جاتے تھے، اور ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یہ ارشاد آپ ﷺ سے سنکر ہی فرمایا ہوگا، اس لئے کہ کسی حکم کا منسوخ ہونا اجتہاد سے معلوم نہیں ہوتا، پھر آپ ﷺ سے مرفوعاً منقول ہے: من شاء فعل ومن شاء لم يفعل. (اوجزالمسالک۴/۲۷۳)

اس حدیث کے ذیل میں ایک اختلافی مسئلہ اور آتا ہے، اس کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے۔

﴿مسئلة خلافية﴾

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عقیقہ میں لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری ہی ذبح کی جائے گی، لڑکے کی طرف سے دو بکریوں کا ذبح کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

ائمہ ثلثہ امام اعظمؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری عقیقہ میں ذبح کی جائے گی۔

فریق اول کی دلیل

عن ابن عباس أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عَقَّ عَنِ الحسن والحسين كبشاً كبشاً. (ابوداؤد۲/۳۹۲)

فریق ثانی کی دلیل

عن أم كرز الكعبيةؓ قالت: سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : عن الغلام شاتان و مكافئتان وعن الجارية شاة. (ابوداؤد/۲/۳۹۱)

فریق اول کی دلیل کا جواب

(۱) اگرچہ ایک بکری کی روایت بھی صحیح ہے، لیکن زیادہ مضبوط اور زیادہ صحیح وہ ہی روایت ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''لڑکے کے عقیقہ میں دو بکریاں ذبح کی جائیں'' کیونکہ اس حدیث کو صحابہ کی پوری جماعت نے روایت کیا ہے۔

(۲) ایک بکری ذبح کرنا آپ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے اور دو بکریاں ذبح کرنا آپ ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے، اور ظاہر ہے کہ جو چیز قول سے ثابت ہوتی ہے وہ فعل سے ثابت شدہ چیز سے کہیں زیادہ مضبوط اور کہیں زیادہ مکمل سمجھی جاتی ہے، کیونکہ فعل کے بارے میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص حالت سے متعلق ہو، جبکہ قول میں عمومیت اور اکملیت ہوتی ہے، اور فعل تو محض جواز پر دلالت کرتا ہے، قول سے جواز کے ساتھ استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔

(۳) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ لڑکے کے حق میں استحباب کا کم سے کم درجہ ایک بکری کا ہونا ہے اور کمال استحباب دو بکریوں کا ہونا ہے، اس لئے احتمال ہے کہ ایک بکری والی روایت کم سے کم درجہ پر اکتفار کرنے کے جواز پر محمول ہے۔

(۴) یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے ایک بکری تو پیدائش کے دن ہی ذبح کردی ہو اور ایک بکری ساتویں دن ذبح کی ہو، اس تاویل کی صورت میں روایات میں تطبیق ہو جائے گی۔

(۵) یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے تو بذات خود دونوں (حسنؓ اور حسینؓ) کی طرف سے ایک ایک مینڈھا ہی ذبح کیا ہو اور دوسرے کا حکم حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو دیا ہو، تو گویا ایک مینڈھا ذبح کرنے کی نسبت حضور ﷺ کی طرف حقیقت کے اعتبار سے ہے، اور جس روایت میں دو بکریوں یا دو دنبوں کو ذبح کرنے کی نسبت کی گئی ہے وہ مجازاً ہے۔ (مرقاۃ: ۸/۱۵۵، اوجز المسالک: ۴/۲۷۹، مظاہر حق: ۵/۶۹)

قوله مكافئتان : اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، چنانچہ زید بن اسلمؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں بکریاں شکلاً ایک دوسری کے متشابہ ہوں، امام خطابیؒ کہتے ہیں کہ دونوں کا عمر میں برابر ہونا مراد ہے، امام ترمذیؒ نے کہا کہ فربہ اور لاغر ہونے میں ایک دوسرے کے مساوی ہوں۔

ترجمة الباب: حدیث شریف سے ترجمۃ الباب واضح ہے کیونکہ باب کا مقصد عقیقہ سے متعلق احکام بتلانا ہے، اور روایت میں بھی عقیقہ سے متعلق حکم یعنی لڑکی کی طرف سے ایک بکری اور لڑکے کی طرف سے دو بکری ذبح ہونی چاہئیں بیان کیا گیا ہے۔

۱۸۵ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ قال نا سفيانُ عَن عُبيدِ اللّٰهِ بنِ أبِي يَزِيدٍ عَن أبِيْهِ عن سبَاع بنِ ثابتٍ عن أُمِّ كُرزٍ قالت : سمعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يقولُ : أَقِرُّوا الطَيرَ على مَكِنَاتِهَا ؟ قالتْ : وسمِعْتُه يقول : عَنِ الغُلَامِ شَاتَانِ وعَنِ الجَارِيَةِ شاةٌ ، لايَضُرُّكُم أذكراناً كُنَّ أمْ أناثاً.﴾

ترجمہ: حضرت ام کرزؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا رہنے دو، اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ (عقیقہ میں) لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہے، اور تم کو اس میں کوئی نقصان نہیں کہ وہ نر ہوں، یا مادہ ہو۔

تشریح مع تحقیق : أقِرّوا الطَيرَ علیٰ مَكِنَاتِهَا : اس جملے کی تفسیر کے سلسلے میں پانچ قول منقول ہیں۔ (۱) مُكُنات : بضم الميم والكاف، مُكُن کی جمع ہے، اور مُكُن مكان کی جمع ہے، جیسے حُمُر کی جمع حُمُرات ہے، اور اس کے معنی ہیں: گھونسلا۔

(۲) مَكِنَات : بفتح الميم والكاف، اور یہ مَكِنَةٌ کی جمع ہے بمعنی گوہ کا انڈا، صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ اس سے مطلقاً انڈا مراد ہے۔

(۳) مَكِنَات مَكِنَة کی جمع ہے بمعنی تَمكُّن۔

(۴) مَكِنَات : اَمْكِنَةٌ کی جمع ہے جیسے بولا جاتا ہے : الناس على مكناتهم.

ان چاروں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا کہ پرندوں کو ان کے آشیانوں اور انڈوں سے ہٹانا، اسی طرح ان کو ڈرانا صحیح نہیں ہے، جس جگہ وہ رہتے ہیں اسی جگہ رہنے دو۔

(۵) پانچواں قول جو راجح ہے وہ یہ ہے کہ یہاں تطیر سے روکنا مراد ہے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کی عادت تھی، کہ جب سفر وغیرہ کے لئے گھر سے نکلتے تو پرندوں کے گھونسلوں پر آتے اور ان کو اڑا کر دیکھتے کہ اگر وہ دائیں جانب اڑتا تو اس کو خیر و برکت سمجھتے، اور اگر بائیں طرف اڑتا تو نحوست سمجھتے اور پھر سفر کو چھوڑ دیتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس فعل سے منع فرمادیا۔ (مرقاۃ: ۸/۱۵۵، بذل: ۴/۸۵)

باقی حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ لڑکے کے عقیقہ میں دو بکریاں ذبح کی جائیں، اور لڑکی کے عقیقہ میں ایک بکری ذبح کی جائے، اور بکری کی قید حدیث میں اتفاقی ہے، یعنی ضروری نہیں مادہ ہی ذبح کی جائے یا نر ہی ذبح

کیا جائے، بلکہ جو بھی میسر ہو ذبح کر دو، ایسا بھی نہیں ہے اگر لڑکا ہے تو بکرا اور لڑکی ہے تو بکری ذبح کی جائے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، یہ حدیث امام مالکؒ کے خلاف حجت ہوگی، کیونکہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری ہی کافی ہے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس کے برخلاف جمہور کے مسلک کی تائید "للذكر مثل حظ الأنثيين" سے بھی ہوتی ہے۔ (فتح الباری: ۷/۷۳۹)

۱۸۶ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ قال نا حمّادُ بنُ زيدٍ عَنْ عُبيدالله بنِ أبي يَزيدٍ عَن سباع بنِ ثابتٍ عَنْ أمّ كُرزٍ قالتْ : قالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عَنِ الغُلَامِ شاتَانِ مثلاَنِ ، وعَنِ الجَارِيَة شاةٌ ، قال أبوداوٗدَ : هذا هُوَ الحديثُ وحديثُ سُفيَانَ وَهْمٌ.﴾

ترجمه: حضرت ام کرزؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لڑکے کی طرف سے برابر کی دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (عقیقہ میں ذبح کی جائے) ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، اور سفیان کی حدیث وہم ہے۔

تشریح مع تحقیق: مثلان : اس کا مفہوم وہی ہے جو مکافئتان کا مفہوم ہے، یعنی دونوں ایک دوسری کے مساوی ہوں، ایسا نہ ہو کہ ایک تو بہت فربہ اور ایک بہت لاغر اور کمزور ہو، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دونوں ہم عمر ہوں، اصل مطلب یہ ہے کہ ایک سال سے کم کی کوئی نہ ہو، بلکہ ایسی ہوں جیسی کی قربانی جائز ہے۔ (حاشیہ ابوداؤد: ۲/۳۹۲)

قال أبو داؤد : یہاں سے امام ابوداؤدؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اس حدیث سے پہلی حدیث میں سفیان بن عیینہ عبیداللہ بن ابی یزید سے روایت کرتے ہیں، اور عبیداللہ بن یزید اور سباع بن ثابت کے درمیان لفظ "أبيه" کا اضافہ کرتے ہیں، نیز حماد بن زید بھی عبیداللہ ابن ابی یزید سے روایت کرتے ہیں لیکن عبیداللہ بن ابی یزید اور سباع بن ثابت کے درمیان لفظ "أبيه" کا اضافہ نہیں کرتے، تو ابوداؤد یہ کہتے ہیں کہ سفیان کی حدیث میں لفظ "أبيه" کا وہم ہے، یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، اس لئے دوسری سند زیادہ صحیح ہے۔

ترجمة الباب: اس حدیث میں بھی عقیقہ سے متعلق حکم ہی بیان کیا گیا ہے، لہٰذا مناسبت ثابت ہے۔

۱۸۷ ﴿حَدَّثَنا حفصُ بنُ عُمَر النمريُّ قال نا همّامٌ قال نا قتادةُ عَنِ الحسنِ عَن سمُرةَ عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم قال : كُلُّ غُلَامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ ، تُذْبَحُ عَنْهُ يومَ السَابِعِ ، ويُحلَقُ رأسُهُ ، ويُدَمّى ، فكَانَ قتادةُ إذا سُئِلَ عَنِ الدَّمِ كَيفَ يُصنَعُ بِهِ ؟ قال : إذَا ذُبِحَتِ العَقِيقَةُ أخِذَتْ مِنها صُوفَةٌ ، واستقبلتْ بِهِ أَوْدَاجُهَا ، ثم تُوضَعُ عَلى يَافُوخِ الصَبِيِّ حتّى يَسِيلَ عَلى رأسِهِ مِثْلَ الخَيْطِ ، ثُم يُغسَلُ رأسُهُ بَعْدُ

ويُحلَقُ، قالَ أبوداؤد : هذا وَهْم مِنْ هَمّامٍ وَيُدَمّٰى وَ إنّما قالوا : يُسَمّٰى ، فقال همّام: يُدَمّٰى قال أبوداؤد: وَلَيسَ يُؤخَذُ بِهٰذَا.﴾

ترجمہ: حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر لڑکا اپنے عقیقہ کے بارے میں مرہون ہے، ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے، اور اس کا سر منڈا جائے، اور قربانی کا خون اس کے سر پر لگایا جائے، جب حضرت قتادہ سے کوئی پوچھتا کہ کس طرح خون لگایا جائے؟ تو وہ کہتے تھے کہ جب عقیقہ کا جانور ذبح کیا جائے تو اس کے بالوں میں ایک ٹکڑا لیکر اس کی رگوں پر رکھ دیا جائے، پھر وہ ٹکڑا لڑکے کی کاخ (چندیا) پر رکھ دیا جاوے، یہاں تک کہ خون اس کے سر سے دھاگے کی طرح بہنے لگے، پھر اس کا سر دھویا جاوے اور مونڈ دیا جاوے، ابوداؤد فرماتے ہیں کہ "یدمی" ہمام کا وہم ہے بلکہ "یسمیٰ" تھا، ابوداؤد کہتے ہیں کہ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

تشریح مع تحقیق : رَهِينَةٌ : بمعنی مرہون، گروی رکھا ہوا۔

ظاہر ہے کہ بچہ مکلف نہیں ہوتا ہے، اگر اس کا عقیقہ نہ کیا جائے تو اس کے ماخوذ اور معتوب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر عقیقہ کے عوض بچے کے گروی ہونے کا کیا مطلب ہے، چنانچہ حضرت امام احمدؒ نے تو اس ارشاد گرامی کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہیں ہوتا اور وہ کم سنی کی حالت میں مرجاتا ہے، تو اس کو اپنے والدین کی شفاعت سے روک دیا جاتا ہے، کہ جب تک والدین اس کا عقیقہ نہ کریں وہ ان کے حق میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں ہوگا۔

بعض حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ جب تک والدین بچے کا عقیقہ نہیں کرتے اس کو بھلائیوں، سلامتی آفات اور بہتر نشو نما سے دور رکھا جاتا ہے، اور اس کے جو برے نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت میں والدین کے مواخذہ کا سبب بنتے ہیں۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ گروی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ بچہ اپنے بالوں وغیرہ کی گندگی اور اذیت میں مبتلا رہتا ہے، جیسا کہ بخاری شریف کی حدیث میں ہے "فأميطوا عنه الأذىٰ" بچے کو اذیت سے ہٹاؤ، یعنی اس کے بال، میل کچیل اور خون وغیرہ صاف کرو، لہٰذا جب بچے کا عقیقہ ہوتا ہے تو وہ گویا سر کے بال وغیرہ کے صاف ہوجانے سے اذیت سے نجات پاجاتا ہے۔ (الاشعہ:۵۱۲/۳، بذل:۸۶/۴، مظاہر حق:۶۸/۵)

تذبح عنه يوم السابع : واضح رہے کہ اکثر احادیث کے پیش نظر بچے کا عقیقہ اس کی پیدائش کے ساتویں دن ہونا چاہئے، اور حضرت امام شافعیؒ و حضرت امام احمدؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر ساتویں دن عقیقہ کرنا ممکن نہ ہو تو پھر چودھویں دن کیا جاوے، اگر چودھویں دن بھی نہ ہوسکے تو اکیسویں دن، ورنہ اٹھائیسویں دن، پھر پینتیسویں دن

کرے، علی ہذا القیاس۔

یُدَمّٰی : بضم الیاء وفتح الدال وفتح المیم المشددة، تَدْمِیۃٌ سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ "خون آلود کرنے" کے ہیں، اکثر روایات میں اس کی جگہ "یسمّٰی" ہے یعنی اس بچہ کا نام رکھ دیا جاوے، تاہم قتادہ نے "ویُدَمّٰی" کی تشریح یوں کی ہے کہ جب عقیقہ کے جانور کو ذبح کیا جائے، تو اس کے تھوڑے سے بال لے کر ان کی گردن کے سامنے رکھ دیئے جائیں، تاکہ وہ بال اس خون سے آلود ہو جائیں، جو ذبح کے وقت اس جانور کی گردن کی رگوں سے نکلے، اور پھر وہ خون آلود بال بچے کی چندیا پر اس طرح رکھ دیئے جائیں کہ خون اسکی چندیا پر ایک لکیر کی صورت میں بہے، اور اس کے بعد بچے کا سر دھو کر مونڈ دیا جائے۔

سفر السعادہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ (تدمیہ) نہ کیا جائے، کیونکہ روایت میں لفظ "یُدَمّٰی" دراصل کسی راوی کی طرف سے تحریف ہے، جس کا حضور ﷺ کے ارشاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور نہ ہی حضور ﷺ سے تدمیہ ثابت ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کا عقیقہ کیا، لیکن یہ عمل (تدمیہ) نہیں کیا تھا، نیز یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمل دراصل زمانہ جاہلیت کی رسم تھی جس کو منسوخ قرار دیا گیا۔

قال أبو داؤد ھٰذا وھم الخ : یہاں سے امام ابوداؤدؒ یہ فرما رہے ہیں کہ روایت میں لفظ "یُدَمّٰی" کا منقول ہونا "ہمام" کا وہم ہے، اصل میں یہ لفظ "یسمی" تھا اور وہم کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو "أمیطوا عنه الأذیٰ" فرمایا ہے کہ بچے کو گندگی سے بچاؤ اور اس کے بدن سے اذیت اور سوکھی پلیدی کو دور کرو، پھر اس کے سر کو خون سے آلودہ کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ اس میں گندگی بڑھتی ہے، اور پھر اکثر روایات میں "یسمی" کا لفظ ہے۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ابوداؤد کا ہمام کی طرف وہم کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ آگے قتادہ نے لفظ "یدمی" کی ہی تفسیر کی ہے، اگر ہمام کا وہم ہوتا تو قتادہ کی تفسیر "یُدمی" کی نہ ہوتی، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "یدمی" ہمام کا ہی وہم ہے اور قتادہ نے جو تشریح کی ہے وہ زمانہ جاہلیت کی حالت کو بیان کیا ہے جو منسوخ ہے، اور نسخ کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث "کانوا فی الجاهلیة إذا عقوا عن الصبی خضبوا قطنة بدم العقیقة، فإذا حلقوا رأس الصبی وضعوها علی رأسه، فقال النبی صلی الله علیه وسلم : اجعلوا مکان الدم خلوقاً" وزاد أبو الشیخ "ونهیٰ أن یمس رأس المولود بدم. (فتح الباری ۷/۲۱)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ یہ حکم منسوخ ہے، اور یہی مسلک جمہور علماء کا ہے۔

ترجمة الباب : کلّ غلام رهینة بعقیقته الخ سے ثابت ہے۔

۱۸۸ حَدَّثَنا ابنُ المثنّٰی قال نا ابنُ أبی عَدِيٍ عن سَعِیْدٍ عن قَتَادَةَ عَنِ الحَسَنِ عَنْ

سَمُرَةَ بنِ جُندبٍ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال : كلُّ غُلامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَومَ سَابِعِهِ ، ويُحْلَقُ ويُسَمىٰ ، قال أبوداؤدَ : ويُسمىٰ أَصَحُّ ، كذا قال سلامُ بنُ أبِي مُطِيعٍ عَنْ قتادةَ وإياسِ بنِ دغفلٍ وأشعثَ عن الحسنِ.﴾

ترجمه: حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے گروی ہے، ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے، اس کا سر مونڈا جائے، اور نام رکھا جائے، ابوداؤد فرماتے ہیں کہ لفظ "یسمی" زیادہ صحیح ہے، اسی طرح سلام بن مطیع نے قتادہ اور ایاس بن دغفل اور اشعث سے روایت کیا ہے، ان حضرات نے حسن سے روایت کیا ہے (کہ لفظ یسمی ہی صحیح ہے)۔

تشریح مع تحقیق : قال أبو داؤد : یہاں سے بھی امام ابوداؤدؒ یہ ہی بیان فرما رہے ہیں کہ لفظ "یُدمّٰی" تحریف ہے صحیح لفظ "یسمیٰ" ہی ہے، اپنے اس قول کی تائید میں سلام بن مطیع کے واسطہ سے متابع بھی پیش کردیا۔

باقی حدیث سے متعلق پوری وضاحت ماقبل کی روایت میں مفصل طور پر گزر چکی ہے۔

۱۸۹ ﴿حَدَّثَنا الحسنُ بنُ عليٍّ قال نا عبدُالرزاق قال نا هِشَامُ بنُ حسّانَ عن حَفْصَةَ بنتِ سِيرِينَ عَنِ الرَّبابِ عن سَلْمَانَ بنِ عامرٍ الضبيِّ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : مَعَ الغُلامِ عَقِيقَةٌ ، فَاهْرِيقُوا عَنْهُ دَماً ، وأَمِيطُوا عَنْهُ الأذىٰ.﴾

ترجمه: سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، لہٰذا اس کی طرف سے خون بہاؤ، اور اس سے نجاست کو دور کرو۔

تشریح مع تحقیق : مع الغلام عقیقة : حافظ بن حجرؒ نے لکھا ہے کہ لفظ غلام کے مفہوم سے حسن اور قتادہ نے یہ استدلال کیا ہے صرف لڑکے کی طرف سے عقیقہ کیا جائے گا، لڑکی کا عقیقہ نہیں ہوگا، لیکن جمہور علماء کا قول اس کے برخلاف ہے، جمہور کے نزدیک جس طرح لڑکے کا عقیقہ مسنون ہے، اسی طرح لڑکی کا عقیقہ بھی مسنون ہے، اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث ہیں، جن سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے گی جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دو بچے ایک ہی پیٹ سے پیدا ہوئے تو ہر ایک کا الگ الگ عقیقہ کرنا مستحب ہے، علامہ ابن عبدالبرؒ نے اس کو امام لیث سے نقل کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس مسئلہ کی ممانعت کسی نے نہیں کی ہے۔ (فتح الباری ۷/۷۳۹)

فاهريقوا عنه دماً : اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف سے عقیقہ کرو، عقیقہ میں ان ہی جانوروں کو ذبح کیا جائے گا جو اضحیہ میں ذبح کئے جاتے ہیں، اسی کے ساتھ بچے پر جو گندگی لگی ہوتی ہے اس کو بھی دور کردینی

چاہیے، علماء میں اختلاف ہے کہ "الأذی" سے کیا مراد ہے، تاہم علامہ نوویؒ اور محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بالوں کا مونڈنا ہے، علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد رحم کے خون کو صاف کرنا ہے، اسی طرح زمانہ جاہلیت کی طرح بچے کو خون نہ لگانا ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد ختنہ ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کوئی خاص چیز مراد نہیں ہے، بلکہ ہر مستقذر اور گندگی کو دور کرنا مراد ہے۔ (بذل:۴/۸۶، فتح الباری:۷/۲۰)

١٩٠ ﴿حَدَّثَنا يحي بنُ خلفٍ قال نا عبدُ الأعلى قال نا هشامٌ عنِ الحَسَنِ أنَّهُ كانَ يَقُوْلُ : إمَاطَةُ الأذىٰ حَلقُ الرأسِ.﴾

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اماطۃ الاذی سے مراد سر منڈوانا ہے۔

١٩١ ﴿حَدَّثَنا أبو مَعْمَرٍ عبدُالله بنُ عمرٍو قال نا عبدُالوارثِ قال نَا أيوبُ عَن عكرِمَةَ عن ابنِ عبّاسٍ أنّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم عَقَّ عَنِ الحَسَنِ والحُسَيْنِ كَبشاً كَبشاً.﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی طرف سے ایک ایک دنبہ کا عقیقہ کیا۔

تشریح مع تحقیق: اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کی طرف سے حضور ﷺ نے ایک ایک دنبہ کا عقیقہ کیا، جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک ہے، لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے ہم مفصل بحث باب کے شروع میں کر چکے ہیں، وہاں دیکھ لی جائے۔

اس حدیث سے ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ باپ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی بچے کا عقیقہ کر سکتا ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے کیا، امام احمدؒ کا مسلک یہ ہی ہے، لیکن جمہور یہ کہتے ہیں کہ جس پر بچے کا نان ونفقہ لازم ہے، اسی کو عقیقہ کرنا چاہیے۔

١٩٢ ﴿حَدَّثَنا القعنبيُّ قال نا داؤدُ بنُ قَيسٍ عن عَمرو بنِ شُعيبٍ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم ح وحدثنا محمد بنُ سليمانَ الأنبَارِيُّ نا عبدُ الملكِ يعنى بنَ عَمرٍو عن داؤدَ عن عمرِو بنِ شعيبٍ عن أبيه أراهُ عَنْ جدّهِ قال : سُئِلَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عَنِ العَقِيْقَةِ ؟ فقال : لايُحِبُّ اللّٰهُ العقُوقَ ، كأنَّهُ كَرِهَ الإسْمَ ، وقال : مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ ، فأحبَّ أن يَنْسِكَ عَنْهُ ، فَلينسِكْ عَنِ الغُلامِ شَاتَانِ مُكافِئَتَانِ ، وعَنِ الجارِيةِ شاةٌ ، وسُئِلَ عَنِ الفَرَعِ ؟قال : وَالفرعُ حَقٌّ ، وأَنْ تَترُكُوْهُ حَتّٰى يكونَ بِكْراً شُغْزُباً ابنَ مخاضٍ أو ابنَ لبونٍ ، فَتُعْطِيهِ أرمِلَةً ، أو تَحْمِلَ عليهِ فى سبيلِ اللّٰهِ خيرٌ

مِنْ أنْ تَذْبَحَهُ فَيَلْزَقُ لَحْمُهُ بِوَبَرِهِ ، وتُكْفِئ إنَائَكَ ، و تُوَلِّه نَاقَتَكَ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عقیقہ کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عقوق کو پسند نہیں کرتا، گویا کہ آپ ﷺ نے اس نام کو پسند نہیں کیا، اور فرمایا کہ جس کا بچہ پیدا ہوا اور وہ اپنے لڑکے کی طرف سے قربانی کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے برابر کی دو بکریوں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کرے، پھر آپ ﷺ سے فرع کے بارے میں پوچھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرع حق ہے، اور اگر تم فرع کو چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ جوان اونٹ ہو جاوے ایک سال کا یا دو سال کا، پھر اس کو کسی بیوہ کو دیدو، یا جہاد کے لئے دیدو تو وہ تمہارے ذبح کرنے سے بہتر ہے، (یعنی پیدا ہوتے ہی کاٹنے سے بہتر ہے) اس وقت کہ اس کا گوشت بالوں سے لگا ہوا ہو (کم ہونے کی وجہ سے) اور بہتر ہے اس سے کہ اوندھا دو تم اپنا برتن، اور اس کی ماں کو دیوانہ کردو۔

تشریح مع تحقیق : شُغْزُبًا: بضم الشين وسكون الغين وضم الزاء، اس کی اصل "زُخْزُبًا" ہے "ز" کو شین سے اور "خ" کو غین سے بدل دیا جس کی وجہ سے شغزباً ہو گیا، اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اصل لفظ "زخربًا" ہے، اس کے معنی ہیں "وہ بچہ جو قوی اور طاقت ور ہو جائے"۔

ابن مخاض : اونٹ کا ایک سال کا بچہ۔

ابن لبون : اونٹ کا دو سال کا بچہ۔

تكفئ : (افعال) برتن کو الٹنا۔

أرْملة : وہ عورت جس کا شوہر نہ ہو۔

يلزق : (س) چپکنا، ملنا۔

تُوله : (افعال) غمزدہ کرنا، دکھ دینا۔

اس حدیث سے پہلی بات تو یہ ثابت ہوئی کہ عقیقہ کو عقیقہ نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ یہ عَقّ سے مشتق ہے جس کے معنی قطع کے ہیں، لیکن دوسری تمام روایات کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے لفظ عقیقہ کے اطلاق میں کوئی کراہت نہیں، اگر لفظ عقیقہ مکروہ ہوتا تو دیگر احادیث میں اس کا تلفظ نہ کیا جاتا، آپ ﷺ اس کا تلفظ ہرگز نہ کرتے، اس وجہ سے جمہور علماء نے اس روایت کو دیگر صحیح روایات کے مقابلہ میں قبول نہیں کیا، اور اس حدیث کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

(۱) اس حدیث کی دوسری سند میں ایک شخص مجہول ہے، سند اس طرح لکھی ہے: قال مالك عن زيد بن أسلم عن رجل من بني ضمرة عن أبيه الخ اب اس سند میں "رجل من بني ضمرة" کے نام کی صراحت

نہیں، تاہم حافظ نے تقریب میں کہا ہے کہ یہ تیسرے طبقہ کے راوی ہیں لیکن نام حافظ نے بھی ذکر نہیں کیا، دوسری بات یہ ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں بھی حضرت شعیب لفظ "اراہ" کے ذریعہ روایت کرر ہے ہیں، تو یقیناً ان کو اس کے مرفوع ہونے میں شک ہے، اس لئے یہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔

(۲) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ سائل نے کہا ہو: ولد لي مولود أحب أن أعق عنه، تو آپ ﷺ نے لفظ "أعق" کو مکروہ سمجھا، اس لئے کہ یہ لفظ عقیقہ اور عقوق دونوں کے درمیان مشترک ہے، اور ایسے لفظ سے بچنا جو کراہت اور عدم کراہت دونوں کے درمیان مشترک ہو فصاحت میں داخل ہے، اس صورت میں مکروہ لفظ عقیقہ نہیں ہوا بلکہ "أعق" مکروہ ہوا۔

(۳) ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ میری اولاد بڑی ہونے کے بعد نافرمان نہ ہو اس کو چاہئے کہ حالت صغر میں ہی اولاد کی طرف سے عقیقہ کر دے، اگر یہ عقیقہ نہ کرے گا تو بچے کے حق میں عقوق ہوگا، پھر جب بچہ بڑا ہوگا تو وہ نافرمانی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس عقوق اور نافرمانی کو پسند نہیں کرتے، یہ تاویل بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ (اوجز المسالک: ۴/۲۷۵)

قوله والفرع حق : اس کا مطلب یہ ہے کہ فرع ثابت ہے، یا بقولِ بعض فرع واجب ہے، لیکن فرع کی مشروعیت حنفیہ کے نزدیک منسوخ ہے، کیونکہ اضحیہ کے بعد زمانہ جاہلیت کی تمام قربانیاں منسوخ کر دی گئی ہیں، اس مسئلہ پر ماقبل میں ہم مفصل کلام کر چکے ہیں۔

وإن تتركوه الخ : اس کا مطلب یہ ہے کہ فرع کو ذبح کرنے سے بہتر یہ ہے، کہ تم اس کو پالتے رہو اور خوب کھلاتے رہو، جب وہ نوجوان ہو جائے، دوسروں کی خدمت کے لائق ہو جاوے تو اس کو کسی بیوہ عورت کے لئے صدقہ کر دو، یا کسی مجاہد کو دیدو تاکہ وہ اس کے ذریعہ اللہ کے راستہ میں لڑے، یا حاجیوں کو سفر کے لئے دیدو، ان کاموں میں بھلائی ہے، اس لئے جب تم اس کو چھوٹا ہونے کی حالت میں کاٹ لوگے تو تم کو بھی اس میں خاص فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ تھوڑا سا گوشت نکلے گا۔

يلزق لحمه بوبره : یہ گوشت کے کم ہونے سے کنایہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کا گوشت بہت کم ہوتا ہے، وہ اس کے بالوں میں ہی لگ جاوے گا اور تم کو کچھ بھی نہ ملے گا، اس سے بہتر یہ ہے کہ اس کو پال کر دوسروں کو ہی صدقہ کر دو۔

تكفئ السائك : ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی جانور کا بچہ مرجاتا ہے تو اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہے، لہٰذا جب اس اونٹنی کا بچہ ذبح کر دو گے تو اس کا دودھ خشک ہو جائے گا گویا تم نے اپنی دودھ کی بالٹی خود اوندھی کر دی، (اپنے پیروں میں کلہاڑی مار لی)۔

قوله ناقتك : یہ ظاہر بات ہے کہ جب کسی کا بچہ مفقود ہو جاتا ہے تو اس کو انتہائی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا تمہارے ذبح کرنے سے اونٹنی کو بھی تکلیف ہوگی، حاصل یہ ہے کہ تین سبب بظاہر ایسے ہیں جن کی وجہ سے اس حدیث میں فرع سے منع کیا گیا ہے۔

(۱) اس میں گوشت کم ہوتا ہے

(۲) دودھ کا ذریعہ ختم ہو جاتا ہے

(۳) جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

ترجمة الباب: مَن ولد لهٗ ولد فاحبّ أن ينسك عنه فلينسك عن الغلام شاتان مكافئتان الخ سے ثابت ہے۔

١٩٣ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ محمّدِ بنِ ثابتٍ قالَ نا عليُّ بنُ الحسينِ قال نا أَبِیْ قَالَ حدثنی عبدُالله بنُ بُرَيْدَةَ قال سمعتُ أبی بريدةَ يقولُ : كُنَّا فی الجاهِلِيّةِ إِذَا وُلِدَ لأَحَدِنَا غُلَامٌ ، ذَبَحَ شَاةً ، ولَطَخَ رأسَهٗ بِدَمِهَا ، فلمَّا جَاءَ اللّٰهُ بِالإِسْلامِ ، كنَّا نَذْبَحُ شاةً و نَحْلِقُ رأسَهٗ ونَلطَخُهٗ بِزَعْفَرانَ.﴾

ترجمہ: حضرت ابو بریدہؓ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم لوگوں میں سے کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا تھا، اور بچے کے سر کو خون آلود کر دیتا تھا، جب اسلام آیا تو ہم بکری ذبح کرتے تھے اور بچے کا سر مونڈ کر زعفران لگاتے تھے۔

تشریح مع تحقیق : یہ حدیث جمہور کی مستدل ہے کہ بچے کے سر کو عقیقہ میں ذبح کی گئی بکری کا خون نہیں لگایا جائے گا، اور حضرت قتادہ سے جو خون لگانے کی تشریح مذکور ہے وہ اب منسوخ ہے، اب اس خون کی جگہ خلوق اور زعفران جیسی خوشبوؤں سے بچے کے سر کو معطر کیا جائے گا، جیسا کہ خود حضرت ابو بریدہؓ اس عمل کی صراحت فرما رہے ہیں کہ ہم لوگ مسلمان ہونے کے بعد زعفران وغیرہ خوشبو بچوں کے سروں کو لگایا کرتے تھے۔

(مظاہر حق جدید: ۵/ ٦٨، بذل: ۴/ ۸۷)

ترجمة الباب : "كنا نذبح شاة ونحلق رأسه ونلطخه بزعفران" سے ثابت ہے۔

قد وقع الفراغ عن شرح كتاب الذبائح من سنن أبي داؤد فی الساعة الخامسةالا الربع ليل الخميس ١٤٢٣/٦/٥هـ بفضل الله تعالىٰ وعونه الكبير، وأساله تعالى أن يتهيأ لی فرصة ذهبية لإكمال كتاب الصيد والوصايا حسب ما يحبه ويرضاه إنه فعّال لما يريد.

أول الصيد

"صید" مصدر ہے بمعنی اصطیاد: شکار کرنا، لیکن کبھی اس کا اطلاق "مصید" (شکار کیا ہوا جانور) پر بھی ہوتا ہے، اور یہاں اس معنی میں مراد لینا ہی مناسب ہے۔

شکار کرنا مباح ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو افضل المخلوقات بنایا ہے، اور دنیا کی تمام چیزیں اسی انسان کے لئے بنائی گئی ہیں، تا کہ انسان دنیا میں ان تمام چیزوں سے اپنی ضرورت کی تکمیل کر سکے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ھو الذی خلق لکم مافی الأرض جمیعاً. اس آیت سے واضح ہے کہ تمام اشیاء کو انسانی منفعت کی خاطر ہی وجود بخشا گیا ہے۔

اس کے باوجود شریعت نے ان چیزوں سے نفع اٹھانے کے طریقے الگ الگ بیان کیے ہیں، جن چیزوں سے نفع اٹھانا انسان کے لئے مفید ہو ان کو حلال قرار دیدیا، اور جو اشیاء اللہ کے علم کے پیش نظر انسان کو ضرر پہنچائیں ان کو حرام قرار دیا، انسان کی بہت سی ضروریات ہیں، لیکن ان تمام ضروریات میں سب سے بڑھ کر کھانے پینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ بغیر اکل وشرب کے زندگی کی بقاء ناممکن ہے، اور پاکیزہ جانوروں کا گوشت انسان کے لئے بہت مفید ہے، اس لئے کہ اس سے جسم کو طاقت ملتی ہے، خود انسان کی خلقت بھی گوشت کی متقاضی ہے، اس لئے کہ اس کی چوڑی چوڑی داڑھیں ہوتی ہیں، اور تیز انیاب ہوتے ہیں، پھر صرف خضروات اور مزروعات پر اکتفاء بھی دشوار ہے، انسان کی اسی فطرت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ حیوانات کے گوشت کو انسان کے لئے حلال قرار دیا، پھر گوشت کے حصول کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں، ان ہی میں سے ایک طریقہ شکار کر کے گوشت کو حاصل کرنا، چنانچہ اللہ نے اس کو بھی حلال قرار دیا۔

تمام اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ جانور کا شکار کرنا مباح ہے، حلال ہے، ہر اس شخص کے لئے جو احرام کی حالت میں نہ ہو، اور ہر اس جگہ جو حدود حرم سے باہر ہو۔

اباحت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہے، "رسالہ ابن زید" ایک کتاب ہے جو امام مالکؒ کے مسلک کی ہے، اس میں لکھا ہے کہ محض تفریحاً شکار کرنا مکروہ ہے۔

﴿بَاب اتخاذ الكلب للصيد وغيره﴾

شکار وغیرہ کی وجہ سے کتا پالنے کا بیان

۱۹۴ ﴿حَدَّثَنا الحسنُ بنُ عليٍّ نا عبدُالرزّاق قال أخبرنا معمرٌ عن الزُهريِّ عن أبِي سَلَمَةَ عَنْ أبِي هُريرةَ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال : مَنْ اتَّخذَ كَلْباً إلاّ كلبَ ماشيةٍ أو صَيْدٍ أو زَرْعٍ ، انْتَقصَ مِنْ أجْرِهِ كلَّ يَوْمٍ قِيراطٌ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مویشی یا شکار کرنے، یا کھیتی کی حفاظت کے علاوہ کے لئے کتا پالے تو ہر دن اس کے ثواب میں سے ایک قیراط کم کر دیا جاتا ہے۔

تشریح مع تحقیق : انْتَقَصَ : (افتعال) گھٹنا، کم ہونا۔

قیراط : ایک پیمانہ ہے، لیکن اس کا صحیح وزن اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہی معلوم ہے، البتہ بخاریؒ کی کتاب الجنائز میں ایک روایت میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص میت کی نماز پڑھ کر بغیر دفن کئے واپس آجائے اس کو ایک ثواب اور جو شخص نماز پڑھ کر دفن کر کے واپس آئے اس کو دو قیراط ثواب ملے گا، پھر آپ ﷺ نے قیراط کی مقدار بیان فرمائی کہ ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔

لیکن مقام رضا، اور مقام خفا میں فرق ہونا چاہئے ، بخاری شریف کی روایت تو مقام رضا کی ہے، اور فضیلت کی ہے، اور یہ روایت سزا اور مقام خفا کی ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس روایت کو کتاب الجنائز والی روایت پر قیاس نہ کیا جائے۔

اس حدیث میں یہ بات واضح ہوئی کہ شریعت نے تین وجہ سے کتے پالنے کی اجازت دی ہے، ایک مویشی یعنی بکری وغیرہ کی حفاظت کے لئے ، مثلاً کوئی شخص بکریاں پالتا ہے، اور اس کو خوف ہے کہ ان بکریوں کو کوئی درندہ اپنا لقمہ بنا لے گا، تو شریعت نے اس کے لئے کتا پالنے کی اجازت دی ہے، دوسرا وہ شخص جو شکاری ہے، اور شکار کر کے گوشت کو استعمال کرتا ہے، تیسرا وہ شخص جو اپنی کھیتی کی حفاظت کے لئے کتا پالے، ان تین لوگوں کے لئے شریعت نے اجازت دی ہے کہ کتا پالنے میں کوئی گناہ نہیں۔

البتہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کلب ماشیہ اور کلب صید پال سکتا ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو اولاً کلب صید اور کلب ماشیہ کے سلسلے میں ہی روایت پہنچی تھی، بعد میں جب ان کو یہ خبر پہنچی کہ زراعت وغیرہ کے لئے بھی کتا پالا جا سکتا ہے تو وہ بھی تین ہی چیزوں کے بارے میں روایت کرنے

لگے، ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ سے کہا گیا کہ حضرت ابو ہریرہؓ تو ''زراعت کے لئے بھی کتا پالنے کی اجازت ہے'' کے بارے میں روایت کرتے ہیں، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ "کان صاحب زرع" یعنی ابو ہریرہؓ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اس لئے اس بارے میں ان کو زیادہ تحقیق ہوگی، گویا حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی تائید فرمائی، اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ بھی اسی طرح روایت کرنے لگے۔ (بذل المجہود: ۴/۸۷)

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر ضرورت کے کتا پالنے کی وجہ سے ایک قیراط روزانہ اس کے ثواب سے کم کر دیا جائے گا، جبکہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دو قیراط کم ہوتا ہے بظاہر اس روایت کا دوسری روایات سے تعارض ہے۔

جواب

اشکال بہت اچھا ہے، لیکن اس کے بہت سے جوابات ہمارے پاس موجود ہیں، جن سے یہ اشکال بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

(۱) اولاً حضور ﷺ نے ایک قیراط ثواب کم ہونے کی خبر دی ہوگی، بعد میں دو قیراط کم ہونے کی خبر دی ہوگی، تاکہ کتوں سے زیادہ نفرت ہو جائے، اب جن راویوں نے پہلے سنا انہوں نے ایک قیراط والی روایت بیان کر دی، اور جن حضرات نے بعد میں سنا تو انہوں نے دو قیراط والی روایت بیان کر دی۔

(۲) شروع زمانے میں شریعت کا حکم زیادہ سخت رہا ہوگا جس کی وجہ سے دو قیراط ثواب کے کم ہونے کی اطلاع دی ہو، اور بعد میں تخفیف ہوگئی تو ایک قیراط ثواب کم ہونے کی اطلاع دی ہوگی۔

(۳) یہ مکان کا فرق ہے، کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کے لئے خاص طور پر یہ حکم فرمایا کہ جو ان تین قسم کے کتوں کے علاوہ کتے پالے اس کے ثواب میں روزانہ دو قیراط کم ہوں گے، اور جو دوسری جگہ کتے پالے اس کے ثواب میں سے روزانہ ایک قیراط کم ہوگا۔

(۴) بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ فرق کتوں کے اعتبار سے ہے، بعض کتے زیادہ شریر ہوتے ہیں اور بعض کم شریر ہوتے ہیں، جو شریر کو پالے اس کے ثواب سے دو قیراط اور جو کم شریر کو پالے اس کے ثواب سے ایک قیراط کم ہوگا۔

ترجمة الباب : باب کا مقصد کتوں کے پالنے کے جواز اور عدم جواز کو بتلانا ہے، اور حدیث میں بھی کتوں کے پالنے کے جواز اور عدم جواز کو بتلایا گیا ہے کہ کس جگہ کتوں کا پالنا جائز ہے اور کس جگہ جائز نہیں ہے، لہٰذا

ترجمۃ الباب ثابت ہوگیا۔

۱۹۵ ﴿حَدَّثَنا مسدَّد نا يزيد قال نا يونس عن الحسن عن عبدالله بن مغفل قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لَوْ لَا الكِلَابَ أُمَّةٌ مِنَ الأُمَمِ لَأَمَرْتُ بِقَتْلِهَا ، فَاقْتُلُوا مِنْهَا الأَسْوَدَ البَهِيْمَ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ کتے بھی جماعتوں میں سے ایک جماعت ہیں (کتے بھی ایک امت ہیں) تو میں ان کے قتل کرنے کا حکم کرتا، اب تم ان میں سے خالص سیاہ کتوں کو قتل کرو۔

تشریح مع تحقیق : اسود البھیم : ایسا سیاہ کتا جس میں بالکل بھی سفیدی نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ کتوں کی جنس ہے، اور ہر جنس کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی حکمت ضرور رکھی ہے، مثلاً اکثر زہریلے جانور گندی فضا کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اور جب اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت اور مصلحت ہے تو ان کی جنس کو ختم نہیں کرنا چاہئے، اس لئے ایسا کرو کہ جو کتے شریر ہیں، انسان کی ایذارسانی کا سبب بنتے ہیں، تو ان کو قتل کردو، بعض روایتوں میں ہے کہ "ذالنقطتین" یعنی جن کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہیں ان کو قتل کردو، کیونکہ ایسے کتے انتہائی موذی ہوتے ہیں، اس کے علاوہ جو کتے انسان کو تکلیف نہیں دیتے ان کو قتل مت کرو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، کہ تمام موذی اور سیاہ کتوں کو قتل کیا گیا، جیسا کہ دیگر روایات سے ثابت ہے، امام خطابیؒ نے بھی تقریباً کتوں کے قتل کرنے کے بارے میں یہ ہی بات کہی ہے۔

ترجمۃ الباب : یہاں پر ضمناً ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے سیاہ کتوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا، اور باقی کو قتل نہ کرنے کا حکم فرمایا، کیونکہ ان کے باقی رکھنے میں ہی مصلحت اور منفعت ہے، اور منفعت میں سے شکار کرنا بھی ہے، لہٰذا ضمناً دوسری روایات کو سامنے رکھ کر کتوں کے پالنے کا جواز ثابت ہوگیا۔

۱۹۶ ﴿حَدَّثَنا يحيٰ بن خلف نا أبو عاصم عن ابن جريج قال اخبرنى أبوالزبير عن جابر قال : أَمَرَ نَبِيُّ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِقَتْلِ الكِلَابِ حتّٰى إِنْ كَانَتِ المرأةُ تَقْدَمُ مِنَ البادِيَةِ يَعْنِىْ بالكلبِ فنقْتُلهُ ، ثم نَهانَا عَنْ قَتْلِهَا ، وقالَ : عَلَيْكُمْ بِالأَسْوَد.﴾

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کے مارنے کا حکم فرمایا یہاں تک کہ اگر جنگل سے بھی کوئی عورت اپنے ساتھ کتا لے کر آتی، تو ہم اس کو مار ڈالتے تھے، پھر حضور ﷺ نے ہم کو کتوں کے مارنے سے منع فرمادیا، اور فرمایا کہ صرف کالے کتے ہی مارو۔

تشریح مع تحقیق :علامہ طیبیؒ اس روایت کی وضاحت فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے صحابہؓ

کو کتوں کے مارنے کا حکم فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے مدینہ کے تمام کتوں کو مار ڈالا، اور اس حکم کی تعمیل میں اتنی سختی سے کام لیا کہ اگر کوئی عورت بھی دیہات سے آتی اور اپنے ساتھ کتا لاتی تو ہم اس کو بھی نہیں چھوڑتے تھے، ایک تو حضور ﷺ کا حکم، پھر ان کتوں کی خباثت اور ایذا رسانی ان کے قتل کا سبب بنی، چونکہ یہ معلوم ہے کہ کتا انتہائی خبیث جانور ہے، گندی چیزیں اور مردار ہی اس کی مرغوب غذا ہے، اس لئے ان کو قتل کیا گیا۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب صرف کالے کتوں کو قتل کرو کیونکہ یہ زیادہ خبیث ہوتے ہیں، ان کے علاوہ سفید کتوں کو مت قتل کرو بلکہ ان سے تو نفع بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔

امام الحرمین نے اسی سے استدلال کرتے ہوئے کہہ دیا کہ اب کسی بھی طرح کے کتے کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ حکم منسوخ ہو گیا، ہاں کالا کتا جو موذی ہو اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، لیکن ملا علی قاریؒ نے ان کے اس فتوے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ امام الحرمین کو اپنے فتوے کی مزید وضاحت اور اس کو مدلل کرنا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ مطلقاً نسخ کا قائل ہونا محتاج دلیل ہے۔

ترجمة الباب: کالے کتوں کو مارنے کا حکم فرمایا اور دوسرے کتوں کو چھوڑنے کا حکم فرمایا معلوم ہوا کہ ان دوسرے کتوں سے نفع اٹھانا جائز ہے۔

﴿بَاب في الصيد﴾

شکار کرنے کا بیان

۱۹۷ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ عِيسٰى قال نا جريرٌ عَنْ منصورٍ عن إبْراهيمَ عَن همامٍ عن عَدِى بنِ حاتمٍ قال : سألتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم ، قلتُ : إنّى أرسِلُ الكلابَ المعلَّمـةَ فَتُمسِكُ عَلَىَّ أفَاكُلُ ؟ قال : إذَا أَرْسَلْتَ الكلابَ المعلَّمةَ وذَكَرتَ إسْمَ اللّٰهِ ، فَكُلْ مِمَّا امسَكْنَ عَلَيْكَ ، قُلْتُ وإنْ قَتَلْنَ ؟ قال : وإنْ قَتَلْنَ ، مَالَمْ يُشْرِكُهَا كَلْبٌ ليس مِنْهَا ، قلتُ ارمىْ بالمِعْرَاضِ فأصِيْبَ أفاكُلُ ؟ قَالَ إذَا رَمَيْتَ بالمِعْرَاضِ ، وذكرتَ إسْمَ اللّٰهِ ، فأصابَ فَخَرَقَ ، فكُلْ وإنْ اصَابَ بعَرْضِهٖ فَلَا تاكُل.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑتا ہوں (شکار کے پیچھے) اور وہ شکار کو پکڑ لیتا ہے (اور کھاتا نہیں) تو کیا میں اس کو کھالوں؟

آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب تم سدھائے ہوئے کتوں کو چھوڑو اور بسم اللہ پڑھ لو تو جو شکار اس نے تمہارے لئے روک رکھا ہے اس کو کھالو۔

عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اگرچہ وہ اس شکار کو مار ڈالیں؟ (تو بھی حلال ہے) آپ ﷺ نے ارشادفرمایا اگرچہ مارڈالیں، تو بھی حلال ہے، جب تک دوسرا غیر سدھایا ہوا کتا اس شکار کے مارنے میں شریک نہ ہوا ہو، عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ میں بے پر کے تیر سے شکار کرتا ہوں تو کیا میں اس کو کھالوں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب تم بے پر کا تیر مارو اور اللہ کا نام لے لو اور وہ تیر شکار کو لگ کر پھاڑ ڈالے تو اس کو کھالو اور اگر تیر شکار کو عرضاً (چوڑائی) میں پہنچے تو مت کھاؤ۔

تشریح مع تحقیق : عدی بن حاتمؓ : یہ حاتم الطائی کے بیٹے ہیں، جو اپنی سخاوت میں مشہور ہیں، یہ پہلے نصرانی تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکار کے بڑے شوقین تھے، اس وجہ سے شکار کے سلسلے میں ان سے بکثرت روایات ملتی ہیں۔

أُرْسِلُ : أَرْسَلَ أحدٌ احداً (افعال) بھیجنا۔

المعلَّمة : (تفعیل) تعلیم دینا، سکھانا، اسم مفعول ہے بمعنی سکھایا ہوا، چونکہ کلب کی صفت ہے ترجمہ ہوگا وہ کتا جس کو شکار کرنا سکھا دیا ہو، ہماری زبان میں کہتے ہیں سدھایا ہوا کتا۔

فتُمْسِك : (افعال) روک کر رکھنا، محفوظ رکھنا۔

مِعْرَاض : (۱) بے پر کا تیر، سہم اور معراض میں فرق یہ ہے کہ سہم نوک دار اور پر والا تیر ہوتا ہے، معراض میں نوک اور پر نہیں ہوتے بلکہ سیدھا اور چپٹا ہوتا ہے۔

(۲) ایسی لکڑی جس کے دونوں کنارے نوک دار ہوں اور درمیانی حصہ موٹا ہو، عود رقيق الطرفين غليظ الوسط.

(۳) بعض حضرات کا کہنا ہے کہ معراض کے آگے نوک کے بجائے دھار ہوتی ہے اور وہ دھار طول میں ہوتی ہے۔

فَخَرَقَ : (ض) پھاڑنا، بعض روایات میں خَزَقَ "ز" کے ساتھ ہے، جس کے معنی "جرح" کے ہیں۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ہم اپنے سدھائے ہوئے کتے، جو شکار کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں، شکار کرنے کے لئے چھوڑتے ہیں، جب وہ کتے اس شکار کے جانور کو ہمارے پاس لاتے ہیں، تو بعض اوقات وہ جانور مر چکا ہوتا ہے، تو اب یہ شکار ہمارے لیے حلال ہوگا یا نہیں؟ حضور اقدس ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ جس جانور کو تمہارے کتے روک کر لائے ہوں اس کو تم

کھاسکتے ہو، یعنی اگر کتے نے شکار کے جانور کونہیں کھایا ہے، بلکہ اسکول تمہارے لئے روک کر رکھا ہے، لیکن اگر اس نے کچھ کھالیا ہے تو اس شکار کوتم نہیں کھاسکتے، اس لئے کہ اس صورت میں وہ جانور "ما أکل السبع" میں داخل ہوجائے گا، جس کے کھانے کی ممانعت قرآن میں آچکی ہے اور اس کتے کا کھالینا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے لئے شکار کررہا ہے نہ کہ تمہارے لئے۔

حضرت عدی بن حاتمؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! چاہے ان کتوں نے اس جانور کوقتل ہی کردیا ہو اور ہمیں ذبح کرنے کا موقع نہ ملا ہو، تب بھی یہی حکم ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اگرچہ ان کتوں نے اس کو جان سے ماردیا ہو، تب بھی تمہارے لیے حلال ہے، جبکہ تم نے اپنا کتا "بسم اللہ" پڑھ کر شکار کی طرف چھوڑا ہو، اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا کتا شریک نہ ہوا ہو، اور اگر دوسرا کتا شریک ہوگیا ہوتو تمہارے لئے وہ شکار حلال نہیں ہوگا، کیونکہ تم نے اپنے کتے پر "بسم اللہ" پڑھی ہے دوسرے کتے پر بسم اللہ نہیں پڑھی، جب کہ جانور دونوں کے مشترکہ حملے سے ہلاک ہوا ہے، اس لئے یہ جانور تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔

پھر حضرت عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ ہم بعض اوقات معراض سے شکار کرتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہے؟ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ "ماخرق فکُلْ" یعنی جو تیر زخمی کردے، یا آرپار ہوجائے، اس جانور کو کھالو، اور جو تیر جانور کو چوڑائی میں لگے، اس کومت کھاؤ، اس لئے کہ وہ جانور تیر کی چوٹ سے مرا ہے، زخمی ہونے کی وجہ سے نہیں مرا، یہ ہے حدیث شریف کا مطلب۔

ہمیں اس حدیث کے تحت تفصیلی کلام کرنا ہے، تاکہ پورے باب کا خلاصہ ہمارے سامنے آجائے، اور پھر باب میں ذکر کردہ گیارہ روایتوں کے مابین کوئی تعارض نہ رہے، یاد رہے کہ ہم جس تفصیل میں جانا چاہتے ہیں یہ ان گیارہ روایتوں کا ہی نچوڑ ہے، اس لیے اس کا سمجھنا اور یاد رکھنا امر ناگزیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۱) جب مشروع اور غیر مشروع دو سبب جمع ہوجائیں تو جانور حلال نہیں۔

حدیث بالا سے فقہائے کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی جانور کی ہلاکت میں دو سبب جمع ہوجائیں، جن میں سے ایک سبب مشروع ہو اور دوسرا غیر مشروع ہو تو اس صورت میں وہ جانور حلال نہیں ہوگا، مثلاً ایک پرندے کو تیر سے مارا، اور وہ پانی میں گر کر مرگیا تو اب یہ معلوم نہیں کہ اس کی موت تیر لگنے کی وجہ سے ہوئی ہے یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے، اگر تیر لگنے کی وجہ سے ہوئی ہے تو حلال ہے، اور اگر پانی کی وجہ سے ہوئی ہے تو حرام ہے، لیکن چونکہ یہاں دو سبب ایک جگہ جمع ہوگئے، ایک مشروع اور دوسرا غیر مشروع، اس لئے یہ جانور حرام ہی ہوگا۔ إذا اجتمع الحلال والحرام، أو المحرّم والمبیح غُلِّب الحرام والمحرّم۔ (درمختار: ۶/۴۷۲ کراچی، قواعد الفقہ: ۵۵)

غلیل سے شکار کئے ہوئے جانور کا حکم

فقہائے کرام نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ غلیل سے کیا ہوا شکار حلال نہیں ہوتا، جب تک اس کو ذبح نہ کیا جائے، کیونکہ غلیل کا غلہ یا پتھر محدد نہیں ہوتا، اور نہ ہی جارح ہوتا ہے، لہٰذا جانور اس کی چوٹ سے مریگا اور ''موقوذہ'' کے حکم میں ہوگا، اس لئے وہ جانور حلال نہیں ہوگا، عربی زبان میں غلیل کو ''بندقہ'' کہا جاتا ہے، ہدایہ میں جہاں ''بندقہ'' کا حکم لکھا ہے وہاں اس سے غلیل ہی مراد ہے۔ (المغنی لابن قدامہ: ۱۱/ ۳۷، بدایۃ المجتہد: ۱/ ۴۴۱)

بندوق سے شکار کئے ہوئے جانور کا حکم

اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ''بسم اللہ'' پڑھ کر بندوق یا رائفل کی گولی چلائے، اور اس سے شکار ہلاک ہو جائے تو یہ حلال ہوگا یا نہیں؟

یہ مسئلہ فقہاء متقدمین کی کتابوں میں تو موجود نہیں ہے، کیونکہ جب بندوق وغیرہ کا رواج نہیں تھا، عصر حاضر کے علماء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہو گیا ہے، علماء کی ایک جماعت اس جانور کو حلال قرار دیتی ہے، جبکہ دوسری جماعت حرمت کی قائل ہے، جو لوگ حلال قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت جس وقت جانور کو گولی لگتی ہے، تو وہ آر پار ہو جاتی ہے، اور اس گولی کی وجہ سے اتنا خون نکل جاتا ہے کہ بسا اوقات چھری سے ذبح کرتے وقت بھی اتنا خون نہیں نکلتا، لہٰذا ذبح کا جو اصل مقصد ہے کہ خون جانور میں نہ رہے، یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، اور جانور حلال ہوگا۔

جو علماء اس کو حرام قرار دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بندوق کی گولی بذات خود محدد نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس میں دھار نہیں ہوتی ہے، اور جب وہ شکار کو لگتی ہے تو اس کے نتیجے میں شکار کو چوٹ لگتی ہے، البتہ وہ گولی دور سے اور تیز رفتاری سے آتی ہے، اس لئے جسم کو پھاڑ کر اندر گھس جاتی ہے، ورنہ اس گولی کے اندر بذات خود جارح اور محدد ہونے اور جسم پھاڑنے کی صلاحیت نہیں ہے، بلکہ وہ مثقل کے حکم میں داخل ہے، اس لئے اس گولی سے شکار کیا ہوا جانور حلال نہیں۔

چنانچہ علامہ شامیؒ نے ردالمحتار میں فرمایا ہے کہ اگر گولی لگنے کی وجہ سے جو موت واقع ہوتی ہے وہ اندفاع عنیف یعنی شدید ثقل کی وجہ سے ہوتی ہے، بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ احراق کی وجہ سے ہوتی ہے، اس لئے کہ گولی محرق ہے، اور محرق محدد کے حکم میں ہے اس وجہ سے وہ جانور حلال ہوگا۔

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ نے لکھا ہے کہ بندوق کی گولی محرق نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے زمانے میں اس کا تجربہ کیا کہ ایک روئی کا گالہ سامنے رکھا اور اس پر فائر کیا، اس کے نتیجے میں گولی اس میں سے گزر گئی اور

اس میں آگ نہیں لگی، اگر وہ محرق ہوتی تو روئی میں آگ لگ جاتی، اسی وجہ سے علماء دیوبند کے بیشتر حضرات کا فتویٰ یہ ہی ہے کہ گولی سے شکار کیا ہوا جانور حلال نہیں ہے، مگر اس کے باوجود فقہائے عصر کے مابین مختلف فیہ ہے، تاہم حرمت راجح ہے۔

کیونکہ علامہ رافعیؒ نے ایک اصول لکھا ہے کہ جہاں اس بات کا شبہ پیدا ہو جائے کہ اس جانور کی موت چوٹ سے واقع ہوئی ہے یا زخم لگنے سے، تو وہ جانور حرام ہوگا، اگر اس اصول کو مدنظر رکھا جائے تو جانب حرمت ہی راجح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (تکملہ فتح الملہم: ۳/۴۸۹)

تعلیم کلب کا مسئلہ

تعلیم کلب کے مسئلے کا مدار عرف پر ہے، کیونکہ قرآن پاک میں ان کی تعلیم کی کوئی حد نہیں بیان کی گئی، اسی طرح حدیث میں بھی حد نہیں بیان کی گئی، اس لئے اس مسئلہ کا مدار عرف پر ہوگا، لیکن چونکہ عرف میں اختلاف ہوتا ہے اس لئے فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ تعلیم کلب کی کیا حد ہے، اور تعلیم طیور کی کیا حد ہے؟

(۱) امام احمدؒ، صاحبینؒ اور امام اعظمؒ کا ایک قول یہ ہے کہ کتے کے معلم ہونے کی تین شرطیں ہیں:
۱ بھیجنے سے چلا جائے اور روکنے سے رک جائے، ۲ شکار سے نہ کھائے بلکہ مالک کے لئے روک کر رکھے، ۳ ان دونوں کاموں کا کم از کم تین مرتبہ تجربہ ہو جائے۔

(۲) امام مالکؒ کے نزدیک صرف ایک شرط ہے: کہ بھیجا جائے تو چلا جائے اور روکا جائے تو رک جائے، کھانے نہ کھانے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(۳) امام شافعیؒ نے تعلیم کلب کا مدار عرف پر رکھا ہے کہ جب عرف میں اس کو معلم کہا جانے لگے تو معلم ہوگا، ورنہ نہیں۔

(۴) امام ابوحنیفہؒ کا اصل مذہب یہ ہے کہ تعلیم کلب کا اعتبار مبتلی بہ کی رائے پر ہے، تو گویا تمام اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام احمد، امام شافعی اور امام اعظم علیہم الرحمہ کی مابین کوئی خاص فرق نہیں تقریباً سب کا مسلک ایک ہی ہے، کیونکہ ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے عرف کے مطابق بات کہی ہے، البتہ امام مالکؒ کا مسلک ان تینوں فقہاء سے بالکل مختلف ہے، اس لئے اس مسئلہ میں اصلاً دو فریق ہو جاتے ہیں، ایک طرف امام مالکؒ اور دوسری طرف ائمہ ثلثہ اور صاحبین رحمہم اللہ۔

امام مالکؒ کی دلیل

امام مالکؒ نے اپنے مسلک کی تائید میں حضرت ابوثعلبہ الخشنی کی روایت پیش کی ہے جس میں ہے: إذا

أرسلتَ كلبك المعلم وذكرت اسم الله عليه فَكُلْ وإن أكلَ منه. (ابوداؤد:۲/۳۹۴)

جمہور کی دلیل

حضرت عدی بن حاتمؓ کی متعدد روایات جمہور کی مستدل ہیں:

(۱) فيه : فإن أكل الكلب فلاتأكل، فإني أخاف أن يكون إنما أمسكه على نفسه. (ابوداؤد:۲/۳۹۳)

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فكلوا مما أمسكن عليكم. (قرآن)

امام مالکؒ کی دلیل کا جواب

ابوثعلبہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کتے نے شکار کیا اور اس کو چھوڑ دیا، اور شکار سے جدا ہوگیا پھر دوبارہ آکر شکار سے کھالیا تو اس صورت میں کتے کے کھانے سے وہ شکار حرام نہیں ہوگا، دوسری بات یہ ہے کہ ابوثعلبہ کی روایت ضعیف ہے، جس سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ (تکملہ فتح الملہم:۳/۴۸۲)

مزید تفصیل ابوثعلبہ کی حدیث کے تحت آئے گی۔

(۵) پرندوں کی تعلیم کا مسئلہ

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پرندوں کی تعلیم یہ ہے کہ جب ان کو شکار پر چھوڑا جائے تو چلا جائے، اور جب بلایا جائے تو واپس آجائے، اور شکار کو نہ کھائے۔

باقی جمہور علماء فرماتے ہیں کہ پرندوں کی تعلیم یہ ہے کہ بھیجنے سے چلا جائے اور بلانے سے واپس آجائے، کھانے اور نہ کھانے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل

امام شافعیؒ نے اپنے مسلک کی تائید میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی اس روایت کو پیش کیا ہے جس کو امام ابوداؤدؒ نے مجالد کے طریق سے نقل کیا ہے:

عن مجالدٍ عن الشعبي عن عدى بن حاتم قال قال النبى صلى الله عليه وسلم: "ما علمت من كلبٍ أو بازٍ، ثم ارسلتهُ وذكرت اسم الله ، فكل مِمَّا أمسك عليك، قلتُ: وإن قتل؟ قال: إذا قتله ولم يأكل منه شيئاً ، فإنما أمسكه عليك".

وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے کتے اور باز کو معلم بنانے کا حکم فرمایا، اور فرمایا کہ "بسم اللہ" پڑھ کر شکار پر

چھوڑ دو، اگر وہ شکار سے نہ کھائے تو حلال ہے اور اگر کھالے تو حرام ہے، اب دیکھئے آپ ﷺ نے ترک اکل کی قید کلب اور باز دونوں سے متعلق کی ہے، کہ جس طرح اگر کتا شکار سے کھالے تو وہ حرام ہے اسی طرح باز وغیرہ بھی شکار سے کھالیں تو وہ حرام ہوگا، نیز کلب سے مراد تمام سباع ہیں، اسی طرح باز سے مراد تمام پرندے ہوں گے، اور جب باز کے ساتھ ترک اکل کی قید ثابت ہوگئی تو تمام پرندوں کے ساتھ ترک اکل کی قید ہوگی۔

جمہور کی دلیل

جمہور نے اپنے مسلک کی تائید کے لئے حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر لی ہے جس کو امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے متصلاً نقل کیا ہے:

عن ابن عباسؓ أنه قال فی الطیر: "إذا أرسلته فقتل فكُلْ، فإن الكلبَ إذا ضربتهُ لم يعد، وإن تعليم الطير أن يرجع إلى صاحبه، وليس يُضرب إذا أكَلَ من الصيد ونتف من الريش فكُلْ.

اس سے صراحۃً معلوم ہوا کہ تعلیم طیور میں کھانے اور نہ کھانے کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کلب اور طیور کی تعلیم میں یہ فرق کیوں ہے؟ تو اس کی چند وجوہات ہیں

(۱) تعلیم نام ہے عادت طبعی کو چھڑانے کا، اور پرندے کی طبعی عادت توحش ہے، یعنی وہ لوگوں سے ڈرتا اور بھاگتا ہے، پس جب اس کی یہ عادت طبعی چھوٹ جائے گی، اور وہ لوگوں کے ساتھ مانوس ہو جائے گا، بلانے سے آجائے گا اور چھوڑنے سے چلا جائے گا، تو اس کی تعلیم کو مکمل سمجھا جائے گا، برخلاف کتے کے، کیونکہ وہ لوگوں سے تو مانوس ہوتا ہی ہے، اس لئے اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ وہ بھی اپنی فطری عادت یعنی شکار کو کھانا چھوڑ دے۔

(۲) ترک اکل کتے کو تو مار کر سکھایا جا سکتا ہے، لیکن پرندوں کو مار کر ترک اکل نہیں سکھایا جا سکتا، اس لئے کہ وہ مار کو برداشت ہی نہیں کر سکتے، اس لئے دونوں کی تعلیم میں فرق کرنا ضروری ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل کا جواب

امام شافعیؒ نے جو مجالد کے طریق سے حدیث پیش کی تھی وہ روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس میں مجالد نام کے راوی ضعیف ہیں اور لفظ "باز" کی زیادتی میں متفرد ہیں، لہٰذا یہ روایت دیگر صحیح روایات کے مقابلہ میں قابل استدلال نہیں۔ (بدائع: ۴/۱۸۰، تکملہ فتح الملہم: ۳/۴۸۳)

(٦) مسئلة التسمية فی حلة الحیوان

(۱) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ شکار ہو یا ذبیحہ "بسم اللہ" کا پڑھنا سنت ہے واجب نہیں۔

(۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ذبیحہ میں "بسم اللہ" پڑھنا شرط ہے حالت عمد میں، اور حالت نسیان میں شرط نہیں، لیکن شکار کی صورت میں حالت عمد ہو یا نسیان "بسم اللہ" کا پڑھنا شرط ہے۔

(۳) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ حالت عمد میں "بسم اللہ" پڑھنا شرط ہے اور حالت نسیان میں "بسم اللہ" پڑھنا شرط نہیں، خواہ ذبیحہ ہو یا شکار۔

(۴) امام مالکؒ حالت عمد اور نسیان میں "بسم اللہ" کو شرط قرار دیتے ہیں خواہ ذبیحہ ہو یا شکار۔

امام شافعیؒ کے دلائل

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "حُرِّمَتْ عليكم الميتة" إلى قوله "إلا ما ذكّيتم" اس آیت کریمہ میں مطلق "ذکوۃ" کو حلت کا سبب قرار دیا گیا ہے، تسمیہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔

(۲) حضرت عائشہؓ کی حدیث: إن قوماً قالوا للنبي صلى الله عليه وسلم: إن قوماً يأتوننا بلحم لاندري أذُكِرَ اسمُ الله عليه أم لا، فقال: سموا عليه أنتم و كلوه. (ابوداؤد)

(۳) قوله عليه السلام: المسلم يذبح على اسم الله تعالى سمّٰى أو لم يسمِّ. (ہدایہ)

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے دلائل

(۱) ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وإنه لفسق. یہ آیت کریمہ عمداً کی صورت کو شامل ہوگی کیونکہ اس میں "إنه لفسق" کی قید کا بڑھانا اس بات پر دلیل ہے کہ ترک تسمیہ عمداً ہی مراد ہے، اس لئے کہ عمد کی صورت میں ہی فسق ہوتا ہے، ناسی تو مرفوع الحکم ہے۔

(۲) حضرت عدی بن حاتم کی حدیث: إذا أرسلت كلبك المعلم وذكرت اسم الله عليه فكُلْ. الخ یہاں پر کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی شرط لگائی گئی ہے۔ (ابوداؤد: ۲/۳۹۳)

(۳) حضرت ابوثعلبہ کی حدیث: ما صِدْتَ بقوسك فاذكر اسم الله عليه و كُلْ، وما صدت بكلبك فاذكر اسم الله و كُلْ. (بخاری، مسلم، ابوداؤد: ۲/۳۹۴)

(۴) حضرت جندبؓ بن سفیان کی حدیث: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ذبح قبل الصلاة فليذبح مكانها أخرى، ومن لم يذبح حتى صلينا فليذبح على اسم الله. (بخاری)

(۵) حضرت رافع کی حدیث: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما أنهر الدم وذكر اسم الله عليه فكل ليس السِنّ والظُفر. (بخاری) یہ پانچ دلیلیں تو حالت عمد میں ضروری ہونے کی تھیں۔

(۶) حضرت ابن عباسؓ کی حدیث: المسلم يكفيه اسمه، فإن نسي أن يسمي حين يذبح،

فاليسم وليذكر اسم الله ثم ليأكل. (حاکم مستدرک:۴/۲۳۳)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حالت نسیان میں ''بسم اللہ'' پڑھنا معاف ہے اور ذبیحہ حلال ہوگا۔

(۷) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث: سال رجل النبی صلی الله علیه وسلم : الرجل منّا یذبح وینسٰی أن یسمی الله؟ قال : اسم الله علی کل مسلم. (دارقطنی)

(۸) راشد بن سعد کی حدیث: إن النبی صلی الله علیه وسلم قال : ذبیحة المسلم حلال سمی أو لم یسمّ، مالم یتعمد، والصید کذلك. (الدرالمنثور:۳/۴۲)

(۹) حضرت ابن عباسؓ کی حدیث: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : تجاوز الله عن أمتی الخطأ والنسیان، وما استکرهوا علیه. (مشکوۃ)

(۱۰) اگر نسیان کی حالت میں بھی تسمیہ کو ضروری قرار دیں تو حرج عظیم لازم آئے گا، اور شریعت میں حرج نہیں ہے بلکہ حرج تو شرعاً مدفوع ہے، وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ"۔

امام شافعیؒ کے دلائل کے جوابات

پہلی دلیل کا جواب

اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ صرف ذبح کرنے سے جانور حلال ہو جائے گا صحیح استدلال نہیں ہے، کیونکہ "إلّا ما ذکیتم" میں ذکوۃ مع التسمیہ ہی مراد ہے، اس لئے کہ ذکوۃ کے لغوی معنی تو مراد لئے نہیں جاسکتے کیونکہ ذکوۃ کے لغوی معنی تو پھاڑنے کے آتے ہیں اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ جس کو درندے نے پھاڑ دیا ہو وہ حلال ہو، اس لئے یہاں ذکوۃ کے شرعی معنی مراد لئے جائیں گے، اور ذکوۃ کے شرعی معنی ہیں ''ذبح مع التسمیہ''۔

دوسری دلیل کا جواب

اس حدیث سے بھی استدلال تام نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ اس حدیث کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر مسلمان گوشت لے کے آئے تو اس کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یقیناً اس نے بسم اللہ پڑھی ہوگی، اس سے یہ ثابت کرنا کہ ان لوگوں نے قصداً بسم اللہ چھوڑی ہوگی محتاج دلیل ہے، حافظ ابن حجر نے بھی اس مسئلے میں حنفی مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (اعلاء السنن:۱۷/۵۷، بدائع:۴/۱۶۷)

تیسری دلیل کا جواب

امام شافعیؒ کی تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ جس روایت کو آپ نے حالت عمد کے سلسلے میں پیش کیا ہے وہ

حالت نسیان کے بارے میں ہے یعنی حالت نسیان میں اگر بسم اللہ نہ پڑھی تو اس کا ذبیحہ حلال ہوگا۔
صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کا امام شافعیؒ کا یہ مذہب کہ متروک التسمیہ عمداً حلال ہے اجماع کے خلاف ہے، کیونکہ صحابہؓ کے درمیان بھی متروک التسمیہ نسیاناً کے بارے میں تو اختلاف تھا لیکن عمداً کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں تھا، بلکہ تمام صحابہؓ کا اجماع تھا کہ متروک التسمیہ عمداً حرام ہے۔(ہدایہ:۴/۴۱۹)

امام مالکؒ کی دلیل

امام مالکؒ نے اپنے مسلک کے اثبات کے لئے اللہ تعالیٰ کے فرمان: "ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم الله عليه". کے عموم سے استدلال کیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متروک التسمیہ کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے خواہ حالت عمد میں ہو یا نسیان میں، اگر دونوں میں فرق ہوتا تو اس کی تفصیل بیان کی جاتی۔
نیز جب حالت عمد میں تسمیہ واجب ہے تو نسیان میں بھی واجب ہونی چاہئے، اس لئے کہ نسیان کسی چیز کے وجوب سے مانع نہیں ہے، جس طرح خطار کسی چیز کے وجوب سے مانع نہیں ہے، اور جس طرح نماز کے دوران کلام کرنا دونوں حالتوں (نسیان اور عمد) میں حرام ہے اسی طرح متروک التسمیہ بھی دونوں حالتوں میں حرام ہونا چاہئے۔

امام مالکؒ کی دلیل کا جواب

آیت کے عموم سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آیت تو حالت عمد کے بارے میں ہے، جس کا قرینہ "وانه لفسق" ہے، چونکہ فسق حالت عمد ہی میں ہوتا ہے، حالت نسیان میں فسق لازم نہیں آتا ہے، جہاں تک نماز کے دوران کلام کرنے کا مسئلہ ہے تو اصل یہ ہے کہ نماز میں کلام کرنا ایک نادر چیز ہے، شاید زندگی میں کسی کسی کو ہی پیش آتا ہوگا، اور جو چیز نادر ہو اس کو عذر نہیں قرار دیا جائے گا۔(بدائع:۴/۱۶۸ زکریا، البحر الرائق:۸/۳۰۷ زکریا)

(۷) چوٹ سے مرا ہوا شکار حلال ہے یا حرام؟

فقہاء کرام نے حضرت عدی بن حاتمؓ کی اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مسئلہ طے کیا ہے کہ اگر شکار کو عرضاً تیر لگا اور خون نہیں نکلا بلکہ ثقل کی وجہ سے جانور مرا تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا الا یہ کہ اس کو زندہ پکڑ لے اور پھر ذبح کرلے۔
لیکن امام اوزاعیؒ اور سعید بن مسیب وغیرہ نے اس مسئلہ میں جمہور کی مخالفت کی اور کہا کہ تیر شکار کو عرضاً لگے یا طولاً، ہر صورت میں حلال ہوگا۔

امام اوزاعی کی دلیل

ایک حدیث میں "کُلْ مما أمسکن علیك" مطلق آیا ہے جس میں خون بہانے کی کوئی شرط نہیں ہے، لہٰذا عرضاً تیر لگ جائے اور خون نہ بہے تب بھی شکار حلال ہوگا۔

جمہور کی دلیل

حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث ہے: کُلْ مَا خَزَقَ الخ یعنی حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تیر زخمی کردے تو اس کو کھالو اور "وما أصاب بعرضه فلا تأکل" اگر عرضاً تیر لگے تو مت کھاؤ۔ (ابوداود: ۲/۳۹۴)

جواب

اگر ایک حدیث میں زخم کرنے کا ذکر نہیں ہے، تو عدمِ ذکر سے عدمِ شئ لازم نہیں آتی، جبکہ دوسری متفق علیہ روایات اس کے خلاف ہیں، اس لیے یا تو اس روایت کو ان تمام روایات ہی پر محمول کرلیا جائے، ورنہ یہ روایت مرجوح ہوگی۔ (مرقاۃ: ۸/۱۰۹)

حدیث بالا سے مستنبط مسائل کی جھلک

(۱) کتے سے شکار کھیلنا جائز ہے۔
(۲) کتے کو شکار کے پیچھے چھوڑنا شرط ہے، اگر خود بخود شکار کرے تو حلال نہیں۔
(۳) کتے کا معلم ہونا ضروری ہے۔
(۴) کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے۔
(۵) سدھائے ہوئے کتے سے شکار مرجائے تو بھی حلال ہے۔
(۶) سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ دوسرا کتا مل جائے اور شکار میں شریک ہوجائے تو شکار حرام ہوگا۔
(۷) جب تیر سے مارے تو خون نکلنا شرط ہے۔

۱۹۸ ﴿حَدَّثَنا هنّاد بنُ السریُّ قال أخبرَنا ابنُ فُضَيْلٍ عَن بيانِ بنِ عامِرٍ عَن عَدِیّ بنِ حَاتِمٍ قال: سألتُ رسولَ اللّٰه صلی الله علیه وسلم قلتُ : إنا نَصِيدُ بهٰذِهِ الكِلاَبِ، فقَالَ لِیْ : إذَا أَرْسَلْتَ كِلاَبَكَ المعلَّمةَ وذكرتَ اسمَ اللّٰهِ عليها ، فَكُلْ مِمّا أَمْسَكْنَ عَلَيكَ وَ إنْ قَتَلَ ، إلاَّ أَنْ يأكُلَ الكلبُ ، فإنْ أكَلَ الكلبُ فلاَ تأكُلْ ، فإنّی أخافُ أنْ يكونَ إنّما أمْسَكَهُ علىٰ نَفْسِه.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ ہم ان معلم کتوں کے ذریعہ شکار کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم اپنے سدھائے ہوئے کتوں کو چھوڑو اور بسم اللہ پڑھ لو، تو جس شکار کو تمہارے کتے تمہارے لئے روک کر رکھیں اس کو کھالو، اگر چہ اس شکار کو قتل ہی کر دیں، مگر یہ کہ اس شکار سے کتا کھالے اگر کتا کھالے تو اس کو مت کھاؤ، اس لئے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اس کتے نے شکار اپنے لئے ہی روک کر رکھا ہو۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث شریف کا حاصل یہ ہے کہ جب کتے کو شکار پر چھوڑا جائے، تو بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا جائے، پھر وہ کتا بھی ایسا تربیت یافتہ اور سدھایا ہوا ہو کہ شکار کو اپنے مالک کے لئے روک کر رکھے خود بالکل بھی شکار کو نہ کھائے، اور اگر کتا ایسا نہیں ہے بلکہ وہ شکار سے کھالیتا ہے، تو پھر وہ شکار حرام ہوگا، کیونکہ اس نے درحقیقت اپنے لئے شکار کیا ہے مالک کے لئے نہیں، اور قرآن پاک میں "مما أمسكن عليكم" کی قید ہے، باقی حدیث سے متعلق مفصل کلام گزر چکا ہے، دیکھ لیا جائے۔

۱۹۹ ﴿حَدَّثَنا موسٰى بنُ إسمعيلَ قال نا حمّاد عَن عاصمِ الأحولِ عَن الشَعْبِيّ عن عَدِيّ بنِ حاتمٍ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قالَ: إذَا رَمَيْتَ سَهْمَكَ، وذكرتَ اسمَ اللّٰه عليهِ، فوجدتَه مِنَ الغَد، ولم تَجِدْهُ فِي ماءٍ، ولَا فِيهِ أَثَرُ غَيْرِ سَهْمِكَ فَكُلْ، وإذَا اختلَطَ بِكِلَابِكَ كَلْبٌ مِنْ غَيْرِهَا فَلَا تَأكُلْ، لَا تَدرِي لَعَلَّهُ قَتلَهُ الذي لَيسَ مِنهَا.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم بسم اللہ پڑھ کر اپنے تیر سے شکار کرو، لیکن اس شکار کو دوسرے دن اس حالت میں پاؤ کہ نہ تو وہ پانی میں گرا ہے، اور نہ ہی اس میں تمہارے تیر کے علاوہ دوسرے تیر کا نشان ہے، تو تم اس کو کھالو، اور جب تمہارے معلم کتے کے ساتھ کوئی دوسرا غیر معلم کتا شریک ہو جائے تو بھی شکار مت کھاؤ، اس لئے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہوسکتا ہے اس کو کسی دوسرے غیر معلم کتے نے مارا ہو۔

تشریح مع تحقیق: امام بخاریؒ نے بھی اسی معنی کی حدیث نقل کی ہے، اسی طرح امام مسلمؒ نے بھی اس طرح کی حدیث کئی سندوں کے ساتھ ذکر کی ہے، اس حدیث سے متعلق کئی مسئلے ہیں، جن کی طرف ہم ماقبل میں اشارہ کر چکے ہیں، تاہم دو مسئلوں کی وضاحت ضروری ہے:

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جانور کو تیر مارا اور وہ تیر جانور کو لگ گیا، لیکن اتفاق یہ ہوا کہ وہ زخمی شکار بھاگ گیا، اب یا تو وہ جانور ایک دو دن میں زندہ ہی مل جائے گا یا مردہ ملیگا، اگر یہ جانور زندہ ملے تو کوئی مسئلہ نہیں اس کو

ذبح کرلیا جائے گا، بغیر ذبح کیے ہوئے حلال نہیں ہوگا، اور اگر اس جانور کو جس کو ایک یا دو دن پہلے تیر مارا تھا مردہ پایا تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں، یا تو شکاری اس کو برابر تلاش کرتا رہا ہوگا، پھر وہ مل جائے، اور اس میں کسی دوسرے تیر یا کسی درندے کے پھاڑنے کا کوئی نشان نہیں ہے تو اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس جانور کو کھانا جائز ہوگا۔

البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ جانور ایک رات گزر جانے کے بعد ملا ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں، اور اگر ایک رات کے گزرنے سے پہلے مل جائے تو پھر اس کا کھانا حلال ہوگا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی اس شکار کا کھانا جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ شکار کے پیچھے مسلسل دوڑتا رہا ہے اور پھر اس کو پائے زندہ ہونے کی حالت میں، مردہ ہونیکی حالت میں تو مطلقاً جائز ہی نہیں ہے، امام رافعیؒ (بہت بڑے محدث ہیں شافعی المسلک ہیں) فرماتے ہیں لَوْ جَرَحَه ثُم غَاب ثُم جَاء وجدهٗ میتاً أنه لایحل، وھو ظاھر نص الشافعی فی "المختصر" لیکن امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ دلیل کے اعتبار سے قوی اور طاقت ور بات یہ ہے کہ اس کا کھانا حلال ہوگا، امام بیہقیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے قول: "کل ما أصمیت و دع ما أنمیت". کے بارے میں امام شافعیؒ کے بیان کردہ معنی کا تذکرہ کیا ہے، کہ امام شافعیؒ اس قول کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ "ما أصمیت" کے معنی ہیں "ما قتله الکلب وأنت تراه" یعنی جس کو کتے نے تمہارے سامنے قتل کیا ہو، اس کو کھالو، اور "ما أنمیت" کے معنی ہیں "ماغاب عنك مقتله" جو تمہارے سامنے قتل نہ کیا گیا ہو وہ حرام ہے۔

لیکن حنفیہ فرماتے ہیں کہ ضرورت کی وجہ سے تلاش وجستجو کو سامنے قتل ہونے کے قائم مقام کردیا جائے گا۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس جانور میں کسی دوسرے تیر وغیرہ کا نشان نہیں ہے تو مطلقاً اس کا کھانا حلال ہوگا۔ (فتح الباری: ۷/۶۲۷، بذل: ۴/۸۹، المغنی لابن قدامہ: ۱۱/۲۰)

حضور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ مردہ جانور پانی میں نہ ملا ہو، کیونکہ اگر پانی میں ملے گا تو اس کی موت دو سببوں محرم اور مبیح کے درمیان متردد ہوگی، جیسا کہ آنے والی حدیث میں اس کی وضاحت آرہی ہے، "إنك لاتدری الماء قتله أو سهمك".

اسی طرح ارشاد فرمایا کہ اگر معلم کتے کے ساتھ غیر معلم کتا شریک ہوجائے، تو شکار حلال نہیں ہوگا، اور اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ اس شکار میں دو سبب جمع ہوگئے ایک حلت کا اور دوسرا حرمت کا، اگر شکاری کتے نے قتل کیا ہے تو حلال ہے اور اگر غیر شکاری کتے نے کیا ہے تو حرام ہے اور یہ بات ماقبل میں گزر چکی ہے کہ جہاں حلت اور حرمت کے دو سبب جمع ہوجائیں وہاں حرمت کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ (فتح الباری: ۷/۷۵۰)

۲۰۰ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ یحیٰ بنُ فارسٍ قال أنا أحمد بنُ حنبل قال نا یحیٰ بن زکریا

بن أبی زائدةَ قال أخبرنی عاصمٌ الأحولُ عن الشعبی عن عدی بن حاتمٍ أنَّ النبی صلی الله علیه وسلم قال :إذَا وَقَعَتْ رَمِیَّتُكَ فی ماءٍ ، فغَرِقَتْ فمَاتَتْ فلاَ تأكُلْ. ﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہارا شکار پانی میں گر جائے، اور ڈوب کر مر جائے تو اس کو مت کھاؤ۔

تشریح مع تحقیق: اگر جانور کے مرنے کے دونوں احتمال برابر ہوں کہ آیا تیر سے ہلاک ہوا ہے یا پانی سے ہلاک ہوا ہے، تو اس شکار کو کھانا جائز نہیں ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اگر ذبیحہ کا گلا کاٹ دیا گیا، اور پھر وہ ذبیحہ پانی میں گر گیا، تو اس وقت غالب گمان یہ ہے کہ اس ذبیحہ کی موت قطع حلقوم کے نتیجے میں ہوئی ہے، اور اس ذبیحہ کا خون بہہ گیا ہے، اس لئے اس صورت میں اس جانور کو کھانا جائز ہے، لیکن جہاں دونوں سبب برابر کا احتمال رکھتے ہوں وہاں کھانا جائز نہیں۔

اسی کو حافظ ابن حجرؒ نے یوں بیان کیا ہے: فلو تحقق أن السهم أصابه فمات، فلم يقع فی الماء إلا بعد أن قتله السهم، فهذا يحل أكله، ويؤيده قوله عليه السلام فی رواية مسلم "فإنك لاتدری الماء قتله أو سهمك" فدل على أنه إذا علم أن سهمه هوالذی قتله أنه يحلّ. (فتح الباری: ۷/۶۳)

لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ اگر ظن غالب یہ ہے کہ میرے تیر نے اس کو ہلاک کیا ہے، اور اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو اس جانور کو کھانا جائز ہے۔

۲۰۱ ﴿حَدَّثَنا عثمانُ بنُ أبی شیبةَ قالَ نا عبدُاللّٰهِ بنِ نُمیرٍ قالَ نا مُجالِدٌ عَنِ الشعبیِّ عَنْ عدیِ بنِ حاتمٍ أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم قال : ماَ علّمتَ مِنْ کلبٍ أو بازٍ ثم أرْسَلْتَهُ ، وذکرتَ اسمَ الله علیه فَکُلْ ممّا امْسَكَ عَلیكَ ، قلتُ : وإنْ قَتَلَ ؟ قالَ : إذَا قتَلَهُ ولم یأکُلْ مِنْهُ شیئاً ، فإنّما أمْسكَهُ عَلَیكَ. ﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کتے یا باز کو تم نے سدھایا ہو اور پھر تم نے اس کو شکار پر چھوڑا اور اللہ کا نام لیا تو جس شکار کو تمہارے لیے اس نے پکڑا ہو اس کو کھالو، حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اگر وہ مار ڈالے تو کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اس کو مار ڈالے اور اس میں سے کچھ نہیں کھایا تو سمجھو کہ اس نے تمہارے لئے ہی پکڑا ہے۔

تشریح مع تحقیق: اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر پرندے بھی شکار کے جانور سے کچھ کھالیں تو شکار حلال نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر کتا شکار سے کھالے تو جانور حلال نہیں رہتا، یہ ہی مسلک حضرت امام شافعیؒ کا ہے، لیکن جمہور علماء چند وجوہات کے پیش نظر یہ کہتے ہیں کہ پرندے اگر شکار سے کھالیں تو شکار حلال

ہوگا، اور اگر کتا شکار سے کھالے تو حرام ہوگا، یعنی پرندوں اور کتوں کی تعلیم میں فرق ہے، اور یہ فرق جمہور نے کیوں کیا ہے اس کی وجوہات ہم باب کے شروع میں کر چکے ہیں، لہٰذا وہاں دیکھ لیا جائے، تاہم اس روایت کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند میں مجالد نام کے راوی ضعیف ہیں اور لفظ "باز" کی زیادتی میں منفرد ہیں، اس لئے یہ روایت قابل استدلال نہیں۔ (بدائع ۴/۱۸۰)

۲۰۲ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ عِیسٰی .قالَ نا هُشیمٌ قال أخبَرَنَا داوٗدُ بنُ عمروٍ عَن بُسر بنُ عبیدِ اللهِ عَن أبی إدرِیسَ الخَولَانیِّ عَنْ أبی ثَعْلبَةَ الخشنیِّ قال : قال النبیُّ صلی الله علیه وسلم فی صَیْدِ الکَلْبِ : إذَا أرسَلْتَ وذَکرتَ اسمَ الله فکُلْ ، وَ إنْ أکَلَ مِنهُ ، کُلْ مَا رَدَّتْ عَلَیْکَ یَدُکَ .﴾

ترجمہ: حضرت ابوثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے کتے کے شکار کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جب تم اللہ کا نام لیکر اپنے کتے کو چھوڑ و تو شکار کو کھالو، اگر چہ کتے نے اس میں سے کھالیا ہو، اور جس جانور کا شکار تمہارے ہاتھ نے کیا ہے اس کو بھی کھاؤ۔

تشریح مع تحقیق: اس روایت سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کتا شکار سے کھالے تو بھی شکار حرام نہیں ہوتا، جبکہ دوسری روایات مثلاً حضرت عدی بن حاتمؓ کی روایت: فإن أکل الکلب فلا تأکل الخ اس کے معارض ہیں، حضرت امام مالکؒ نے اسی حدیث کو اپنا مستدل بناتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کتے کے معلم ہونے کے لئے ترک الاکل من الصید شرط نہیں ہے، جس طرح پرندوں میں ترک اکل شرط نہیں ہے، لیکن جمہور کا مسلک اس سے مختلف ہے، ان کے یہاں کتے کے معلم ہونے کے لئے ترک الاکل شرط ہے، ہم اس مسئلہ کی وضاحت "کتے کی تعلیم کا مسئلہ" کے عنوان سے ماقبل میں کر چکے ہیں۔

تاہم حدیث بالا کا جواب یہ ہے: کہ حضرت ابوثعلبہ خشنی کی اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ کتے نے شکار کیا اور اس کو چھوڑ دیا، اور شکار سے بالکل الگ ہو کر چلا گیا، مالک کو شکار اٹھانے میں دیر ہوئی تو یہ کتا دوبارہ آیا اور اس سے کچھ کھالیا تو اس صورت میں کتے کے کھانے سے شکار حرام نہیں ہوگا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابوثعلبہ کی حدیث کے مقابلہ میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث مقدم ہوگی، کیونکہ ابوثعلبہ کی حدیث میں ایک راوی داؤد بن عمرو ضعیف ہیں امام احمدؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام عجلی نے لکھا ہے: "یُکتَبُ حدیثه ولیس بالقوی. عبداللہ بن احمد نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ وہ مقارب الحدیث ہیں، البتہ ابن حبان نے اپنی ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ متکلم فیہ راوی ہیں، اس لئے ان کی یہ حدیث متفق علیہ روایات کے مقابلہ میں مرجوح ہوگی۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث قرآن کی آیت: "فکلوا مما أمسکن علیکم" کے صریح مخالف ہے، اس لیے قرآن کی آیت کو ہی ترجیح ہوگی۔ (تکملۂ فتح الملہم:۳/۴۸۲، بذل:۴/۹۰)

۲۰۲ ﴿حَدَّثنا الحسنُ بنُ معاذِ بنِ خليفٍ قال عبدُالأعلىٰ قال نا داوٗدُ عن عامرِ بنِ عديِ بنِ حاتمٍ أنه قال: يا رسولَ الله! أحدنا يَرْمِيُ الصَّيدَ ، فيَقْتَفِيُ أثْرَهُ اليَوْمَيْنِ و الثلاثَةَ ثم يَجِدُهُ مَيتاً وفيهِ سَهْمُهُ ايأكُلُ؟ قال : نعم إنْ شاءَ أو قالَ يأكلُ إنْ شاءَ.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! کوئی ہم میں سے تیر مارتا ہے شکار کو، اور پھر دو تین دن تک اس کے نشان کو تلاش کرتا رہتا ہے، حتی کہ اس کو مرا ہوا پالیتا ہے اور اس میں اس کا تیر لگا ہوا ہوتا ہے، تو کیا یہ شخص اس شکار کو کھا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ہاں، اگر چاہے تو کھالے۔

تشریح مع تحقیق: یرمی الصیدَ : (ض) شکار پر تیر چلانا۔

یَقْتَفِي: (افتعال) پیچھے چلنا، إقْتَفیٰ أثرهُ : نقش قدم پر چلنا، نشان تلاش کرنا، پتہ لگانا، بخاری شریف کی روایت میں اقتفی کی جگہ افتقار سے یَفْتَقِرُ ہے، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ شکار کو بسم اللہ پڑھ کر تیر مارا، تیر لگنے کے بعد وہ جانور بھاگ گیا لیکن شکاری اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا اور تلاش کرتا رہا اور دو یا تین دن کے بعد وہ شکار اس کو مرا ہوا ملا تو اب اس شکار کو کھا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ شکاری کا تیر اس جانور میں موجود ہے؟ جب یہ مسئلہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو مشیت پر چھوڑ یا، کہ اگر طبیعت چاہے تو کھالو، اور اگر طبیعت نہ چاہے تو مت کھاؤ، بعض روایات میں یہ ہے کہ اگر وہ سڑا نہیں ہے اور اس میں بدبو پیدا نہیں ہوئی ہے تو کھالو ورنہ نہیں۔

اب اس حدیث میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا کھانے اور نہ کھانے کو مشیت پر موقوف رکھنا کسی احتمال کی بنیاد پر ہے، کیونکہ ممکن ہے کسی اور سبب سے اس کی موت ہوئی ہو، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں گوشت لائے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کہاں سے لائے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ کل میں نے ایک شکار کو تیر مارا تھا، لیکن اس وقت شکار بھاگ گیا اور میں اس کو مسلسل تلاش کرتا رہا، یہاں تک کہ رات ہوگئی، پھر آج مجھے یہ شکار اس حالت میں ملا کہ میرا تیر اس کے جسم میں موجود تھا، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تم سے غائب ہو گیا تھا، اور ممکن ہے کہ کسی اور چیز نے اس کو مارا ہو، اس لئے میں اس کو نہیں لیتا، اگر چہ یہ روایت کمزور ہے کیونکہ اس کی سند میں عبدالکریم موجود ہے، لیکن یہ ضرور ثابت ہوا کہ شبہات سے حتی الامکان بچنا چاہئے، خود باب کی روایت میں بھی کھانے اور نہ کھانے کا اختیار دینا اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ

شبہ کی بنیاد پر نہ کھانا افضل ہے، اگرچہ شرعاً یقین اور ظن غالب کے مقابلہ میں شبہ کا اعتبار نہیں ہے۔ (بذل المجہود: ۸۹/۴)

۲۰۴ ﴿حَدَّثَنَا محمدُ بنُ كثيرٍ قالَ أخبرنا شعبةُ عن عبدِاللّٰه بنِ أبى السفرِ عن الشعبيِّ قال : قال عديُّ بن حاتمٍ : سالتُ رسولَ الله ﷺ عَنِ المِعْرَاضِ، فقالَ: إذَا أصابَ بحدِّهِ فَكُلْ ، وإذَا أصابَ بِعَرْضِهِ فلَا تَاكُلْ ، فَإِنَّهُ وَقِيْذٌ، فقلتُ: أرْسِلُ كَلْبِىْ قَالَ إِذَا سَمَّيْتَ فَكُلْ وَإِلَّا فَلا تَاكُلْ وَإِنْ اَكَلَ مِنْهُ فَلا تَاكُلْ فَإِنَّمَا اَمْسَكَ لِنَفْسِهٖ فَقَالَ: اَرْسِلُ كَلْبِىْ فأجِدُ عَلَيهِ كلباً آخرَ ؟ فقال : لَاتَاكُلْ ، لِأَنَّكَ سَمَّيْتَ علىٰ كَلْبِكَ.﴾

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے معراض کے بارے میں سوال کیا، تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ جب وہ شکار پر دھار کی طرف سے لگے تو کھاؤ، اور جب چوڑائی کی طرف سے لگے تو مت کھاؤ، کیوں کہ وہ موقوذہ ہے، میں نے عرض کیا کہ میں اپنا کتا چھوڑتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بسم اللہ پڑھ کر چھوڑ و تو کھاؤ، ورنہ نہ کھاؤ، اور اگر کتے نے اس میں سے کھالیا ہے تو بھی مت کھاؤ، اس لئے کہ اس نے اپنے لئے شکار کیا ہے، راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ میں اپنا کتا شکار پر چھوڑتا ہوں، اور اس پر دوسرے کتے کو پاتا ہوں؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ اس شکار کو مت کھاؤ، اس لئے کہ تم نے اپنے کتے پر "بسم اللہ" پڑھی ہے، (دوسرے پر نہیں۔)

تشریح مع تحقیق :وَقِيْذٌ (ج) وَقَائِذُ اسم مفعول کے معنی میں ہے، وہ جانور جو بغیر دھار کے آلہ سے ذبح کیا گیا ہو۔

اس حدیث کے تمام اجزاء کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے، تاہم اجمال یہ ہے کہ "إذا أصاب بحدّه" سے یہ ثابت ہوا کہ ذکوۃ شرعی (اختیاری واضطراری) میں خون کا بہنا شرط ہے، اور "إذا سميت فكُلْ" سے وجوب تسمیہ علی الذبح کی طرف اشارہ ہے، جو اکثر ائمہ کے نزدیک واجب ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک مستحب ہے، تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے، "إن أكل منه فلا تاكل" سے اس طرف اشارہ ہے کہ غیر معلم کتے کا شکار حرام ہے، اور تعلیم کلب کے لئے ترک اکل شرط ہے۔

فأجد عليه كلباً آخر الخ سے اِس اصول کی طرف اشارہ ہے کہ جب حلت وحرمت کے دو سبب جمع ہوجائیں تو حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی دوسرے کتے کے شکار میں شریک ہونے کی تین صورتیں نکلتی ہیں، (۱) یا تو کلب آخر خود آکر شکار میں کلب معلم مرسل بذکر التسمیہ کے ساتھ شریک ہوا، (۲) یا کلب آخر کو کسی ایسے شخص نے چھوڑا ہے جو اہل ذکاۃ میں سے نہیں ہے جیسے مثلاً چھوڑنے والا مجوسی ہو، (۳) کلب آخر کو بھی کسی مسلمان

یاجو اہل ذکوۃ میں سے ہیں نے بسم اللہ پڑھ کر چھوڑا ہے۔
پہلی دونوں صورتوں میں شکار حرام ہے، تیسری صورت میں شکار حلال ہے۔ واللہ اعلم

۲۰۵ ﴿حَدَّثَنا هنادُ بنُ السريّ عن ابنِ المباركِ عن حيوة بنِ شُرَيحٍ قال سمعتُ ربيعةَ بنَ يزيدٍ الدمشقِيَّ يقولُ أخبرني أبوإدريسَ الخَوْلَانِيُّ قالَ سمعتُ أباثعلبةَ الخشنيَّ يقول قلتُ : يارسولَ الله ! إنّي أصِيْدُ بِكَلْبِيَ المعلَّم ، وبكلبِيَ الذى لَيْسَ بِمُعَلَّمٍ ؟ قال : ماصِدتَ بكَلْبِكَ المعلَّم فاذْكُر اسمَ اللهِ وكُلْ ، ومَا صِدتَ بكلبِكَ الذى لَيْسَ بمعلَّمٍ ، فادركت ذكوٰتَهٗ فكُلْ.﴾

ترجمه: حضرت ابوثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں سدھائے ہوئے اور بغیر سدھائے ہوئے کتے سے شکار کرتا ہوں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا جو شکار کلب معلم سے کرو اور بسم اللہ پڑھلو تو اس کو کھالو، اور جو شکار کلب غیر معلم سے کرو اور اس کی ذکاۃ کو پالو تو اس کو بھی کھالو۔

تشریح مع تحقیق: مطلب یہ ہے کہ اگر معلم کتے سے بسم اللہ پڑھکر شکار کیا ہے تو وہ حلال ہے، اس کو دوبارہ ذبح کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور اگر کلب غیر معلم سے شکار کیا ہے اور شکار زندہ مل جائے تو اس کو ذبح کر کے کھالو، اور اگر مردہ ملے تو اس کا کھانا حرام ہے، یہاں ذکوۃ سے مراد جانور کا زندہ ملنا اور پھر اس کو ذبح کرنا ہے۔ (مستفاد از تقریر حضرت الاستاذ)

۲۰۶ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ المُصَفّٰی قال نا محمدُ بنُ حربٍ ح و حدثنا أبوعَلِيٍّ قال نا أبوداؤد قال ح وحدثنا محمدُ المصفّٰی قال نا بقيةُ عن الزُبَيدِيِّ قالَ نا يونسُ بنُ يوسفَ قال نا أبوإدريسَ الخَوْلَانِيُّ قال حدثني أبوثَعلبةَ الخشنيُّ قال : قَالَ لِيْ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : يا ثعلبةُ ! كل ما رَدَّتْ عليكَ قَوْسُكَ و كلبُكَ ، وزادَ عن ابنِ حربٍ المعلَّم ويَدكَ فكُلْ ذَكِيّاً وَغيرَ ذَكِيٍّ.﴾

ترجمه: حضرت ابوثعلبہ الخشنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے ابوثعلبہ! اس جانور کو کھاؤ جس کو تمہاری کمان اور تمہارا کتا لوٹادے، ابن حرب کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ وہ کتا معلم ہو، اور جس کو تمہارے ہاتھ نے شکار کیا ہو اس کو کھالو، خواہ مذبوحہ ہو یا غیر مذبوحہ۔

تشریح مع تحقیق: مطلب یہ ہے کہ جو جانور تم اپنے تیر کمان سے شکار کرو اسی طرح جو کلب معلم سے شکار کرو تو اس کو ذبح (اختیاری یا اضطراری) کی شرائط کے ساتھ کھا سکتے ہو۔

قوله : زاد عن ابن حرب الخ اس حدیث کی یہاں دو سندیں ہیں، اور دونوں زبیدی پر آکر ایک ہو جاتی

ہیں، وہ اس طرح کہ زبیدی کے دوشاگرد محمد بن حرب اور بقیہ اس حدیث کو زبیدی سے نقل کرتے ہیں، لیکن بقیہ "ماردت عليك قوسك و كلبك" کے الفاظ سے روایت کرتے ہیں اور محمد بن حرب "ماردت عليك يدك و كلبك المعلم" کے الفاظ سے روایت کرتے ہیں، امام ابوداؤدؒ نے یہاں پر اسی اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ذكياً أو غير ذكيّ : اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ذکی سے مراد وہ جانور ہے جس کو کتے نے روک لیا ہو اور جانور ابھی زندہ ہے پھر مالک اس کو ذبح کرے گا، اور غیر ذکی سے مراد یہ ہے کہ وہ جانور مالک کے پاس آنے سے پہلے ہی مرجائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے ذکی سے مراد وہ جانور ہو جس کو کتا زخمی کردے اور اس کا خون بہہ جائے، اور غیر ذکی سے مراد وہ جانور ہو جو مالک کو زندہ ملے یعنی وہ کتے کا ذبح کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ مالک اس کو ذبح کرے گا۔

۲۰۷ ﴿حَدَّثَنا محمد بنُ المنهَال الضرير قال نا يزيدُ بنُ زُرَيعٍ قال نا حَبِيبٌ المعلّم عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدّه أن أَعرابِياً يقال له : أبوثعلبةَ قال : يا رسولَ الله! إنّ لي كِلَاباً مكلبةً ، فأَفْتِنِيْ في صَيْدِهَا ؟ فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم : إنْ كَانَ لكَ كِلاباً مكلبةً فكُلْ ممَّا أمْسَكْنَ عليْكَ ، قال : ذَكِيّاً أو غَيْرَ ذكِيٍّ ؟ قالَ : نَعَمْ ، قالَ : فإنْ اكل مِنه ؟ قالَ : وإنْ أَكَلَ مِنْهُ ، قَالَ : يا رسولَ الله ! افتِنِى فِى قَوْسِىَ ؟ قالَ : كُلْ ما رَدَّتْ عليكَ قوسُك ، قال : ذكياً أو غيرَ ذكيٍّ، قال : وإنْ تَغِيبُ عَنّى ؟ قال: وإن تَغِيْبَ عَنْكَ مالم يَصِلَّ او تَجِدْ فِيْهِ أَثَرُ غيرِ سَهْمِكَ ، قال : افْتِنِىْ فى آنِيَةِ الْمَجُوسِ إذا اضْطَرَرْنَا إلَيْها ؟ قال : اغْسِلْهَا و كُلْ فِيْها.﴾

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی جس کا نام ابوثعلبہ تھا نے حضور ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ! میرے پاس شکاری کتے ہیں، آپ ان کے بارے میں حکم فرمادیجئے؟ (مسئلہ بتادیجئے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے پاس سدھائے ہوئے کتے ہیں تو کھاؤ اس جانور کو جس کو وہ تمہارے لئے پکڑ کر لائیں، حضرت ابوثعلبہؓ نے عرض کیا کہ میں اسکو ذبح کرسکوں یا نہ کرسکوں تب بھی، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، حضرت ابوثعلبہؓ نے عرض کیا کہ اگرچہ وہ کتے اس جانور میں سے کھالیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ وہ اس جانور میں سے کھالیں، حضرت ابوثعلبہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ مجھے میرے کمان کے بارے میں بتلایئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس جانور کو تمہارا تیر لوٹائے اس کو کھالو، خواہ تم اس کو ذبح کرو یا نہ کرو، حضرت ابوثعلبہؓ نے عرض کیا کہ اگرچہ شکار تیر کھا کر میری نظر سے غائب ہوجائے؟ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ ہاں! اگرچہ وہ تم سے غائب ہوجائے،

جب سڑے نہیں، اورتم اپنے تیر کے سوا اس میں کوئی نشان نہ پاؤ، حضرت ابوثعلبہؓ نے سوال کیا کہ آپ ﷺ مجوسیوں کے برتنوں کے بارے میں حکم فرمایئے؟ جبکہ ہم ان کی طرف مجبور ہوجائیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کو دھولواوران میں کھالو۔

تشریح مع تحقیق: يَصِلّ : بفتح الياء و كسر الصاد وفتح اللام المشددة ، بمعنی يتغير، صلّ اللحم صلولاً : أنتن، گوشت کا بدبودار ہونا، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سڑا بدبودار گوشت نہیں کھانا چاہئے، لیکن یہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے گوشت کا کھانا ثابت ہے، ہاں اگر اتنا خراب ہوگیا کہ اس کے کھانے سے جان کا اندیشہ ہو تو پھر اس کا کھانا حرام ہوگا، یہی حکم تمام کھانوں کا ہے۔

كل مما أمسكن عليك : اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جانور کو شکاری کتا تمہارے لئے روک لے تو اس کو کھالو، خواہ وہ تم کو زندہ ملے، یا مردہ ملے، یعنی اگر زندہ ملا ہے تو ذبح کر کے کھالو، اور اگر مردہ ملا ہے، اور کتے نے اس کو زخمی کر کے خون بہادیا تھا، تو اس کو بھی کھالو۔

وأكل منه : اس جملے کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس جانور کو شکاری کتا تمہارے لئے روک لے اور اس سے نہ کھائے، پھر جانور کو چھوڑ کر الگ ہوجائے، اس کے بعد دوبارہ اس شکار کے پاس جا کر اس میں سے کھالے تو اب اس شکار کا کھانا حرام نہیں ہوگا، کیونکہ اس کتے نے اصالۃً تو تمہارے لئے ہی شکار کیا ہے، اگر اس جملے کا ظاہری معنی مراد لیا جائے تو یہ روایت جمہور کے خلاف ہوگی۔

افتني في قوسي : سوال کا مقصد یہ ہے کہ میں تیر سے شکار کرتا ہوں، اس لئے اس کے بارے میں بھی مسئلہ بتلا دیجئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حلال ہے ذکی ہو یا غیر ذکی، یعنی اگر زندہ پاؤ تو ذبح اختیاری یعنی حلق اور لبہ میں ذبح کرنا ضروری ہے، اور اگر مردہ پاؤ تو کلب یا باز وغیرہ کا زخمی کر کے خون بہادینا کافی ہے۔

افتني في آنية المجوس : مطلب یہ ہے بسا اوقات ہمیں بڑی ضرورت پڑتی ہے کہ مجوسیوں کے برتنوں کو استعمال کریں، اس لیے اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے بڑے ہی محتاط انداز میں ارشاد فرمایا کہ ان کو دھو کر استعمال کرلو۔

اسکے علاوہ بخاری شریف کی روایت میں ہے: أمّا ما ذكرت من آنية أهل الكتاب فإن وجدتم غيرها فلا تاكلوا فيها، وإن لم تجدوا فاغسلوها وكلوا فيها، اصل یہ ہے کہ ان کے برتنوں میں نہ کھانے کا حکم احتیاط کے پیش نظر ہے، اور اس کے کئی سبب ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ مشتبہ چیز سے بچنا ہی چاہیے، دوسرے یہ کہ اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ حتی الامکان ان کے مستعمل برتنوں میں کھانے پینے سے احتیاط رکھو اور احتراز کرو،

اگر چہ ان کو دھولیا ہو، اور تیسرے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات زیادہ سے زیادہ راسخ اور مضبوط کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان کا ملی تقاضہ ہر وقت اور ہر صورت میں رہنا چاہئے، کہ وہ ان کے ساتھ باہمی اختلاط اور رہن سہن سے نفرت کریں، تاہم یہ حکم کہ ان کے برتنوں میں مت کھاؤ'' دراصل تقویٰ کی راہ ہے'' جہاں تک فتوے کا تعلق ہے تو بخاری کی روایت میں آگے اس کی خود وضاحت ہے:

کہ ان کے برتنوں کو دھولو، مانجھ لو، یہ حکم اس صورت میں تو بطریق وجوب ثابت ہوگا، جبکہ ان کے برتنوں کے نجس اور ناپاک ہونے کا ظن غالب ہو، اور اس صورت میں بطریق استحباب ہوگا جبکہ ناپاک ہونے کا ظن غالب نہ ہو۔

ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے غیر مسلموں کے ان برتنوں کو دھونے کا حکم دیا ہے جن کی نجاست اور ناپاکی کا یقین ہو، اور اگر ناپاکی اور نجاست نہیں ہے تب بھی ان کے برتنوں کو بغیر دھوئے استعمال کرنا مکروہ ہے البتہ یہ کراہت تنزیہی ہے۔

علامہ برماویؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ بخاری کی حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن موجود ہیں تو اس صورت میں ان برتنوں کو دھو کر بھی استعمال نہیں کیا جائے گا، جبکہ فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ ان کے برتنوں کو دھولینے کے بعد استعمال کرنا بہر صورت جائز ہے، خواہ دوسرے برتن مل سکتے ہوں یا نہ مل سکتے ہوں؟

اس صورت میں یہ جواب دیا جائے گا کہ حدیث بخاری ان برتنوں کے بارے میں ہے، جن میں خنزیر کا گوشت پکایا جاتا ہو، یعنی وہ برتن نجس ہوں، اور فقہاء کا قول عام برتنوں کے بارے میں ہے یعنی وہ برتن خنزیر وغیرہ کے گوشت میں مستعمل نہیں ہوتے۔ (بذل المجہود: ۴/۹۱، فتح الباری: ۷/۷۷، ایضاً ۹/۶۰۶، تکملہ فتح الملہم: ۳/۴۹۶، ہندیہ: ۵/۳۴۷)

﴿بَاب إذا قطع من الصيد قطعة﴾

شکار کے کسی حصے کے کاٹ لینے کا بیان

۲۰۸ ﴿حَدَّثَنا عثمانُ بنُ أبي شَيْبَةَ قال نا هاشم بنُ القاسِمِ قالَ عبدُالرحمنِ بنُ عبدِاللهِ بنِ دينارٍ عَنْ زيدِ بنِ أسلم عن عطاءِ بنِ يسارٍ عن أبي واقدٍ قال : قال النبيُّ صلى الله عليه وسلم : مَا قُطِعَ مِنَ البَهِيمَةِ ، وهِيَ حَيَّةٌ ، فَهِيَ مَيْتَةٌ.﴾

ترجمہ: حضرت ابو واقدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جانور کا جو حصہ اس کے

زندہ ہونے کے وقت میں ہی کاٹ لیا جائے تو وہ کٹا ہوا حصہ میتہ ہے۔

تشریح مع تحقیق : اس باب کو قائم کر کے امام ابوداؤدؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر جانور سے گوشت کا کوئی ٹکڑا کاٹ لیا جائے تو وہ کاٹا ہوا ٹکڑا حرام ہوگا، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ اگر رگوں کے کٹ جانے کے بعد جبکہ جانور ابھی تڑپ رہا ہو اگر کسی نے گوشت کا کوئی حصہ کاٹ لیا تو وہ حلال ہوگا، کیونکہ اصلاً یہاں پر جانور ذبح ہو چکا ہے، حضرت ابوواقد لیثی کی مذکورہ روایت ترمذی شریف میں قدرے تفصیل سے آئی ہے، حضرت ابوواقد فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا لوگ زندہ اونٹوں کی کوہانوں کو کاٹتے ہیں، اور زندہ دنبوں، بھیڑوں کی چکتیاں کاٹ کر پکا لیتے ہیں اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جانور کا جو عضو اور حصہ اس کے زندہ ہونے کی حالت میں کاٹ لیا جائے وہ حصہ مردار ہے اس کا کھانا حرام ہے۔ اگرچہ بعد میں اس جانور کو ذبح کر دیا جائے، کیونکہ جس وقت گوشت کا ٹکڑا کاٹا گیا ہے اس وقت ذکوۃ شرعی نہیں پائی گئی، اور جس وقت جانور کو ذبح کیا گیا اس وقت وہ حصہ الگ تھا، اس لئے وہ جزء میتہ کے حکم میں ہوگا، اور اس کا کھانا حرام ہوگا۔ (بذل:۴/۹۲، ہدایہ:۴/۴۹۴)

ترجمة الباب : حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت واضح ہے۔

﴿بَاب في اتباع الصيد﴾

شکار کے پیچھے رہنے کا بیان

۲۰۹ ﴿حَدَّثَنا مسدّدٌ قال يحىٰ عن سفيانَ قال حدثني أبوموسىٰ عَنْ وَهْبِ بنِ منبه عَنْ ابنِ عباسٍ عن النبى صلى الله عليه وسلم ، وقال مرةً سفيانُ ولاأَعْلَمُهُ إلَّا عَنِ النبيّ صلّى الله عليه وسلّم قال : مَنْ سكن البَادِيَةَ جفَا ، ومَنْ اتَّبَعَ الصيدَ غَفَلَ ومَنْ أتى السلطانَ افْتُتِنَ.﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، اور کبھی سفیان کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا ہوں اس ارشاد کو مگر حضور ﷺ کا ہی، کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جنگل میں رہے گا اس کا دل سخت ہو جائے گا، اور جو شکار کے پیچھے رہے گا وہ غافل ہو جائے گا، اور جو شخص بادشاہ کے پاس آمد و رفت رکھے گا وہ کسی بلا میں پڑ جائے گا۔

تشریح مع تحقیق :بَادِيَةٌ : (ج) بادیات بمعنی جنگل۔

جَفَا : (ن) بداخلاق ہونا۔

اس باب کو قائم کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ہر وقت شکار کرنے میں منہمک اور مشغول رہنا کیسا ہے؟ جیسا کہ باب کی پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے شکار کو زخمی کر دیا اور شکار بھاگ گیا پھر اس کے پیچھے پڑا رہنا کیسا ہے؟

قال مرةً سفيان : یحییٰ یہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ اس روایت کو نقل کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اس ارشاد کو حضور ﷺ کا ہی ارشاد سمجھتا ہوں، اور کبھی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کچھ بھی نہیں کہتے، مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی حضرت سفیان کو اس روایت کے مرفوع ہونے میں شک ہو جاتا ہے۔

من سكن البادية الخ : مطلب یہ ہے کہ جو شخص جنگل ہی میں زندگی گزارتا ہے تو اس کا دل سخت ہو جاتا ہے، اس لئے کہ لوگوں سے اس کا ملنا جلنا نہیں ہوتا، اسی طرح وہاں علماء بھی نہیں ہوتے تو علم سے بھی دوری رہتی ہے، لہٰذا اس کے دل میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔

من اتبع الصيد غفل : یعنی جب شکار میں مشغول ہو جاتا ہے، امور دینیہ سے تو غفلت ہو ہی جاتی ہے، کیونکہ شکار کی محبت میں شکار کے پیچھے ہی پڑا رہتا ہے، اور اسی کو تلاش کرتا رہتا ہے، حتی کہ بعض مرتبہ نماز باجماعت بھی چھوٹ جاتی ہے اور کبھی قضاء بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔

من أتى سلطاناً افتتن : اس لئے کہ بادشاہ عموماً اطاعت باری تعالی سے دور ہوتا ہے، اگر بادشاہ کے یہاں آنا جانا ہوگا تو بعض مرتبہ وہ ایسے کام کا حکم دیتا ہے جو شریعت کے خلاف ہوتا ہے، اب اگر اس کام کو کرو گے تو شریعت کی خلاف ورزی ہوگی، جس کی وجہ سے آخرت میں مصیبت اور بلا میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور اگر اس حکم کو نہیں مانو گے تو دنیا میں ہی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے یعنی پھر تمہاری جان کا خطرہ ہوگا، اس لئے حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمادیا کہ بادشاہوں کے پاس آنا جانا مت رکھو، لیکن اس حکم میں وہ بادشاہ داخل نہیں ہوگا جو عادل ہو نیک طبیعت ہو، جس کے پاس بیٹھنے سے دین اور دنیا پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

ترجمة الباب : من أتبع الصيد غفل" سے ثابت ہے۔

۲۱۰ ﴿حـدَّثَنا يحيٰ بنُ معينٍ قال نا حمّاد بنُ خالدِ الخيّاط عَن معاويةَ بنِ صالحٍ عن عبدالرحمن بن جُبيرِ بـن نُفير عن أبيهِ عن أبى ثعلبةَ الخشنىّ عن النبىّ صلّى الله عليه وسلم : إذَا رميتَ الصَيْدَ ، فأدركتَه بَعدَ ثلثَ ليالٍ وسَهْمُكَ فيهِ فكُلْ مالَمْ يَنْتَنْ.﴾

ترجمه: حضرت ابوثعلبہ خشنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم شکار پر تیر مارو

اوراس کو تین دن کے بعد پاؤ جبکہ تمہارا تیر اسی میں موجود ہو، تو اس کو تم بدبو پیدا نہ ہونے تک کھا سکتے ہو۔

تشریح مع تحقیق: ینتن (س) بدبودار ہونا، سڑنا، تعفن پیدا ہونا۔

یہ حدیث امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے خلاف ہے، کیونکہ امام شافعیؒ تو مطلقاً یہ فرماتے ہیں، کہ جو جانور آنکھوں سے غائب ہو جائے اس کو نہیں کھایا جائے گا، اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک رات کے بعد اگر جانور ملتا ہے تو اس کو نہیں کھایا جائے گا۔

البتہ امام احمدؒ اس حدیث کے بالکل ظاہر پر عمل کرتے ہیں کہ اگر اس میں تیر موجود ہے تو ہر حال میں کھایا جائے گا، اور اگر اس میں تیر موجود نہیں ہے تو نہیں کھایا جائے گا، حنفیہ اس روایت میں ایک دوسری قید لگاتے ہیں کہ شکاری اس کو برابر تلاش کرتا رہے، اور اس میں کسی دوسرے تیر کا نشان نہ ہو تو کھالیا جائے گا، اور یہ قید حضرت ابن عباسؓ کے اس فرمان کی وجہ سے لگاتے ہیں: كُلْ ما أصميت ودَعْ ما أنميت" یعنی جب وہ تم سے غائب ہو جائے تو نہ کھاؤ اور جو غائب نہ ہو بلکہ تمہارے سامنے ہی مرا ہے تو اس کو کھالو، اب حنفیہ ضرورت کی وجہ سے تلاش کرتے رہنے کو ہی غائب نہ ہونے کے حکم میں لیتے ہیں۔ (بذل:۴/۸۹)

مالم ینتن : علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ قید تحریم کے طور پر نہیں ہے، بلکہ تنزیہی ہے اس لئے کہ نبی علیہ السلام سے متغیر الریح کا کھانا ثابت ہے۔

ترجمة الباب: ترجمۃ الباب کے دو معنی بیان کئے گئے تھے یہ حدیث دوسرے معنی سے متعلق ہے، اور پہلی حدیث پہلے معنی سے متعلق تھی، اور وہ اس طرح جب شکار پر تیر چلایا اور وہ زخمی ہو کر غائب ہو گیا اور تین دن کے بعد ملا تو اس کو کھانے کی اجازت دیدی، جس سے معلوم ہوا کہ غائب ہونے کے بعد تلاش کیا جائے گا، جیسا کہ حنفیہ فرماتے ہیں۔

تَمَّ بحمد الله شرح كتاب الصيد من سنن أبي داؤد، ويليه شرح "كتاب الوصايا"، حسب ما يحبّ الله ويرضى .

* * *

﴿أوّل كتاب الوصايا﴾

وصايا : وصية کی جمع ہے جیسے هَدَايَا هدية کی جمع ہے، وصیت کے معنی ملانے کے آتے ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حیات کی ملکیت کو مابعد الموت دوسرے کی ملکیت کے ساتھ ملا دیتا ہے، یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، نیز جس طرح ''وصیت کرنا'' اس کے معنی ہوتے ہیں اسی طرح اس مال پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کی وصیت کی جائے۔(فتح الباری: ۵/ ۴۴۷)

مُوصِیْ : وصیت کرنے والا۔

موصیٰ له : جس کے لئے وصیت کی جائے۔

موصیٰ به : وہ مال جس کی وصیت کی جائے۔

موصی إلیه : جو شخص کسی کے مال کی حفاظت اور اس میں تصرف کا ذمہ دار ہو۔

وصیت کی تعریف

عهد خاص مضاف إلی ما بعد الموت عيناً أو منفعة بطريق التبرع.

وصیت کی شرائط

تہائی مال سے کم کی وصیت ہو، وصیت کرنے والے میں وصیت کرنے کی اہلیت ہو، جس کے لئے وصیت کی جارہی ہے وہ زندہ ہو اور وارث نہ ہو۔

وصیت کا ثبوت

ادلۂ اربعہ سے وصیت کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت ان ترك خيرا الوصية. (قرآن)

(۲) باب کی تمام احادیث وصیت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔(حدیث)

(۳) عملی تواتر سے وصیت ثابت ہے۔(اجماع)

(۴) جب آدمی مرتا ہے تو سوچتا ہے کہ کوئی ایسا عمل چھوڑ جاؤں جس سے ثواب جاری رہے اس ضرورت

کی بنیاد پر قیاس کا تقاضہ تھا کہ انسان اپنے مال میں سے بعد مرنے کے کسی کو بطور تبرع کچھ دیدے۔ (قیاس)
(تقریر: حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہ)

﴿بَاب ما جاء فيما يأمر به من الوصية﴾

وصیت کرنے کی تاکید کا بیان

۲۱۱ ﴿حَدَّثَنا مسدّدُ بنُ مسرهدٍ نا يحيٰ عن عبدِالله قال حدثني نافعٌ عن عبدِالله يعني ابنَ عُمرَ عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم قال : ما حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ له شيءٌ يُوصىٰ فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إلّا وَصِيَّةٌ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهٗ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مرد کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس کی کوئی چیز ایسی ہو جو وصیت کی صلاحیت رکھتی ہو کہ وہ دو راتیں گزارے، مگر اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے۔

تشریح مع تحقیق: ماؔ نافیہ له شيء يوصیٰ فيه صفت اول ہے يبيت صفت ثانی ہے اور یہ سب مل کر مبتدا ہوا، وصية مكتوبة عنده خبر ہے، مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس وصیت کے لائق کوئی چیز ہو مثلاً لوگوں کا قرضہ ہے یا منصب امامت ہے تو اس پر لازم ہے اس کی وصیت لکھ کر رکھے، دو راتیں بھی بغیر وصیت کے نہ گزارے تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء اس پر عمل کرسکیں، کیونکہ انسان کو اپنی موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔

بعض روایات میں ليلة ہے اور بعض میں ثلث ليالٍ ہے، لیکن اس سے تحدید ایام مراد نہیں ہے، بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ وصیت سے ہرگز غفلت نہ برتنی چاہئے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ حدیث سنی تو اس کے بعد سے ایک بھی رات ایسی نہیں گزری کہ میرا وصیت نامہ لکھا ہوا نہ ہو،

حدیث شریف میں لفظ مسلم کی قید احترازی نہیں ہے کیونکہ کافر کی وصیت بھی صحیح ہے، اور اگر احترازی بھی مان لیں تو کچھ حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں پر وصیت کے جواز کو ثابت کرنا مقصود نہیں، بلکہ استحباب یا وجوب کو بتلانا ہے، اور اس کا مخاطب مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔ (فتح الباری: ۵/۴۴۹)

﴿مسئلة خلافية﴾

(۱) داؤد ظاہری اور بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ اگر میت نے مال چھوڑا ہے تو وصیت کرنا واجب ہے۔
(۲) جمہور علماء کے نزدیک وصیت کرنا امر مستحب ہے، مگر یہ کہ اس پر کسی کا حق واجب ہو، اور وصیت نہ کرنے

کی صورت میں اس حقِ واجب کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر جمہور کے نزدیک بھی وصیت کرنا واجب ہے۔

فرق اول کے دلائل

(۱) آیت قرآنی ہے: كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت إن ترك خيرا الوصية للوالدين والأقربين. قرآن وحدیث نے والدین اور بہت سے اقرباء کا حصہ تو متعین کردیا ہے، لیکن جن لوگوں کا حصہ متعین نہیں ہے ان کے لئے اس آیت سے وصیت کا وجوب ثابت ہوتا ہے، کیونکہ لفظ کُتِبَ فرض اور وجوب کے معنی میں ہی مستعمل ہوتا ہے۔

(۲) عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما حق امرئ مسلم له شئ يوضى فيه يبيت ليلتين إلا ووصيته مكتوبة عنده. (ابوداؤد:۲/۳۹۵)

فریق ثانی کے دلائل

(۱) عن أبى قلابة أن عليه الصلاة والسلام قال : إن الله تبارك وتعالىٰ أعطىٰ كل ذى حق حقه، فلا وصية لوارث. (ابن ماجہ باب الوصیۃ)

(۲) وصیت بعد الوفات کا تبرع ہے، لہٰذا تبرع فی حالۃ الحیاۃ پر قیاس کرکے کہا جائے گا کہ جس طرح مرنے سے پہلے تبرع مستحب ہے ایسے ہی مرنے کے بعد بھی تبرع مستحب ہے۔(حاشیہ ہدایہ:۴/۶۲۸)

فریق اول کے دلائل کے جوابات

(۱) آیت وصیت آیت میراث سے منسوخ ہے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: قال ابن عباس : نسختها قوله تعالى: للرجال نصيب مما ترك الخ وقال ابن عمرؓ: نسختها آية الميراث. شروع زمانے میں تمام مال کا مالک لڑکا ہوتا تھا تو اس وقت وصیت کرنا واجب تھا، مگر جب آیت میراث نے ہر ایک کے حصوں کو متعین کردیا، تو وصیت کا حکم منسوخ کردیا گیا، اسی وجہ سے والدین کے لئے بھی وصیت جائز نہیں رہی۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آیت وصیت کا نسخ حدیث: "إن الله أعطىٰ كل ذى حق حقه، فلا وصية لوارث" سے ہوا ہے۔(بدائع الصنائع:۶/۳۲۳)

دوسری دلیل کے علماء نے مختلف جوابات دیئے ہیں:

(۱) حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر لفظ "حق" احتیاط کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ

ہر وقت وصیت نامہ لکھ کر رکھنا چاہئے، اسی میں احتیاط ہے کیونکہ موت کا وقت متعین نہیں۔

(۲) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں حقوق واجبہ للغیر مراد ہیں، کیونکہ ان کے لئے تو جمہور کے نزدیک بھی وصیت کرنا واجب ہے۔

(۳) حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں: "له شيء يوصیٰ فيه" ہے، اس سے مراد "يريد أن يوصیٰ فيه" ہے اس لئے کہ ایک روایت میں "له مال يريد الوصية فيه" کے الفاظ ہیں جس سے معلوم ہوا کہ وصیت کو موصی کے ارادے پر معلق کیا گیا ہے، اور جو چیز ارادے پر معلق ہوتی ہے وہ واجب نہیں ہوتی، لہٰذا وصیت کرنا بھی واجب نہیں۔

(۴) لغت میں "حق" کے معنی ثابت کے آتے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں "ما ثبت به الحكم" کو حق کہا جاتا ہے، اور حکم کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب ہوتا ہے لہٰذا یہاں حق سے مراد حکم مستحب ہے نہ کہ واجب، تاکہ دوسری احادیث سے تعارض نہ ہو۔ (فتح الباری: ۴۵۱/۵، بذل: ۹۳/۴، بدائع: ۴۴۳/۶)

۲۱۲ ﴿حَدَّثَنا مسدَّدٌ ومحمد بنُ العَلاءِ قالاَ نا أبومعاوية عَن الأعمشِ عن أبي وائلٍ عن مسروقٍ عن عائشةَ قالت : ما تركَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم دِينَاراً وَلَادِرْهَماً ولابَعِيراً ولاشَاةً ولاأَوصىٰ بِشَيءٍ.﴾

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دینار و درہم اور اونٹ و بکری نہیں چھوڑے، اور نہ ہی کسی چیز کی وصیت کی۔

تشریح مع تحقیق: اہل سیر لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے پاس چھ یا سات دینار تھے، تو آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حکم فرمایا کہ ان کو صدقہ کردو، چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ان کو صدقہ کردیا تھا۔

ملا علی قاریؒ اہل سیر کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ ﷺ کے پاس بہت سے اونٹ، سات بکریاں اور بیس دودھاری اونٹنیاں تھیں، جس سے بظاہر حضرت عائشہؓ کا قول معارض ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سارا مال صدقہ تھا، اسی طرح خیبر کی زمین بھی آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی صدقہ کردی تھی، جیسا کہ بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ازواج مطہرات کے نفقہ کے بعد جو بھی باقی رہے وہ صدقہ ہے۔

اور بھی بہت سی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو بھی مال تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو صدقہ کردیا تھا، اور کسی چیز کی وصیت نہیں فرمائی تھی، البتہ اعتصام بکتاب اللہ اور تعلق مع اہل البیت اسی طرح یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کی وصیت ضرور فرمائی تھی، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مال کی وصیت کی نفی فرما رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں کوئی مال ہی باقی نہیں تھا تو کس چیز

کی وصیت فرماتے۔ (فتح الباری: ۵/۴۵۵، بذل المجہود: ۴/۹۳)

ترجمة الباب: ولا أوصى بشيء سے ثابت ہے۔

﴿بَاب ما جاء فيما لايجوز للموصي في ماله﴾

موصی کے لئے کتنے مال کی وصیت کرنا جائز ہے

۲۱۴ ﴿حَدَّثَنا عثمان بن أبی شيبة وابن أبی خلف قالا نا سفيان عن الزهری عن عامر بن سعيد عن أبيه قال مرض مرضاً اشفی فيه ، فعاده رسول الله صلی الله عليه وسلم فقال : يارسول الله! إن لی مالاً كثيراً ، وليس يرثنی إلا ابنتی ، أفأتصدق بالثلثين ؟ قال : لا ، قال : فبالتشطر ؟ قال : لا ، قال : فبالثلث ؟ قال : الثلث والثلث كثير ، انك أن تترك ورثتك أغنياء خير أن تدعهم عالة يتكففون الناس ، وانك لن تنفق نفقة إلاّ أجرتَ فيها حتی اللقمة تدفعها إلی فی امرأتك ، قلت : يا رسول الله! اتخلف عن هجرتی ، قال : إنك أن تخلف بعدی فتعمل عملاً ، تريد به وجه الله ، لاتزداد به إلا رفعة ودرجة ، لعلك أن تخلف حتی ينتفع بك أقوام ، ويضربك آخرون ، ثم قال : اَللّٰهم أمض لأصحابی هجرتهم ولا تردهم علی أعقابهم، لكن البائس سعد بن خولة يرثی له رسول الله صلی الله عليه وسلم إن مات بمكة.﴾

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ وہ بہت بیمار ہوگئے، رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے، تو حضور اکرم ﷺ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے پاس بہت مال ہے، اور ایک بیٹی کے سوا کوئی دوسرا وارث نہیں ہے، تو کیا میں دوثلث مال کو صدقہ کردوں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آدھا مال صدقہ کردوں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ تہائی مال صدقہ کردوں؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشادفرمایا کہ تہائی مال خیرات کردو، اور تہائی بھی بہت ہے، اگر تم اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو فقیر چھوڑ کر جاؤ کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، اور جو چیز تم خدا کی رضامندی کے لئے خرچ کروگے تو تم کو اس کا ثواب ملے گا، یہاں تک کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ بھی دیدو تو ثواب پاؤگے، حضرت سعد کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیا میں اپنی ہجرت گاہ

سے چھوڑ دیا جاؤں گا، (یعنی آپ مکہ سے چلے جائیں اور میں بیماری کی وجہ سے مکہ میں ہی رہ جاؤں، کیونکہ صحابہؓ تو مکہ چھوڑ کر ہجرت کر چکے ہیں،) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم پیچھے رہ جاؤ گے تو اللہ کی رضامندی کے لئے نیک عمل کروگے، اور تمہارا درجہ بلند ہوگا، اور شاید تم زندہ رہو اور مکہ میں نہ انتقال کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو تمہارے ذریعہ نفع پہنچائے، اور ایک قوم کو تمہارے ذریعہ نقصان پہنچائے، پھر آپ ﷺ نے دعا فرمائی، کہ یا اللہ میرے ساتھیوں کی ہجرت پوری فرمادے، اور ان کو واپس نہ پھیر، لیکن ابن خولہ مصیبت زدہ ہیں، جن کے واسطے رسول اللہ ﷺ نے رنج وغم فرمایا، ان کے مکہ میں مرنے کی وجہ سے۔

تشریح مع تحقیق

:الشطر بمعنیٰ نصف۔

عَالَةً یہ عالٍ کی جمع ہے، (ن) فقیر، محتاج، تنگ دست۔

یتکففون : (تفعل) لوگوں سے مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا۔

یرثی : (ض) یاد کرنا۔

پہلے باب سے وصیت کا ثبوت تھا، اور اس کی اہمیت بیان کی تھی، اب یہاں سے امام ابوداؤد یہ بیان فرمارہے ہیں کہ وصیت صرف تہائی مال میں کی جائے، اسی طرح ورثاء کو محتاج اور فقراء چھوڑنے سے ان کو مال دار چھوڑنا اچھا ہے، اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک مفصل حدیث پیش کی ہے:

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حجۃ الوداع میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے، مکہ میں پہنچ کر بیمار ہو گئے، جب آپ ﷺ کو ان کی بیماری کا علم ہوا تو عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت سعد بن ابی وقاص حضور ﷺ کو دیکھ کر رونے لگے، حضور نے فرمایا، ما یبکیك؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری صرف ایک بیٹی اصحاب الفروض میں سے ہے، اور باقی سب عصبات ہیں، حالانکہ میرے پاس بہت سا مال ہے، اس لئے چاہتا ہوں کہ دو ثلث کی وصیت کردوں؟ حضور ﷺ نے منع فرمادیا، پھر سوال کیا کہ نصف کی وصیت کردوں؟ حضور ﷺ نے اس سے بھی منع فرمادیا، پھر دریافت کیا کہ ایک ثلث کی وصیت کردوں؟ آپ ﷺ نے اجازت دیدی، اور فرمایا کہ ثلث بھی بہت ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے وہم کو دور فرمادیا کہ ایسا نہیں ہے کہ صرف صدقہ کرنے سے ہی ثواب ملے گا اور ورثاء کو مال دینے سے ثواب نہیں ملے گا، بلکہ ورثاء کے لئے مال چھوڑنے میں بھی ثواب ہے، اور فرمایا کہ تمہارے ورثاء لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں، اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ان کو غنی چھوڑو، اور دیکھو ہر چیز میں ثواب ہے بشرطیکہ اچھی نیت ہو، اگر تم اپنی بیوی کے منہ میں کوئی لقمہ دیدو تو اس میں بھی ثواب ہے، حالانکہ بیوی کے منہ میں لقمہ عموماً لذت حاصل کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اندیشہ ہے کہ مکہ میں ہی میرا انتقال ہوجائے، اور میں آپ اور آپ کے ساتھیوں سے پیچھے رہ جاؤں، حضرت سعد کا یہ افسوس کرنا اس لئے تھا کہ علاء حضرمی کی روایت میں ہے کہ مہاجرین کے لئے طواف صدر کے بعد زیادہ سے زیادہ تین دن رہنے کی اجازت تھی، اب میں تو بیماری کی وجہ سے یہیں پر رہ جاؤں گا، اور باقی سب لوگ واپس مدینہ چلے جائیں گے، حضور ﷺ نے تسلی دی کہ اگر تم پیچھے رہ گئے تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ بعد میں بہت سے اعمال صالحہ کروگے اور حضور ﷺ کی مراد پیچھے رہنے سے درازیٔ عمر تھی۔

لعلك أن تخلف : سے پیشین گوئی ہے کہ تم زندہ رہوگے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بہت دنوں تک زندہ رہے، بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں ان کے ۹/ لڑکے اور ۱۲/ لڑکیاں بھی پیدا ہوئیں، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت سعدؓ اس واقعہ کے بعد ۴۵/ یا ۴۸/ سال تک زندہ رہے اور ۵۵/ھ یا ۵۸/ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ بہت لوگوں کو نفع اور بہت سے لوگوں کو نقصان پہنچائیگا۔ ابن تینؒ فرماتے ہیں کہ نفع سے مراد وہ فتوحات ہیں جو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ہاتھوں ہوئی ہیں، جیسے قادسیہ وغیرہ کی فتح، اور ضرر سے مراد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا اپنے بیٹے عمر بن سعد کو اس لشکر کا امیر بنانا ہے جس نے حضرت حسینؓ اور ان کے حامیوں کو قتل کیا تھا، لیکن ابن تین کے اس قول کی حافظ ابن حجرؒ نے تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں بیجا اور بے ضرورت تکلف ہے، جس کی کوئی حاجت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد کفار کو تکلیف پہنچانا ہے، چنانچہ امام طحاویؒ نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ہے: لما أمر سعد علی العراق أتی بقوم ارتدوا، فاستتابهم فتاب بعضهم وامتنع بعضهم، فقتلهم فانتفع به من تاب وحصل الضرر للآخرين. (فتح الباری: ۵/۳۶۲)

صاحب بذل تحریر فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی پیشین گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت سعدؓ نے عراق وغیرہ کو فتح کیا، اور جو لوگ اسلام نہیں لائے بلکہ اسلام کے خلاف تلوار لیکر نکلے ان کو جہنم رسید کیا، اور مسلمانوں کو بہت سے اموال غنیمت حاصل ہوئے۔

دار الہجرت میں بلا اختیا۔ یا بالاختیار مرنے سے ثواب میں تو کمی آجاتی ہے البتہ اگر بالاختیار دار ہجرت میں مرا ہے تو گناہ بھی ہوتا ہے، اور بلا اختیار میں گناہ نہیں ہوتا، اس لئے آپ ﷺ نے یہ دعاء فرمائی: اللهم امضِ لأصحابی هجرتی، یعنی اے اللہ میرے صحابہ کی ہجرت کو پورا فرما، اور اسی وجہ سے سعد بن خولہ پر افسوس کیا کیونکہ ان کا انتقال دار ہجرت یعنی مکہ میں ہوگیا تھا، بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے وقت ہی ان کا

انتقال ہوا تھا، اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ غزوہ بدر کے بعد از خود مکہ میں چلے گئے تھے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوگیا، اگر پہلے قول کو لیا جائے تو یہ رجوع عن الہجرت نہیں ہے، لیکن رجوع کے مشابہ ہے جس کی وجہ سے ثواب میں کمی آجاتی ہے، جس پر آپ ﷺ نے ترحم فرمایا، اور دوسرے قول کے اعتبار سے ان کی ہجرت باطل ہوگئی تھی، اس لئے حضور ﷺ نے افسوس کا اظہار فرمایا۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص ثلث مال سے زیادہ کی وصیت کرتا ہے، تو اس کی وصیت نافذ نہ ہوگی، البتہ اگر سارے ورثاء اجازت دے دیں تو نافذ ہو جائے گی۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص غیر اقرباء یعنی عام آدمی کے لئے بھی وصیت کرے تو جائز ہے۔

فائدہ: اسلام میں سب سے پہلے ثلث مال کی وصیت کرنے والے حضرت ''براء بن المعرور'' ہیں انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثلث مال کی وصیت کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرما کر ان کے ورثاء کو ہی واپس کر دیا تھا۔ (فتح الباری: ۵/۴۶۵)

ترجمة الباب: امام ابوداؤدؒ نے باب قائم کیا تھا کہ کتنے مال کی وصیت جائز ہے اور کتنے کی ناجائز ہے، اور حدیث میں بھی وضاحت ہے کہ ثلث کی وصیت کرنا جائز ہے اور اس سے زیادہ مال کی وصیت کرنا ناجائز ہے، لہٰذا مناسبت ثابت ہوگئی۔

﴿بَاب ما جاء فی فضل الصدقة فی الصحة﴾

تندرستی کی حالت میں صدقہ کرنے کی فضیلت کا بیان

۲۱۴ ﴿حَدَّثَنا مَسَدَّدٌ قال نا عبدُالواحد بنِ زِيادٍ قال نا عمارةُ بنُ القَعْقَاعِ عن أبی زُرعَةَ بنِ عمرو بنِ جَريرٍ عن أبی هريرةَ قال: قال رجلٌ لرسولِ الله صلى الله عليه وسلم: يا رسولَ الله! أیّ الصدقة افضل ؟ قال: أَنْ تَصدَّقَ وأَنْتَ صَحِيحٌ حَرِيصٌ، تَامُلُ البقَاءَ، وتَخشىٰ الفقرَ، ولاتُمهِلَ حتّٰى إذا بَلَغَتِ الحُلقُوْمَ قلتَ : لِفُلانٍ كذا، ولِفُلانٍ كذا، وقَدْ كان لِفُلانٍ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو صحت کی حالت میں ہو، اور اس وقت تجھے زندگی کی امید اور محتاجی کا خوف ہو، اور ڈھیل مت کر یہاں تک کہ جب تیری جان حلق میں آجائے تو کہنے لگے کہ فلاں کو اتنا اور

فلاں کو اتنا، حالانکہ وہ مال فلاں کا حق بن چکا ہے۔

تشریح مع تحقیق:تَامُلُ : (ن) امید کرنا۔

تُمْهِلُ : (افعال) ڈھیل کرنا۔

مطلب یہ ہے کہ صحت کی حالت میں صدقہ کرنا افضل اور بہتر ہے، کیونکہ انسان جب مرتے وقت صدقہ کرتا ہے تو اس وقت مال کی محبت ختم ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص موت کے وقت صدقہ کرے وہ ایسا ہے جیسا کہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد دوسرے کو بچا ہوا کھانا دے، اس کے برخلاف جوانی کی حالت میں جبکہ انسان کو بہت سی ضروریات لاحق ہوتی ہیں صدقہ کرنا باعث ثواب ہے، کیونکہ یہ اخلاص کی دلیل ہے، اور جب موت کا وقت آجاتا ہے تو اس سے ورثاء کا حق بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ (فتح الباری: ۵/۴۷۰)

ترجمة الباب:قال: أن تصدق و أنت صحيح حريص الخ سے ثابت ہے۔

۲۱۵ ﴿حَدَّثَنا أحمد بنُ صالح قال نا ابنُ أبى فُدَيكٍ قال أخبرنى أبنُ أبى ذِئبٍ عن شُرَحْبِيلَ عن أبى سعيد الخدرىّ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : لأن يتصدق المرأ في حياته بدرهم خير له من أن يتصدق بمائة عند موته.﴾

ترجمہ:حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کا اپنی زندگی میں ایک درہم خیرات کرنا مرتے وقت سو درہم خیرات کرنے سے بہتر ہے۔

تشریح مع تحقیق :بعض اسلاف سے منقول ہے کہ مالدار لوگ مال میں دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں، ایک تو اس وقت جبکہ وہ اپنی زندگی کی حالت میں اس میں بخل کرتے ہیں، اور دوسرے جب کہ وہ مرنے لگتے ہیں اور مال ان کے ہاتھ سے نکلنے لگتا ہے تو اس میں اسراف کرتے ہیں۔ (فتح الباری: ۵/۴۷۰)

اس لئے انسان کو چاہئے کہ اپنی زندگی میں ہی جبکہ اس کو بہت سی ضرورتیں درپیش ہوتی ہیں صدقہ کرے، اس میں زیادہ ثواب ہے۔

ترجمة الباب :لأن يتصدق المرء فى حياته بدرهمٍ خير له أن يتصدق بمائة عند موته. سے ثابت ہے۔

﴿ بَاب في كراهية الإضرار فى الوصية ﴾

وصیت کرنے میں دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کراہت کا بیان

۲۱۶ ﴿حَدَّثَنا عَبدَةُ بنُ عبدِاللّٰهِ قال أخبرنا عبدُ الصمدِ قال نَا نصرُ بنُ عليّ الحدانِيُّ

قال نَا الأشعَثُ بنُ جابرٍ قال حدثني شهرُ بنُ حَوشَبٍ أنَّ أباهريرةَ حَدَّثَهُ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: إنَّ الرجلَ ليَعمَلُ والمَرأةُ بطاعةِ الله ستِّينَ سَنَةً، ثُمَّ يَحضُرُهُمَا الموتُ، فيُضارَّانِ في الوَصيَّةِ، فتَجبُ لهُمَا النارُ، قالَ: وَقَدْ قرأ عَلَيَّ أبُو هريرةَ مِنَ ههُنَا "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ" حتى بلغ "ذٰلِكَ الفَوْزُ العَظِيمُ"، قال أبوداوُدَ: هذا يَعنِي الأَشعَثَ بنَ جابرٍ جَدُّ نصر بنِ عَلِيٍّ.

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ مرداورعورت ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، پھر جب ان کو موت آنے لگتی ہے، تو وصیت کرکے نقصان پہنچاتے ہیں، اس وجہ سے ان پر جہنم واجب ہوجاتی ہے، شہر بن حوشب نے کہا کہ حضرت ابوہریرہؓ نے میرے سامنے یہ آیت پڑھی: "من بعد وصية يوصى بها أو دين غير مُضارٍ" سے "ذٰلك الفوز العظيم" تک، ابوداؤد نے کہا کہ اشعث بن جابر، نصر بن علی کے دادا ہیں۔

تشریح: یہ حدیث حقوق العباد کی اہمیت ظاہر کرتی ہے کہ جولوگ اپنی ساری زندگی عبادت الٰہی میں گزار دیتے ہیں، مگر حقوق العباد کو نقصان پہنچانے سے اجتناب نہیں کرتے تو وہ اپنی تمام عبادتوں کے باوجود خدا کی ناراضگی کا مورد بن جاتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جولوگ خواہ وہ مرد ہوں یاعورتیں ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے ہیں، مگراپنی زندگی کے آخری لمحات میں یہ وبال اپنے سر لے لیتے ہیں کہ وہ اپنے مال میں تہائی سے زیادہ کی وصیت کسی غیر شخص کے حق میں کرجاتے ہیں، یااپنا سارامال کسی وارث کو ہبہ کردیتے ہیں تاکہ دوسرے وارثوں کو کچھ نہ ملے، اوراسی طرح وہ اپنے رشتہ داروں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے طویل عرصہ کی اپنی عبادتوں کے باوجود اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب کا سزاوار بنالیتے ہیں، کیونکہ اپنے وارثوں کو نقصان پہنچانا حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے غیر مناسب اورناجائز ہی نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے روگردانی اوراس کی مقررہ ہدایات سے تجاوز بھی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ کا ارشاد بیان کرنے کے بعد بطور تائید مذکورہ بالا آیت کریمہ پڑھی کیونکہ اس آیت میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ مورث کو چاہئے کہ وہ اپنے مال کے تہائی حصہ سے زائد کے بارے میں وصیت کرکے ورثاء کو نقصان نہ پہنچائے۔

جمہور کا اتفاق ہے کہ وارثین کو ضرر پہنچانے یعنی بعض کو ان کے حصوں سے بالکل محروم کرنے اور بعض کے حصوں میں کمی کرنے کی غرض سے وصیت کرنا حرام ہے۔

ترجمة الباب: فيضاران في الوصية فتجب لهما النار. سے ثابت ہے۔

﴿بَاب ما جاء فی الدخول فی الوصایا﴾

وصی بننے کا بیان

۲۱۷ ﴿حَدَّثَنا الحسنُ بنُ علیٍ قال نا عبدُالرحمٰنِ المقرئُ قال نا سعیدُ بنُ أبی أیُّوبَ عن عُبَیْدِاللّٰه بنِ أبی جَعفَرٍ عن سالمِ بنِ أبی سالمِ الجَیْشَانیِّ عَنْ أبِیهِ عن أبی ذَرٍّ قال: قال لی رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنی أَرَاكَ ضَعِیفاً وأنّی أحبُّ لكَ ما أحبُ لنفسِیَ ، فَلَا تَأمَّرَنَّ عَلی اثنَینِ ولَاتُوَلَّینَّ مَالَ یَتِیمٍ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے ابوذر! میں تم کو ضعیف دیکھتا ہوں، اور تمہارے لئے وہ ہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تم دو آدمیوں کا بھی حاکم نہ بننا، اور یتیم کے مال کا وصی مت بننا۔

تشریح مع تحقیق : حضرات صحابہ کرامؓ امارت کے عہدے کو بھی قبول فرماتے تھے، اور یتیموں کے متولی بھی ہوا کرتے تھے، لیکن اس حدیث میں جو حکم بیان کیا گیا ہے، وہ ان لوگوں کے بارے میں ہے، جن میں امارت اور تولیہ کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں، اور ولایت کے لئے دو شرائط ہیں، ایک تو ولایت کے حقائق کا علم ہونا، دوسرے مصالح کی تحسین، یعنی تمام امور کے کرنے پر قادر ہو اور مفاسد کے روکنے پر قادر ہو۔

أنی أراك ضعیفاً : آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوذر! تم ضعیف ہو لیکن اس کمزوری سے مراد بدن کی کمزوری نہیں، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ تمہارے اندر تولیت کی صلاحیت کم ہے، کیونکہ تولیت کے لئے تو بڑی نرمی کی ضرورت ہے، اور حضرت ابوذرؓ کے اندر بڑی سختی تھی، فرائض کے خلاف ہی نہیں بلکہ خلاف اولی کام پر بھی بڑی سختی فرماتے تھے۔

أنی احبُّ لك الخ : یعنی جو چیزیں میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں، اسی چیز کو تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں، لیکن اس میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ تو امیر ہیں، اور پھر فرماتے ہیں کہ میں تمہارے لئے وہ ہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، حالانکہ حضرت ابوذرؓ کے لئے آپ ﷺ نے امارت کو پسند نہیں کیا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اگر میں تمہاری طرح کمزور ہوتا تو کبھی ان دونوں کاموں میں سے کسی کو بھی پسند نہ کرتا، تو دیکھئے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کے اندر وہ دونوں شرطیں نہیں پائیں جو امارت اور تولیہ کے لئے ضروری ہیں، اس لئے ان کو ان دونوں کاموں سے منع فرمادیا، حضرت ابوذرؓ کا تصوف مشہور ومعروف ہے، کہ وہ

دین کے خلاف ذرا سی بات بھی پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی ذرا سا مال اکٹھا کر لیتا تو اس کو بھی کنز سے تعبیر کرتے تھے، جبکہ امارت اور تولیہ کے لئے بڑی نرمی کی ضرورت ہے، بہت سی باتوں کو مزاج کے خلاف برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ترجمة الباب : و لا تولينّ مالَ يتيمٍ . سے ثابت ہے۔

﴿بَاب ما جاء فی نسخ الوصیة للوالدین و الأقربین﴾

والدین اور دوسرے اقربار کے لئے وصیت کے منسوخ ہونے کا بیان

۲۱۸ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ محمدٍ المَرْوَزِيُّ حدثني عليُّ بنُ حسينِ بنِ واقِدٍ عَن أبيهِ عَن يزيدِ النحويِّ عن عِكْرِمةَ عن ابنِ عبّاسٍ "إنْ تَرَكَ خيراً الوَصِيَّةُ لِلْوالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ، فكَانَتِ الوَصِيَّةُ كذٰلكَ حتّٰى نَسَخَتْهَا آيةُ المِيْرَاثِ.﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "إن ترك خيراً الوَصِيَّةُ للوالدين والأقربين کہ وصیت (ابتدار اسلام میں) اسی طرح تھی یہاں تک کہ آیت میراث نے اس کو منسوخ کردیا۔

تشریح مع تحقیق : شروع زمانۂ اسلام میں صرف بیٹے کو میراث ملا کرتی تھی، اور دیگر رشتہ داروں کو کچھ نہیں ملتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے آیت: کتب علیکم إذا حضر أحدکم الموت الخ نازل فرمادی، اور اصح قول کے مطابق وصیت کو واجب قرار دیا گیا، اس کے بعد شریعت نے سب کے حصص مقرر فرمادیئے، تو اس آیت کو منسوخ کردیا گیا، لیکن اس آیت کا ناسخ کیا ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔

احناف تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حدیث: "لا وصية لوارثٍ" سے منسوخ ہے، اور شوافع کہتے ہیں کہ آیت میراث اس کا ناسخ ہے، پھر حنفیہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی کیسے ہوجائے گی؟ اور خبر واحد کتاب اللہ کا ناسخ کیسے ہوسکتی ہے؟ لیکن صاحب بدائع الصنائع نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ خبر متواتر کی دو قسمیں ہیں، ایک تواتر قولی اور ایک تواتر عملی ہے، اور "لا وصية لوارثٍ" تواتر عملی سے ثابت ہے، کیونکہ یہ حدیث حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سنائی اور پھر یہ خبر اتنی عام ہوگئی کہ صحابہؓ سے لیکر آج تک اس پر عمل چلا آرہا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے خواہ ناسخ کتاب اللہ ہو یا سنت رسول اللہ ﷺ ہو، اور اب وصیت کرنا ضروری نہیں، بلکہ بعض احوال میں مستحب ہے اور بعض احوال میں مباح ہے اور بعض احوال میں مکروہ ہے۔

(فتح الباری: ۷/ ۴۶۸، بذل المجہود: ۴/ ۹۶، بدائع الصنائع: ۶/ ۲۲۳)

ترجمة الباب: حدیث شریف میں صراحت ہے کہ والدین اور دیگر رشتہ داروں کے لئے وصیت کرنا پہلے واجب تھا لیکن بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا، لہٰذا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا۔

﴿باب ما جاء فی الوصیة للوارث﴾

وارث کے لئے وصیت کرنے کا بیان

۲۱۹ ﴿حَدَّثَنا عبدُالوهابِ بنُ نَجدةَ قالَ نا ابنُ عيّاشٍ عن شُرَحبِيلَ بنِ مسلمٍ قال: سمعتُ أباأُمامةَ قال سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ: إنَّ اللهَ قَدْ أعْطَى كلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهُ، فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دیدیا ہے، اب وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق: اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ورثار کے لئے حصے متعین کر دیئے، خواہ وہ ذوی الفروض ہوں یا عصبہ ہوں، لہٰذا اب کسی وارث کے حق میں وصیت کی ضرورت نہیں ہے، احناف نے اسی روایت کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ ناسخ یہی حدیث ہے اور شوافع نے یہ تاویل کی کہ ناسخ تو آیت میراث ہی ہے البتہ یہ حدیث آیت میراث کا مبین ہے۔

یہ تو پوری امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی وصیت کر دے اور تمام ورثار اس کو جائز رکھیں، یعنی اس پر راضی ہو جائیں تو وصیت کا نفاذ ہوگا یا نہیں ہوگا، اس مسئلہ میں فقہار کے مابین اختلاف ہو گیا۔

﴿مسئلة خلافية﴾

اہل ظاہر کہتے ہیں کہ اگر میت نے کسی وارث کے لئے وصیت کی تو اس کی وصیت باطل ہو جائے گی، اگر چہ ورثار اجازت دے دیں۔

جمہور فرماتے ہیں کہ اگر ورثار اجازت دیدیں تو اس وصیت کا نفاذ ہو جائے گا۔

اہل ظاہر کی دلیل

حدیث باب سے استدلال کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کو جائز کہہ دیں گے تو ایک حکم منسوخ پر عمل

کرنا لازم آئے گا، اور حکم منسوخ پر عمل کرنا جائز نہیں ہے اس لئے ورثاء اجازت دیں یا نہ دیں کسی صورت میں بھی یہ وصیت درست نہ ہوگی۔

جمہور کی دلیل

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے: لاوصية إلّا أن يجيز الورثاء (وفی بعض إلّا أن يشاء الورثة) (ہدایہ:۴/۶۴۱)

اہل ظاہر کی دلیل کا جواب

آپ نے جو حدیث پیش کی ہے وہ عام ہے، اور حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث جو ہم نے پیش کی ہے خاص ہے، اور اس میں جو زیادتی ہے وہ ثقہ راویوں کی ہے، لہٰذا عام روایت کو خاص پر محمول کرلیا جائے گا، اور چونکہ ممانعت ورثاء کے حق کی وجہ سے تھی اور جب ورثاء خود ہی راضی ہوگئے تو اب ابطال حق الغیر لازم نہیں آئے گا۔

جمہور کی دلیل پر اعتراض

حضرت ابن عباسؓ کی جو حدیث جمہور کی طرف سے پیش کی گئی ہے، اس کو امام بیہقیؒ نے منکر کہا ہے، اور منکر ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کی حضرت ابن عباسؓ سے اس روایت کو عطاء خراسانی نے نقل کیا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ سے ان کی ملاقات نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث دیگر روایات کے مخالف ہے۔

جواب

اس کی دوسری سند دار قطنی نے نقل کی ہے، اور ابن قطان نے اس کی تحسین کی ہے کہ اس میں کوئی بھی راوی "لا بأس به" کے درجہ کا نہیں ہے، اس لئے یہ روایت قابل استدلال ہوگی۔ (ہدایہ:۴/۶۴۱)

﴿بَاب في مخالطة اليتيم فى الطعام﴾

یتیم کو کھانے میں شریک کرنے کا بیان

۲۲۰ ﴿حَدَّثَنا عثمانُ بنُ أبِىْ شَيْبَةَ قالَ نا جَرِيْرٌ عَنْ عطاءٍ عَنْ سَعِيْدِ بنِ جُبيرٍ عَنْ ابنِ عبّاسٍ قَالَ : لَمَّا أنزلَ اللّٰه عزَّ وجلَّ "وَلا تقرَبُوا مالَ اليَتِيمِ إلّا بالَّتِىْ هِىَ أحْسَنُ" و"إنَّ الذِيْنَ يَأكُلُون أموالَ اليَتَامىٰ ظُلْماً" الآية ، انطَلَقَ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ يَتِيْمٌ ، فَعَزَلَ

طَعَامَهٗ مَنْ طعَامِهٖ ، وشَرَابَهٗ مِنْ شَرَابِهٖ ، فَجَعَلَ يَفْضُلُ مَنْ طَعَامِهٖ ، فَيُحبَسُ لَهٗ حتى يأكُلَهٗ أَوْ يَفْسُدُ ، فَاشْتَدَّ ذلك عَلَيْهِمْ ، فَذَكَرُوا ذٰلك لرسولِ الله صلى الله عليه وسلم ، فأنزَلَ الله عزَّ وجلَّ "ويَسْئَلُونَكَ عَنِ اليَتَامىٰ قُلْ إصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وإنْ تُخَالِطُوْهُمْ فإخوانكُمْ ، فخَلَطُوْا طعَامَهُمْ بِطَعَامِهٖ ، وشَرَابَهُمْ بشَرابهٖ.﴾

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے "ولاتقربوا مال اليتيم إلاّ بالتي هي أحسن" اور "إن الذين يأكلون أموال اليتامىٰ ظلماً". الآیة کونازل فرمایا تو جن لوگوں کے پاس یتیم تھے وہ مجلس سے اٹھے، اوران کا کھانا اپنے کھانے سے اور پینا اپنے پینے سے الگ کردیا، چنانچہ یتیم کا کھانا بچ جاتا تھا تو اس کو یتیم کے لئے رکھ لیا جاتا، یہاں تک کہ وہ اس کو کھالیتا یا وہ خراب ہوجاتا، یہ معاملہ صحابہؓ کے لئے دشوار گزرا، تو انہوں نے حضور ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا، پس اللہ تعالیٰ نے "ويسئلونك عن اليتامىٰ قل إصلاح لهم خير" آیت کونازل فرمادیا، چنانچہ صحابہؓ نے ان کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے کے ساتھ ملالیا۔

تشریح مع تحقیق: انْطَلَقَ: (انفعال) جانا، روانہ ہونا۔

عَزَلَ : (ض) علیحدہ کرنا۔

یفضل : (س، ن،) باقی بچنا۔

تخالطوهم : (مفاعلت) ملانا۔

زمانۂ جاہلیت میں ایسا ہوتا تھا کہ لوگ یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملالیا کرتے تھے، اوران کے اموال کو حد سے زیادہ خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ جب یہ یتیم بڑے ہوتے تو ان کے سارے اموال ہی ختم ہوچکے ہوتے تھے، لیکن سب لوگ ایسا نہیں کرتے تھے، صحابہ کرامؓ کی جماعت اس فعل سے بالکل مستثنیٰ تھی، البتہ یتیموں کی پرورش صحابہؓ بھی کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ جولوگ یتیموں کے مال کو ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، اب صحابہؓ کی علوشان دیکھئے کہ انہوں نے فوراً سوچا کہ جب وہ ہمارے ساتھ کھاتے پیتے ہیں تو ظاہری بات ہے کہ وہ ہمارا اور ہم ان کا کھانا ضرور استعمال کرلیتے ہیں، اس سے صحابہؓ ڈر گئے اور فوراً ہی یتیموں کے کھانے پینے کو بالکل الگ کردیا، اس میں یہ دشواری ہوئی کہ ایک چیز یتیم کے واسطے تیار کی گئی، تو جو یتیم سے بچتی وہ رکھی رہتی تھی، یا تو وہ اس کو کھالیتا تھا یا وہ خراب ہوجاتی تھی، اس میں یتیموں کا نقصان بھی ہوتا تھا، اور صحابہؓ کو یہ نقصان اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لئے حضور اکرم ﷺ سے صورت حال بیان کی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمادیا کہ ان کے اموال کی اصلاح اچھی چیز ہے، اگر تم ان کے خرچ کو اپنے خرچ سے ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور بھائی اپنے بھائی کے مال کو ایک جگہ ملاکر استعمال کرتا ہی ہے، اور جولوگ مفسد ہیں یتیموں

کے مال کو حد سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے، اوران کو ان کے فساد کا بدلہ بھی دیگا، چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد صحابہؓ نے یتیموں کے مال کو اپنے اموال کے ساتھ ملالیا، اور ساتھ کھانا پینا شروع کردیا۔

ترجمة الباب: امام ابوداؤد کا مقصد اس روایت کو بیان کرنے سے یہ ثابت کرنا ہے کہ یتیموں کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے کے ساتھ ملانا جائز ہے، سو وہ ثابت ہوگیا۔

﴿بَاب ما جاء فيما يجوز لوليّ اليتيم أن ينال من مال اليتيم﴾

یتیم کے مال سے اس کے متولی کو کس قدر کھانا درست ہے.

۲۱۹ ﴿حَدَّثَنا حُميد بنُ مسعدةَ أن خالد بنَ الحارثِ حَدَّثَهُم قالَ نَا حُسين يعني المعلِّم عَنْ عمْرو بنِ شعيبٍ عن أبيهِ عن جدِّهِ أنَّ رجلاً أتَى النبيَّ صلّى الله عليه وسلّم فقالَ : إنّي فَقِيرٌ لَيسَ لِيْ شَيْءٌ ، وَلِي يَتِيْمٌ ، قالَ : كُلْ مِنْ مالِ يَتيمِكَ غَيْرَ مُسرِفٍ ولَامُبَادِرٍ وَلَا مُتَأثِّلٍ.﴾

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کے پاس آیا، اور عرض کیا کہ میں محتاج ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور میرے پاس ایک مال دار یتیم ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے یتیم کے مال میں سے کھاؤ، دراں حالیکہ تم اسراف نہ کرو، اور جلدی کرنے والے نہ ہو، اور مال جمع کرنے والے نہ ہو۔

تشریح مع تحقیق: مُسرف : (افعال) فضول خرچ کرنا۔

مبادر : (مفاعلت) ایک دوسرے سے آگے بڑھنا، سبقت کرنا۔

متاثل : (تفعل) جمع کرنا، ذخیرہ اندوزی کرنا۔

امام ابوداؤدؒ نے ماقبل کے باب میں یہ بیان کیا تھا کہ یتیم کا کھانا پینا اپنے ساتھ کرنا درست ہے، اب یہاں سے یہ بیان فرمارہے ہیں کہ جو شخص یتیم کا متولی ہے، اوراس کے کھانے پینے کو اپنے ساتھ رکھتا ہے تو کیا وہ اس یتیم کے مال میں سے کچھ لے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے تین شرائط کے ساتھ بقدر ضرورت کھانے کی اجازت دی ہے۔

اول تو یہ کہ اس کے مال میں فضول خرچ نہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ اس کے مال کو اس طرح خرچ نہ کیا جائے کہ جلدی سے جلدی یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے ہی مال کو خرچ کرنے کی فکر میں لگا رہے، اور خوف کرے کہ اگر یتیم بڑا ہوگیا تو بعد میں خرچ کرنے کو نہیں ملے گا، تیسرے یہ کہ اس کے مال کو اپنے لئے بطور پونجی کے جمع کرکے نہ

رکھے، البتہ اس میں تجارت کرنے کی اجازت ہے لیکن نفع یتیم کا ہوگا۔

دراصل حضور ﷺ کا یہ فرمان آیت کریمہ سے ماخوذ ہے: ولا تأکلوا إسرافاً وبداراً أن یکبروا، ومن کان غنیاً فلیستعفف ومن کان فقیراً فلیأکل بالمعروف. اس آیت کریمہ سے یہ اور وضاحت ہوگئی کہ اگر کوئی مالدار ہے، تو اسے نہ کھانا ہی بہتر ہے، اور اگر فقیر ہے تب بھی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت ہی استعمال کرے، اسی طرح بیت المال کے امیر کے لئے بھی جائز ہے کہ بیت المال سے اپنا وظیفہ لے، لیکن ضرورت سے زائد نہ لے۔

ترجمة الباب : حدیث شریف سے یتیم کے مال میں بقدر ضرورت کھانے کا جواز ثابت ہوگیا، جو کہ ترجمۃ الباب کا مقصد ہے، لہٰذا ترجمۃ الباب ثابت ہوگیا۔

﴿باب ما جاء متی ینقطع الیتم﴾

یتیم کی یتیمی کب ختم ہوجاتی ہے

۲۲۲ ﴿حَدَّثَنا أحمد بنُ صالحٍ قال حدثنا یحیٰ بنُ محمدٍ المدینیُّ قال نا عبدُالله بنُ خالدِ بنِ سَعیدِ بنِ أبی مَرْیَمَ عن أبِیْهِ عن سعیدِ بنِ عبدِالرحمن بنِ رُقَیْشٍ أنَّهٗ سمع شُیوخاً مِنْ بنی عَمرو بنِ عَوْف ومِنْ خَالِهٖ عَبدِاللّٰه بنِ أبی أحمدَ قال قال علیُّ بنُ أبی طالبٍ: حَفِظْتُ عَنْ رسولِ اللّٰه صلی الله علیه وسلم: لاَیُتْمَ بَعْدَ احْتِلامٍ، ولاصُمَاتَ یَومٍ إلی اللَّیْلِ.﴾

ترجمه: حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے سن کر یاد رکھا کہ احتلام کے بعد یتیم نہیں ہے، اور نہ ہی دن بھر کی خاموشی رات تک۔

تشریح مع تحقیق : یُتْم : مصدر ہے بمعنی یتیم ہونا۔

صُمات : (ن) خاموش رہنا۔

گزشتہ ابواب یتیم کی پرورش سے متعلق تھے، اس باب میں یہ بتلا رہے ہیں کہ بچہ کب تک یتیم رہتا ہے اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ جب تک احتلام نہ ہو اس وقت تک بچہ یتیم ہی شمار کیا جائے گا، لیکن اگر کسی کو احتلام ہی نہ ہو تو پھر امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ ۱۷/ سال گزرنے پر اس کی یتیمی ختم ہوجائے گی، اور امام ابوحنیفہؒ کا قول ثانی، امام شافعیؒ اور صاحبینؒ کا اصل مسلک یہ ہے کہ ۱۵/ سال گزرنے پر بچے کی یتیمی ختم ہوجاتی ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے۔

باب کی روایت نہایت کمزور ہے اس لئے کہ اس میں دو راوی مجہول ہیں (۱) عبداللہ بن خالد (۲) خالد بن سعید۔ یحی بن سعید قطان اور علی بن مدینی وغیرہ حضرات نے ان دونوں کو مجہول کہا ہے۔

ولا صمات : زمانہ جاہلیت میں ایک عبادت یہ تھی کہ صبح سے شام تک خاموش رہتے تھے آپ ﷺ نے اس سے منع فرما کر ذکر بالخیر اور بات چیت کرنے کا حکم فرمادیا، علامہ نوویؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے صبح سے شام تک خاموش رہنا مکروہ ہے یعنی بغیر کسی عذر کے، اور ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

ترجمة الباب :لایُتم بعد احتلام الخ سے ترجمۃ الباب ثابت ہے۔

﴿ بَاب ما جاء فی التشدید فی أکل مال الیتیم ﴾

یتیم کے مال کو کھانے کی وعید کا بیان

۲۲۳ ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ سعیدٍ الهمدانیُّ قال نا ابنُ وهبٍ عن سلیمانَ بنِ بلالٍ عن ثَوْر بنِ زَیْدٍ عن أبی الغَیْثِ عن أبی هُرَیْرةَ أنَّ رسولَ اللّٰه صلی الله علیه وسلم قال : اجْتَنِبُوا السبعَ المُوْبِقَاتِ ، قِیلَ یا رسولَ الله! وَمَا هُنَّ ؟ قال : الشركُ باللّٰهِ ، وَالسِّحْرُ ، وقَتْلُ النفسِ التی حَرَّمَ اللّٰه إلّا بالحقِّ ، وأکْلُ الرِبَا ، وأکْلُ مالِ الیتیمِ ، والتَوَلِّی یومَ الزَحْفِ ، وقَذْفُ المُحْصَنَاتِ الغَافِلَاتِ المُؤمِنَاتِ .﴾

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو! عرض کیا گیا یا رسول اللہ! وہ کیا چیزیں ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا، جادو کرنا، اللہ کی حرام کردہ جانوں کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، ناحق یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے پشت پھیر کر بھاگنا، اور پاکدامن، ناواقف عورت کو تہمت لگانا۔

تشریح مع تحقیق : مُوْبِقات : یہ موبقۃ کی جمع ہے بمعنی خطرات، گناہ، معاصی، ہلاک کرنے والی چیز۔

تَوَلّي : (تفعیل) بھاگنا۔

زَحْفٌ : (ف) آہستہ آہستہ سرین پر گھسٹنا۔

قَذْفٌ : (ض) تہمت لگانا۔

محصنات : حَصُنَ سے ماخوذ ہے بمعنی پاک دامن ہونا، شادی شدہ ہونا۔

غافلات : غافلة کی جمع ہے بمعنی ناواقف، بے خبر۔

امام ابوداؤدؒ اس حدیث کو یہاں لاکر یہ استدلال فرمارہے ہیں کہ یتیم کے مال کو ناحق طریقہ سے کھانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس حدیث میں گناہ کبیرہ کی تعداد ۷/ بتلائی گئی ہے، اسکے علاوہ بعض روایات میں ۹/ اور بعض میں کل ۳/ کا ذکر ہے، لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ یہاں تحدید بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ تکثیر کو بتلانا ہے۔

گناہ کبیرہ کی تعریفات

گناہ کبیرہ کی تعریف کے حوالے سے علماء کے مختلف اقوال ملتے ہیں:

(۱) حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ جس معاصی اور گناہ میں مفسدہ لذاتہ ہو وہ گناہ کبیرہ ہے، اور جس میں مفسدہ لغیرہ ہو وہ گناہ صغیرہ ہے۔

(۲) صغیرہ اور کبیرہ امور اضافیہ ہیں، یعنی ہر گناہ اپنے مافوق کے اعتبار سے صغیرہ اور اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے۔

(۳) جامع تعریف یہ ہے جس گناہ پر قرآن میں یا حدیث میں وعید یا حد یا لعنت آئی ہو اور اس گناہ کا مفسدہ کسی ایسے ہی گناہ کے مفسدے کے برابر یا زیادہ ہو تو وہ گناہ گناہ کبیرہ ہے۔

الإشراك بالله : علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ شرک کی دو قسمیں ہیں۔(۱) شرک اکبر: جس کو بغیر توبہ کے معاف نہیں کیا جائے گا، وهو أن يتخذ من دون الله اندادا.

(۲) شرک اصغر: جیسے ریاء، سمعہ وغیرہ، یہاں شرک سے قسم اول بھی مراد ہوسکتی ہے، اور قسم ثانی بھی، لیکن قسم اول کا احتمال زیادہ ہے۔(تنظیم الاشتات:۱/۷۶)

سحر : یعنی جادو کرنا، سیکھنا، سکھانا سب فسق اور گناہ کبیرہ ہے، اور سات صورتیں ایسی ہیں، جن میں کفر وشرک لازم آتا ہے، (۱) سحر میں غیر اللہ کی عبادت ہو، (۲) غیر اللہ کی نذر ونیاز ہو، (۳) غیر اللہ سے استمداد ہو، (۴) اس کی ایسی تعظیم ہو جیسی اللہ کی تعظیم ہوتی ہے، (۵) کلمات کفر پر مشتمل ہو، (۶) افعال شرکیہ پائے جائیں، (۷) سحر کو مؤثر بالذات سمجھے، ان سات صورتوں میں سحر سے کفر لازم آتا ہے، حدود شریعت میں رہتے ہوئے ضرر سے بچنے کے لئے سحر کا سیکھنا جائز ہے۔

قتل : ایسے شخص کو قتل کرنا کہ شرعاً اس کا قتل حرام ہے گناہ کبیرہ ہے، البتہ اگر قصاصاً یا ارتداداً قتل کیا گیا تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے۔

أكل الربا : یہ بھی گناہ کبیرہ ہے، قرآن کریم میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، اور سود کھانے والے کی سزا کو بھی بیان کیا گیا ہے، الذين يأكلون الربا لايقومون إلّا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطان الخ .

اکل مال الیتیم: یہ بھی اکبر کبائر میں سے ہے، جو شخص یتیم کا مال ناحق طریقہ پر کھاتا ہے، اس کے بارے میں حکم ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کے کھانے کا انجام آگ ہے۔ (ترجمۂ شیخ الہند)

تولی یوم الزحف : زحف کہتے ہیں اس بڑے لشکر کو جو دشمن کی طرف روانہ ہو، کیونکہ زحف کے اصل معنی ہیں سرین پر گھسٹنا اور چونکہ بڑا لشکر بھی بہت آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا چلتا ہے، اس لئے اس پر مبالغۃً اس مصدر کا اطلاق کر دیا گیا، اور یہاں پر اس سے مراد جنگ ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان فوجی کے مقابلہ میں دو یا دو سے کم کافر ہوں تو وہاں سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے، لیکن اگر ایک مسلمان فوجی کے مقابلہ میں دو سے زائد کافر ہوں تو پھر تولی کی رخصت ہے مگر اس کے باوجود استقامت عزیمت ہے۔

قذف المحصنات : کسی کو تہمت لگانا بھی گناہ کبیرہ ہے، لیکن پاک دامن، شادی شدہ، اور بھولی بھالی عورت کو تہمت لگانا زیادہ سنگین گناہ ہے، عموماً چونکہ عورتوں کو تہمت لگائی جاتی ہے اس لئے یہاں ان کا ذکر کر دیا ہے ورنہ مرد کا بھی یہی حکم ہے۔

ترجمة الباب :أکل مال الیتیم الخ سے ثابت ہے۔

۲۲۴ ﴿حَدَّثَنا إبراهيم بن يعقوب الجوزجاني قال نا معاذ بن هانی قال نا حرب بن شداد قال نا يحيى بن أبى كثير عن عبدالحميد بن سنان نا عبيد بن عمير عن أبيه أنه حدثه وكان له صحبة أن رجلاً سأله فقال : يا رسول الله ! مالكبائر ؟ قال تسع، فذكر معناه، وزاد عقوقَ الوالدين المسلمين ، واستحلال البيت الحرام قبلتكم أحياء وأمواتاً.﴾

ترجمہ:حضرت عمیرؓ جو حضور ﷺ کے صحابی ہیں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! گناہ کبیرہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نو ۹/ ہیں، پھر راوی نے حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث کی طرح حدیث بیان فرمائی، البتہ اس میں یہ اضافہ کیا کہ مسلمان والدین کی نافرمانی کرنا، اور بیت اللہ کی حرمت کو حلال سمجھنا جو بیت اللہ تمہارا قبلہ ہے، زندگی کی حالت میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

تشریح مع تحقیق :یہ حدیث بھی ماقبل کی طرح ہی ہے، یہاں اس کو مختصر کر دیا گیا ہے، اصلاً تو یہ حدیث حضرت ابو ہریرۃؓ کی حدیث سے بھی طویل ہے، اس میں ان مذکورہ سات بڑے بڑے گناہوں کے علاوہ دو گناہوں کا اور اضافہ ہے۔

عقوق الوالدین : عقوق عقّ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کاٹنا، پھاڑنا وغیرہ، مطلب یہ ہے کہ غیر معصیت میں والدین یا ان میں سے کسی ایک کی بھی نافرمانی کرنا، اور ان کو ایسی تکلیف پہنچانا جو عرفاً اور عادۃً والدین

اپنی اولاد سے گوارہ نہ کرتے ہوں حرام ہے، اجداد اور جدات بھی والدین کے حکم میں ہی ہیں، قواعد الفقہ میں ایک قاعدہ ہے: لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

استحلال البیت الحرام: بیت اللہ میں قتل وخوں ریزی، اصطیاد اور قطع اشجار وغیرہ کو حلال سمجھنا گناہ کبیرہ ہے، بیت اللہ حالت زندگی میں اس لئے قبلہ ہے کہ تمام لوگ اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، اور مرنے کے بعد اس لئے قبلہ ہے کہ میت کے چہرے کو اسی کی طرف کیا جاتا ہے۔ (بذل: ۴/ ۹۸، حاشیہ ابوداؤد)

﴿بَاب ما جاء فی الدلیل علی الکفن مع جمیع المال﴾

کفن کے مالِ میت میں داخل ہونے کا بیان

۲۲۵ ﴿حَدَّثَنا محمدُ بنُ کثیرٍ قال أخبرنا سفیانُ عَنِ الأعمشِ عَن أبی وائلٍ عَن خَبَّابٍ قالَ مُصْعب بنُ عمیرٍ قُتِلَ یومَ أحدٍ، لَم یکنُ لَهُ إلاَّ نَمِرَةٌ، کنَّا إذَا غَطَّینَا رَأسَهُ خَرَجَتْ رِجْلاهُ، وإذَا غَطَّینَا رِجْلَیْهِ خَرَّ رَاسُهُ، فقَالَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: غَطُّوا بِها رأسَهُ، واجْعَلُوا علی رِجْلَیْهِ مِنَ الإذْخَرِ.﴾

ترجمہ: حضرت خبابؓ سے روایت ہے کہ مصعب بن عمیرؓ احد کے دن شہید ہو گئے، اور ایک کمبل کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا، جب ہم ان کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے، اور جب پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کمبل سے ان کا سر ڈھانک دو اور پاؤں پر اذخر ڈال دو۔

تشریح مع تحقیق: نَمِرة: اونی چادر، إذخر: ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے۔

امام ابوداؤدؒ اس باب کو قائم کر کے یہ فرما رہے ہیں کہ انسان کی موت رافع ملکیت ہوا کرتی ہے، لیکن بعض احوال میں میت کا مال میت کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا، اور وہ ایسا مال ہے، جس میں میت کی حاجت متعلق ہو، اور سب جانتے ہیں کہ کفن ودفن خود میت کی ضرورت ہے لہٰذا اولاً اس کی تجہیز وتکفین ہی ہوگی، دوسری ضرورت اس کے قرض کی ادائیگی ہوتی ہے، لہٰذا دوسرے نمبر پر اس کے قرض کو ادا کیا جائے گا، اس کے بعد وصیت کو ثلث مال یا اس سے کم میں پورا کیا جائے گا، اخیر میں مال کو ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

تو اس روایت سے دو باتیں خاص طور سے معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ انسان کے مرنے کے بعد سب سے پہلے اس کے جمیع مال سے اس کی تجہیز وتکفین ہوگی، اسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے امام ابوداؤدؒ نے اس باب کے تحت اس روایت کو پیش کیا ہے، دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ میت کے مال سے ہی اس کو کفن دیا جائے گا، جیسا کہ

حضرت مصعب بن عمیرؓ کوان کی ایک چادر میں ہی کفن دیا گیا۔

ترجمۃ الباب: ترجمۃ الباب اور حدیث میں ربط یہ ہے کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کا جمیع مال صرف ایک اونی چادر تھی، جس کو تکفین کے لئے استعمال کرلیا گیا، اور حضور ﷺ نے کسی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ان پر کسی کا قرض یا کسی کے لئے وصیت تو نہیں ہے، معلوم ہوا کہ تجہیز و تکفین جمیع مال سے ہوگی، لہٰذا ترجمۃ الباب اور حدیث میں مناسبت ثابت ہوگئی۔

﴿باب ماجاء فی الرجل یهب الهبة ثم یوصٰی له بها أو یرثها﴾

اس شخص کا بیان جو کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے، پھر واہب کو وہ چیز وصیت یا میراث میں مل جائے

۲۲۶. ﴿حَدَّثَنا أحمدُ بنُ یُونُسَ قال نا زُهَیرٌ قال نا عبدُالله بنُ عطاءٍ عَنْ عبدِالله بنِ بریدةَ عَنْ أَبِیهِ بُرَیْدَةَ أن امْرأةً أتتْ رسولَ اللّٰه صلّی الله علیه وسلم فقالَتْ: کنتُ تَصدَّقْتُ عَلٰی أُمّي بِولِیْدَةٍ وانَّها مَاتَتْ، وَتَرَکَتْ تلكَ الولیدةَ، قال: قد وَجَبَ أجْرُكِ، ورجَعَتْ إلَیْكِ فی المِیْرَاثِ، قالَتْ: وإنّها مَاتَتْ وَعَلَیْهَا صَوْمُ شَهْرٍ، أَفَیُجْزِئُ أَوْ یُقْضٰی عَنْهَا أَنْ أَصُومَ عَنْها؟ قال: نَعَمْ، قالَتْ: وإنَّها لَمْ تَحُجَّ، أَفَیُجْزِئُ أو یُقْضٰی عَنْهَا أَنْ أَحُجَّ عَنْهَا؟ قال: نَعَمْ.﴾

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی، اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے اپنی والدہ کو ایک باندی ہبہ کی تھی، اب میری والدہ کا انتقال ہوگیا، اور ترکہ میں وہ لونڈی ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا ثواب تو ثابت ہوگیا، اور وہ باندی بھی میراث میں تمہاری طرف لوٹ آئی، پھر اس عورت نے عرض کیا کہ میری والدہ اس حال میں مری ہیں کہ ان پر ایک ماہ کے روزے تھے، کیا میں ان کی طرف سے قضاء کرلوں؟ تو کافی ہوجائے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ادا ہوجائے گا، اس عورت نے عرض کیا کہ میری والدہ نے حج بھی نہیں کیا تھا، تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں تو ادا ہوجائے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کافی ہوجائیگا۔

تشریح مع تحقیق: اس باب کے تحت دو مسئلے آتے ہیں، جن کی وضاحت ناگزیر ہے، پہلا مسئلہ تو یہ ہے: کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو کوئی چیز صدقہ کردے یا ہبہ کردے، پھر موہوب لہ اسی چیز کی واہب کے لئے وصیت کرجائے، یا واہب اس شئ موہوب کا وارث ہوا اور وہ ہی شئ اس کو وراثت میں ملے تو واہب

کے لئے اس چیز کا لینا کیسا ہے.؟

امام ابوداؤدؒ اس باب کو قائم کر کے جواز ثابت کر رہے ہیں، کہ ایک عورت نے سوال کیا کہ میں نے اپنی والدہ کو ایک باندی ہبہ کی تھی، اور اب والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، اور وہ باندی مجھے بطور وراثت مل رہی ہے تو میں اسکو لے سکتی ہوں یا نہیں؟ کیونکہ اس لونڈی کے میری ملک میں واپس لوٹ آنے میں یہ شبہ ہے کہ یہ عود فی الھبہ تو نہیں ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہبہ کر کے واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے دوبارہ اسی کو کھالے؟ حضور ﷺ نے اجازت دیدی کہ یہ عود فی الصدقہ یا عود فی الھبہ نہیں ہے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تبدل ملک سے تبدل شئ ہو جاتی ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: عليها صدقة ولنا هدية، معلوم ہوا کہ جب ملک بدل گئی تو ایسا ہو گیا جیسا کہ وہ شئ ہی بدل گئی، ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کا یہی مذہب ہے، البتہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس مال کو فقراء کو دیدینا چاہئے۔

نیابت فی العبادات

یہاں پر دوسرا مسئلہ نیابت فی العبادات کا زیر بحث آتا ہے، اس مسئلے کی اصل میں تین صورتیں نکلتی ہیں، کیونکہ عبادات کی تین ہی قسمیں ہیں، (۱) عبادت مالیہ محضہ: جیسے زکوۃ۔ (۲) عبادت بدنیہ: جیسے نماز۔ (۳) عبادت مرکبہ: یعنی من وجہ مالیہ اور من وجہ بدنیہ جیسے حج۔

پہلی صورت میں تمام ائمہ کرام متفق ہیں کہ نیابت درست ہے، خواہ حالت اختیاری ہو مثلاً جبکہ منوب عنہ زندہ ہو، یا حالت غیر اختیاری ہو جیسے منوب عنہ مرجائے اور اس کی طرف سے زکوۃ ادا کی جائے، تو درست ہے۔

دوسری قسم کی عبادات میں بالاتفاق نیابت نہیں چلے گی، نہ حالت اختیاری میں اور نہ ہی حالت اضطراری میں، بلکہ مکلف کو خود ہی اس کی ادائیگی ضروری ہے، البتہ امام احمدؒ صرف نذر کے روزوں میں نیابت کے قائل ہیں، جبکہ جمہور مطلقاً عبادات بدنیہ میں نیابت کے قائل نہیں ہیں۔

تیسری قسم کی عبادات میں بحالت عجز بالاتفاق نیابت چل سکتی ہے، البتہ قدرت کے وقت عبادات مرکبہ میں بھی نیابت نہیں چلے گی۔ (درس ترمذی: ۲/۴۹۱)

اب اختلاف صرف ایک صورت میں ہوا کہ نذر کے روزوں میں نیابت چلے گی یا نہیں؟

مسئلة خلافية

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ نذر کے روزوں میں نیابت چل سکتی ہے۔

جمہور فرماتے ہیں کہ بدنی عبادات میں مطلقاً نیابت نہیں چلے گی۔

امام احمدؒ کے دلائل

(۱) مَنْ مَاتَ وعَلَيهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْه وَلِيُّهٗ. (بخاری: ۲۲۶/۱)

(۲) حدیث باب ہے: قالَتْ : وإنَّها ماتَتْ وعَلَيُها صَومُ شهرٍ أفَيُجزِئُ أو يُقضىٰ عَنها أن أصوم عنها؟ قال: نعم . اس سے امام احمدؒ نے استدلال اس طور پر کیا ہے، اگر نیابت نہ چلتی تو حضور ﷺ اس عورت کو اپنی والدہ کی طرف سے روزے رکھنے کی اجازت نہ دیتے۔

جمہور کے دلائل

(۱) حضرت ابن عباسؓ کی حدیث: قال : لاَ يُصلّي أحدٌ عن أحدٍ ولاَ يصومُ أحدٌ عن أحدٍ.

(۲) مؤطا مالک میں حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں یہ مروی ہے: كان يسأل هل يصوم أحدٌ أو يصلي أحدٌ عن أحدٍ؟ فيقول : لايصوم أحد عن أحدٍ ولايصلي أحد عن أحد. (مؤطا مالک: ۲۲۵)

(۳) طحاوی شریف میں ایک حدیث صحیح سند سے منقول ہے: عن عمرة بنت عبدالرحمن قالت : قلت لعائشةؓ: إنّ أمي تُوفّيَتْ وعليها صيام رمضان أيصلح أن أقضي عنها؟ فقالت: لا، ولكن تصدقي عنها مكان كل يوم على مسكين خير من صيامك. (عمدۃ القاری: ۶۰/۱۱)

(۴) عن ابن عمرؓ قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من مات وعليه صوم شهرٍ فليطعم عنه مكان كل يوم مسكيناً. الخ۔

امام احمدؒ کے دلائل کا جواب

دوسری روایات کی روشنی میں صیام سے مراد کفارۂ صیام ہے، یا مطلب یہ ہے کہ روزے رکھکر والدہ کو ثواب پہنچادو تو یہاں ایصال ثواب مراد ہے نہ کہ انکی طرف سے ادائیگی۔ واللہ اعلم بالصواب (تفصیل کے لئے عینی ۵۹/۱۱ تا ۶۲)

﴿بَاب ما جاء فى الرجل يوقف الوقف﴾

اس آدمی کا بیان جو اپنا مال وقف کردے

۲۲۷ ﴿حَدَّثنا مُسدَّدٌ قال نا يزيدُ بنُ زُرَيعٍ ح وحدثنا مُسدَّدٌ قال نا بِشْرُ بنُ المفضَّلِ ح وحدثنا مسدّد قال نا يحىٰ عَن ابنِ عونٍ عن نافعٍ عن ابنِ عُمَرَ قال : أَصَابَ عُمَرُ

أرضاً بِخَيْبَرَ ، فأتىَ النبيَّ صلّى الله عليه وسلّم ، فقالَ : أَصَبْتُ اَرْضاً لم أُصَبْتُ مالاً قَطُّ أَنْفَسَ عِنْدِيَ مِنْهُ ، فكَيْفَ تأمُرني بِهِ ؟ قال : إنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْلَهَا وتَصَدَّقْتَ بِهَا ، فَتَصَدَّقَ بِها عُمَرُ ، أنَّهُ لايُبَاعُ أصلُها وَلَايُوهَبُ ، ولايُورَثُ لِلْفُقَرَاءِ والقُرْبىٰ والرِقَابِ ، وفىٰ سبيلِ اللّهِ ، وابنِ السَّبِيلِ ، وزادَ عَنْ بشرٍ وَالضَّيْفَ ، ثم اتفقوا لاجُنَاحَ عَلىٰ مَنْ وليَّها أنْ ياكُلَ منها بالمعروفِ ، ويُطْعِمَ صديقاً ، غيرَ مُتَمَوِّلٍ فِيه ، زادَ عَنْ بشرٍ قال : وقال محمد : غَيرَ مُتَأَثِّلٍ مَالاً .﴾

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک زمین ملی، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے ایک ایسی زمین ملی ہے کہ اس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا، آپ اس کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کی ملکیت روک لو، اور اس کے منافع کو صدقہ کردو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے صدقہ کردیا، کہ اصل زمین نہ بیچی جائے، نہ ہبہ کی جائے اور نہ ہی میراث میں آئے، اس سے فقراء، قربیٰ، غلام، مجاہدین، اور مسافرین نفع اٹھائیں، اور بشر نے زیادہ کیا مہمان کو بھی (کہ وہ بھی اس سے نفع اٹھائے) اور جو شخص اس کا متولی ہو وہ منافع میں سے کھاسکتا ہے، اور ان دوستوں کو کھلاسکتا ہے جو مالدار نہ ہوں، مسدد نے بشر سے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ بشر نے کہا کہ محمد بن سیرین نے فرمایا کہ وہ مال جمع کرنے والا نہ ہو۔

تشریح مع تحقیق: مُتَموِّلٌ : (تفعل) اسم فاعل ہے بمعنی سرمایہ کار، مال کو جمع کرنے والا۔

مُتَأثِّل : (تفعل) اسم فاعل بمعنی مال اکٹھا کرنے والا، متمول اور متاثل دونوں کے معنی قریب قریب ہیں۔

یہ ایک طویل حدیث ہے، اسی طرح اس کے بعد والی حدیث بھی مفصل ہے، اس لئے ہم حدیث کے ہر جزو کی تشریح ساتھ ساتھ کرتے رہیں گے، تاکہ بعد میں کوئی جزء چھوٹ نہ جائے، نیز حدیث کے اخیر میں وقف سے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

الوقف : وقف کے لغوی معنی حبس اور روکنے کے ہیں، کہا جاتا ہے: حَبَسْتُ الأرض ووقفتُها، حنفیہ نے وقف کی اصطلاحی تعریف یہ کی ہے:

إنه حبس العين على حكم ملك الله تعالى والتصدق بالمنفعة . (مجمع الانہر)

فتاویٰ شامی میں یہ لکھا ہے کہ: هو شرعاً حبس العين على حكم ملك الواقف والتصدق بالمنفعة.

(شامی:۶/۵۱۹)

قوله أصاب عمرؓ ارضاً :

اس زمین کا نام ثمغ تھا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین خیبر میں تھی اور بعض روایات میں یہ ہے کہ یہ زمین مدینہ میں تھی، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں یہ لکھا ہے کہ یہ زمین خیبر ہی میں تھی، اور اس کی مقدار اُن سو (۱۰۰) حصوں کے برابر تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کی غنیمت میں سے ملے تھے۔ (فتح الباری: ۵/۵۰۲)

اس کے برخلاف ابوعبید البکری اور علامہ سمہودی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ زمین مدینہ منورہ میں تھی، اب روایات میں تعارض ہوگیا، اس لئے فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ثمغ نام کی زمین حضرت عمرؓ کی ملکیت تھی اور یہ مدینہ میں تھی، جس کو حضرت عمرؓ نے وقف کیا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ ان کو خیبر سے بھی سو (۱۰۰) حصے ملے تھے ان کو بھی حضرت عمرؓ نے صدقہ کردیا تھا، اب بعض راویوں نے صرف ثمغ کے صدقہ کرنے کا ذکر کیا، اور بعض نے صرف خیبر کی غنیمت سے ملے ہوئے سو حصوں کے صدقہ کرنے کا ذکر کیا، پھر بعض رواۃ نے خلط ملط کردیا اور ثمغ کو خیبر کی زمین قرار دیا، حالانکہ یہ زمین مدینہ میں تھی، خیبر کے حصوں کا صدقہ اور مدینہ میں ثمغ زمین کا وقف دونوں الگ الگ ہیں۔ (تکملہ فتح الملہم: ۲/۱۲۷)

قوله: أنفَسَ عِندِي مِنه

یہ زمین بڑی عمدہ بھی تھی، جو دل کو بھانے والی تھی، اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے "لن تنالوا البرّ حتی تنفقوا مما تحبون" نازل فرمایا تو بہت سے صحابہؓ نے اپنے اپنے محبوب اور پسندیدہ مال کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کردیا، انہیں میں سے حضرت عمرؓ بھی ہیں، ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے اس زمین کو صدقہ کرنے کے بارے میں مشورہ کیا: في رواية يحیٰ بن سعيد "أن عمرؓ استشار رسول الله صلى الله عليه وسلم في أن يتصدق". (فتح الباری: ۵/۵۰۳)

قوله: حبست أصلها

مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر باقی رکھو، یہ مطلب تو جمہور کے نزدیک ہوگا، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ملکیت پر باقی رکھو، اور اس کے منافع کو تقسیم کردو، جمہور اور حنفیہ کے درمیان کیا اختلاف ہے، اس کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب آجائے گی۔

قوله: تصدقت بها

ایک حدیث میں ہے: "تصدق بثمره وحبس أصله" مطلب یہ ہے کہ اس کے منافع کو فقراء و مساکین پر صدقہ کردو، اور اس کی اصل کو اپنی ملکیت میں باقی رکھو۔

قوله: لايباع اصلها

یعنی اس زمین کو بیچنا جائز نہیں، اور نہ ہی اسکو ہبہ کیا جائے گا، اور نہ اس میں وراثت جاری ہوگی، امام بخاریؒ

نے ان شرائط کے پیش نظر اس روایت کو کتاب الشروط میں بھی نقل کیا ہے، کتاب الشروط میں سب سے آخری حدیث یہ ہی نقل کی ہے۔

اس روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرائط حضرت عمرؓ کی بیان کردہ ہیں، جبکہ دوسری روایات مثلاً نافع نے روایت ہے اس میں ہے کہ ان شرائط کو حضور نے خود بیان کیا ہے، حدیث یہ ہے:فقال النبی صلی الله علیه وسلم تصدق بأصله لایباع ، ولایوهب ولایورث، ولکن ینفق ثمرهٔ. اسی طرح اور بھی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے، اب ان دونوں باتوں میں تطبیق کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ حضور نے حضرت عمرؓ کو یہ شرائط بتلائیں اور انہوں نے ان پر عمل کیا، اس وجہ سے دونوں کی طرف نسبت کردی گئی۔ (تکملہ فتح الملہم:۲/۱۲۰)

قوله: فتصدق عمرؓ

حضرت عمرؓ نے اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی صدقہ کردیا تھا، البتہ آگے آنے والی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو اپنی خلافت کے زمانہ صدقہ کیا تھا، کیونکہ آگے آنے والی روایت میں صراحت ہے کہ اس وقف نامہ کو معیقیب نے لکھا ہے اور یہ حضرت عمرؓ کے زمانے کے کاتب تھے۔

لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو حضور ﷺ کے زمانہ میں ہی وقف کردیا تھا، اور خود ہی اس کے متولی رہے، لیکن جب وصیت کا وقت آیا تو وقف نامہ لکھوایا تھا، اس لئے دونوں باتوں میں تعارض نہیں۔ (فتح الباری:۵/۵۰۵)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ سے تو مشورہ لیا تھا، اور وقف کیا اپنی خلافت کے زمانے میں ہی، جیسا کہ طحاوی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے "لولا ذکرت صدقتی لرسول الله ﷺ لرددتها".

قوله: للفقراء

فقراء سے عام فقراء مراد ہیں، اور قربیٰ سے کون لوگ مراد ہیں اس میں دو قول ہیں: (۱) وہ اقرباء مراد ہیں جن کا تذکرہ "واعلموا أنما غنمتم من شئ الخ" میں کیا گیا ہے۔ (۲) یا اقرباء سے مراد واقف کے اقرباء ہیں، علامہ قرطبی نے قول ثانی کو ہی راجح قرار دیا ہے۔ (فتح الباری:۵/۵۰۴)

قوله: وفی الرقاب

وہ غلام جو مکاتب ہیں، ان کا بدل کتابت ادا کرنے میں اسکے منافع کو خرچ کیا جائے، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اس زمین کی آمدنی سے غلام خریدے جائیں اور پھر ان کو آزاد کیا جاوے۔ (بذل:۴/۹۹)

قوله: فی سبیل الله

یہاں یہ اپنے عمومی معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے منقطع الحاج والغزاۃ مراد ہیں، مثلاً ایک شخص حج کے لئے

نکلا اور راستہ میں سواری ہلاک ہوگئی، اور ابن السبیل سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس گھر تو مال ہو لیکن اس وقت سفر میں اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے گھر واپس جاسکے۔

قوله: زاد عن بشر الضيف

یہاں پر مسدد کے تین استاذ ذکر کئے گئے ہیں (۱) یزید بن زریع۔ (۲) بشر بن المفضل۔ (۳) یحییٰ۔ تو یحییٰ اور یزید کی روایت میں "ضیف" (مہمان) کا ذکر نہیں ہے، اور بشر کی روایت میں ضیف (مہمان) کا بھی ذکر ہے، یعنی جس طرح مسافر وغیرہ پر اس وقف کی آمدنی کو خرچ کیا جائے گا اسی طرح مہمان کی ضیافت میں بھی اس کو خرچ کیا جائے گا، لیکن یاد رہے کہ ضیف کا ذکر عطف الخاص علی العام کی قبیل سے ہے کیونکہ ابن السبیل میں ضیف بھی داخل ہے۔ (حاشیہ ابوداؤد: ۲/۳۹۸)

قوله: لاجناح على من وليها

جو شخص ارض موقوفہ کا متولی ہو اس کے لئے عام دستور کے مطابق بقدر ضرورت کھانا جائز ہے، علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جو شخص وقف کی زمین میں کام کرتا ہے تو وہ اسی میں سے کھاتا ہے، آگے بالمعروف کی قید ہے، اس کے تین مطلب بیان کئے جاتے ہیں: (۱) معروف سے مراد عرف اور عادت ہے کہ عرف اور عادت کے اعتبار سے کھا سکتا ہے، (۲) معروف سے مراد بقدر ضرورت کھانا ہے، (۳) معروف سے مراد یہ ہے کہ اپنے عمل کی بقدر کھا سکتا ہے، حنفیہ نے پہلے معنی کو ہی ترجیح دی ہے۔

قوله: غير متمول

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نگراں وقف کی آمدنی کو اپنے لئے جمع کر کے نہ رکھے، اسی طرح آمدنی کو تو جمع کر کے نہیں رکھتا لیکن اس سے غلام وغیرہ خرید کر اپنے استعمال میں لاتا ہے وہ بھی اسی میں داخل ہے۔ (تکملہ فتح الملہم: ۲/۱۲۲)

حدیث کی تشریح کے بعد یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وقف کی شرعی حیثیت اور اسکی حقیقت کیا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور علماء کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے، ہم اس کی جامع اور مختصر وضاحت آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

﴿مسئلة خلافية﴾

ائمہ ثلاثہ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ وقف مشروع ہے، اور ہمیشہ لازم ہی ہوا کرتا ہے یعنی اس کو بیچنا، ہبہ کرنا اور وراثت میں دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح واقف کے لئے اس شیٔ موقوفہ میں رجوع جائز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ وہ وقف کے لازم ہونے کے قائل نہیں ہیں، اور کہتے ہیں کہ واقف کو رجوع کا حق ہے، اس کو بیچنا، ہبہ کرنا اور اس میں وراثت کا جاری ہونا سب جائز ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کی طرف وقف کے عدم لزوم کی علی الاطلاق نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ بالکل غلط ہے، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک میں قدرے تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ وقف کی دو قسمیں ہیں (۱) وقف لازم (۲) وقف غیر لازم۔

وقف لازم: تو یہ ہے کہ واقف کسی چیز کی ذات کو ہی وقف کردے، جیسے زمین کو مسجد کے لئے، یا قبرستان کے لئے وقف کردینا، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اس میں واقف کو رجوع کا حق نہیں، اسی طرح نہ اس کو بیچا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی۔

وقف غیر لازم: یہ ہے کہ شئی کی ذات کو تو وقف نہ کرے، بلکہ اس کے منافع کو صدقہ کردے، مثلاً یہ کہہ دے کہ اس زمین سے جو آمدنی ہوگی وہ مسجد کے لئے یا فقراء کے لئے وقف ہے۔

پھر اس وقف غیر لازم کی تین صورتیں ہیں:

(۱) واقف نے وقف کو موت کی جانب منسوب کیا ہوگا، مثلاً کہے کہ یہ چیز میری زندگی میں وقف ہے، اور مرنے کے بعد صدقہ ہے، یا یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد یہ گھر فلاں طریقے پر صدقہ ہے، تو اس صورت میں بھی وقف لازم ہی ہوگا، اور "لایباع ولایوہب ولایورث" کا حکم اس میں جاری ہوگا۔

(۲) واقف نے کسی شئی کی منفعت کو مطلقاً وقف کیا اور مابعد الموت کی طرف منسوب نہیں کیا، مثلاً یہ کہا کہ میں نے اپنی زمین کی آمدنی کو فلاں آدمی پر وقف کردیا، اور مرنے کے بعد کا کوئی حکم بیان نہیں کیا، لیکن کسی حاکم نے اس کے لزوم کا فیصلہ کردیا ہو، تو بھی یہ وقف لازم ہی ہوگا۔

(۳) واقف کسی چیز کی منفعت صدقہ کردے، اور اس کو مابعد الموت کی طرف منسوب نہ کرے اور اس کے ساتھ حاکم کا فیصلہ بھی متصف نہ ہو، مثلاً یہ کہے کہ میں نے اپنے گھر کی آمدنی کو فلاں شخص پر وقف کردیا، اس تیسری صورت میں امام ابوحنیفہؒ اور جمہور کے درمیان اختلاف ہے، امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وقف لازم نہیں ہوگا، لہٰذا اس میں واقف کے لئے رجوع جائز ہے، اسی طرح اس کو بیچنا، ہبہ کرنا وغیرہ بھی جائز ہے۔

اس کے برخلاف ائمہ ثلثہ اور صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ وقف لازم ہی ہوتا ہے، کسی صورت میں بھی وقف غیر لازم نہیں ہوتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے وقف کے لزوم اور مؤبد ہونے کے سلسلے میں جمہور کی مطلقاً مخالفت نہیں کی ہے، بلکہ وقف لازم ہونے اور نہ ہونے کے طریقے میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کا کہنا ہے کہ صرف تین صورتوں میں ہی وقف لازم ہوتا ہے۔

(۱) زمین کی ذات کو ہی وقف کردیا جائے۔
(۲) اس کو مابعد الموت کی طرف منسوب کردیا جائے۔
(۳) یا اس کے ساتھ حاکم کا فیصلہ متصف ہو جائے۔
اگر ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی گئی تو وقف لازم نہیں ہوگا۔

جمہور کی دلیل

جمہور نے اپنے مسلک کی تائید میں حضرت عمرؓ کے قصۂ مذکورہ کو پیش کیا ہے، کیونکہ یہ واقعہ اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس زمین کے منافع صدقہ کیے تھے، اور حضور ﷺ نے فیصلہ فرمادیا تھا کہ :أنه لايباع ولا يوهب ولا يورث، معلوم ہوا کہ عین رقبہ کو صدقہ نہیں کیا گیا پھر بھی وہ وقف لازم ہی ہوا، اگر لازم نہ ہوتا تو اس کو بیچنے کی اجازت ہوتی، اسی طرح اس کو ہبہ بھی کیا جاسکتا تھا، اور میراث بھی جاری ہوسکتی تھی۔

جواب

امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ وقف ان تین صورتوں میں داخل تھا جن میں حنفیہ کے نزدیک بھی وقف لازم ہوجاتا ہے، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ:
(۱) حضرت عمرؓ نے رقبۂ ارض کو صدقہ کیا ہو، اور حضور ﷺ کے فرمان : "إن شئت حبست أصلها" کی مراد "حبست أصلها على ملك الله" ہو۔
(۲) اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ نے وقف کو مابعد الموت کی طرف منسوب کردیا ہو، جیسا کہ باب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے۔
(۳) اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمرؓ نے محض زمین کے منافع کو صدقہ کیا ہو، لیکن حاکم یعنی حضور اکرم ﷺ کا فیصلہ اس کے ساتھ ہو، جس کی وجہ سے یہ وقف لازم ہوگیا۔

خلاصہ

مسئلہ وقف مختلف فیہ ہے، ہر فریق کے پاس دلائل بھی ہیں، لیکن عام روایات سے سلف نے یہ ہی فیصلہ کیا ہے کہ تمام اوقاف لازم ہی ہوتے ہیں، اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے بارے میں جو تفصیل ذکر کی گئی ہے، اس کے ساتھ وقف کو مقید نہیں کرتے، نیز دور حاضر میں حنفیہ نے فتویٰ بھی صاحبینؒ کے قول پر ہی دیا ہے۔
(مذکورہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے دیکھیں: اعلاء السنن: ۱۳/۹۵، عمدۃ القاری: ۶/۳۶۹، فتح الباری: ۵/۵۰۵، بذل المجہود: ۴/۹۹، تکملہ فتح الملہم: ۲/۱۲۲۔)

۲۲۸ ﴿حَدَّثَنا سليمانُ بنُ داوٗدَ المهريُّ قال أخبرَنَا ابنُ وهبٍ قال أخبرنی اللَّيثُ عن يَحيَیٰ بنِ سعيدٍ عَنْ صَدَقَةِ عُمَرَ بنِ الخطّابِ قال : نَسَخَهَا لِی عبدُالحميد بنُ عبدِالله بنِ عبْدِالله بنِ عُمَرَ بنِ الخطّابِ ، بسْم الله الرحمٰن الرحيم: هٰذا ما كَتَبَ عبدُالله عُمَرُ فی ثَمغٍ ، فَقَصَّ مِنْ خَبَرِهٖ نَحْوَ حَدِيثِ نافعٍ قال غَيْرُ مُتَأَثِّلٍ مالاً ، فما عَفَا عَنْهُ مَنْ ثَمَرِهٖ فهو لِلسَّائلِ والمحرومِ ، قال : وسَاقَ القصةَ ، قال : وإنْ شَاءَ وَلِیُّ ثَمغٍ اشْتَرىٰ مِنْ ثَمَرِهٖ رقيقاً لعملِهٖ ، وَكَتَبَ مُعَيقِيْبٌ وشَهِدَ عبدُالله بنُ الأرقمِ ، بسْم الله الرحمن الرحيم هٰذا ما أَوْصىٰ بِهٖ عَبدُ الله عُمَرُ أَمِيرُ المؤمنينَ إن حَدَثَ بِهٖ حَدَثٌ، إنَّ ثَمْغاً و صَرْمَةُ بنُ الأَكْوَعِ والعبدُ الذی فِيهٖ ، والمائةُ سهمِ الذی بِخَيْبَرَ، ورَقِيْقُهُ الذیْ فِيهٖ ، والمائةُ التی أطعمه محمد صلی الله عليه وسلم بالوَادِیْ تَلِيْهٖ حفصةُ ما عَاشَتْ ، ثم يَلِيْهٖ ذُوالرأيِ مِنْ اهلها أن لايُبَاعَ ولَا يُشْتَرىٰ ، يُنْفِقُهُ حَيْثُ رأىَ مِنَ السائِلِ والمَحْرُوْمِ ، وذيِ القُربىٰ ، ولَا حَرَجَ علىٰ مَنْ وليهُ إنْ آكَلَ أو آكَلَ أَوْ اشترىٰ رقيقاً مِنْهُ.﴾

ترجمہ: یحییٰ بن سعید سے حضرت عمر بن الخطابؓ کے صدقے کے بارے میں روایت ہے، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ عبدالحمید بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عمرؓ کے صدقے کا واقعہ لکھ کر دیا، (خط کا مضمون یہ تھا) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ وہ تحریر ہے جس کو اللہ کے بندے عمرؓ نے ثمغ زمین کے بارے میں لکھا، پھر ان کی روایت کو نافع کی حدیث کی طرح بیان کیا، یعنی انہوں نے کہا کہ مال جمع کرنے والا نہ ہو، اور جو پھل اس میں سے گرے مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کے لئے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید نے پورا واقعہ بیان کیا، یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ (اس تحریر نامہ میں یہ بھی تھا) اگر ثمغ کا متولی چاہے تو اس ثمغ زمین میں کام کرنے کے لئے پھلوں کے بدلے میں غلام خرید لے، اس تحریر نامہ کو معیقیب نے لکھا، اور عبداللہ بن ارقم نے گواہی دی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ وہ وصیت ہے جو اللہ کے بندے عمر بن الخطاب امیر المؤمنین نے کی ہے، کہ اگر مجھ پر کوئی حادثہ آئے (مرجاؤں) تو ثمغ، صرامہ بن الاکوع، وہ غلام جو وہاں ہیں، اور وہ سو (۱۰۰) حصے جو حضور ﷺ نے مجھے دیئے تھے اس وادی میں جو خیبر کے قریب ہے، ان سب کی متولی حضرت حفصہؓ رہیں گی (جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور حضور ﷺ کی زوجہ ہیں) جب تک بھی وہ زندہ رہیں، پھر ان کے خاندان میں سے جو ذی رائے اور عقلمند ہوں وہ متولی رہیں گے، اس شرط پر کہ اس کو نہ بیچا جائے گا اور نہ خریدا جائے گا، اور جہاں مناسب سمجھے وہاں اس کو خرچ کرے یعنی مانگنے والوں پر، محروموں پر اور عزیزوں پر، اور اگر اس کا متولی اس میں سے خود کھائے یا

دوسروں کو کھلائے یا غلام خریدے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح مع تحقیق :اس حدیث میں حضرت عمرؓ کی وقف کردہ زمین کا تذکرہ ہے، اوراس تحریر کا ذکر ہے، جو حضرت عمرؓ نے وفات سے قبل بطور وصیت لکھوائی تھی، پہلی حدیث میں اوراس حدیث میں صرف الفاظ کا فرق ہے، اوراس میں وقف کی شکل بیان کردی گئی ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں اتنا مفصل بیان نہیں تھا، تاہم اس حدیث سے بہت سے نئے فوائد معلوم ہوئے۔

(۱) بیٹا اپنے والد کا نام بغیر کنیت اور بغیر القاب کے بھی لے سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا۔

(۲) وصیت کو عورت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، اسی طرح عورت کو وقف کا نگراں بنایا جاسکتا ہے۔

(۳) کسی غیر معین شخص کو بھی ناظر بنایا جاسکتا ہے جبکہ اس کی ایسی صفات کو بیان کردیا جائے، جس سے امتیاز ہو سکے۔

(۴) واقف اگر دوسرے کسی شخص کو ناظر اور نگراں مقرر نہ کرے تو خود مال موقوفہ کا ناظر بن سکتا ہے۔

(۵) کسی بھی دینی یا دنیوی کارخیر کے سلسلے میں اہل علم وفضل سے مشورہ کرنا چاہئے اور مشورہ دینے والے کو اچھا مشورہ دینا چاہئے۔

(٦) اس حدیث سے حضرت عمرؓ کی فضیلت ظاہر ہے کہ انہوں نے "لن تنالوا البرّ حتی تنفقوا مما تحبون" پر عمل کرنے میں انتہائی دلچسپی اور رغبت کا مظاہر کیا۔

(۷) وقف کی فضیلت یہ ہے کہ وہ صدقہ جاریہ کے حکم میں ہوتا ہے۔

(۸) واقف اگر کوئی شرط لگائے تو اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اوراس پر عمل بھی ضروری ہے۔

(۹) ایسی چیز ہی کا وقف ہوسکتا ہے جس سے ہمیشہ نفع اٹھانا ممکن ہو، اور جو چیز دائمی طور پر قابل انتفاع نہ ہو مثلاً طعام تو اس کا وقف کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

(۱۰) مالداروں پر وقف کرنا بھی جائز ہے، کیونکہ ذوی القربیٰ اور مہمان کو ضرورت مند ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے۔

(۱۱) واقف کے لئے جائز ہے کہ وہ شئ موقوفہ کی آمدنی کے کسی حصہ کو اپنے لئے متعین کرلے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے والی کو اس کے منافع سے بقدر ضرورت استعمال کی اجازت دی ہے، اور والی کبھی واقف خود بھی ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح دوسرا والی اور ناظر کھا سکتا ہے اسی طرح خود واقف بھی کھا سکتا ہے۔

(۱۲) خیبر کے اکثر قلعے عنوۃ فتح ہوئے تھے، جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو مال کثیر حاصل ہوا۔

ان فوائد کے علاوہ اور بھی فوائد حدیث بالا سے اخذ کئے جاسکتے ہیں، ہم نے ان میں سے اکثر فوائد کو فتح الباری، تکملہ فتح الملہم اور بذل المجہود سے اخذ کیا ہے۔

ترجمة الباب: حدیث اور باب میں مناسبت واضح ہے کیونکہ حدیث میں وقف کی صورت حال ہی کو بیان کیا گیا ہے۔

﴿باب ما جاء فی الصدقة عن المیت﴾

میت کی جانب سے صدقہ کرنے کا بیان

۲۲۹ ﴿حَدَّثَنا الربیعُ بنُ سلیمانَ المؤذِّنُ قال نا ابنُ وهبٍ عَنْ سُلیمانَ یعنی ابنَ بلالٍ عن العَلاءِ بنِ عبدالرحمن أراهُ عن أبیهِ عَنْ أبی هریرةَ أنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم قال: إذَا مَاتَ الإنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ، إلَّا مِنْ ثَلٰثَةِ أشْیَاءٍ، مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ، أو عِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ، أو وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْ لَهٗ.﴾

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، یعنی صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے انتفاع کیا جاتا ہو، اور ولد صالح جو اس کے لئے دعا کرے۔

تشریح مع تحقیق: جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل بھی ختم ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے عمل کا وجود ہی نہیں ہوتا، مگر یہ تین قسم کے کام مرنے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں، اس لئے ان کا ثواب بھی ملتا رہتا ہے، روایت میں قرین قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ جاریہ سے مراد وقف ہے، اور ولد صالح سے مراد مؤمن ہے، اور اس میں یدعو کی قید احترازی نہیں ہے، بلکہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینے کے لئے یہ قید لگائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی شاندار تربیت کریں، کیونکہ نیک اولاد ہی سے دعا کی بھی امید ہوتی ہے، نیک اولاد ہی مرنے کے بعد ثواب پہنچاسکتی ہے، اس کے برخلاف جو اولاد والدین کی زندگی میں ہی تکلیف دے تو وہ مرنے کے بعد کیسے ان کو ثواب پہنچائے گی، اس لئے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے بچوں کی صالح اور اچھی تربیت کریں۔ (تکملہ فتح الملہم:۲/۱۱۷)

اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے معتزلہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر اعمال میں نیابت جاری ہوتی تو انقطاع عمل نہ ہوتا، عمل کا انقطاع اعمال میں نیابت کے جاری نہ ہونے کی واضح دلیل ہے، اور جب اعمال میں نیابت جاری نہیں ہوگی تو میت کو ثواب بھی نہیں پہنچے گا۔

ہم ماقبل میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ دو مسئلے بالکل الگ الگ ہیں، ایک تو نیابت فی العبادت کا مسئلہ اور دوسرا میت کے لئے ایصال ثواب کا مسئلہ، معتزلہ دونوں مسئلوں کا ہی انکار کرتے ہیں نہ تو وہ نیابت فی العبادت کے قائل ہیں، اور نہ ہی ایصال ثواب للمیت کے قائل ہیں، پہلے مسئلے کی وضاحت ہو چکی ہے، دوسرا مسئلہ زیر بحث ہے:

میت کے لئے ایصال ثواب کا مسئلہ

معتزلہ کہتے ہیں کہ میت کو کسی بھی طرح کی عبادت کا ثواب نہیں پہنچتا ہے، خواہ عبادت بدنی ہو یا مالی ہو۔

جمہور کے نزدیک تین عبادتوں کا ثواب تو بالاتفاق میت کو پہنچ جاتا ہے، یعنی حج، صدقہ، اور دعاء کا ثواب، لیکن عبادت بدنیہ اور تلاوت کلام پاک وغیرہ کے ثواب پہنچنے کے بارے میں جمہور کے درمیان بھی اختلاف ہے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک صرف حج، صدقہ اور دعاء کا ثواب ہی پہنچ سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی عبادت کا ثواب میت کو نہیں پہنچے گا، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ہر عبادت کا ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے۔ فتح الملہم: ۳/ ۳۸

معتزلہ کے دلائل

(۱) قرآن کی آیت ہے: "لیس للإنسان الا ما سعی" اور ظاہر ہے کہ دوسرے کی سعی اور کوشش اس کی سعی اور کوشش نہیں ہے، لہٰذا دوسرے کے عمل کا ثواب اس کو نہیں پہنچ سکتا۔

(۲) حدیث باب بھی معتزلہ کی دلیل ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ جب انسان سے اس کا عمل منقطع ہو گیا، تو ثواب کس چیز پر ملے گا؟ ثواب تو عمل ہی پر ملتا ہے۔

جمہور کے دلائل

جمہور علماء کے پاس بہت سارے دلائل ہیں، جن کا شمار کرنا بھی دشوار ہے، تاہم چند دلائل حاضر خدمت ہیں۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے: إن رجلاً قال للنبی صلی الله علیه وسلم : إن أبی مات وترك مالاً ولم یوص، فهل یکفر عنه أن أتصدق عنه؟ قال : نعم. (مسلم)

(۲) حضرت عائشہؓ کی حدیث: إن رجلاً أتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال : یا رسول الله! إن أمی افتلتت نفسها، وإنی أظنها لو تکلمت تصدقت، فلی أجر إن اتصدق عنها؟ قال نعم. (مسلم)

(۳) قل رب ارحمهما کما ربیانی صغیراً (قرآن) اگر دعاء کا فائدہ نہ ہوتا تو دعاء کا حکم کیوں دیا جاتا۔

(۴) ولیستغفرون للذین آمنوا الخ مطلب یہ ہے کہ فرشتے مؤمنین کے لئے استغفار کرتے ہیں، اب اگر استغفار کا فائدہ نہ ہوتا تو فرشتوں کو اس کام میں نہ لگایا جاتا۔ (مزید دلائل کے لئے دیکھئے: فتح الملہم: ۳/ ۳۸)

معتزلہ کے دلائل کے جوابات

(۱) آیت کریمہ میں سعی سے مراد سعی ایمان ہے۔

(۲) یہ آیت کریمہ دیگر احادیث سے خاص کردی گئی ہے۔

(۳) آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف اپنی سعی کا حقدار ہے، دوسرے کی سعی اور کوشش کا مالک اور حقدار نہیں ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی دوسرا شخص تبرع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب بھی نہیں پہنچائے گا، اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے، جیسا کہ انسان صرف اپنے مال کا مالک ہوتا ہے دوسرے کے مال کا مالک نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی دوسرا شخص ہبہ کردے تو لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ایسے ہی یہاں پر ہے، کہ اگر کوئی انسان اپنے عمل کا ثواب کسی کو ہبہ کردے تو کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پہنچائے گا۔ (تکملہ فتح الملہم: ۲/۱۱۶)

شوافع اور مالکیہ کے دلائل

شوافع اور مالکیہ فرماتے ہیں کہ میت کو صرف حج، صدقہ، اور دعاء کا ثواب ہی پہنچ سکتا ہے، اور دلیل یہ ہے کہ ان ہی تین چیزوں کا ثواب پہنچانا منصوص ہے، دوسرے اعمال کو ان پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ اور حنابلہ کی دلیل

جب انسان کے پاس کوئی چیز ہو تو اس کو اختیار ہے کہ کسی کو بھی ہبہ کردے، تو اسی طرح عبادات بدنیہ اور تلاوت قرآن وغیرہ کا ثواب بھی دوسرے کو ہبہ کرسکتا ہے۔

البتہ حدیث میں تین چیزوں کے علاوہ ثواب پہنچانے کا ذکر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے ثواب پہنچانا ایک کلی ہے، اور کسی بھی چیز کے ثبوت کے لئے کلی کے ہر ہر جزو کو ثابت کرنا ضروری نہیں، بلکہ کلی کے ایک جزو کو ثابت کرنے کے بعد اس کے دوسرے تمام اجزاء کو اسی پر قیاس کرلیا جاتا ہے اور ایک جزء کو ثابت کر کے ایک ضابطہ بنالیا جاتا ہے، اور جب تین عبادتوں کا ثواب پہنچانا ثابت ہوگیا تو تمام عبادتوں کا ثواب پہنچانا بھی ثابت ہوجائے گا۔ (فتح الملہم: ۳/۳۹)

﴿بَاب ما جاء فیمن مات من غیر وصیة یتصدق عنها﴾

وصیت کئے بغیر مرنے والے کی طرف سے صدقہ کرنے کا بیان

۲۳۰ ﴿حَدَّثَنا موسىٰ بنُ إسمٰعِيلَ قالَ نا حَمّادٌ عَنْ هِشَامٍ عَنْ أبِيهِ عَنْ عائشة أنَّ امْرَأةً

قَالَتْ: يـا رسـولَ الله ! إِنَّ أُمِّـيَ افْتُلِتَتْ نَفْسهَا ، وَلَـوْ لَا ذٰلِكَ لَتَصَـدَّقَتْ وَاعطَتْ ، أَفَيُجْزِئُ أَنْ أَتصدَّقَ عَنْهَا ؟ فقَالَ النبيُّ صلى اللّٰه عليه وسلم نعم، فَتَصَدَّقِيْ عَنْهَا.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا، اگر وہ اچانک انتقال نہ کرتی تو صدقہ کرتی، اور (کچھ) دیتی، تو کیا میرا ان کی طرف سے صدقہ کرنا کافی ہوجائے گا؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ہاں اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردو۔

تشریح مع تحقیق: افْتُلِتَتْ : فلت سے ماخوذ ہے، بمعنی اچانک مرنا، کہا جاتا ہے "افتلت الرجل إذا فوجئ قبل أن يستعد له".

نفسها : اس پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں، رفع تو اس لئے کہ وہ نائب فاعل ہے، یعنی سُلِبَ نفسها فجاءة، اور نصب تمیز یا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے جائز ہے بمعنی سُلبت المرأة نفسها ، لیکن دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہی ہوگا کہ وہ اچانک مرگئی۔

مطلب یہ ہے اگر میت کی طرف سے صدقہ کیا جائے تو اس کا ثواب میت کو پہنچ جائے گا، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا افضل ہے، اور مستحب ہے اور یہ صدقہ میت کو بھی نفع دیگا اور صدقہ کرنے والے کو بھی نفع دیگا، اسی پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔ (مسلم:۲/۴۱)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان "وأن ليس للأنسان إلا ماسعى" کے عموم کے لئے مخصص ہے، اور مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے عمل کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ (فتح الباری:۵/۴۹۰)

ترجمة الباب : آپ ﷺ سے صدقہ کے ثواب کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے صدقہ کرنے کی اجازت دیدی جو جواز کی صریح دلیل ہے۔

نوٹ :اس روایت میں سائل ایک عورت ہے، جبکہ بخاری شریف میں یہ روایت حضرت عائشہؓ سے منقول ہے تو اس میں سائل ایک مرد ہے، اور مسلم شریف میں بھی سائل مرد ہی ہے، اس لئے بعض حضرات نے اس کو دو واقعوں پر محمول کیا ہے، اور بعض نے صحیحین کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

۲۳۱ حَدَّثَنَا احمدُ بنُ منيعٍ نا روحُ بنُ عُبَادَةَ قال نا زَكَرِيَّا بنُ إسْحٰقَ قالَ أخبرنا عَمرو بنُ دينارٍ عَن عِكرمةَ عن ابنِ عبّاسٍ أنّ رَجُلاً قال : يا رسولَ الله ! إنّ أُمَّهُ تُوُفِّيَتْ أَفَيَنْفَعُهَا أَنْ تَصَدَّقْتُ عَنْها ؟ قال : نعم ، قال فإنّ لِيْ مِخرفاً وأنّي اُشهِدُكَ أَنِّي قَدْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، تو کیا میرا ان کی طرف سے صدقہ کرنا ان کو نفع دیگا؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ہاں نفع دیگا، اس نے عرض کیا کہ میرا ایک باغ ہے، میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے یہ باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردیا۔

تشریح مع تحقیق :مِخْرَفاً : کھجور کے باغ کو مخرف کہا جاتا تھا، لیکن بعد میں یہ لفظ عام ہوگیا اور ہر قسم کے باغ کو مخرف کہا جانے لگا، اس حدیث سے بھی امام ابوداؤدؒ یہ بات ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا مستحب ہے اور میت کو اس کا ثواب ضرور پہنچتا ہے اور اگر میت کے ذمے کوئی حق شرعی واجب ہو اور اس نے مال چھوڑا ہو تو اس کے ترکے سے اس حق واجب کو ادا کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح اگر میت نے صدقہ کرنے کی وصیت کی ہو تب بھی اس کی وصیت کو پورا کیا جائے گا، البتہ ثلث مال سے زیادہ وصیت نافذ نہیں ہوگی۔

ترجمة الباب : حدیث اور باب میں مناسبت ظاہر ہے کہ جس صحابی کی والدہ کا انتقال ہوا تھا ان کی والدہ نے صدقہ کرنے کی وصیت نہیں کی تھی لیکن پھر بھی انہوں نے ان کی طرف سے صدقہ کیا، اور باب کا مقصد بھی یہی ہے کہ اگر میت بغیر وصیت کئے مرجائے تو اس کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا، لہٰذا مناسبت ثابت ہوگئی۔

﴿بَاب ما جاء فی وصية الحربی يسلم وليه أيلزمه أن ينفذها﴾

جس حربی کافر کا ولی مسلمان ہوگیا ہو اس کی وصیت کا بیان کیا اس مسلم ولی کو اس کی وصیت نافذ کرنا ضروری ہے؟

۲۳۲ ﴿حَدَّثَنا العَبّاسُ بنُ الوليدِ بنِ مَزْيَدٍ قال اخبرنیْ أَبِیْ قال نا الأوزاعیُّ قال حدثنی حسانُ بنُ عَطِيَّةَ عَنْ عَمرو بنِ شعيبٍ عن أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ العاصَ بنَ وَائِلٍ اَوْصیٰ أَنْ يُعْتَقَ عَنْهُ مائةُ رقبةٍ فأعْتَقَ ابْنُهُ هِشَامٌ خَمسِيْنَ رقبةً ، فأرَادَ ابْنُهُ عَمروٌ أَنْ يُعْتِقَ عَنْهُ الخمسِينَ البَاقِيَةَ ، فقالَ : حتّٰى أسْألَ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم ، فَأَتَی النبیُّ صلی الله عليه وسلم فقالَ : يا رسولَ الله ! إنّ أَبِیْ أَوْصیٰ بِعِتْقِ مائَةِ رقبةٍ، وإنَّ هشاماً أعْتَقَ عَنْهُ خَمْسِيْنَ ، وبَقِيَتْ عَلَيْهِ خمسُونَ رَقَبَةً ، أفَأُعْتِقُ عنه ؟ فقال رسول

الله صلى الله عليه وسلم : لَوْ كانَ مُسْلِماً فاعْتَقْتُمْ عَنْهُ ، أو تَصَدَّقْتُمْ عَنْهُ ، أو حَجَجْتُمْ عَنْهُ ، بَلَغَهُ ذٰلكَ.

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ عاص بن وائل نے اپنے بیٹوں کو سو غلام آزاد کرنے کی وصیت کی، تو ہشام بن العاص نے پچاس غلام آزاد کردیے، پھر عمرو بن العاص نے باقی پچاس غلاموں کے آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو کہا کہ (میں آزاد نہیں کروں گا) یہاں تک کہ میں حضور ﷺ سے معلوم کرلوں، چنانچہ حضرت عمرو بن العاص حضور کے پاس آئے اور عرض کیا یارسول اللہ! میرے والد نے سو غلام آزاد کرنے کی وصیت کی ہے اور ہشام نے پچاس غلام آزاد کردیے ہیں، اور اس پر (مجھ پر) پچاس غلاموں کا آزاد کرنا باقی ہے، تو کیا میں ان کی طرف سے آزاد کردوں؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ اگر عاص بن وائل مسلمان ہوتے تو پھر تم ان کی طرف سے غلاموں کو آزاد کرتے، یا ان کی طرف سے صدقہ کرتے، یا ان کی طرف سے حج کرتے تو اس کو اس کا ثواب پہنچ جاتا۔

تشریح مع تحقیق: عاص بن وائل نے اسلام کا زمانہ پایا تھا، لیکن بد قسمتی سے وہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور نہ ہوسکے، اور کفر ہی کی حالت میں مرگئے، ان کے دو بیٹے تھے، ایک ہشام بن العاصؓ اور دوسرے عمرو بن العاصؓ، ان دونوں کو اللہ نے ہدایت کے راستہ پر گامزن کیا، چنانچہ یہ دونوں مشرف باسلام ہوئے، اور رسول اکرم ﷺ کے صحابی ہونے کا اعزاز پایا رضی اللہ عنہما۔

آں حضرت ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے والد عاص اگر مسلمان ہوتے، اور اسلام ہی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوتے تو ان کی طرف جو بھی عبادت اور نیکی کی جاتی، اس کا ثواب انہیں پہنچتا، لیکن چونکہ وہ مسلمان نہیں ہوئے اور کفر کی حالت میں ہی دنیا سے چلے گئے، تو اب تم ان کی طرف سے کوئی بھی عبادت کرو یا کوئی بھی نیک کام کرو، اس کا ثواب انہیں نہیں پہنچے گا، لہٰذا حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ وغیرہ کافر کے لئے فائدہ مند نہیں، جبکہ مسلمان کے لئے مفید ہے۔

امام ابوداؤدؒ یہاں یہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کافر آدمی اپنے وارث کو کوئی وصیت کرکے مرجائے، اور وارث مسلمان ہوجائے تو وارث جو مسلمان ہے کے لیے وصیت کو پورا کرنا ضروری نہیں، کیونکہ کافر کو کسی عبادت یا نیکی کا ثواب نہیں پہنچتا ہے، خود کافر نے جو دنیا میں نیک کام کئے تھے وہ بھی اکارت ہوجاتے ہیں، ان پر کوئی ثواب نہیں ملتا تو اگر کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے نیکی کا ثواب پہنچانا چاہے تو کیسے پہنچا سکتا ہے۔

ترجمۃ الباب: ترجمۃ الباب کا مقصد یہ تھا کہ کافر مورث کی وصیت کو مسلمان وارث کے ذمے پورا کرنا ضروری نہیں ہے، سو روایت سے صراحۃً یہ مسئلہ ثابت ہوگیا لہٰذا مناسبت بھی ثابت ہوگئی۔

بَاب ما جاءَ فی الرجُلِ یموتُ وعَلَیْهِ دَیْنٌ وَلَهُ وَفاءٌ یُسْتَنظر غُرَمَائُهُ ویُرفقُ بالوَارِثِ

اس آدمی کا بیان جو مقروض ہونے کی حالت میں مرجائے اور اس کے پاس قرض کی ادائیگی کے بقدر مال ہو، تو اس کے غرمار سے مہلت دلوائی جائیگی، اور وارث کے ساتھ نرمی برتی جائے گی

۲۳۳ حَدَّثَنا محمد بنُ العَلاءِ أن شُعَیْبَ بنَ اسْحٰقَ حَدَّثَهُم عَنْ هِشَامِ بنِ عُرْوَةَ عَنْ وَهْبِ ابنِ کَیْسَانَ عَنْ جابرِ بنِ عبدِالله أنه أخبرهُ أنَّ أبَاهُ تُوُفِّیَ وَتَرَكَ عَلَیْهِ ثَلاثِیْنَ وَسقاً لِرَجُلٍ مِنَ الیَهُوْدِ ، فَاسْتَنْظَرَهُ جَابِرٌ فَأَبیٰ ، فَکَلَّمَ جَابِرٌ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم أنْ یَشْفَعَ لَهُ إلَیْهِ، فَجَاءَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم فَکَلَّمَ الیَهُوْدَ لِیَأخُذَ ثَمَرَ نَخْلِهٖ بالّذیْ لَهُ عَلَیْهِ فَأَبیٰ ، وکَلَّمَهُ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم أنْ یُنظِرَهُ ، فَأبیٰ ، وَسَاقَ الحدیثَ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا، اور انہوں نے اپنے ذمہ ایک یہودی کا تیس وسق قرض چھوڑا، حضرت جابرؓ نے اس یہودی سے مہلت طلب کی تو اس نے انکار کردیا، حضرت جابرؓ نے حضور اکرم ﷺ سے گفتگو کی کہ آپ اس یہودی سے میرے لئے شفارش کردیں، چنانچہ حضور ﷺ نے آکر یہودی سے بات چیت کی کہ وہ اپنے اس قرض کے بدلے میں جو حضرت جابرؓ پر تھا ان کے باغ کے پھل لے لے، اس نے انکار کردیا، پھر آپ ﷺ نے یہودی سے کہا کہ ان کو مہلت دیدو، اس نے انکار کردیا، راوی نے پوری حدیث بیان کی۔

تشریح مع تحقیق : استنظرہ : (استفعال) مہلت مانگنا۔

یَشْفَعُ : (ف) شفع أحد لأحدٍ إلی فلانٍ : سفارش کرنا۔

یُنظِرَهُ : (افعال) مہلت دینا

امام ابوداوٗدؒ یہاں سے یہ بیان فرمارہے ہیں کہ انسانی زندگی میں کسی ایک حالت کو قرار ودوام نہیں، آج کچھ ہے کل کچھ، ایک غریب شخص راتوں رات میں ہی رحمت خداوندی کے نتیجہ میں مال وزر کے خزانوں کا مالک بن جاتا

ہے، تو دوسری طرف ہر وقت عیش وعشرت میں زندگی گنوانے والے، مال وزر جن کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے، چشم زدن میں وہ پائی پائی کے محتاج نظر آتے ہیں، یہی کائنات کا نظام اور تقدیر کا کھیل ہے۔

لیکن بدلے ہوئے حالات کو متوازن بنانا اور اس میں مدد کرنا انسان کے بس میں ہے، چنانچہ یہاں جو باب قائم کیا ہے اس کے تحت نقل کی جانے والی حدیث کا حاصل یہ ہی ہے کہ اگر کوئی شخص تنگدستی کا شکار ہو جائے، دوسرے کا مقروض ہو جائے، اور وہ اس کی ادائیگی سے وقتی طور پر عاجز ہو تو صاحب حق کو چاہئے کہ اسے مہلت دے۔

اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ تنگدست سے اپنا قرضہ وصول کرنے میں تاخیر کرے، یا اس کو معاف کر دے۔ (مسلم)

باب کے تحت جس حدیث کو بیان کیا گیا ہے، یہ حدیث بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی موجود ہے، لیکن اس میں قدرے تفصیل ہے، بخاری شریف میں ہے: حضرت جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال اس وقت ہوا جبکہ ان کے ذمے ایک یہودی کا تیس وسق قرض تھا، حضرت جابرؓ نے اس سے مہلت مانگی تو اس نے مہلت نہیں دی، حضرت جابرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس یہودی سے سفارش کر دیجئے کہ وہ مجھے چند دنوں کی مہلت دیدے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس یہودی کے پاس آئے اور یہ سفارش کی کہ اس وقت کے پاس قرض ادا کرنے کے لئے تیس وسق نہیں ہیں، جب ان کے باغ میں کھجوریں پک جائیں گی تو تم لے لینا، اس یہودی نے انکار کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے اور حضرت جابرؓ کے باغ میں پہنچے، اور باغ میں گھومے، پھر حضرت جابرؓ سے کہا کہ کھجوریں توڑلو اور اس یہودی کے قرض کو ادا کر دو، حضرت جابرؓ نے کھجوروں کو توڑا اور تیس وسق اس کو دیدیں، سترہ وسق کھجوریں بچ گئیں۔

حضرت جابرؓ واپس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے واقعہ کی اطلاع دی کہ اس کا قرض بھی ادا ہو گیا اور مزید کھجوریں بھی بچ گئیں، اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت عمر کو بتلاؤ، حضرت جابرؓ حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے اور واقعہ کی اطلاع دی، تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ مجھے تو جب ہی یقین ہو گیا تھا جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے باغ میں ٹہلے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس میں ضرور برکت دیگا۔ (فتح الباری: ۵/۷۶)

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ غریب آدمی کو مہلت دینی چاہئے وہیں پر یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کی سفارش چل سکتی ہو تو مہلت دلوانے میں سفارش کر دے، نیز حدیث سے حضور ﷺ کا معجزہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت جابرؓ کے باغ میں بہت تھوڑی سی کھجوریں تھیں لیکن حضور اکرم ﷺ کے قدم مبارک وہاں پہنچے تو اللہ نے اس میں بہت برکت دیدی کہ قرض بھی ادا ہو گیا اور باقی بھی بچ گئیں۔

ترجمة الباب: جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے اس باب کو یہ بات بتلانے کے لئے قائم کیا تھا کہ تنگدست کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے، اور اگر مقروض کا وارث کمزور پوزیشن میں ہو تو اس کو اپنے مورث کے قرضہ کی ادائیگی کے لئے کچھ وقت کی مہلت دی جائے، تو حدیث شریف میں بھی حضور ﷺ کا حضرت جابرؓ کے لئے مہلت مانگنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صاحب حق کو چاہئے کہ وہ اپنے مقروض کو مہلت دے، جیسا کہ دیگر احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے، لہٰذا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

تَمَّ بِتوفيقِ اللّٰه تعالىٰ وفَضْلِهِ شَرْحُ الأبوابِ التى قصدتُها مِن "سُنَنِ أبى داؤد" وذٰلكَ فى السَاعَةِ الثَانيةِ والنِّصْفِ بَعْدَ صَلاةِ الجُمعةِ مِنْ شهر جمادي الاٰخرسنة ١٤٢٣هـ.

فالحمد للّٰه الذيْ بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَالِحات ، أَحْمَدُهٗ حَمْداً دائماً مَعَ دَوَامِهٖ، واحمدُهٗ حَمْداً خَالِدًا مَعَ خُلُودِهٖ، واحمدُهٗ حَمْدًا لَامُنْتَهٰى لهٗ إلا بمنشيته ، وأحمدُهٗ حمداً لايُرِيدُ حامِدُهٗ إلا رِضاهٗ ، وله الحمد زِنَةَ عرشِهٖ ، ومِدَادَ كلماتِهٖ ، وعَدَدَ خَلْقِهٖ ، وأصلّي وأسلّم على نبيّهٖ وصفِيّه سيدِنا محمّد و على اله وأصحابه أجمعين ، وأسأله سبحانَه وتعالىٰ أن يَجْعَلَ هٰذا العملَ المتواضعَ لخالص وجهِهٖ الكريم ، ويجعله وقايةً لهٰذا العبد الضعيف : "محمد عبدالرزاق القاسمي" مِنْ سخطِهٖ وعذابِهٖ .

وأسأله ان يغفرلي ما فرط منّى أثناءَ هٰذا التأليف مِن خطاءٍ أو سوء أدبٍ ، ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم.

* * *